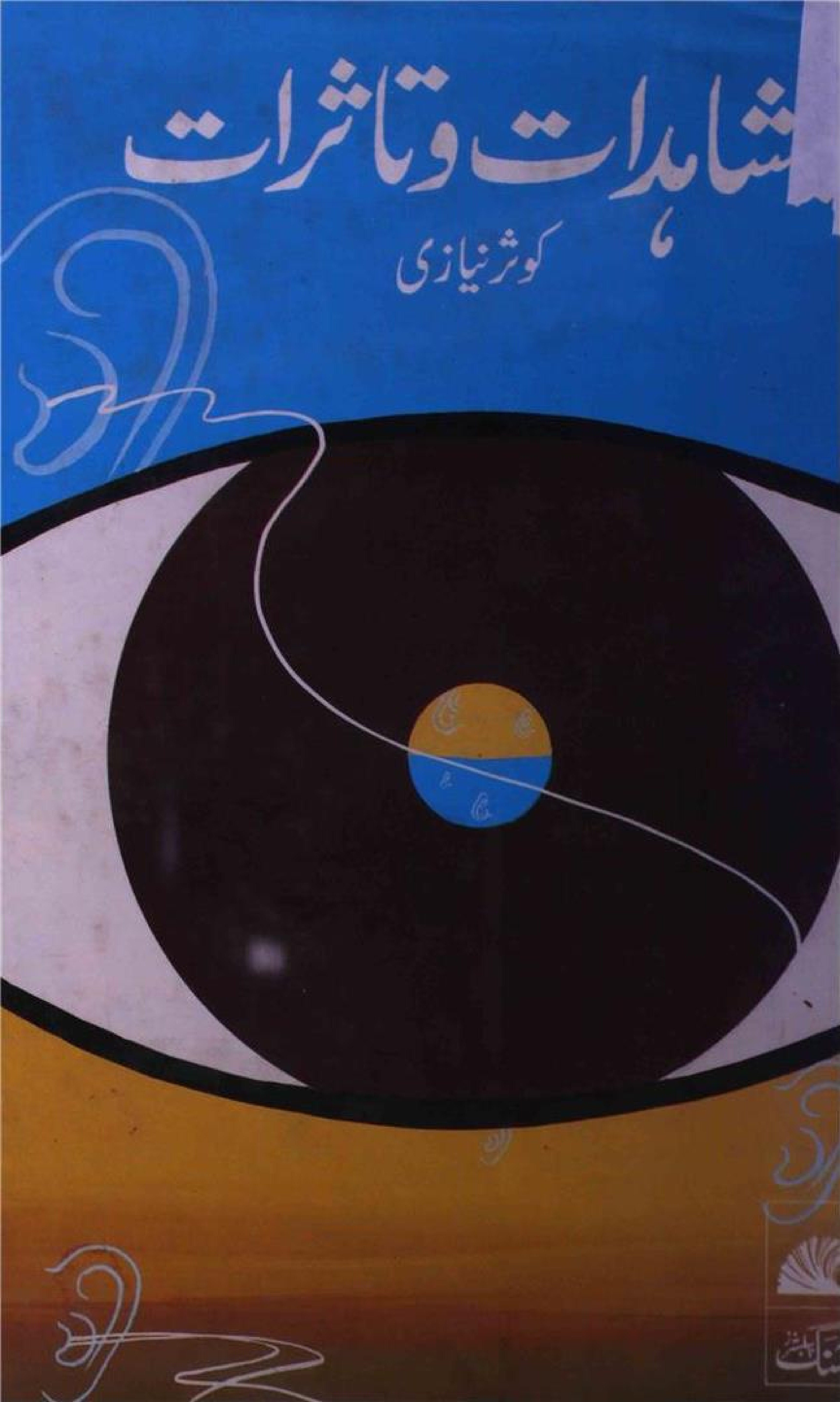
شاہدات وتاثرات
کوثر نیازی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشاہدات و تاثرات

کوثر نیازی

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

جنگ پبلشرز

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	:	اکتوبر 1990ء
تعداد	:	2000
قیمت	:	250 روپے
بیرون ملک قیمت	:	22 امریکن ڈالرز
سرورق	:	عبدالوہاب
اہتمام	:	مظفر محمد علی
ناشر	:	جنگ پبلشرز۔ لاہور
مطبع	:	جنگ پبلشرز پریس 13۔ سر آغا خان روڈ لاہور

انتساب

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
کے نام جن کے فیض صحبت نے مجھے قلم پکڑنے
کا سلیقہ عطا کیا

مندرجات

معروضات 11

پہلا باب اسلامیات

1- موسم حج کی چند یادیں 15
2- سب سے پہلا عوامی انقلاب 20
3- پیغمبرِ انقلاب 28
4- صحتِ عامہ سیرت النبیؐ کی روشنی میں 33
5- عالمِ طب پر اسلام کے احسانات 39
6- تو برائے وصل کردن آمدی 44

دوسرا باب روحانیات

7- حضرت سلطان باہوؒ اور ان کی تعلیمات 51
8- حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات۔ 1 58
9- حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات۔ 2 64
10- حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات۔ 3 70
11- خواجۂ اجمیرؒ۔ زندگی اور تعلیمات 76

تیسرا باب شخصیات

12- امام انقلاب حضرت آیت اللہ خمینیؒ 83
13- کچھ صدر غلام اسحٰق خان کے بارے میں 90
14- حضرت حکیم فاضل ظہیر 101

15- حکیم محمد سعید دہلوی اور انٹرنیشنل سیرت کانگریس 105
16- مارکوس کا عبرتناک انجام۔ 1 110
17- مارکوس کا عبرتناک انجام۔ 2 116
18- مارکوس کا عبرتناک انجام۔ 3 122
19- مارکوس کا عبرتناک انجام۔ 4 127

چوتھا باب سیاسیات

20- بھارتی جریدے سے میرا انٹرویو 135
21- صدر جنرل ضیاء الحق سے مذاکرات 140
22- غریبی بہت بڑا جرم ہے 147
23- چین............ماؤزے تنگ کے بعد 154
24- اندرا گاندھی کے بعد 161
25- اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتیں۔ 1 167
26- اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتیں۔ 2 175
27- پنجاب کے نادان دوست 183
28- محبت کی میز پر 190
29- بہاری پاکستانیوں کا مسئلہ 198

پانچواں باب مباحثات

30- کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟ 211
31- سوٹ اور ٹائی کا مسئلہ 217
32- پھر وہی ٹائی اور سوٹ کی بحث 223
33- منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی 230
34- علمائے کرام کی خدمت میں 236
35- کیا آنکھوں کا عطیہ جائز ہے؟ 242
36- پردے کا روایتی تصور اور اسلام 249

-37	کیا کوڑوں کی سزا اسلامی ہے؟	255
-38	دین اور سیاست کی یکجائی کا مبالغہ آمیز تصور	260
-39	روایتی پردہ اور اسلامی تعلیمات	265
-40	علمائے کرام کے باہمی اختلافات	271
-41	"گاندھی" اور "بلڈ آف حسین"	277
-42	کیا جمعۃ المبارک کی تعطیل ختم کر دی جائے۔ 1	283
-43	کیا جمعۃ المبارک کی تعطیل ختم کر دی جائے۔ 2	289
-44	مقروض ملک میں خیراتی حج کا مسئلہ	294
-45	عید کے چاند کا مسئلہ	297
-46	قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان	302
-47	دھماکے اور اللہ دین کا چراغ	309
-48	استخارے کی سیاست	315

چھٹا باب — کتابیات

-49	دنیا کی سب سے بڑی تاریخ ساز شخصیت	323
-50	دی مہدی۔ مغرب کا ایک منصوبہ	330
-51	ایک سفیر کی یادداشتیں۔ 1	336
-52	ایک سفیر کی یادداشتیں۔ 2	342
-53	پیرزادہ صاحب کا کارنامہ	348
-54	کچھ پختونوں کے بارے میں۔ 1	354
-55	کچھ پختونوں کے بارے میں۔ 2	359
-56	وی ایس نیپال کی نئی کتاب	364

ساتواں باب — خیالات

-57	بوہرہ جماعت کی ایک تقریب	373
-58	جگرِ لخت لخت	379
-59	کچھ فنِ خطابت کے بارے میں	384

60- دنیا کے چند مشہور خطیب 389
61- برِ صغیر کے نامور خطیب اور واعظ 396
62- لاہور کا فاؤنٹین ہاؤس 403

آٹھواں باب — خطبات

63- کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے؟ 411
64- علماء کنونشن میں چند معروضات 422
65- مارشل لاء کی حکومت اور خدمت اسلام 427
66- پارلیمنٹ سے صدر صاحب کا خطاب 436

نواں باب — ماورائے نفسیات

67- احوالِ غیب جاننے کی خواہش 447
68- چند محیّر العقول واقعات 454
69- پیش گوئیاں...... ایک سیاسی ہتھیار 459
70- اسرائیل کا آئندہ ہدف 466
71- حقیقت اور افسانے کے درمیان 472
72- جین ڈِکسن کی تازہ پیش گوئیاں 477

دسواں باب — شیطانی آیات

73- سلمان رشدی کی "شیطانی آیات" 485
74- شیطانی کتاب اور سانحۂ اسلام آباد 490
75- رشدی کا مسئلہ 498

معروضات

1979ء سے میں نے روزنامہ "جنگ" میں "مشاہدات وتاثرات" کے عنوان سے اپنا ہفتہ وار کالم شروع کیا تھا جس کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب تک جاری ہے۔ میں نے اس دوران کوشش کی کہ زندگی کے بھی رنگ اس میں سمیٹنے کا تجربہ کروں اور متنوع موضوعات پر لکھوں بعض اوقات ایک کالم لکھنے کیلئے مجھے بیسوں کتابیں پڑھنا پڑیں میری خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی تحریر وقتی اور ہنگامی نہ رہے اور خدا کا شکر ہے کہ قارئین نے بھی ہمیشہ قدردانی کا ثبوت دیا۔

ادھر ایک عرصے سے احباب تقاضا کر رہے تھے کہ اس سلسلہ مضامین کو کتابی صورت میں محفوظ کر لیا جائے مگر مشکل یہ تھی کہ اگر اب تک کے سارے کالم جمع کئے جاتے تو کئی جلدیں بن جاتیں لاچار ان کا کڑا انتخاب کرنا پڑا اپنی ہی تحریروں میں سے کچھ کو لینا اور کچھ کو چھوڑنا بڑا مشکل کام تھا اور میرے اپنے ہی ایک شعر کے مطابق انتخاب کرتے وقت ہر آن میرا احساس یہ رہا کہ ؎

خاک کہتی ہے کہ یہ بھی ہیں مرے لختِ جگر
پھول چنتا ہوں تو کانٹوں سے حیا آتی ہے

مگر جوں توں کر کے 70 سے اوپر مضامین منتخب ہو ہی گئے اور اب یہ گلدستہ "مشاہدات وتاثرات" ہی کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے کاش! میں اپنے ہر قاری سے کہہ سکوں کہ ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

کوثر نیازی

....

اسلامیات

موسم حج کی چند یادیں

قارئین کی نظر سے یہ سطور گزریں گی تو حج کی آمد آمد ہو گی۔ حکومتِ سعودی عرب کی دعوت پر میں بھی 8 ستمبر کو عازم حجاز ہو رہا ہوں یہ کالم میری غیر حاضری میں شائع ہو گا دو تین کالم اور بھی سپرد قلم کر کے چھوڑے جا رہا ہوں تا کہ اس محفل سے میری غیر حاضری محسوس نہ ہو واپسی پر انشاءاللہ اس مقدس سفر سے متعلق تمام تفصیلات پیش کروں گا فی الوقت موسم حج کی مناسبت سے ذیل میں اپنی ایک غیر مطبوعہ ڈائری سے چند اوراق نذر کر رہا ہوں یہ جنوری 73ء کے حج کے دوران لکھے گئے تھے ایک ٹکڑا "زمزم" سے متعلق اپنی کتاب "رہنمائے حج" سے نقل کر رہا ہوں' امید ہے اس میں بھی قارئین کی دلچسپی کا سامان ہو گا۔

"آج غسل کعبہ کی تقریب تھی! اس تقریب میں پاکستان سے مجھے اور پاکستانی سفارت خانہ کے ناظم الامور کو دعوت نامہ ملا تھا ساڑھے آٹھ بجے مطاف خالی کرا لیا گیا ہر طرف پولیس اور فوج کے سپاہیوں نے حلقہ بنا لیا شاہ فیصل کی آمد سے قبل مہمانوں کو جن کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہو گی باری باری بیت اللہ شریف کے اندر نفل پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی یہی اصل خانہ کعبہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماںؐ تک نے ربِ کعبہ کے حضور سجدے کئے ہیں' کون جانتا ہے جہاں ہم گناہ گاروں کے ماتھے ٹکے تھے وہاں کس کس نبی اور رسول کی پیشانی لگ چکی ہو گی میں ایک مرتبہ نفل ادا کرنے کے بعد نیچے اترا تو شاہ فیصل آ چکے تھے اور طواف میں مشغول تھے چند منٹ کے بعد سعودی وزیر حج کے ساتھ

میں دوبارہ بیت اللہ شریف میں داخل ہوا۔ اب باہر کے مہمانوں میں سے صرف مصر کے وزیر ج واوقاف اندر تھے یا میں۔ تھوڑی ہی دیر میں شاہ فیصل بھی سعودی عمائدین کے ساتھ تشریف لے آئے وہ دو رکعت نماز ادا کر چکے تو حاضرین کو بانسوں سے بندھے ہوئے بڑے بڑے جھاڑو تقسیم کر دیئے گئے۔ اس گھر کے جاروب کشوں میں آج میں بھی شامل تھا۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ عرقِ گلاب سے بھری ہوئی بالٹیاں فرش پر انڈیل دی گئیں، جھاڑو حرکت میں آئے فرش دھل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے نامہ ہائے اعمال کی سیاہی بھی۔ کعبہ کا فرش اور دیواریں دھل چکیں تو شاہ نیچے اترے ان کے پیچھے پیچھے ہم بھی۔ میرے کندھے پر جھاڑو والا بانس رکھا ہوا تھا آج زندگی میں پہلی بار افتخار کا احساس ہوا دنیوی اقتدار نے تو خدا کا شکر ہے طبیعت میں پہلے سے زیادہ عجز پیدا کر دیا ہے مگر آج کچھ پندار کا رنگ جھلک رہا تھا اس مہربان آقا نے اپنے گھر کی جاروب کشی کا منصب عطا فرمادیا اب اس کے بعد اور کیا درکار ہے۔

شاہ روانہ ہوئے تو سپاہیوں کے حصار میں بیتاب و بے قرار اجتماع دیوانہ وار مجھ پر ٹوٹ پڑا لوگ اس جھاڑو کے تنکے توڑنا چاہتے تھے جو میرے کندھے پر رکھا تھا کچھ دیر تو میں نے مزاحمت کی، چند پاکستانیوں نے بھی میرے گرد حلقہ بنانے کی کوشش کی لیکن عقیدت کے اس طوفان میں میری حیثیت ایک تنکے سے زیادہ نہ تھی میری عینک کا شیشہ بھی ٹوٹ گیا سیاہ فام افریقی اور سوڈانی جھاڑو کے تنکوں کو منہ میں لئے اس کا پانی چوس رہے تھے یہ جھاڑو میرے نزدیک سرفرازی وارجمندی کا علم تھا میں بھی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہ تھا یہ کشمکش جاری رہتی تو کتنے ہی آدمی ہجوم کے پیروں سے کچلے جاتے لہٰذا میں نے جھاڑو کو ہجوم کے حوالے کر دیا خانہ کعبہ سے نکلتے ہوئے اپنی قیام گاہ میں برابر یہی سوچ رہا تھا کہ اس قوم کو اپنے دین سے کتنا عشق ہے کاش عشق کے اس چراغ میں شعور کا روغن بھی ڈالا جاسکتا۔

2

کتب احادیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ معجزہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ پانی کی قلت تھی تو آپؐ نے اپنی انگلیاں پانی کے برتن میں رکھ دیں لوگ اسے استعمال کرتے چلے گئے اور پانی انگشت ہائے مبارک سے اس طرح اُبلتا رہا جیسے چشموں سے اُبلتا ہے یہ نبی آخر الزماںؐ کے مبارک ہاتھ کا معجزہ ہے اور اسی طرح کا معجزہ حق تعالیٰ نے اپنے ایک اور برگزیدہ پیغمبر اور حضورؐ کے جدِ اعلیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قدموں کی برکت کے طور پر ظاہر کیا اور وہ "زمزم" کا ظہور ہے سب جانتے ہیں کہ جب حضرت ہاجرہؓ صفا اور مروہ کے درمیان بے تابانہ چکر لگا رہی تھیں تا کہ شیرخوار بچے کے لئے کہیں سے پانی حاصل کر سکیں اور یہاں تک کہ اب کوئی صورت اس کے حصول کی نظر نہ آتی تھی تو اچانک انہوں نے دیکھا کہ شیرخوار بچہ پیاس کی شدت سے جہاں اپنی ایڑیاں رگڑ رہا تھا وہیں سے پانی کا ایک صاف شفاف چشمہ پھوٹ نکلا ہے یہی زمزم تھا جس کی روانی اور فیض رسانی میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی۔

زمزم کے بعض اور نام بھی کتابوں میں آئے ہیں۔ جیسے کاملہ، سیدہ، طیبہ، وغیرہ مگر معروف نام یہی ہے

اور لغت میں اس کے معنی کثیر یعنی بہت کے ہیں علماء کے ہاں اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئی ہیں کہ زمزم افضل ہے یا جنت کا پانی کوثر۔ اکثر کا فیصلہ یہ ہے کہ زمزم افضل ہے۔ اس کی فضیلت کا یہ عالم ہے کہ کعبہ کی طرح اس کو رضائے الٰہی کی خاطر دیکھنا بھی عبادت ہے۔ جہاں تک اس کے مادی فوائد کا تعلق ہے اس کا کیمیاوی تجزیہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس میں تمام قیمتی معدنیات اور حیاتیاتی اجزاء پائے جاتے ہیں یہ بجائے خود غذا اور خوراک ہے اور اس کے پینے سے امراض سے شفا ملتی ہے بشرطیکہ دل ایمان سے خالی نہ ہو خود مجھ گناہ گار کا ذاتی تجربہ اس کی دلیل ہے۔ 67ء کے حج میں جاتے ہوئے ایئرپورٹ پر ہی مجھے دردِ گردہ لاحق ہوا اس سے پہلے بھی کبھی کبھی اس کا حملہ ہوتا تھا اور یہ کتنی ظالم چیز ہے کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنہیں بدقسمتی سے کبھی اسے برداشت کرنا پڑا ہو۔ دوستوں نے کہا اس حالت میں جانا ٹھیک نہیں مگر میں احرام باندھ چکا تھا اسے کھولنے کو جی نہیں چاہا۔ جوں توں کر کے کمر پکڑے اور درد سے کراہتے ہوئے جہاز میں سوار ہوا مگر اس طرح کہ سیٹ پر بیٹھنا دوبھر تھا چہرے پر ایک رنگ آتا تھا دوسرا جاتا تھا خدا کی شان کہ ادھر جہاز رن وے پر حرکت میں آیا ادھر درد کم ہونا شروع ہو گیا مگر ٹیسیں برابر اٹھتی رہیں۔ جدّہ پہنچ کر میرے دوسرے رفقائے سفر تو جدّہ میں ٹھہر گئے کہ رات کا وقت تھا میں کار سے مکّہ مکرّمہ روانہ ہو گیا ہماری ریزرویشن شبرہ ہوٹل میں تھی جو حرم سے متصل ہے مگر جدّہ اور مکّہ کے راستہ ہی میں درد کا شدید دورہ پڑ گیا اور میں نے ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے پاکستانی شفاخانہ کے اوپر کے فلیٹ میں ٹھہرنا مناسب سمجھا کہ وقت پر دوا ملتی رہے گی۔ دو روز دوا کی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ میاں کس چکر میں پڑے ہو دوا دارو چھوڑو صرف زمزم پینا شروع کرو اور پھر خدا کی شان دیکھو۔ مجھے یاد ہے دو دن زمزم پیا، کثرت سے پیا، الحاح وزاری کر کے پیا، تیسرے دن گردے کی پتھری کھڑاک سے پیشاب کے راستے باہر آ گری۔
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا ارشاد ہے اور جامع صغیر میں امام سیوطیؒ نے اسے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

"زمزم جس غرض سے پیا جائے وہ پوری ہوتی ہے، جس نے اسے کسی بیماری سے شفا حاصل کرنے کے لئے پیا اسے اللہ شفا دیتا ہے، بھوک ہو تو اللہ اسے سیر فرماتا ہے، کوئی اور ضرورت ہو تو اللہ اسے پورا کر دیتا ہے"

3

مدینہ منورہ پہنچ چکا ہوں کیا لکھوں کہ دل کا کیا عالم ہے۔

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

مجھ پر فتویٰ نہ لگے تو کہوں کہ مکّے کے بعد مدینے کا سفر ایسا ہے جیسے وضو کے بعد نماز، امام ابن تیمیہؒ اور ان کے ہم مسلک اصحاب شریعت تو اسی کو جرم سمجھتے ہیں کہ کوئی زائر حرم گھر سے روضہ

رسولؐ کا قصد کر کے نکلے، مگر اپنا حال تو یہ ہے کہ مکّہ اس لئے حاضری دیتے ہیں تاکہ مدینہ میں باریابی کے قابل ہو سکیں۔ شاہ فیصل کی میرے دل میں بڑی عزت ہے وہ خادم الحرمین شریفین ہیں لیکن یہ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے کہ ان کی بیدار مغزی بھی پہلے کے بعض بدویانہ اقدامات کی تلافی نہیں کر سکی میرا اشارہ آثار قدیمہ کی بربادی کی طرف ہے ایک لمحہ کے لئے مان لیجئے کہ مزارات کے متعلق وہابی عقیدہ ہی صحیح عقیدہ ہے مگر اس سے یہ کیوں کر لازم آیا کہ اپنی تاریخ کے انمول خزانوں کی بھی حفاظت نہ کی جائے۔

جنت البقیع مدینہ کا وہ قبرستان ہے کہ

دفن ہو گا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

یہاں اتنے آفتاب و ماہتاب دفن ہیں کہ زمین کا یہ حصہ آسمان سے افضل ہو گیا ہے ایک روایت کے مطابق سوا لاکھ کے قریب صحابہ وائمہ اور صلحاؤ اتقیاء یہاں محو خواب ہیں۔ ادھر کوہ اُحد کا ایک ایک پتھر لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے عہد رسالتؐ کی اور کوئی چیز مدینہ میں اپنے اسی رنگ و روغن کے ساتھ موجود ہو یا نہ ہو مگر اس پہاڑ کے بارے میں تو کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ یہی وہ پہاڑ ہے جس کے بارے میں سرکارؐ فرمایا کرتے تھے۔

"یہ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں"

جس کے دامن میں غزوۂ احد کی تاریخ بکھری ہوئی ہے پھر جنگ خندق و غزوہ احزاب کے آثار ہیں، مقدس مسجدیں ہیں حضرت سلمان فارسیؓ کا باغ ہے۔ حضورؐ کے دست مبارک کی لگائی ہوئی کھجوریں ہیں خاکِ شفا کا میدان ہے غرضیکہ مدینہ منورہ کا ذرہ ذرہ اسلام کی کتابِ عروج کا درخشاں ورق ہے مانا کہ ان اوراق سے شرک و توہم کا سلوک سخت سوئے ادب ہے مگر کیا دوسری زندہ قوموں کی طرح ہم ان تاریخی آثار کی شایان شان حفاظت بھی نہیں کر سکتے؟ سنا تھا کہ حضورؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کا مزار بھی اسی طرح کی شان خستہ حالی کے ساتھ مدینہ میں موجود ہے میں ان لوگوں میں نہیں، جو سیدنا عبداللہ کے ایمان واسلام کو اپنے خود ساختہ ترازو میں تولنے کی جسارت کرتے ہیں۔ میں قیامت کے دن سیدنا عبداللہؑ جناب عبدالمطلبؓ اور حضرت ابو طالب کی قربت وصحبت کا تمنائی ہوں، بڑی تلاش کے بعد ایک راہبر کا انتظام ہوا جو ہمیں پرانے مدینہ کے پیچ در پیچ راستوں سے گزارتا ہوا منزل مقصود پر لے آیا تنگ سی گلی میں ایک دیوار تھی جس پر فارسی زبان میں کسی صاحب عقیدت بادشاہ کی طرف سے ایک کتبہ درج تھا۔

"یہاں شاہ رسلؐ کے والد حضرت عبداللہ آرام فرما رہے ہیں"

کہتے ہیں اس دیوار کے ادھر قبر تھی جسے بند کر دیا گیا ہے دیوار کا ایک حصہ کسی زمانے میں کھلا ہوا تھا اسے بھی اینٹوں سے چن دیا گیا ہے اینٹوں کے درمیان کہیں کہیں سے سوراخ نظر آئے میں نے جھانکا مگر اندر کسی قبر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دیوار سے متصل گندے پانی کا ایک جوہڑ سا جمع ہو گیا ہے اس کے کنارے میری

آنکھوں سے کچھ آنسو گرے اور پانی میں تحلیل ہو گئے اور اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا؟

4

مسجد نبوی نماز عشاء کے تھوڑی دیر بعد بند ہو جاتی ہے۔ آج رات سعودی "پروٹو کال" والے مسجد بند ہونے کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد اسے بطور خاص چند غیر ملکی مہمانوں کے لئے کھولنے والے تھے۔ میں 'اراکین حج وفد اور ان کی رشتہ دار خواتین کے ہمراہ "باب السلام" پر حاضر ہوا خیال تھا شاید ہم سب اندر جائیں گے مگر پروٹو کال افسر نے بتایا کہ صرف میں ہی اندر جا سکتا ہوں۔ میری ذاتی درخواست پر وہ چار پانچ اور افراد کو بھی اندر لے جانے پر آمادہ ہو گیا باہمی مشورے سے طے پایا کہ میرے ساتھ مردوں کے بجائے خواتین اندر جائیں۔ مردوں نے تو پھر کسی نہ کسی طرح ریاض الجنتہ میں نوافل ادا کر لئے تھے مبارک جالیوں کے باہر کھڑے ہو کر سلام عرض کر لیا تھا مگر دربان خواتین کو تو ان مقامات کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔

مسجد نبویؐ میں اس لمحے نور کی بارش ہو رہی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے فرشتوں نے ہمارے سروں پر امن و سکون کی چادر سی تان دی ہے ہم نے ایک ایک مقام پر خاص طور پر نفل پڑھے، دعائیں مانگیں نور بھری جالیوں کے جھروکوں سے جمال نبویؐ چھن چھن کر باہر آ رہا تھا ساتھی کہتے تھے کسی طرح قبر مبارک کھلوا کر اندر حاضری دو میں انہیں کیسے سمجھاؤں خانہ کعبہ کی اور بات ہے وہاں ان دیکھے خدا کا دربار ہے مگر یہ اس قرآنِ مجسم کی بارگاہِ اقدس ہے، جو پیکرِ انسانی میں نزول فرمائے کائنات ہوئے تھے۔ بشریّت کے اس رشتے سے وہ کیفیات یہاں با آسانی موجزن ہوتی ہیں، جو شرم و ندامت اور احساس تہی دامنی سے عبارت ہیں غالبؔ نے کہا تھا

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ

اور اقبالؒ اس مقام کے بارے میں کہتا ہے

کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے الفاظ میں "کعبے کے اس کعبے میں" کس منہ سے حاضری دوں، اس جمال جہاں آراء کو جالیوں کی حدود سے گزر کر بے نقاب دیکھنے کی ہمّت کہاں سے لاؤں ابھی تک تو انہی جذبات کا غلبہ ہے، سال آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی بار وہ خود ہی اندر بلا بھیجیں، تب تابِ نظارہ بھی انہی کی عطا ہو گی ابھی تو میرے لئے جالیوں کی زیارت اور گنبد خضرا کا دیدار ہی بہت ہے۔

میں گنبد خضرا کی طرف دیکھ رہا ہوں
کوثر میرے نزدیک یہ معراجِ نظر ہے

سب سے پہلا عوامی انقلاب

میرا عقیدہ ہے کہ اس دنیا کا سب سے پہلا عوامی انقلاب اسلام اور صرف اسلام ہے اور ہادیؐ اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اس کائنات رنگ و بُو کے وہ سب سے پہلے مصلح ہیں، جنہوں نے عوامی انقلاب کی طرح ڈالی تھی ورنہ اس سے پہلے اس دنیا کے کسی بھی خطے میں انقلاب نام کی کوئی شے بالکل متعارف نہ تھی، میرا ایمان ہے کہ اگر حضور سرور کائناتؐ اس دنیا میں تشریف نہ لائے ہوتے، اگر حضورؐ نے اسلام کا انقلابی علم بلند نہ کیا ہوتا، انسانی فکر و عمل میں طرز نو ایجاد نہ کی ہوتی، آدمیت و انسانیت کو تولنے کیلئے نئی میزان نصب نہ فرمائی ہوتی اور اقدار کہنہ اور نظام فرسودہ کی بنیادوں کو تہ و بالا نہ کیا ہوتا تو اس عالمِ آب و گِل میں کوئی بنیادی تبدیلی قصعار و نمانہ ہو پاتی اور فکرِ حاضرہ چمن کبھی آباد نہ کر سکتا جو انقلاب فرانس کے عنوان سے پہلے ارض فرانس، پھر سرزمین جرمنی پھر روس میں اور آخر میں چین کی وسعتوں میں ہر سُو پھیل گئے ہیں۔

ان انقلابات عالم کی روداد قلمبند کرنے والے اہل قلم خواہ ان کے محرّکین کے ناموں میں حضور نبی عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا نام نامی اور اسم گرامی نوک قلم پر لائیں یا نہ لائیں لیکن یہ ساری عالمی تہذیبی سرسبزیاں و شادابیاں حضورؐ اور صرف حضورؐ کا فیضِ عام ہیں۔

جب تک حضور اکرمؐ اس دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے اور اسلام کی شمع روشن نہ ہوئی تھی ساری دنیا

جبرو استبداد کی چکی میں پس رہی تھی، ہر سُو ظلم و جور کا سکہ رواں تھا۔ ہر طرف استحصال کا دور دورہ تھا۔ یہاں صرف قوت و طاقت اور سرمایہ و دولت کو حکمرانی کا حق تھا، کمزوروں اور ناچاروں کی حیثیت تو محض بھیڑ بکریوں کی تھی۔ بادشاہوں، امراء اور دولت مندوں اور سرمایہ داروں نے ہر شہر اور ہر قصبہ میں انسانی منڈیاں قائم کر رکھی تھیں۔ جہاں آدمی، بر سرعام نیلام کیے جاتے تھے کمزور مرد بھی بکتے اور کمزور عورتیں بھی فروخت ہوتیں۔ جس جابر و قاہر بادشاہ کا جی چاہتا اپنی خونخوار فوجوں کا رُخ کمزور ملکوں، شہروں اور بستیوں کی سمت پھیر دیتا، وہ مخالف بستیوں کو ویرانوں میں بدلتا، مردوں کو ذبح کرتا اور عورتوں کے ریوڑ کے ریوڑ اپنی قلمرو کی سمت ہانک لے جاتا۔ یہی عالم امراء اور بڑے لوگوں کا تھا وہ جس کا مال چاہتے چھین لیتے، جس کا خون چاہتے بہاتے، کوئی ترازو کہیں بھی تو ایسی نصب نہ تھی جہاں بڑوں اور طاقتوروں کے ظلم و جور کو انصاف و عدل کے باٹوں سے تولا جاسکتا اور کوئی ہاتھ کسی بھی جگہ اتنی سکت نہ رکھتا تھا کہ امیروں، سرمایہ داروں، بڑوں اور مقتدر لوگوں کے ظلم و جور کے سامنے کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر سکتا، جن لوگوں کی نظر اس وقت کی دنیا کے حالات پر ہے وہ مجھ سے اس بات میں پوری طرح اتفاق کریں گے کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت دنیا کی کوئی بستی، کوئی شہر اور کوئی قریہ بھی تو ایسا نہ تھا جہاں ظلم و زیادتی اور استحصال کو سکۂ رائج الوقت کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ جہاں آدمی، آدمی پر ظلم کرتے وقت ذرا بھی جھجک محسوس کرتا، جہاں خون انسانی کی کوئی تھوڑی بہت قیمت بھی ہوتی اور جہاں کوئی دستور زندگی کا ایسا بھی ہوتا جو ظالم کو ظلم کرنے سے روک سکتا۔

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت کا سارا جہان جب تک حضورؐ اس میں تشریف نہ لائے تھے ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے جہان بے آئین تھا اور اس جہان بے آئین کو بدلنے کیلئے ایک ہمہ جہتی مکمل انقلاب کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت آنحضورؐ کے برپا کردہ انقلاب نے پوری کی اور دیکھا جائے تو اپنی انقلابی جدوجہد میں جو اسلوب آپؐ نے اختیار فرمایا، بعد میں اٹھنے والی تمام انقلابی تحریکوں نے کسی نہ کسی رنگ میں اس کا اثر قبول کیا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ناقص انداز ہی میں سہی مگر اس کی پیروی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ میرے نزدیک حضورؐ کی زندگی کا مکّی دور، نئے دور کی ہر بڑی سے بڑی انقلابی تحریک کا دور آغاز ہے۔

حضورؐ نے پہلے مرحلے میں اپنی انقلابی تحریک کو بالکل اسی طرح مخفی رکھا تھا جس طرح تمام انقلابی تحریکوں نے شروع شروع میں اپنی تمام سرگرمیاں مخفی رکھی ہیں۔ اسلام کے اس پہلے دور میں سانس سے سانس غذا پاتی تھی اور ایک دل کے دیئے سے دوسرے دل کا چراغ روشن ہوتا تھا۔ ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن کثیر جیسے تمام پائے کے مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام کا یہ مخفی دور، اس وقت تک چلا جب تک جناب عمر فاروق اسلام نہ لائے تھے۔ محض یہی نہیں کہ اسلام کا یہ مخفی دور، عالمی انقلابی تحریکوں کے ابتدائی مخفی ادوار کیلئے قابل تقلید بنا، اس مخفی دور سے نکل کر اسلام نے اپنی انقلابی منزل تک رسائی پانے

13615

کیلئے جو سفر اختیار کیا ویسا ہی سفر تمام عالمی انقلابی تحریکوں کو اختیار کرنا پڑا ہے اور ان ہی مشکلات اور دشواریوں نے ان کی راہ روکی ہے' جنہوں نے اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی بلکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اسلام نے انقلاب لانے کیلئے جو شدائد برداشت کئے ہیں وہ دوسری عالمی انقلابی تحریکوں کی نسبت کہیں زیادہ جاں گداز اور جاں گسل ہیں۔

اسلام کے راستے میں یہ شدائد و مشکلات کیوں کھڑی کی گئیں' اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام فرسودہ اقدار حیات اور استحصالی نظام زیست کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتا تھا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس نے نہ صرف پہلی استحصالی قدریں توڑ پھوڑ دیں بلکہ اس نے زندگی کی عمارت بالکل نئی بنیادوں پر استوار کی اور ایک ایسا نظام حیات دنیا کے سامنے رکھا جس میں نہ ظلم کی گنجائش تھی اور نہ زیادتی کی' جس میں نہ طبقاتی اونچ نیچ تھی اور نہ بڑے اور چھوٹے کا امتیاز تھا۔ جہاں ہر شخص ایک ہی تول تلتا' جہاں ہر ایک کیلئے زیست کی ایک جیسی راہیں کھلی تھیں' جہاں کسی خاص و عام کی تمیز نہ تھی جہاں عمر فاروقؓ کو جو سہولتیں میسّر آئیں وہی کل کے غلام حبشی سیدنا بلالؓ اور کل کے ادنیٰ پیشہ ور مزدور سیدنا صہیبؓ رومی کو دی گئی تھیں' جہاں نہ کوئی مالک تھا اور نہ کوئی مزدور' جہاں نہ کوئی آقا تھا اور نہ غلام' جہاں سارے کے سارے آدمی آدم کی اولاد قرار دیئے گئے تھے۔ میرا دعویٰ ہے کہ خطبہ جمعۃ الوداع میں آنحضورؐ نے انسانی مساوات کا جو پہلا عالمی چارٹر عطا کیا تھا نہ اس سے پہلے کسی مذہب' کسی مجلس یا کسی اجتماعی تحریک نے ایسا منشور پیش کیا تھا اور نہ بعد کے آنے والے اب تک کے تمام ادوار میں کوئی تنظیم یا تحریک اس میں اضافہ و ترمیم کر سکی ہے۔

انسانی مساوات کا اس سے بڑھ کر درخشاں اور روشن معیار اور کیا ہو گا جس پر قرآن حکیم کی اس آیت میں روشنی ڈالی گئی ہے' سورۃ الروم میں ارشاد فرمایا۔

> "اللہ نے بیان کی ہے تمہارے لئے مثال' تمہارے آپس میں سے اگر تمہارے پاس ہیں کچھ زیر دست تمہارے (جنہیں تم نے دولت کے بل پر اپنے سے وابستہ کیا ہے) وہ شریک ہیں تمہارے رزق میں جو ہم نے تمہیں دیا ہے' پس تم اس رزق میں ان کے ساتھ برابر برابر ہو' ان کا اسی طرح لحاظ رکھو جس طرح تم اپنے آپ کا لحاظ رکھتے ہو' ہم اپنی علامات اور نشانیاں انہی لوگوں پر واضح کرتے ہیں جو عقل و شعور رکھتے ہیں"

(سورۃ الروم پارہ 21)

ابن سعد جز 2 ص 41 پر ہے کہ آنحضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی اس علامت اور نشانی پر مزید روشنی ڈالی آپؐ نے فرمایا

> "جنہیں تمہاری دولت نے تمہاری تحویل میں دیا ہے ان کا پوری طرح خیال رکھو جو خود کھاتے ہو انہیں کھلاؤ جو خود پہنتے ہو انہیں پہناؤ"

یہ محض اصولی اور قانونی شق نہ تھی آنحضورؐ نے اپنی زندگی میں اس کا باقاعدہ عملی نمونہ بھی پیش فرمایا۔ حضورؐ نے جتنے بھی زیردست اپنی ذات سے وابستہ کر رکھے تھے ان میں سے ایک جناب زیدؓ بن حارثہ بھی تھے، جو شام کی کسی منڈی میں بک کر جناب خدیجہؓ کے بھائی کے ذریعے آپؐ تک پہنچے تھے، حضورؐ نے انہیں نہ صرف غلامی سے آزادی بخشی انہیں افراد معاشرہ کا ہم پلہ بنانے، اپنا لباس پہنانے اور اپنی روٹی کھلانے کا پوری طرح اہل بنانے کیلئے اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا انہیں حضورؐ نے اپنی ایک پھوپھی زاد بہن بیاہ دی تھی۔ انہیں حضورؐ نے اپنے چچیرے بھائی جناب جعفر طیارؓ اور جناب خالدؓ ابن ولید جیسے بڑے سپہ سالاروں کا سا مقام بخشنے کیلئے جنگِ موتہ میں شریک اسلامی سپاہ کا قائد مقرر کیا تھا اور ان کی شہادت کے بعد رومیوں سے انتقام لینے کیلئے اٹھائیس ہزار مجاہدین پر مشتمل جو فوج وصال سے پہلے روانہ کی تھی، اس کی قیادت عظمیٰ ان ہی زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ کو عطا فرمائی تھی تاکہ اس وقت کی ساری دنیا اور آنے والی انسانی نسلیں اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ اسلام کے داعی اور اس دنیا کے سب سے پہلے عوامی انقلاب کے بانی سرور دو عالمؐ کے نزدیک معاشرتی عدل محض روٹی کپڑے میں مساوات تک محدود نہ تھا یہ ہر جہتی اور ہر نوعی مساوات کا نظام تھا۔

....

پیغمبر انقلابؐ نے جو عملی مساوات دنیا کے سامنے رکھی تھی اس کی ایک مثال اس وقت بھی دنیا نے دیکھی جب دشمن قوتیں مدینہ پر ہر چہار طرف سے یورش کر آئی تھیں اور انہوں نے کچھ اس طرح مدینہ کی ناکہ بندی کر لی تھی کہ کھانے کا سامان اندر نہ آسکتا تھا، اس ناکہ بندی کے سبب مدینہ میں قحط کی سی صورتحال پیدا ہو گئی، امام بخاریؒ کی روایت ہے کہ مسلمانوں نے بھوک کی وجہ سے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے تھے اور یہ پتھر باقی لوگوں کی طرح حضورؐ کے پیٹ پر بھی بندھے ہوئے تھے (بخاری جز 3 ص 31 - 32)

دنیا کے سب سے بڑے انقلابی قائد کے کردار کا عالم تو یہ تھا کہ جناب ابوہریرہؓ کہتے ہیں، آپؐ اکثر بھوکے رہتے تھے اور گھر میں مسلسل ایک ایک مہینہ تک چولہا نہ جلتا تھا۔ جناب ابوہریرہؓ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ حضورؐ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے۔ رات کو جب بھی کھانے کیلئے گھر آتے تو ان کے ساتھ بھوکوں کی ایک بڑی جماعت ہوتی، گھر میں جو کچھ ہوتا حضورؐ اس جماعت کے سامنے رکھ دیتے اور خود بھوکے سو جاتے۔ حضورؐ نہ صرف اپنا کھانا ان بھوکوں کی نذر کرتے اپنے خاندان کا کھانا بھی انہیں کھلا دیتے، سیدہ عائشہؓ اور سیدہ فاطمہؓ کو بھوک کی وجہ سے سخت تکلیف اٹھانا پڑتی یہاں تک کہ بعض دفعہ تو بھوک کی شدت سے ان کے آنسو نکل آتے۔ اس وقت کا اسلامی معاشرہ خود کفیل نہ ہوا تھا اور اس بات پر قادر نہ تھا کہ سب کو روٹی مہیا کر سکے اور سب پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں اس لئے اس وقت کی عملی مساوات صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ حضورؐ اور ان کے اہل خاندان، خود تو بھوکے رہیں اور اپنا کھانا

غریبوں کو کھلا دیں، کسی بڑے سے بڑے انقلابی سے تقابل مقصود نہیں ہے، تاہم دنیا کا کوئی مورخ اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ دنیا کے تمام بڑے انقلابیوں میں حضور سرور عالمؐ کے سوا اور کوئی ایسا انقلابی نہیں ہے، جس نے اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی خوراک ساتھیوں کو اس پابندی سے کھلائی ہو کہ بھوک اس کے گھر والوں کا مزاج بن گئی ہو' دنیا کے کسی انقلابی کے بارے میں تاریخ یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے ہتھیار چند سیر جَو کے عوض کسی کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے، لیکن آنحضورؐ جو پچاس لاکھ مربع میل پر مشتمل ریاست کے حکمران اعلیٰ تھے دنیا سے اسی عالم میں رخصت ہوئے (ابن سعد جز 1 ص 121)

مؤرخ ابن سعد کہتے ہیں کہ جب بادشاہ ولید ابن عبدالملک اموی کے دور میں مسجد نبویؐ کو وسیع کرنے کیلئے وہ حجرے گرائے گئے جن میں حضورؐ وصال کے وقت تک سکونت پذیر رہے تھے تو ایک مشہور تابعی محدث پھوٹ پھوٹ کر روئے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اے کاش' یہ حجرے نہ گرائے جاتے تا کہ آنے والی نسلیں دیکھ سکتیں کہ ہمارے آقا و مولا اس وقت بھی کس طرح کے گھر میں قیام پذیر تھے جبکہ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں ان کے پاس تھیں۔

ابن سعد ہی اس بات کے بھی راوی ہیں کہ ان حجروں کی چھتیں قد آدم سے بہت تھوڑی اونچی تھیں۔ حضرت حسن بصریؒ اپنا ہاتھ اوپر کر کے ان کی چھتوں کو چھو لیتے تھے' یہ پھونس اور کھجور کے پتوں اور تنوں سے بنی ہوئی تھیں' دیواریں اور فرش مٹی کے تھے' حضورؐ سونے کیلئے جو چٹائی فرش پر بچھاتے وہ اتنی کھُردری تھی کہ اس کے نشان جسم مبارک پر پڑ جاتے' ایک انصاری خاتون نے ایک گدا آپؐ کی خدمت میں بھجوایا تو آپؐ نے یہ کہہ کر اسے لوٹا دیا کہ مدینہ کے رہنے والے تمام لوگوں کو ایسے گدے میسر نہ تھے (ابن سعد جز 1 ص 157)

آنحضورؐ کی زندگی میں ایسی اور بھی لاتعداد مثالیں موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آپؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے عظمت انسانی کا جو معیار مقرر فرما دیا تھا اس پر آپؐ کے سوا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انقلابی رہنما پورا نہیں اتر سکتا اور آپؐ کے جانشینوں نے جس انداز کی زندگی گزاری ویسی اونچی زندگی کسی اور انقلابی کو میسّر نہیں آئی ہے اور دنیا کا کوئی بھی ایسا انقلابی پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے حکمران ہونے کے باوجود اس طرح کی روکھی سوکھی روٹی کھائی جس طرح خلفائے راشدینؓ نے اپنے اقتدار کے دنوں میں اپنے لئے پسند کی؛ جس نے اس طرح کا کھُردرا پیوندوں سے بھرا ہوا لباس پہنا جیسا کہ ان خلفائے محمدؐ نے اپنے جسموں پر سجایا اور جس نے ایسی معمولی رہائش پر قناعت کی ہو جس پر محمد مصطفیٰؐ کے بعد اسلامی مملکت کے ان فرمانرواؤں نے قناعت کر لی تھی۔ مؤرخ المسعودی کہتے ہیں کہ یمن کے کچھ شیوخ و رؤسا حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس آئے اس حال میں کہ وہ کمخواب کی چادریں کندھوں پر ڈالے ہوئے تھے اور سونے اور چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے جبّے ان کے زیب بدن تھے مگر جب انہوں نے

خلیفۃ المسلمینؓ کو دیکھا کہ وہ اپنے جسم پر بکری کی کھال لپیٹے ہوئے ہیں اور کمبل کا تہبند باندھے ہوئے ہیں تو انہوں نے بھی شاہانہ لباس اتار پھینکے اور بکری کی کھالیں اوڑھ لیں (المسعودی ، مروج الذہب جز 2 ص 305)

مؤرخ ابن سعد کی روایت ہے کہ انہوں نے وصال سے پہلے اپنی بیٹی حضرت عائشہؓ سے کہا تھا۔

"جب سے ہم مسلمانوں کے امیر بنائے گئے ہیں ہم نے نہ تو ان کا کوئی دینار کھایا ہے اور نہ درہم ، البتہ ہم نے ان کے طعام میں سے روکھی سوکھی خوراک کھائی ہے ان کے لباس میں سے کھردرا لباس اپنے جسموں پر پہنا ہے اور ہمارے پاس مسلمانوں کے مال میں سے کوئی بھی شے نہیں ہے. بجز اس حبشی ملازم اور اس اونٹنی کے"

(ابن سعد جز 3 ص 129)

ایک اور روایت میں ملازم اور اونٹنی کے علاوہ ایک چکی اور ایک گدے کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور یہ ساری چیزیں حضرت ابو بکرؓ نے وصال کے وقت حضرت عمر فاروقؓ کو واپس کر دی تھیں (ابن سعد جز 3 ص 130)

جناب ابو بکرؓ کی طرح جناب عمر فاروقؓ بھی امیر المومنین ہونے کے باوجود معمولی خوراک کھاتے تھے اور اٹھارہ اٹھارہ پیوندوں کا لباس جسم پر پہنتے تھے، حالانکہ اسلامی ریاست کی آمدنی اتنی بڑھ چکی تھی کہ رعایا کا ہر فرد معقول وظیفہ لے رہا تھا اور سارا معاشرہ انتہائی خوشحال ہو گیا تھا۔ ابن سعد نے اس سلسلے میں جناب عمر فاروقؓ کی صاحب زادی حضرت حفصہؓ کی ایک روایت بیان کی ہے وہ لوگوں کی نمائندہ بن کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ

"لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ اپنی موجودہ خوراک بدل لیں اور بہتر کھانا کھائیں، اچھا لباس پہنیں کیونکہ اب ریاست کی آمدنی بہت ہو گئی ہے"

ابن سعد کہتے ہیں کہ حضرت حفصہؓ حضور سرور عالمؐ کی زوجہ محترمہ تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تنگی ترشی خود دیکھ چکی تھیں. حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی درخواست پر انہیں آنحضورؐ کی تنگی ترشی کے کچھ واقعات اس طرح یاد کرائے کہ حفصہؓ محترمہ بھی بیساختہ رو دیں اور عمر فاروقؓ بھی بہت روئے اور جب دونوں کے آنسو تھمے تو آپ نے اپنی بیٹی سے کہا

"تمہارے مجھ پر بڑے حق ہیں مگر یہ دین کا معاملہ ہے اور دین کے مقابلے میں کوئی رشتہ بھی مجھے عزیز تر نہیں"

(ابن سعد جز 3 ص 195)

تو گویا یہ عمر فاروقؓ کا دین تھا کہ وہ امیر المومنینؓ ہوتے ہوئے بھی پیوندوں سے بھرا ہوا لباس زیب تن کریں، خشک روٹی کھائیں اور حد درجہ معمولی مکان میں رہائش رکھیں البتہ ملت کے ایک ایک فرد کو عمدہ لباس

بھی مہیا کریں، اچھی روٹی بھی کھلائیں اور اچھی اور مناسب جگہ بھی رہائش کیلئے عطا کریں۔ موؤرخ ابن سعد اس امر کے بھی راوی ہیں کہ عراق کے لوگوں کا ایک سرکاری وفد آخری دنوں میں حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں باریاب ہوا تھا، حضرت عمر فاروقؓ نے اس وفد سے عراق کے مسلمانوں کا حال پوچھا تو وفد کے نمائندے نے بڑی سرخوشی کے ساتھ بیان کیا کہ عراق کے لوگوں کا حال بہت اچھا ہے وہ آپ کیلئے دعا گو ہیں کہ آپ ان کے ہر ہر فرد کو بارہ بارہ پندرہ پندرہ سو درہم سالانہ تنخواہ بھی دیتے ہیں ان کے بیوی بچوں کو ہر ماہ دو جریب غلہ، کئی سیر سرکہ اور زیتون بھی سرکاری خزانے سے مفت مہیا کرتے ہیں، ان کے بچے پیدا ہوتے ہی سو درہم بیت المال سے وصول کرنے لگتے ہیں، عمر کے دوسرے سال میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا روزینہ دگنا ہو جاتا ہے اور تیسرے سال تین گنا اور جب وہ جوان ہوتے ہیں اور سرکاری ملازمت میں داخل ہوتے ہیں تو ان کو وہی کچھ ملنے لگتا ہے، جو پوری اسلامی سپاہ کے حصے میں آتا ہے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان کے مزے ہی مزے ہیں۔

عمر فاروقؓ نے یہ بات سنی تو وفد کے سربراہ سے کہا "یہ میری مہربانی نہیں یہ تو ان کا حق ہے جو انہیں ملتا ہے"

اور یہ حق جسے عمر فاروقؓ نے عوامی ٹھہرایا پیغمبر اسلامؑ کے لائے ہوئے انقلاب سے پہلے عوامی حق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حقوق تو سارے کے سارے صرف بادشاہوں، امیروں دولتمندوں اور طاقتوروں کو حاصل تھے۔

یہ اسلام کا عظیم انقلاب تھا کہ اس نے امراء و سلاطین اور سرمایہ داروں کے مختص حقوق ان سے چھین کر عوام کی جھولی میں ڈال دیئے تھے اور یہ صورتحال پیدا کر دی تھی کہ امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰؓ کوفہ کے بازاروں میں اس حال میں گھومتے پھرتے کہ ان کے جسم پر کھردری اون کا جو لباس لپٹا ہوتا وہ ان مزدوروں کے لباس سے مشابہ ہوتا جو دور دیس سے مزدوری کی تلاش میں شہر میں آیا کرتے اور ان کے لباس سے دھوکہ کھا کر بعض ناواقف مسافر اپنا سامان ان کے سر پر لاد دیتے تھے اور بعض تو ان سے یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ

"اے شخص کیا تم زندہ ہو؟ یہ کیا تم نے مُردوں کا سا کفن جسم پر لپیٹ رکھا ہے؟

(ابن کثیر جز 8 ص 40)

ان کی شان سے ناواقف لوگوں کے نزدیک خواہ ان کا لباس مردوں کا اوڑھنا تھا مگر انہیں یہ اوڑھنا بھی بہت پسند تھا۔ المسعودی کے الفاظ میں

"انہیں کھانا وہ اچھا لگتا جو خشک ہوتا اور لباس وہ پسند تھا جو کوتاہ ہوتا"

مسعودی، تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "لم یلبس علیہ السلام فی ایامہ ثوباً جدیداً" انہوں نے اپنے دور خلافت میں کبھی کوئی نیا لباس نہیں پہنا (المسعود جز 2 ص 341) ابن کثیر کی ایک روایت میں اس بات کا تو ثبوت ملتا ہے کہ سیدنا علیؓ نے ایک بار چار درہم میں ایک قمیص خرید کر جسم مبارک پر پہنی، مگر یہ قمیص دنیا بھر

کے انقلابیوں کیلئے وجہ حیرت ہے کہ انہوں نے یہ قمیص اپنی ایک تلوار نیلام کر کے خریدی تھی۔
(ابن کثیر جز 8 ص 4)

بات انقلاب کی تو ہر کوئی زبان پر لے آتا ہے مگر اسلام نے جو انقلاب انسانی معاشرہ میں پیدا کرنا چاہا تھا وہ کوئی معمولی انقلاب نہ تھا۔ وہ ایک ایسا عظیم انقلاب تھا جو فرد سے نفس اور غرض کا جذبہ "کلیتہً" چھین لیتا ہے اور فرد کو غیر جماعتی آلائشوں سے اور غلاظتوں سے اس طرح پاک کر دیتا ہے کہ اسے اپنا خیال بالکل نہیں رہتا وہ ملّت کے عمومی وجود میں یوں گم ہو جاتا ہے کہ اس کی انفرادیت کی پہچان تک نہیں کی جا سکتی اور اگر اسے پہچانا جا سکتا ہے تو یہ پہچان صرف یہی ہے۔ جو اسلام کے ان اوّلین حکمرانوں اور رسول خدا کے ان پاک باز ساتھیوں کی پہچان تھی۔

(7 اگست 80ء)

* زہد، مال و لذّات کے بارے میں ایک بیان تو وہ ہوا جو مولانا کوثر نیازی نے لکھا ہے، اب دوسرا بیان علامہ ابن حزم کا پڑھیے۔ الملل والنحل میں لکھتے ہیں: "علی رضؓ نے اس باب میں (یعنی مال و لذّات کے باب میں) حلال طریقے سے وسعت حاصل کی۔ اپنی وفات کے وقت چار بیویاں اور اُنیس کنیزیں (ام ولد) چھوڑ گئے اور بہت سے خادم و غلام ان کے علاوہ تھے۔ ان کے چوبیس بیٹے بیٹیاں تھے جن کے لیے اتنی جائداد اور باغات چھوڑ گئے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے اغنیاء میں ہو گئے۔ یہ وہ امر ہے جس کے انکار پر ہر وہ شخص قادر نہیں ہے جسے تاریخ کا کچھ بھی علم ہے۔ منجملہ ان کی اس جائداد کے جسے انھوں نے وقف علی الاولاد کیا تھا ایک جائداد ایسی بھی تھی جس کی آمدنی ایک ہزار وسق کھجور تھی (وسق ۶۰ صاع کا اور صاع تقریباً ۲½ سیر کا ہوتا ہے) جو اس کی زراعت کے علاوہ تھی۔"

بحوالہ "تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہؓ و یزید" ج ۲،
مولفہ محمود احمد عباسی مرحوم، پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۱۶۰

پیغمبر انقلاب

افراد کے معیار زندگی کو اگر معیار سمجھا جائے تو تیرہ چودہ سو سال کا عرصہ خاصا لمبا معلوم ہو گا اگر اس سے ذرا آگے قدم بڑھایا جائے اور قوموں کی زندگی کے معیار کو معیار بنالیا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ سو سوا سو نسلوں میں سمٹ جائے گا اور اس کے بعد کا احساس بہت کم ہو جائے گا لیکن اگر اس دنیا کو ایسی عصر ساز تحریکوں کے نقطہ منظر سے دیکھا جائے جو عالم انسانی کی فلاح و بہبود کیلئے جاری ہوئیں اور جن کے اثرات نے انسانی تاریخ کے دھارے اس طرح موڑے کہ انسان موجودہ دور تک ترقی کی منزلیں طے کرنے میں کامیاب ہو سکا تو یہ طویل اور بعید عرصہ کل کی بات معلوم ہوتا ہے اور آدمی حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایک فرد واحد کی آواز میں یہ اثر کیسے اور کیوں کر پیدا ہوا کہ اس آواز نے نہایت قلیل مدت میں تاریخ کے متوقع راستوں کو بدل کر انسان کو اس راستے پر ڈال دیا ہے کہ اس کی تاریخ کی کوکھ سے مشتری شکار دور جنم لے سکے۔

لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایسا ہی ہوا اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ آج سے چودہ سو برس پہلے کی دنیا عجیب و غریب تھی یورپ ایک وسیع و عریض خطہ ءزمین تھا جسے چند خاندانوں یا قبیلوں نے آپس میں بانٹ لیا تھا اور جو آپس میں آج کے عام دیہاتی زمینداروں کی طرح پانی کی باری یا مویشیوں کی کمی بیشی پر لڑا کرتے تھے ان میں سے کسی کو کپاس کا علم نہ تھا جانوروں کی کھالیں لباس کے نام سے اوڑھی جاتی تھیں

انگریزی کا مشہور ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیئر ملکہ الزبتھ اوّل کے عہد کا انگریز اور سترہویں صدی عیسوی کا انسان ہے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ رہی کہ وہ ایک تکیہ حاصل کر سکے جس پر سر رکھ کر سونے کی عیاشی اس کیلئے مقدر ہو سکے اس ایک واقعہ سے آپ انگلستان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا اندازہ کر لیجئے اور اس سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے کی زندگی کو قیاس کر لیجئے تیمور گورگان نے تیرہویں صدی عیسوی میں ماسکو پر حملہ کیا تھا اسوقت ماسکو لکڑی کے پانچ سو گھروندوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے رہنے والوں کو برفانی طوفانوں سے بچنے کی کسی ترکیب کا کوئی علم نہ تھا اس سے تقریباً سات سو سال پہلے آج کی دنیا کے اس عظیم شہر کی سماجی سیاسی اور اقتصادی حیثیت کا قیاس اس واقعہ سے کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں یہ آج سے چودہ سو برس پہلے کی مغربی دنیا ہے، دو ہزار سال پہلے ہندوستان میں بھی ایک سیاسی طاقت پیدا ہوئی جس نے اشوک اعظم کے نام سے مختلف سیاسی وحدتوں میں بٹے ہوئے اس خطۂ زمین کو چند دنوں کیلئے ایک سیاسی وحدت میں بدل دیا، بیشمار ترقیاں ہوئیں، بتایا جاتا ہے کہ اس عہد میں سونا اچھالتے گزر جایئے، چوری چکاری کا کسی کو کوئی خطرہ نہ تھا ہر آدمی روٹی کھاتا تھا یہاں تک کہ برہمن دور کی ہولناک صورت بھی باقی نہ رہی تھی جسے ذات پات کی تقسیم کے گھناؤنے نام سے یاد کیا جاتا ہے، انسان خواہ مفتوح غلام ''شودر'' ہو یا فاتح اور مالک کھشتری اور اس کا دماغ برہمن، سب یکساں تھے اور مہاراج ادھیراج سب کی سنتے اور سب کی مدد کو پہنچتے تھے آریہ نسل کے متعیّن اور معروف اصولوں کے ہولناک انسان کش مظالم کی داستان کے درمیان یہ داستان بڑی خوش آئند اور انتہائی خوبصورت معلوم ہوتی ہے، جلتے صحرا کے درمیان نخلستان مہکے ، لیکن یہ کتنا کم سواد اور تھوڑی عمر والا دور تھا اور اس کے بعد کیا ہوا؟ مہاتما بدھ کو کیوں خداؤں میں شامل کر کے خدا کا درجہ دے دیا گیا، سیاسی زبان میں ایک چھوٹی سلطنت کو بڑی سلطنت نے اپنے اندر ضم کر کے اپنا اٹوٹ انگ بنا لیا، مذہبی زبان میں برہمومت کی دیومالا میں ایک اور دیوتا کا اضافہ ہو گیا، بدھ مہاراج ان معنوں میں ہندومت کا اٹوٹ انگ بنا کہ یہ بھی ہندوؤں کے لاتعداد فرقوں میں سے ایک فرقے کا معبود ہے، البتہ سماجی زبان میں نہیں کیونکہ بدھ کے ماننے والے برہمن اور کھشتری کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے برہمن اور کھشتری اس کے ہاتھ کا پکا نہیں کھائیں گے، ان کے کنوئیں کا پانی نہیں پئیں گے، کوئی بدھ ان کے چوکے میں داخل نہیں ہو سکے گا، ان حد بندیوں کے بعد بدھ مت ہندو مت کا اٹوٹ انگ ہے، تاریخی طور پر بدھ مت تحریک کا مسئلہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا برہمن سامراج نے بجا طور پر اعلان کر دیا کہ بدھ مت اب کوئی مسئلہ نہیں اس نظریۂ حیات کو بانجھ کر دیا گیا ہے اب اس کی کوکھ سے کوئی اشوک اعظم جنم نہیں لے گا اور یہی ہوا بھی، کوئی اشوک پیدا نہیں ہوا، شودر ذلتوں کی انتہائی پستیوں تک اتار دیئے گئے، برہمن عزت کے بلند سے بلند تر سنگھاسن پر قابض ہو گیا اور کسی بدھ نے مہاتما بدھ کے نظریات کے نام پر اس انسان کشی کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔

اس دنیا کا تیسرا مہذب اور ترقی یافتہ حصہ وہ تھا جسے آسانی کیلئے ایران کی سلطنت کہا جاتا ہے یہ متعدد جغرافیائی وحدتوں کے مجموعے کا نام تھا جو درفش کادیانی کے سائے میں متحد کر دیا گیا تھا اس کا سب سے شاندار دور نوشیرواں عادل کا دور ہے۔ جس کی ستائش میں شیخ سعدی شیرازی جیسے معتدل اور منصف مزاج مفکر اور شاعر نے اپنا زور بیان صرف کیا اور اس حکایت کو زندہ جاوید بنا دیا کہ نوشیرواں نے ایک غریب بڑھیا کی جھونپڑی کی خاطر اپنے محل کی کجی کو بھی گوارا کر لیا لیکن اس حکایت کی مقبولیت کے عقب میں جو بات پنہاں ہے وہ یہ بھی ہے کہ نوشیرواں عادل سے پہلے اور بعد ایسی کئی غریب بوڑھی عورتیں دب کر رہ گئی ہوں گی؛ جن کی رات کے مقابلے میں نوشیرواں کا یہ چراغ سورج کی طرح چمکتا نظر آتا ہے۔ اسی حکایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عین نوشیرواں کے محل کے زیر سایہ اس کی غریب رعایا جھونپڑیوں میں آباد تھی تفصیلات کی گنجائش نہیں' اس حکایت کے پس منظر میں بے انصافی اور جبر و استحصال کی مکمل تصویر تصوّر کی جا سکتی ہے۔

اس دنیا کا چوتھا مہذب ملک یونان ہے جسے یورپ والے اپنا کہتے ہیں اور ایشیا والے اس پر اپنا دعویٰ جتاتے ہیں یہ اس کی عظیم مقبولیت کی دلیل ہے اور یہ مقبولیت بے بنیاد نہیں اس میں ارسطو' بقراط اور افلاطون جیسے قائدین و مفکرّ پیدا ہوئے ہیں' جنہیں آج کی دنیا بھی اپنا استاد مانتی ہے' انہوں نے سیاست' تاریخ' سائنس' حکمت' اقتصادیات' نو آبادیات غرض ماڈرن زندگی کے ہر شعبے کیلئے راہیں متعیّن کیں۔ حد یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے دینی مدرسوں میں درس نظامی میں ان کے فلسفہ و منطق کے اصول اور مبادیات کی تعلیم آج بھی دی جاتی ہے' انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں عالم انسانی کی قیادت کا حق ادا کر دیا لیکن یہ دنیا تھی کیا؟ وہ کیسا معاشرہ تھا جس نے یہ غیر فانی نام تاریخ میں محفوظ کرائے' یہ الگ داستان ہے اس میں مفتوح قومیں اس طرح غلام بنائی گئیں کہ ان کا نام و نشان مٹ گیا' جمہوری ریاست کے شہری صرف حکمران قوم کے افراد تھے اور یہی وہ لوگ تھے۔ جو ووٹوں کے ذریعے مفتوح اقوام پر حکومت کرتے تھے ان کے ووٹ ایسے قانون بناتے تھے۔ جو مفتوحوں پر تو نافذ العمل ہوتے تھے مگر فاتحین پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے مفتوح اقوام کی اکثریت پر فاتح قوم کی متحدہ آمریت کو جمہوریت کے نام پر مسلط کر دیا گیا تھا یہی یونان کی شہری جمہوریت تھی' مفتوح قوم کے سربازار نیلام ہوتے ہوئے ناموس' بھیڑ بکریوں کی طرح بکتی ہوئی جوانیاں' انصاف سے مایوس ہونے والے مفتوحوں کی خود کشی' ان کا قتل عام اور ان کی زندگی بیزار زندگی کے پس منظر میں سقراط کے مقالے اور افلاطون کی مشہور کتاب "جمہوریت" کا مطالعہ بڑے بڑوں کے پتے پانی کر دیتا ہے' یہ بڑے بڑے خیالات یکسر لغو اور بے معنی معلوم ہونے لگتے ہیں اور رومیوں کی عظیم سلطنت اس کا منطقی نتیجہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

اس دنیا کا پانچواں ترقی یافتہ ملک چین تھا اس میں کنفیوشس پیدا ہو چکا تھا اور اس کی تعلیمات تقریباً ایک ہزار سال تک چینی ذہن کی تربیت کرتی رہی تھیں چین کے جدید مؤرخین کے دعووں کے مطابق چین میں کاغذ ایجاد ہو چکا تھا اور تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا شعری ادب ترقی کر چکا تھا ریشم کا کپڑا تیار ہونے لگا تھا' چین ترقی کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں سے عالمی تجارتی استعمار کا دور شروع ہوتا ہے لیکن یہ دنیوی اور

فکری ترقی کا مفہوم اولاد آدم کے نقطۂ نظر سے کیا تھا یہ بالکل مختلف کہانی ہے کنفیوشس کا فلسفہ مزارع کو زمیندار کا مزدور کو کارخانے دار کا رعایا کو درباری امیروں کا اور ان کی وساطت سے شہنشاہ معظم کا غلام بنانے کے کام میں بڑی خوبصورتی سے جوت دیتا ہے' اس فلسفے نے بڑے کے احترام کے نام پر چھوٹے کو ایسی اخلاقی زنجیروں میں کس دیا کہ وہ بڑے کی ہر ناانصافی اور طاقتور کے ہر استبداد کو خاموشی سے سہہ جائے اور زبان سے اُف تک نہ کرے۔ کنفیوشس نے یہ کہا تھا یا نہیں یہ الگ موضوع ہے لیکن بالادست نے اسے یہی بنا دیا اس سے جدید اور قدیم چینی مؤرخ انکار نہیں کر سکتے ملک کی اسی فیصد اکثریت بیس فیصد اقلیت کی اقتصادی غلامی میں اس طرح جکڑ دی گئی کہ انقلابات اس اقتصادی جبر و استحصال کا کوئی علاج نہ کر سکے اور اسّی فیصد آبادی بے کسانہ اور بے رحمانہ غلامی میں صدیوں تک اپنی زندگی اس طرح گزارنے پر مجبور ہوئی کہ ایک گھر کے چار افراد ہیں تو صرف ایک جوڑا کپڑا گھر میں موجود ہے' ایک فرد اس ایک جوڑے سے تن ڈھانپ کر مزدوری کیلئے باہر نکلتا ہے اور باقی کے تین افراد نیم برہنگی کے عالم میں جھونپڑے میں بند رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ریشم کی دریافت 'تاریخ نویسی کی ابتداء اور برآمدی تجارت کیلئے نئے راستوں کی دریافت کس قدر بے معنی اور بے مصرف معلوم ہوتی ہے یہ وہ دنیا تھی جو آج سے چودہ سو برس پہلے تک قائم تھی' اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ذرا تصوّر کیجئے کہ یہ دنیا انسانی تاریخ کیلئے کیا خطوط عمل متعیّن کرتی ہے اور اس سے کیا یہ قیاس ہوتا ہے کہ آنے والی دنیا اگر انہی خطوط پر چلتی رہی تو اس کا رنگ کیا ہو گا؟! اگر آپ خود غور کریں تو اس کا نقشہ ہم سے بہتر قائم کر سکیں گے ہماری سمجھ میں جو کچھ آتا ہے یہ ہے کہ یہ دنیا بالا دستوں کی جنت اور زیر دستوں کیلئے دوزخ ہونی چاہئے' یہ طاقت کی دنیا ہے، جو طاقتور ہے وہ کمزور کو غلام بنا لے گا' فاتح مفتوح کو کچل کر شودر بنائے گا' انسان انسان کو اس طرح نگل جائے گا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے' اس طرح کی عالمی فضا کے درمیان آج سے صرف چودہ سو سال پہلے عرب کے دور افتادہ اور الگ تھلگ علاقے میں مکّہ کے خاندان قریش میں ایک بچہ پیدا ہوا جس نے یتیمی میں آنکھ کھولی' غریبی میں پل کر جوان ہوا اور جب نبوّت کے فرز عظیم سے سرفراز ہوا تو اس کی آواز اس کی تعلیمات اور اس کی جدوجہد نے سارے تصوّرات کو باطل کر دیا اور دنیا کا نقشہ بدل گیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ......

اس بدلے ہوئے نقشے میں بعض عجیب و غریب چیزیں نظر آتی ہیں

(1) دنیا میں کوئی قوم ایسی باقی نہیں جو وحدانیت کی قائل نہ ہو اور بُت پرستی کو قابلِ فخر مذہب سمجھتی ہو یہاں تک کہ نہایت سخت جان برہمو دھرما بھی ہتھیار ڈال رہا ہے۔

(2) دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو کم از کم نظری طور پر انسان پر انسان کی برتری کو بطور حق قبول کرے اور اُس کا اعلان کر سکے انسانی برادری کا تصوّر بطور فلسفۂ زندگی کے پوری دنیا میں رائج ہو چکا ہے۔

(3) دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو بلند آواز سے دعویٰ کر سکے کہ وہ دوسری قوم کے مال کو بغیر حق' غصب کر لینے کی حق دار ہے اور اس لئے حق دار ہے کہ وہ طاقتور ہے گویا طاقت کا قانون غیر متعمل نہیں

تو غیر مقبول ضرور ہو چکا ہے اور عمل کے دائرے میں نہیں تو اعلان اور بیان کے دائرے میں طاقت کے قانون پر فخر کرنے والا باقی نہیں۔ آج کی دنیا میں نوشیرواں عادل کی کہانی مقبول نہیں ہو سکتی یہ معمول کا حق ہے جس میں تعجب انگیزی اور سنسنی خیزی کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔

(4) دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو آئین کے بغیر حکومت کرے خود اپنے آپ پر آئین کے بغیر حکومت قائم کرنے والی قوم اقوام عالم کی برادری میں ننگو سمجھی جائے گی اور برداشت نہیں کی جائے گی۔

یہ چند بنیادی تبدیلیاں ہیں اور اس فہرست میں اضافے کی بہت گنجائش باقی ہے یہ ہم لوگوں کی کمزوری اور بدبختی ہے کہ دنیا کی اکثریت اس ہستی مقدس و مطہر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہدایت و راہنمائی حاصل کرنے کا اعتراف کرنے سے ہچکچا رہی ہے لیکن اس حقیقت سے تاریخ عالم کا کوئی معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑا طالب علم انکار نہیں کر سکتا کہ ہادی کا اقرار و اعتراف کرنے کی سعادت سے محروم ہونے کے باوجود دنیا "ہدایت" پر عمل کر رہی ہے اور آج کی ترقی یافتہ قوموں میں کوئی ایک قوم ایسی نہیں جس نے ان ہدایات پر شعوری یا غیر شعوری طور سے عمل کئے بغیر ترقی کی ہو یہ بے مثال اور غیر فانی معجزہ آج کی تاریخ کا بے حد نمایاں پہلو ہے کہ لا اللہ الا اللہ پر ہر جگہ عمل ہو رہا ہے یہاں تک کہ چین اور روس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں یموت سے کچھ عرصہ پہلے چین کے عظیم راہنما ماؤزے تنگ ایک امریکی اخبار نویس سے یہ کہتے سنے گئے تھے کہ میں اپنے خدا سے ملنے کی تیاریاں کر رہا ہوں یہ لا اللہ الا اللہ کی کامیابی کی بڑی نمایاں مثال ہے اس کلمۂ طیبہ کے دوسرے حصہ "محمد رسول اللہ" تک آنے کیلئے دنیا کو ابھی وقت کی ضرورت ہے جس طرح ایک ہزار سال پہلے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کلمۂ طیبہ کا ایک حصہ اس طرح پوری دنیا کا جزو ایمان بن جائے گا اسی طرح آج یہ دعویٰ کرنے میں سب کو تامل ہے کہ اس کے دوسرے حصے پر بھی جلد عمل ہو گا لیکن ہم علی وجہ البصیرت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسا ہو گا لیکن ہم تاریخ کے وہ دھارے جنہیں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس رُخ پر موڑا گیا تھا اگر ایک حصے تک پہنچ سکتے ہیں تو دوسرا حصہ زیادہ دور نہیں سمجھا جا سکتا۔

....

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ چند دن پہلے تاریخ عالم کے ان دھاروں کا رُخ پلٹ دینے والے کا یوم ولادت منانے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہو گا دنیا کی کسی قوم یا دنیا کے کسی فرد کیلئے اس سے زیادہ فخر کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسے عظیم ہادیؐ کی تنظیم ہدایت کا ایک رُکن ہے جو پوری دنیا کے فکری ڈھانچے کو بدلنے اور عالم انسانی کو انصاف کی ترازو میں مساوی کر دینے کیلئے پیدا ہوا اور جس نے اپنا مقصد حیات اس حسن و خوبی سے حاصل کیا کہ کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا یہ یقیناً بڑے فخر کی بات ہے لیکن اس فخر کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس سعادت کی وجہ سے ہم پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں اور جب تک ہم ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کریں گے یہ فخر و ناز ہمیں زیب نہیں دے گا۔

13 جنوری 83ء

صحت عامہ سیرت النبیؐ کی روشنی میں

جس طرح بہت سے حقیقت پسند دانشوروں نے 'اپنوں نے اور غیروں نے بھی' قرآن حکیم کو جدید سائنس کی ایک بنیادی نظریاتی اساس قرار دیا ہے' بالکل اسی طرح میرے نزدیک طب جدید کی بنیاد حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وہ حکیمانہ تصوّرات و مشاہدات ہیں جن سے دنیا آج سے چودہ سو سال پہلے آشنا ہوئی۔ یہ ستم ظریفی کی حد ہے کہ وہ طب عربی جس کے تمام تر سوتے سیدّ کائنات مسیحائے جہاں صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمؐ کے پاک قدموں تلے سے پھوٹے تھے' اس کا نام طب عربی کے بجائے طب یونانی مشہور ہوا اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ بنو عباس کے عہد میں خصوصاً ابو جعفر منصور' مہدی' ہارون الرشید اور مامون الرشید کے دور ہمایونی میں بہت سے حکمائے یونان کی طبّی تالیفات عربی زبان میں منتقل ہوئی تھیں اور یونان کے سقراط' ارسطو' جالینوس اور اس پایہ کے دوسرے حکماء یونان کی جغرافیائی حدود سے نکال کر نہ صرف عرب اور ملحقات عرب میں بلکہ پوری اسلامی مملکت میں داخل کر لئے گئے تھے' اس کے باوجود تاریخ اسلام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا دعویٰ ہے کہ یہ طب عربی جس نے حکمائے یونان کے تصوّرات' نظریات اور معالجات سے عہد بنی عباس میں بڑا اثر قبول کیا تھا اپنے مزاج اپنی فطرت اور اپنے اصل کے اعتبار سے نہ صرف عربی تھی' مکی بھی تھی اور مدنی بھی' حجازی بھی تھی اور یمنی بھی' بلکہ میں تو یہ کہنے میں بھی ذرا سی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ہوں کہ یہ طب عربی ان آخری گھڑیوں تک طب عربی ہی تھی جب قرطبہ اور غرناطہ سے اسے جلاوطنی کی سزا ملی تھی اور اسے اطالیہ اور پھر دوسرے مغربی ممالک کی

سمت ہجرت پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

بلاشبہ اس ہجرت کے وقت وہ ایک زوال چشیدہ تمدن کی لٹی ہوئی پونجی کے طور پر مغربی دانش کدوں میں پہنچی تھی مگر اس کے سارے فطری اوصاف برقرار تھے وہ ہر لحظہ اور ہر اعتبار سے طب العرب تھی' اندلس کی ہواؤں' اندلس کے دریاؤں' پہاڑوں اور ندی نالوں نے اس کے طبعی مزاج میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا کیونکہ اندلس کے آباو کار مسلمان بادشاہ اور مسلمان عوام جب اندلس کو اپنا وطن بنا کر اس میں بس گئے تھے تو وہ اپنے سارے قومی اوصاف ہمراہ لیکر وہاں پہنچے تھے وہ اپنے سارے قومی اوصاف حتیٰ کہ وہ قومی جغرافیائی علامت کے طور پر کھجور کے درخت تک وہاں لے گئے تھے اور کوئی عرب بستی اندلس کی ایسی نہ تھی جہاں کھجور کے درختوں کے سائے دن اور شام کے وقت گھٹتے بڑھتے نظر نہ آتے۔

یقیناً میں اتنا تنگ دل نہیں ہوں کہ یونانی حکماء کے ان وسیع اثرات سے انکار کروں جو یونانی کتابوں کے تراجم کے سبب طب عربی اور عرب طبیبوں کے ذہنوں میں بنو عباس اور اندلس میں اسلامی عروج کے دور میں مرتب ہوئے تھے۔

مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے بعض درباری طبیب یونانی طریق علاج میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے یونانی اطباء کے تجربات و مشاہدات کو اپنے طریق علاج میں پوری طرح سمو لیا تھا اور طب العرب کے دامن میں بے پناہ وسعتیں پیدا ہو گئی تھیں مگر طب اور ادویہ سازی سے عرب علماء کا اصل لگاؤ یونان کے تتبع میں نہیں حضورؐ سرور کون و مکان کی اس دلچسپی اور توجہ کا حاصل تھا جو آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات گرامی کو انسانی جسم کو صحت مند رکھنے سے تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی مدنی زندگی میں یقیناً آج کے ترقی یافتہ طبی دور کی طرح باقاعدہ ہسپتال یا دار العلاج قائم نہیں کئے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس دنیا کے وہ پہلے نبی اور مصلح ہیں جن کی نظر کیمیا اثر محض دلوں کی اصلاح پر مرکوز نہ تھی حضورؐ انسانی صحت کے برقرار رکھنے کو بھی اچھے معاشرہ کی تخلیق میں بنیادی امر قرار دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سوانح نگاروں اور تمام بڑے محدثین نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذاتی اوصاف و حسنات کا شمار کرتے وقت اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نہ صرف خود ہر وقت پاک صاف رہتے' ماحول کو بھی ہر طرح کی گندگی' غلاظت اور ان اشیاء سے ہمہ تن پاک صاف رکھتے جو انسانی صحت کو بگاڑنے کا موجب بنتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گلی سڑی' متعفن غذا کے استعمال سے خود بھی رکتے اور ساتھیوں کو بھی روکتے۔

یقیناً حضورؐ کی خوراک بے حد سادہ تھی۔ خشک روٹی یا کھجوریں عموماً دوپہر اور رات کے دستر خوان پر سجتیں مگر یہ دستر خوان بھی صاف اور شفاف ہوتا اور وہ جگہ بھی صاف ہوتی جس پر یہ دستر خوان بچھتا۔

ابن سعد اور محدث ترمذی نے حضورؐ کے شمائل میں اس وصف کو بنیادی صفت ٹھہرایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حجروں کے فرش اس درجہ صاف ہوتے کہ کہیں کوئی تنکا تک پڑا دکھائی نہ دیتا اور وہ صحن جو حضورؐ کے حجروں اور مسجد نبوی میں حائل تھا اس قدر پاکیزہ تھا کہ وہاں صحابہؓ کچھ بچھائے بغیر سونے میں ہزار لطف محسوس کرتے تھے۔

حضور کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا تھا مگر اتنا ستھرا ہوتا کہ اسے جائے نماز کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا اور بعض صحابہؓ تو قسمیں کھا کھا کر بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جدھر سے گزرتے فضا خوشبو سے بھر جاتی تھی۔

مدینہ میں پانی کی خاصی قلت تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انسانی صحت کے اس بنیادی عنصر کی پاکیزگی کو ایمان کی سی پاکیزگی کی حیثیت دیتے تھے کیونکہ حضورؐ جانتے تھے کہ خوراک کے ساتھ پانی کی پاکیزگی صحت انسانی کیلئے حد درجہ ناگزیر ہے ایسی کئی حدیثیں مختلف محدثین نے بیان کی ہیں جو یہ شہادتیں مہیا کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پانی کے ذخیروں کی حفاظت کو ایک مذہبی فریضہ بنا دیا تھا اور ساتھیوں پر یہ پابندی بڑی سختی سے عائد کی تھی کہ پانی کے ذخیروں کو گندہ نہ ہونے دیں ان میں کسی قسم کی غلاظت نہ پڑنے دیں تاکہ بیماری کے سارے امکانات ختم ہو جائیں۔ خوراک صاف ستھری اور سادہ ہو، پیٹ بری طرح بھرنے نہ پائیں اور پانی پاکیزہ ہو اور پینے اور دوسرے استعمال کیلئے ہر خاص و عام کو میسر آئے تو بیماریاں بہت کم جنم لیتی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی اسلامی معاشرہ کی عمومی صحت بہت اچھی تھی۔ لوگ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور اگر کبھی بیمار ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کے علاج پر بہت توجہ فرماتے۔ نہ صرف خود ان کی تیمار داری اور معالجہ کی خاطر مشاورت کیلئے ان کے پاس پہنچتے، طبیبوں اور جراحوں کو بھی ان کے پاس بھیجتے۔ مؤرخین نے گو عہد نبوی کے طبیبوں کے اسمائے گرامی سے آنے والی نسلوں کو آگاہ نہیں کیا ہے تاہم اس بات کی پوری وضاحت پیش کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے متعدد بار خود بھی اپنا علاج طبیبوں اور جراحوں سے کروایا اور جماعت کیلئے بھی اس گروہ کی خدمات مستعار لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں ان سب کے وقوع کے وقت طبیبوں اور جراحوں کا ایک پورا گروہ حضورؐ کے ساتھ ہوتا جو زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج معالجے کا کام کرتا تھا۔

جنگ احد میں مؤرخ ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن جریر طبری اور ابن کثیر نے حضور سرور کائنات کے دندان مبارک کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دہن مبارک اور چہرۂ اقدس کی مرہم پٹی کا خصوصی ذکر کیا ہے اور یہ تفصیل بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ زخم

کس طرح آئے تھے اور حضورؐ کا دفاع جن عشاق نے اپنے جسموں سے کیا ان میں سے کئی تو شہادت پا گئے۔ تھے تین جانباز زندہ رہے تھے مگر سخت زخمی تھے ان میں سے جناب ابو دجانہؓ اور جناب طلحہ کے جسم تو دشمن کی تیراندازی سے بری طرح چھد گئے تھے۔ جنگ احد میں زخمی ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی اور ان کی مرہم پٹی جن جراحوں نے کی تھی وہ بھی کئی تھے۔ جنگ احد کی تفصیل لکھتے وقت مؤرخین نے بعض مسلمان خواتین کے نام بھی شمار کئے ہیں جو میدان جنگ میں حاضر تھیں اور جنہوں نے "نرسنگ" کے فرائض انجام دیئے تھے (بخاری شریف جز3 ص215)

یہ بات اس امر کا ثبوت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نہ صرف طب و جراحت کو سرکاری حیثیت دی تھی بلکہ نرسنگ کو بھی ایک ملی ضرورت قرار دیا تھا۔ بلاشبہ یہ پیشہ اس وقت رضاکارانہ حیثیت رکھتا تھا اور خاصا محدود تھا مگر اس وقت کی ضرورت کو بخوبی پورا کر سکتا تھا جیسے جیسے فوجی اور عوامی طبی ضرورتیں بڑھتی گئیں طبیبوں اور جراحوں کا عملہ بھی بڑھتا چلا گیا۔

محدثین اور مؤرخین کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے وقت اسلام کی باقاعدہ سپاہ تیس ہزار کے قریب تھی اور اس تیس ہزار کی طبی ضرورتوں اور جراحتوں کی مرہم پٹی کیلئے جو طبیب اور جراح مخصوص کئے گئے تھے وہ کافی تعداد میں تھے (ابن کثیر جز 5 ص 311/ الطبری جز 3 ص 222 - 225)

بلاشبہ ہم ان طبیبوں اور جراحوں کی تعداد گن نہیں سکتے مگر انہیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے وقت دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے کئی بار حضورؐ کی فصد کھولی انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا علاج کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جب ایک بدبخت یہودیہ نے زہریلی خوراک کھلادی تھی تو حضورؐ کا باقاعدہ علاج ہوا تھا اور جس معالج نے حضورؐ کا علاج کیا تھا وہ اسلامی معاشرہ کا ایک اہم رکن تھا۔

یوں یہ تاثر بجا ہے کہ علمائے حدیث و تاریخ نے اس سلسلے میں جو تفصیل پیش کی ہے وہ نئے طبی دور کے طبی شعبوں سے کاملاً ہم آہنگ نہیں ہے تاہم اس دور کا جو رنگ تھا وہ اس سے خوب جھلکتا ہے۔

امام بخاری نے جو محدثین کے امام مانے گئے ہیں اپنی تالیف صحیح بخاری کا ایک مستقل باب "کتاب الطب" کے عنوان سے قائم کیا ہے اور طب سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرمودات اور معمولات کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً حضور کے دور کی "نرسنگ" سے متعلق ایک معزز خاتون ربیع بنت معوذ کی یہ روایت بھی پیش کی ہے کہ انہوں نے کہا

"ہم حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتی تھیں۔ سپاہیوں کو پانی پلاتیں، ان کی خدمت کرتیں اور زخمیوں کو اٹھا کر مدینہ واپس لاتیں"

(بخاری جز3 ص215)

ان ہی کی طرح سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؑ سے بھی یہ بات منسوب ہے کہ وہ بھی زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ امام بخاری نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت بعض ایسی روایتیں بھی درج کی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بعض مریضوں کا خود علاج تجویز فرمایا تھا۔ مثلاً ایک صحابی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کے بھائی کے پیٹ میں درد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا اسے شہد کھلاؤ۔ یہ صحابی دوبارہ سہ بارہ حضورؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا شہد کھلا چکا ہوں مگر شفا نہیں ہوئی۔ آپؐ نے تیسری بار بھی انہیں شہد کھلانے کا حکم دیا۔ تیسری بار شہد کا استعمال مؤثر ثابت ہوا اور بیماری جاتی رہی (بخاری جز3 ص215)

(شہد کے شفا ہونے کا قرآنی نظریہ دور حاضر کی ریسرچ کے نتیجے میں کس طرح صحیح ثابت ہوا ہے اس پر ایک جداگانہ آرٹیکل کی ضرورت ہے اور اللہ نے چاہا تو میں اس پر جلد قلم اٹھاؤں گا)

امام بخاری نے ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر کیا ہے جو غلط اور ناکافی خوراک کے استعمال سے بیمار ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس پورے گروہ کا علاج خود کیا انہیں صاف ستھری جگہ رہائش کیلئے مہیا کی، عمدہ خوراک کا بندوبست کیا اور پھر ایک صحت افزاء مقام پر ٹھہرانے کا اہتمام فرمایا۔ یہ پورے کا پورا گروہ حضورؐ کے اس عمل سے شفایاب ہو گیا (بخاری جز3 ص216)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض ادویہ کے استعمال کی ہدایات بھی تھیں مثلاً کلونجی والجنتہ السویدا کے استعمال کو ضروری قرار دیا تھا اور تلبیہ قسم کے ایک مرکب (مکسچر) کو جو شہد، دودھ اور چوکر کی باہمی آمیزش سے تیار ہوتا تھا عوامی مفاد کیلئے خوب عام کیا تھا۔

اس وقت شاید یہ بات کچھ عجیب لگے لیکن حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور کے عرب میں بعض بیماریوں کا علاج پچھنے لگوانا تھا اور اس طریق علاج کے ماہرین کی ایک خاصی بڑی جماعت مدینہ اور مدینہ کے نواح میں موجود تھی اور باقاعدہ آج کل کے سرجنوں کی طرح اپنی خدمات کا معاوضہ وصول کرتی تھی اور یہی اس کا پیشہ تھا۔ مثلاً جناب ابن عباسؓ ایک ایسے ہی سرجن کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس سے پچھنے لگوائے اور باقاعدہ اجرت عطا کی (بخاری جز3 ص218)

ایک دوسری روایت بھی جناب ابن عباسؓ ہی کی ہے وہ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک حج کیلئے مکہ تشریف لے گئے تھے دوران حج حضورؐ کو آدھے سر کا درد لاحق ہوا تو آپؐ نے اس درد سے نجات پانے کی خاطر ایک سرجن سے سر مبارک میں پچھنے لگوائے (بخاری جز3 ص219 - 220)

امام بخاریؒ نے انصار کی ایک صحابیہ جناب ام قیسؓ کا نام لیا ہے جن کے بیٹے کے گلے میں کوئی تکلیف تھی اور انہوں نے کسی اناڑی معالج سے اس کے گلے پر مالش کروائی تھی مگر بیماری بڑھ گئی۔ یہ خاتون گھبرا گئیں۔ بچے کو اٹھا کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور حضورؐ نے حال سن کر انہیں ڈانٹا اور "عود ہندی" کے استعمال کا حکم دیا۔ (بخاری جز3 ص322)

میں نے یہ روایت یہ سمجھانے کیلئے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے نہ صرف عرب میں مروج طریق علاج کو برما بلکہ بعض ایسی مفید غیر ملکی ادویات کا استعمال بھی ضروری سمجھا جو عوامی علاج کیلئے مفید تر تھیں۔ مثلاً یہی ''عود ہندی'' جو ہندوستان سے عرب میں در آمد ہوتی تھی۔

(13 دسمبر 84ء)

عالم طب پر اسلام کے احسانات

مجھے ان علماء سے شدید اختلاف ہے جن کا خیال یہ ہے کہ طب العرب کی تمام تر وسعتیں یونانی طبیبوں اور حکماء کی تصانیف کے تراجم کا نتیجہ تھیں۔ میرے وجدان کی رو سے یہ کلیہ درست نہیں ہے۔ اگر یہ کلیہ درست ہوتا تو یونانی حکماء کے طریق علاج اور نظریات کے تعارف سے پہلے کے دور کے اسلامی معاشرے میں بیماریاں عام ہوتیں حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد مبارک کے مکی دور کو چھوڑ کر مدنی دور سے لیکر ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانے تک کوئی دو سو سال کا عرصہ بنتا ہے 'ان دو صدیوں میں صرف ایک متعدی بیماری کا ذکر کیا گیا ہے جس میں عوام الناس مبتلا ہوئے تھے' یہ بیماری عمواس سے شروع ہوئی تھی اور اس سے اسلامی معاشرہ کو خاصا نقصان پہنچا تھا مگر جب حضرت عمر فاروقؓ نے اس کا مناسب تدارک فرمالیا تو بنی عباس کے دور تک کوئی ایسی وبا اسلامی معاشرہ میں رونما نہیں ہو پائی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس دو سو سالہ دور میں اسلامی حکومت نے عوام الناس کی صحت کی بحالی اور نگہداشت پر پوری توجہ صرف کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طبی مسلک کو ہر لحاظ سے عملی جامہ پہنایا تھا۔

اس لئے میرا دعویٰ ہے کہ بنو امیہ' بنو عباس اور مابعد کی مسلمان حکومتوں کے عہد میں مغرب کی بیداری کے وقت تک انسانی صحت کی بقا اور ادویہ سازی کے باب میں جتنی بھی ترقی ہوئی اس کی بنیاد طب نبوی اور مسلک نبوی کے سوا کوئی اور شے بالکل نہیں ہے۔

یہ طب عربی کے پہلے دور کی بڑی شخصیتیں جابر بن حیان ' ابراہیم جنداب ' محمد بن ابراہیم فرازی ' جبریل ' عبدالملک احملی ' حنین بن اسحاق ' اصطرلابی اور بعد کے دور کے یعقوب کندی ' عطارد ' محمد موسیٰ خوارزمی ' ثابت ' جابر ' حامد واسطی ' محمد حجازی ' عبداللہ ترکی ' احمد بلخی ' علی عمرانی ' سنان ' سعید (دمشقی) موفق ہردی ' فارابی ' یوسف خوارزمی ' احمد طبری ' ابو الوفا بوز جانی ' فجبندی ' مجوسی ' صفانی ' قرطبی ' مجریطی ۔ جلجل ' ابن الواخذ ' الزرقانی ' ابو القاسم زہراوی ' ابن یونس تمیمی بلادی مردانی موصل ' ابن ابن الہیثم ' بجتانی ' البیرونی ' بو علی سینا ' کرخی نسوی ' عمر خیام ' واسطی ' اسفرازی ' بیہقی ' خازن ' علی بن عیسیٰ ' ابو لحسن اور نصیرالدین محقق طوسی ایسے یگانۂ روزگار حکماء اطباء اسلامی طبی افق کے آفتاب و ماہتاب بن کر محض اس لئے چمکے تھے کہ ان سب کے محبوب نبویؐ نے ان کے سینوں میں صحت انسانی کو برقرار رکھنے کا صحیح جذبہ موجزن کیا تھا اور جستجو کی ایک ایسی لگن ان کے دلوں میں بھر دی تھی کہ انہوں نے طب و ادویہ سازی میں نت نئے تجربات و مشاہدات کئے اور تحقیق کا دامن کچھ اس طرح پھیلایا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کوئی بیماری سچ مچ ایسی نہ رہی جس کی دوا انہوں نے ڈھونڈ نہ لی۔

....

میں نے جابر بن حیان کا نام سرفہرست رکھا ہے ' یہ جابر بن حیان عرب کے جنوبی علاقے کے ایک بہت ہی قدیم قبیلہ ازد کا چشم و چراغ تھا۔ یہ طب عربی ہی نہیں طب جدید کی عظیم عمارت کا بہت بڑا ستون ہے۔ اس طبیب بے مثال اور حکیم عرب کا باپ حیان کوفہ میں دوا سازی کا کام کرتا تھا۔ وہ طبیب بھی تھا اور دوا ساز بھی۔ تاریخ نے حیان کے اساتذہ کے نام شمار نہیں کئے ہیں لیکن اس کے یہ اساتذہ قطعی طور پر عرب حکماء اور اطباء تھے کیونکہ یہ شخص حیان جب کوفہ کے ایک بڑے دوا ساز کی حیثیت سے عوام الناس کو طبی سہولتیں بہم پہنچا رہا تھا تو طب یونانی کے شہرۂ آفاق حکماء کا سایہ طب عربی پر بالکل نہیں پڑا تھا اور میں تو بجا طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک عرب طبیب یونانی حکماء سے متعارف تک نہ تھے۔ طب عربی اس وقت پورے طور پر خود کفیل تھی اسے کسی بیرونی ذہنی و عملی آمیزش کی قطعاً حاجت نہ تھی۔

بلاشبہ اس بات سے اختلاف ممکن نہیں ہے کہ حیان کے بیٹے جابر نے جب طب و حکمت کے نئے نئے تجربے اور اہم انکشافات کئے اور کیمیا سازی کے ایک بالکل نئے انداز کی طرح ڈالی تو وہ یونانی حکماء کے نظریات و تجربات کا پورا علم رکھتا تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت بڑی وزنی حقیقت ہے کہ جابر کا پہلا بڑا طبیب استاد حوبی الحمیادی نامی ایک خالصتاً عرب طبیب تھا۔ نظریاتی اعتبار سے بھی اور تجرباتی لحاظ سے بھی۔ جابر نے اس سے ہر وہ بات سیکھ لی جو ایک طبیب حاذق کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب جابر حوبی الحمیادی کے مکتب سے فیض یاب ہو کر عملی دنیا میں داخل ہوا تو وہ ایک مکمل طبیب تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی علمی جستجو اسے یونانی حکماء کے دربار

میں بھی لے آئی۔ اس نے اپنی فکری تشنگی بجھانے کیلئے یونانی زبان سیکھی اور حکمائے یونان کے خیالات و نظریات اور مشاہدات کو پہچانا اور جانا اس کے باوجود ساری دنیا کے حق پسند سائنس دانوں اور طبی علوم کے ماہرین نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ جابر اپنی ذات میں استادوں کا استاد اور فن و حکمت کی راہوں کو منور کرنے والا خورشید بے نیاز تھا۔ اس کا نور کسی کے پرتو کا محتاج نہ تھا۔ حکمائے یونان کے نظریات و تصورات سے اسکی نظر کو یقیناً وسعتیں میسر آئی تھیں یقیناً اس کے ذہنی افق لامحدود بن گئے تھے لیکن اس کی شخصیت کسی بھی نوع اور کسی بھی حیثیت سے ثانوی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ جابر کیمیائی تجربات کرتے وقت کسی بھی یونانی حکیم کو اپنے پیش نظر نہیں رکھتا تھا اس نے جو آلات استعمال کئے تھے وہ بھی اس کے اپنے ذہن رسا کی تخلیق تھے وہ ہمہ تن اپنا استاد خود تھا اور اس کی مشاہداتی قوتیں پوری طرح سے خود مختار تھیں اور یہ خود مختاری اس ذوق مسیحائی کی پیداوار تھی جو دربار نبویؐ کے فیض سے سکہ رائج الوقت بن گئی تھی۔

یہی عالم باقی کے ان نامور طبیبوں اور حکمائے عرب کا بھی تھا جو جابر بن حیان کے ہم عصر تھے۔ وہ بھی یقیناً حکمائے یونان کے نظریات و مشاہدات سے آشنا تھے۔ اس کے باوجود ان کی ذہنی صلاحیتیں نبی عربی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے سینہ مبارک سے پھوٹنے والی نورانی کرنوں کا پرتو تھیں اور اس دلچسپی اور توجہ کا نتیجہ تھیں جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو صحت عامہ کے تحفظ سے تھی۔ انہوں نے طب و حکمت کے چمن میں جو پھول کھلائے، صحت عامہ کو برقرار رکھنے کی جو جدوجہد کی اس کی اصل حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا یہ بنیادی فرمان تھا کہ

"اللہ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی جس کی دوا نازل نہ کی ہو"

(بخاری ج 3 ص 215)

اور میرے نزدیک یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ بنو عباس کے نامور تاجداروں ابو جعفر منصور مہدی" ہارون الرشید اور مامون الرشید نے یونانی حکماء کی تصانیف کے تراجم کا کام جس انہماک اور ذوق و شوق سے شروع کیا تھا یہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اسی فرمان کا نتیجہ تھا۔ ابو جعفر منصور اسکے بیٹے مہدی اسکے پوتے ہارون الرشید اور پڑپوتے مامون الرشید کے عہد میں یونانی حکماء و اطباء کی کتابوں کے تراجم جب عام ہوئے تو ان کا اثر طب عربی پر خوب پڑا اور طب عربی اور طب یونانی کی باہمی آمیزش خوب ہوئی تھی مگر اس طرح کی ہر بات کے باوجود طب عربی کا ذہن اور عرب طبیبوں کا اسلوب علاج کلیتاً عرب ذہن اور عرب طریق علاج ہی رہا۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ میں صرف ہارون الرشید کے طبیب خاص جبرئیل کے طریق علاج کی مثال پیش کروں گا۔

مؤرخ الطبری کہتے ہیں کہ جبرئیل ہر سال دو بار ہارون الرشید کی فصد کھولتا تھا اور تمام تر وہی لوازم اختیار

کرتا تھا جو حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد سے مخصوص تھے (طبری جز10ص 111) طبقات الاطباء میں بھی جبریل کے تذکرہ میں یہی بات بیان ہوئی ہے (طبقات الاطباءُ جز1ص 36)

بلاشبہ جبریل عربی الاصل نہ تھا اور مسلمان بھی نہ تھا ایرانی اور عیسائی تھا مگر اسلام اور ہادیٔ اسلام سے بہت متاثر تھا اور طب عربی اور عرب خون کا مزاج شناس تھا۔ یہ تاریخ طب عربی کی ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ جبریل کی طرح کئی اور غیر مسلم طبیبوں نے بنو عباس اور اندلسی بادشاہوں کے درباریوں میں نمایاں جگہ پائی تھی ان میں سے کئی ایک نے جبریل کے طریق کار اور طرز عمل کو اپنایا کہ آخر وقت تک مسلمان نہ ہوئے اس کے باوجود انہیں مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں قدرو منزلت نصیب رہی کہ اسلام رواداری کا مذہب ہے اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں جبر کو جائز نہ سمجھتے تھے اور یہ حضور سرور کون ومکاں صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ نہ بنو عباس نے اور نہ کسی مسلم بادشاہ نے اپنے دربار سے وابستہ ہونے والے غیر مسلم طبیبوں سے کوئی تعصب برتا۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حکمت گم گشتہ کو متاع مومن جانا اور غیر مسلم طبیبوں کی طبی مہارت وذہانت پر کوئی قدغن نہ لگائی اور ان کے مشاہدات و تجربات کو عوام الناس کی عمومی پونجی قرار دیا اور انہیں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلامی درباروں میں جو غیر مسلم طبیب آئے ان میں سے اکثر نے اسلام کی سچائی تک پہنچنے میں زیادہ تامل وتذبذب نہ برتا۔ بہرحال جو چند اپنے مذہب پر قائم رہے ان سے کوئی تعرض نہیں ہوا اور انہیں اس بات کی مکمل اجازت رہی کہ وہ طبی تحقیقات میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو بہر طور آزمائیں کہ وہ بھی اسلامی مملکت کے ویسے ہی شہری تھے جیسے کہ عرب یا دوسرے مسلمان تھے۔ مجھے یہاں یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ طب عربی بغداد کے مسلمان تاجداروں، اندلس کے امویوں اور مابعد کی مسلمان بادشاہتوں کے دور میں طب اسلامی بن گئی تھی اور اس کے دامن سے وابستہ جواہر آبدار علاقائی اور نسلی حد بندیوں سے قطعاً مبرا تھے اور وہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو دوسرے فنون کی تھی کہ اسلام علاقوں اور نسلوں کے اندر محدود رہنے کیلئے نہیں آیا تھا وہ نہ عرب کیلئے ہی مخصوص تھا نہ عجم کیلئے وہ ایران کیلئے بھی تھا عراق کے لئے بھی۔ شام کیلئے بھی تھا حجاز کیلئے بھی، یمن کیلئے بھی تھا اور سندھ و کابل کیلئے بھی، وہ مصر کیلئے بھی تھا اور افریقہ کے صحراؤں، ریگزاروں اور سبزہ زاروں کیلئے بھی۔

یہی وجہ ہے کہ علوم حدیث وفقہ اور تفسیر وادب میں بخاری ومسلم، نسائی وترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد، الطبری و مسعودی، ابن اثیر وابن کثیر، شافعی وحنبل، ابو حنیفہ وابو یوسف کی طرح غیر عرب مسلمانوں کے اندر سے طب سے وابستہ علماء وحکماء میں رازی، بحتانی، مروانی، جبریل، اصطرلابی، ابو الوخا ابوزحانی، فجہندی، احمد بلخی، فارابی بحریطی، عمر خیام، طوسی، بو علی سینا، زہراوی، ابن الہیثم، البیرونی،

اسفرازی، بیہقی، اور خوارزمی جیسے نادر وجود اور پرکو ابھرے اور ایسی ایسی ایجادات سے بنی نوع انسان کو نوازا جن کی مثال پوری تاریخ میں موجود نہ تھی۔

میں قدیم یونانی حکماء کا بہت مداح ہوں اور یہ بات مانتا ہوں کہ انہوں نے اپنے دور میں طب کی بڑی خدمات انجام دی تھیں اور اس فن شریفہ کو بڑا جلال بخشا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ میں اس امر پر بھی مصر ہوں کہ اسلامی دور کے اطباء نے فن طب و ادویہ سازی میں جو وسعتیں پیدا کیں اور انتھک محنت اور غیر معمولی جستجو کے سبب جو عظیم اور غیر فانی کارنامے انجام دیئے تھے وہ پہلے دور کا کوئی حکیم اور طبیب نہ دے سکا تھا۔

یہ محض میرا ہی خیال نہیں ہے طب عربی یا طب اسلامی پر جن غیر متعصب مغربی اہل علم نے کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ نئی کیمیا و ادویہ سازی کا پہلا موجد جابر بن حیان کوفی کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ اسی طرح ابوالقاسم زہراوی، ابوالوخابوز جانی، اصطرلابی، مجریطی۔ جلجل وابن الواخذ، ابن الہیثم البیرونی، عمر خیام، امام رازی اور بوعلی سینا نے طب عالم کو جو کچھ دیا ہے ان کے سوا کوئی اور نہیں دے سکا ہے۔ مشہور محقق میکڈانلڈ براؤن اور سکاٹ تو یہاں تک مانتے ہیں کہ جدید طب و ادویہ سازی حتیٰ کہ جراحی کی ساری عمارت ان ہی بنیادوں پر کھڑی ہے، جو مسلمان اطباء خصوصیت سے رازی، الزہراوی، اصطرلابی، ابن جلجل۔ ابن الہیثم بوعلی سینا، عمر خیام، فارابی اور خوارزمی نے متعارف کرائی تھیں۔ اسکاٹ نے اپنی کتاب "تاریخ اندلس" میں کئی ہزار جڑی بوٹیوں کا شمار کیا ہے، جو اندلس کے طبیبوں نے اندلس کے مختلف مقامات پر از خود اگائی تھیں اسکاٹ ادویہ سازی کے ایسے بڑے بڑے کارخانوں اور ہسپتالوں کا بھی ذکر کرتا ہے جہاں بالکل جدید پیمانے پر مختلف ادویہ کے سفوف اور ٹکیاں تیار کی جاتیں۔ عملی جراحی میں جو اوزار استعمال کئے جاتے وہ آج تک یورپ کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کہیں کہیں حجم بدل گئے ہیں اور کہیں کہیں چمک دمک بڑھ گئی ہے۔ یہ موضوع بڑی ضرورت کا محتاج ہے مختصراً یوں سمجھئے کہ نئے دور کی تمام ترطبی ایجادات و اختراعات صرف اس لئے ممکن ہوئیں کہ آٹھویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری سے لیکر سترہویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری تک کے دور میں اسلام اور مسلمان قوم نے من حیث الجماعت طب و ادویہ سازی کو ایک مقدس فریضہ جان کر اپنے کندھے اس کی نشوونما کیلئے مخصوص کر رکھے تھے اور اسے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ مجھے پورا پورا اعتراف ہے کہ مغرب طب و ادویہ سازی اور سائنسی انکشافات و ایجادات میں اس وقت بہت آگے نکل گیا ہے اور اس نے بڑی لمبی مسافت طے کر لی ہے لیکن یہ طویل سفر ہم نے ہی شروع کیا تھا اس کے تمام تر راستے ہم ہی نے اپنے بنائے ہوئے چراغوں سے سجائے تھے۔ سارے سنگ میل ہم ہی نے نصب کئے تھے اور اس عظیم مقصد کی لگن ہمارے نبیؐ ہی نے سینہ آدمی میں پیدا کی تھی۔

(20 دسمبر 84ء)

[illegible] حضرت حسن [illegible] ایک بزرگ ہوئے" سے الحاق خلافت کی حقیقت :-

یہ بزرگ ہوئے "محمد الارقط بن عبداللہ بن حسن المثنیٰ بن حسن بن علی رض" تھے - ارقط ان کا لقب تھا - پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیاسی مقاصد کیلیے اپنے کو "مہدی" کہا اور کہلوایا - سبائیوں نے ان کے خروج کو بعد میں بہت شہرت اور وضع حدیثوں اور روایتوں کے ذریعے النفس الزکیہ ان کا لقب رکھا - امیرالمومنین ابوجعفر المنصور کے زمانہ میں ۱۴۵ھ بمقام مدینہ منورہ خروج کیا جس کی تیاری کئی سال سے کر رہے تھے - سرکاری لشکر سے بمقام احجار زیت مقابلہ کیا اور مارے گئے - اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے خروج کرنے والے کی توقیر میں حدیثیں اور روایتیں وضع کی گئیں اور سبائیوں کے وضع کردہ لقب النفس الزکیہ کو اتنی شہرت دی گئی کہ غیرشیعہ مولفین بھی ان کے نام کے بجائے یہی لقب لکھتے ہیں - انھیں کی عظمت بڑھانے کے لیے سبائیوں نے یہ کذب [illegible] کی ہے کہ امام مالک رح نے لوگوں کو ان کے ساتھ خروج کرنے کا فتویٰ دیا تھا اور خود بھی بیعت کی تھی - یہ سب کذب و افترا ہے - امام مالک نے تو اپنی حدیث کی کتاب الموطا کی تدوین خلیفہ المنصور کی ہدایت و فرمائش پر کی تھی - لیکن سبائی پروپیگنڈا اس منظم اور مسلسل دربارہ فتوائے امام مالک برائے نکث بیعت خلیفہ المنصور وغیرہ [illegible] روایت پرستی کی بنا پر ان خرافات کو اپنی تالیفات میں درج کر دیا، جیسے مولانا کوثر نیازی نے کیا ہے - بعض اہل سنت والجماعت مصنفین نے

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہ رض و یزید" از مولانا محمود احمد عباسی مرحوم، پہلا ایڈیشن [illegible] صفحات ۱۸۲ تا ۱۹۲ -

تو برائے وصل کردن آمدی

کسی مسلمان کو کافر قرار دے دینا' انتہا درجے کی شقاوت اور سنگدلی ہے' یہی وجہ ہے کہ سلف کے اکابر علماء و فقہاء اس سلسلے میں بے حد محتاط تھے۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ شامی نے اپنی کتاب "ردالمختار" میں لکھا ہے کہ:

"ایک مسلمان کے کسی قول اور عقیدے کی سو تاویلیں ممکن ہوں جن میں سے ننانوے کفر کی ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو تو اس کی تکفیر جائز نہیں"

مشہور صوفی بزرگ حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے انہوں نے اپنے مکتوب "انوار القلوب" میں فقہاء کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ قول فقہاء ننانوے "احتمال" کا تحدیدی نہیں ہے بلکہ اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں جن میں سے نوسو ننانوے احتمالات کفریہ ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو تو اس کی بھی تکفیر جائز نہیں"

ہمارے مختلف مذہبی مکاتب فکر ان اصولوں کو سامنے رکھتے تو مسلمانوں میں کبھی انتشار و افتراق پیدا نہ ہوتا۔ وہ اختلاف رکھتے ہوئے بھی ایک ملت اور ایک جماعت بن کر رہ سکتے تھے مگر افسوس کہ ہر دور میں بعض غیر محتاط اور جذباتی اہل علم ذاتی اور گروہی تعصبات کا شکار ہو کر اندھا دھند تکفیر کا لٹھ گھماتے رہے اور انہوں نے یہ غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی کہ اسلام کی کتنی جلیل القدر ہستیاں اس کی زد میں آ رہی ہیں' تاریخ کے اوراق الٹے جائیں تو یہ تماشا نظر آتا ہے کہ مسلمانوں میں جتنی تاریخ ساز شخصیتیں پیدا

ہوئیں جن کے تذکرے حذف کر دیئے جائیں تو خدمت اسلام کا باب اپنے سر عنوان ہی سے محروم ہو جائے وہ سب کی سب اپنے اپنے زمانے میں بعض ظالم فتویٰ نگاروں کی نوازشات کا شکار ہو چکی ہیں۔ ہم نے اس سلسلے میں "حربہ تکفیر اہل قبلہ" "حسام الحرمین" "فتاویٰ الحرمین" "موج الکرامہ" "سوانح مولانا عبداللہ غزنوی" "رود کوثر" اور نظم الدارنی مسلک الیسرٰ وغیرہ نامی کتابوں کی طرف رجوع کیا تو ایسی ہستیاں جن پر کفر کے فتوے لگائے گئے ان کی فہرست میں یہ نام بھی دکھائی دیتے ہیں۔ (1) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (2) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (3) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (4) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (5) حضرت امام حسینؓ (6) حضرت امام ابو حنیفہؒ (7) حضرت امام مالکؒ (8) حضرت امام احمد حنبلؒ (9) حضرت امام شافعیؒ (10) حضرت جنید بغدادیؒ (11) حضرت شبلیؒ (12) حضرت ذوالنون مصریؒ (13) حضرت منصورؒ (14) شیخ محی الدین ابن عربیؒ (15) حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ (16) حضرت بایزید بسطامیؒ (17) حضرت داتا گنج بخشؒ (18) حضرت مجدد الف ثانیؒ (19) خواجہ نظام الدین اولیاؒ (20) حضرت امام غزالیؒ (21) حضرت امام بخاریؒ (22) حضرت ابن حزمؒ (23) علامہ ابن القیم (24) علامہ ابن تیمیہ (25) حضرت ابوالحسن اشعریؒ (26) حضرت سید محمد جونپوریؒ (27) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (28) حضرت مظہر جان جاناںؒ (29) حضرت قاضی عیاضؒ (30) حضرت شہاب الدین سہروردیؒ (31) حضرت فرید الدین عطارؒ (32) حضرت داؤد ظاہریؒ (33) حضرت علامہ ابن رشدؒ

جو اصحاب علم تاریخ اسلام میں علمائے سوء کے کردار سے آگاہ ہیں ان پر یہ امر واضح ہے کہ جب کبھی ماضی میں (اور حال میں بھی) کوئی مجتہد وقت اور احیائے ملت کا طلب گار اوپر کو اٹھا اور ملت کے حضور اپنی دانائیوں ہوشمندیوں اور افکار عالیہ کا تحفہ نذر لایا تو علمائے تنگ نظر کا یہ گروہ تکفیر کے مسموم ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا اور کچھ ایسے نوکیلے کانٹے اور بوجھل پتھر اس کے سامنے بکھیرے کہ اس کے پاؤں لہولہان بھی ہوئے اور منزل کا سفر بھی دشوار سے دشوار تر ہو گیا۔ حضرت امام مالکؒ اپنے تقویٰ و طہارت اور پاکیزگی عمل کی رو سے دوسری صدی ہجری کے امام اور مجتہد عصر تسلیم کئے گئے ہیں وہ حدیث کے پہلے مجموعے موطا امام مالکؒ کے مرتب و مولف ہیں انہوں نے اپنی ساری عمر مسجد نبوی میں گزاری وہ مدینہ کی گلیوں کو جنت کی روشوں سے بھی بہتر جانتے تھے انہوں نے اس خاک پاک سے آنکھوں کا نور بڑھایا تھا جو حضور سرور کون و مکاں کے قدموں کو برابر دس سال تک چومتی رہی تھی علماء اور ابنائے وقت کے نزدیک ان کا پہلا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ابو جعفر منصور اور ابو العباس سفاح کے ظالم ہاتھوں پر بیعت نہ کی تھی اور حضرت امام حسنؓ کے ایک بزرگ پوتے کو خلافت کا مستحق جانتا تھا حضرت امام مالکؒ کا

دوسرا جرم ان علماء کے نزدیک یہ تھا کہ انہوں نے فکرِ نو کی شمع جلائی تھی اور ملت بیضا کو نئی روشنی عطا کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر بھر میں ان کی تشہیر کرائی گئی۔ حضرت امام شافعیؒ فقہ اسلامی کے روشن چراغ ہیں مگر یار لوگوں نے انہیں "افرہ من ابلیس" (شیطان سے بڑھ کر خطرناک) قرار دیا پہلے ان پر بغداد شہر کی وسعتیں تنگ کی گئیں پھر مصر کی فضاؤں میں ان کے خلاف خوفناک بارود اچھالا گیا اس سے برا سلوک امام احمد حنبلؒ کے ساتھ روا رکھا گیا ان کی تکفیر کے فرمان پر علمائے سوء نے دستخط ثبت کئے تو ان کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنادی گئیں ان کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر سوار کیا گیا اور ان کے جسم پر کوڑے برسائے گئے۔ علماء کا یہ تنگ نظر گروہ رئیس محدثین امام بخاریؒ کے خلاف بھی اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ امام محدثین نے ان کی وضعی حدیثوں کے چہروں سے نقاب الٹ دیئے تھے۔

اس گروہ نے اپنی کوتاہ نظری اور کج نگاہی کے مظاہرے احیائے اسلام کے داعی حضرت امام غزالیؒ کے خلاف تو اس قدر کئے تھے کہ حضرت امامؒ کو ان کے اندر اپنی راہ بنانے میں مدتیں لگ گئیں۔ انہوں نے طب جدید اور فکرِ نو کے موجدِ اول جابر ابن حیان کے چہرے پر بھی تکفیر کا پتھر پھینکا۔ انہوں نے امام رازیؒ، فارابی، حکیم ابن رشد، ابن سینا اور طب قدیم میں سب سے بڑے سرجن ابن الہیثم اور ابن الواحد پر تو کفر کے پتھر کچھ اس طرح برسائے تھے کہ سارا ماحول پتھروں سے بھر گیا تھا۔

غرضیکہ علماء کا یہ گروہ تنگ نظر بنوامیہ، بنوعباس، سلجوقیوں، فاطمیوں۔ صفویوں، سامانیوں، غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کے ادوار میں ہمیشہ ہر اس روشنی کی کرن کا دشمن رہا ہے جس سے ملت کے اندھیرے چھٹنے کا اسے گمان ہوا۔ انہوں نے کبھی اجالوں کو سینے سے نہیں لگایا انہوں نے کبھی فکری آفتابوں اور ماہتابوں کو خوش آمدید نہیں کہا انہوں نے افق ملت پر نمودار ہونے والے کسی بھی ستارے کے پھوٹنے والے نور سے عوامی دھند لکے دور کرنے میں مدد نہیں لی۔

کوئی شبہ نہیں کہ ان اکابر اسلام کی تکفیر تاریخ اسلام کا ایک الم ناک سانحہ ہے مگر اس میں خوشی کا یہ ایک پہلو ضرور نظر آتا ہے کہ کفر کا فتویٰ لگانے والے معدودے چند تنگ نظر اور متعصب افراد تھے جنہیں کبھی قبول عام حاصل نہیں ہو سکا مذکورہ بزرگان دین نے نہ انہیں کوئی اہمیت دی اور نہ ہی جوابی کارروائی میں الجھے نتیجہ یہ نکلا کہ یہ فتوے صابن کی جھاگ اور پانی کے بلبلوں سے زیادہ حیثیت حاصل نہ کر سکے۔

یہ تو پہلے ادوار کی بات تھی انگریزوں کے عہد غلامی کا جائزہ لیا جائے یا خود اپنے عہد آزادی کا تو اس میں زوال اور انحطاط کی دوسری علامتوں کے علاوہ تکفیر کی مہم بھی پورے جوبن پر نظر آتی ہے پہلے محض چند گنے چنے علمائے سُوء اپنی روپہلی مصلحتوں کے تحت فتویٰ فروشی کا کاروبار کرتے تھے اب جماعتوں کی جماعتوں نے کفر سازی کے کارخانے کھول لئے۔

....

بخاری شریف (جلد اول باب استقبال القبلہ) میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو شخص ہماری طرح کی

نماز پڑھتا ہے ہمارے قبلے کی طرف منہ کرتا ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے وہ مسلمان ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حفاظت اس کو حاصل ہے پس اے مسلمانو! اس کو کسی قسم کی تکلیف دے کر اللہ تعالیٰ کو اس کے عہد میں جھوٹا نہ بناؤ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی مشہور عالم کتاب حجتہ اللہ البالغہ (جلد 1 ص 322) میں حضورؐ کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ایمان کی تین بڑی جڑیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہہ دے تو اس کے ساتھ کسی قسم کی لڑائی نہ کرو اس کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ بناؤ اور اسلام سے خارج مت قرار دو۔"

امام طبرانیؒ کہتے ہیں حضورؐ نے اسلام کو دس اجزاء پر منقسم کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اسلام کے دس حصے ہیں جس شخص کے حصے میں ایک حصہ بھی نہ آیا ہو وہ تباہ ہو گیا پہلا حصہ یہ ہے کہ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ دیتا ہے وہ ملت اسلامیہ میں داخل ہو جاتا ہے" (کنز الایمان)

مشکوٰۃ شریف کی یہ حدیث تو بڑی مشہور ہے کہ

رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے (1) شہادت اس بات کی کہ نہیں کوئی معبود مگر اللہ تعالیٰ اور شہادت اس کی کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (2) نماز قائم کرنا (3) زکوٰۃ دینا (4) حج کرنا (5) رمضان کے روزے رکھنا۔

بنظر انصاف دیکھا جائے تو مسلمانوں کا کون سا گروہ ایسا ہے جو ان بنیادی عقیدوں پر یقین نہیں رکھتا سبھی کو ان اصولوں پر دل سے اتفاق ہے صرف بعض تشریحات یا فروعات میں جھگڑے ہیں جو اختلاف عقل کی وجہ سے عین فطری ہیں بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر محض نزاعات کو اچھالنا نہ دین کی خدمت ہے نہ ملّت کی ہم اختلافات سے بالاتر ہوئے تو ہم نے پاکستان حاصل کیا پاکستان بننے کے بعد علمائے کرام نے اس نکتے کو سمجھا تو ان کے اتحاد و اتفاق کے نتیجے میں قرار داد مقاصد منظور ہوئی انہوں نے اسلامی دستور کیلئے کامل اتفاق رائے سے بنیادی اصول پیش کئے مگر افسوس کہ پاکستان بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد فرقہ واریت نے فضاء کو پھر سے مسموم بنا دیا اور پیشہ ور واعظوں نے ایسے ایسے تعصبات کھڑے کر دیئے کہ اختلاف عقیدہ کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے مصافحہ کرنے تک کا روادار نہ رہا مسجدوں پر تختیاں لگا دی گئیں کہ یہاں فلاں اور فلاں فرقے کے لوگ نماز ادا نہیں کر سکتے ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کچھ عرصے سے یہ فضا خراب تر ہو رہی ہے بریلوی دیو بندی اور شیعہ سنی نزاع کو ہوا دی جا رہی ہے فتنہ تکفیر ایک مرتبہ پھر زوروں پر ہے اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جبکہ ملت ایک خوفناک صورتحال سے دوچار ہے دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں عالم اسلام کے جسد واحد سے صیہونیت کے لگائے ہوئے زخموں کی وجہ سے خون رس رہا ہے لاکھوں افغانی مسلمان گھر سے بے گھر ہو کر ہمارے ملک میں خیمہ زن ہیں۔ ہم کسی ایک فرقے کے واعظوں کو مطعون نہیں کرتے اس طرح کی کالی بھیڑیں ہر

فرقے میں پائی جاتی ہیں لیکن سوچنے اور غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ جو علماء روشن خیال رواداراور فراخ دل ہیں وہ ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کیلئے کیا اقدام کر رہے ہیں ان انتشار پسند اور کافر ساز خطیبوں سے کچھ کہنا تو سراسر بیکار ہے وہ بیچارے اپنی معاشی ضروریات کے ہاتھوں مجبور ہیں فرض ان حضرات کو پکار رہا ہے جن کے دل میں درد، جن کی نظر میں وسعت ہے اور ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ خدا کے فضل وکرم سے ایسے اہل علم آج بھی ہر مکتب فکر میں پائے جاتے ہیں ، یہ ان کا کام ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقے کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر فتنہ تکفیر کا سدباب کرنے کی کوشش کریں ارباب حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے اب تک کے جاری کردہ احکام وفرامین کا غائر نظر سے جائزہ لیں کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے بعض اقدامات سے فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہو رہا ہو کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ آغاز کار ان اسلامی قوانین سے ہوتا جن پر سب مکاتب فکر کا اتفاق ہے ان قوانین کے اجراء کیلئے بھی سالہا سال درکار تھے دریں اثناء نزاعی معاملات کے تصفیے کیلئے ہر عقیدہ وخیال کے اہل علم کا بورڈ بنتا جو پورے تدبر سے کوئی بیچ کی راہ نکالتا اس طرح نہ کسی گروہ کو یہ الزام لگانے کا موقع ہاتھ آتا کہ یہ تو ایک فرقے کی حکومت قائم کی جارہی ہے اور نہ دوسرے گروہ کو یہ شکایت ہوتی کہ ان کے ہم عقیدہ محض بعض ادائیگیوں سے بچنے کیلئے دوسرے گروہ میں شامل ہونے کا اصرار واعلان کئے دے رہے ہیں اسلامی حکومت کے قیام کا کام اس دور میں پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے اس کیلئے علمائے حق کو بھی اپنا فرض ادا کرنا ہوگا اور ارباب حکومت کو بھی غیر معمولی فراست سے کام لینا ہوگا ورنہ ہماری غفلت کے نتیجے میں پاکستان کی فضا میں فرقہ واریت اور تکفیر کا زہر پھیل گیا تو قوم مدت مدید تک کسی دینی نصب العین کیلئے کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکے گی۔

روحانیات

حضرت سلطان باہوؒ اور ان کی تعلیمات

سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ کا مزار پر انوار ضلع جھنگ میں واقع ہے۔ جمادی الثانی میں آپ کا عرس ہوتا ہے لیکن اس معاملے میں آپ منفرد ہیں کہ آپ نے اپنی زندگی میں حضرت امام حسینؓ اور شہیدان کربلا کا عرس شروع کیا جو یکم محرم سے عاشورے تک منایا جاتا ہے اور آج تک اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ محرم ہی میں تین دن پاک پتن شریف میں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا بھی عرس ہوتا ہے لیکن یہ بابا صاحبؒ کا اپنا عرس ہے۔ شہیدان کربلا کا عرس نہیں اس لحاظ سے سلطان باہوؒ میں یکم محرم سے دس محرم الحرام تک ہونے والا یہ عرس پوری دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کی ایک ہی تقریب ہے۔ شہرہ اس کا ایک عرصے سے سن رکھا تھا لیکن اتفاق کبھی اس میں حاضری کا نہیں ہوا تھا لیکن اب کے حضرت سلطان العارفینؒ کی اولاد میں سے ایک جوان صالح حضرت صاحبزادہ سلطان فیاض الحسن صاحب نے اپنے اور اپنے ارادتمندوں کے زیر اہتمام ایک شہادت کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا اور مجھے بھی اس سے خطاب کرنے کی دعوت دی تو سالہا سال کی یہ آرزو پوری ہوئی اور 9 محرم کو مجھے حضرت سلطان باہوؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

پروگرام یہ بنا کہ میں 9 محرم کی صبح کو بذریعہ طیارہ فیصل آباد پہنچ جاؤں وہاں سے بذریعہ کار سلطان باہوؒ روانگی ہو میں اس خیال میں رہا کہ سیٹ آسانی سے مل جائے گی پیشگی ریزرویشن کی ضرورت نہیں مگر 8 محرم کو پی۔ آئی۔ اے کے دفتر سے پتہ کیا تو معلوم ہوا طیارے میں ایک سیٹ بھی خالی نہیں۔ ڈرائیور چھٹی پر

تھا۔ ورنہ بذریعہ موٹر کار چلا جاتا' ایک دو دوستوں سے معلوم کیا اتفاق سے ان کی گاڑیاں بھی خراب نکلیں اب ظاہر ہے سفر کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا لیکن اتفاق سے اسی رات لاہور سے حضرت صاحب زادہ صاحب کے ایک ارادتمند خاص علامہ سعید الرشید عباسی کا فون آ گیا معلوم ہوا وہ کافی دیر سے میرے ساتھ ٹیلیفون پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ادھر ایسا ہوا کہ اسی روز میرے گھر کا فون نمبر تبدیل ہو گیا کہیں دس بجے رات اسلام آباد انکوائری سے انہیں میرا نیا نمبر ملا تو میں نے ان سے ساری صورتحال بیان کرتے ہوئے اپنی آمد کے سلسلے میں معذرت چاہی انہوں نے کہا میں کار لیکر ابھی اسلام آباد روانہ ہو جاتا ہوں ڈھائی تین بجے رات تک پہنچ جاؤں گا پھر صبح منہ اندھیرے ہم جھنگ کیلئے روانہ ہو جائیں گے۔ ٹھیک تین بجے وہ میرے گھر پر پہنچ گئے اور پھر ٹھیک پانچ بجے صبح ہم جناب عزیز بھٹی ایڈووکیٹ سابق رکن قومی اسمبلی کو ساتھ لیتے ہوئے عازم جھنگ ہو گئے ہمارا روٹ براستہ گوجرانولہ شیخوپورہ تھا۔ کار لاہور کے ایک تاجر شجاعت صاحب چلا رہے تھے وہ بے چارے رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ پھر بھی بڑی مستعدی سے انہوں نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا۔ قاری صاحب کا حسن انتظام کہ انہوں نے شیخوپورہ موڑ پر ایک دوسری کار کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ یہاں عاشق بھٹی صاحب اور لاہور کے طالب علم رہنما جبار بٹ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم نے کار تبدیل کی اور براستہ فیصل آباد پھر سے جھنگ کے لئے روانہ ہو گئے۔ جھنگ پہنچتے پہنچتے آٹھ ساڑھے آٹھ گھنٹے ہو گئے اور ابھی منزل مقصود پچاس ساٹھ میل اور آگے تھی۔ اب یہاں سے جو بسوں' ٹرکوں اور ٹرالیوں کی ٹریفک شروع ہوئی ہے تو بس کچھ نہ پوچھئے۔ بسوں کی چھتیں تک انسانوں سے لدی پھندی تھیں۔ جھنڈے لہراتے کلام باہوؒ پڑھتے سب اسی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ بے شمار بسیں واپس بھی آ رہی تھیں۔ یہ راستہ بڑی مشکل سے طے ہوا۔ خدا خدا کر کے حضرت سلطان باہوؒ پہنچے۔ خیال تھا یہ کوئی قصبہ ہو گا مگر یہ تو جنگل بیابان نکلا۔ صرف حضرت سلطان العارفینؒ کا مزار اور اس کے ارد گرد خانقاہ کی عمارت' سجادہ نشین اور آپ کی اولاد کے دوسرے افراد کے چند گھر باقی اللہ اللہ خیر سلا مگر اس لق ودق صحرا میں خیموں کا ایک شہر آباد' جدھر نگاہ اٹھاؤ موٹریں ہی موٹریں' بسیں ہی بسیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا جہان کی رونق اس ویرانے میں سمٹ آئی ہو۔ حضرت سلطان باہوؒ کا یہ مصرع یاد آ گیا۔

نام فقیر تنہاں دا باہو قبر جنہاں دی جیوے ہو

(اے باہو! فقیر کہلانے کے مستحق وہ ہیں' جن کی قبر بھی زندہ ہوتی ہے)

اور اس قبر اور صاحب قبر کی زندگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ خلقت ہر چہار جانب سے اس ویرانے کی طرف کھنچی چلی آ رہی تھی جو بادشاہت جسموں پر قائم ہوتی ہے وہ بڑی فانی اور زوال پذیر ہے۔ اسی ماضی قریب میں دنیوی اقتدار کے عروج وزوال کے کیا کیا ڈرامے دنیا نے نہیں دیکھے جو کل تک اناولاغیری کے ڈنکے بجا رہے تھے وہ آج بے کس اور بے بس بن کر خلق خدا کی طرف سے ایک حرف دعا

کے محتاج ہیں مگر ان فقیروں کے اقتدار کے کیا کہنے! ان کا سکہ تو دلوں کی نگری میں چلتا ہے اور ان کی بادشاہت تو روحوں کی دنیا میں قائم ہے۔ وقت کی ہر گردش اور زمانے کی ہر الٹ پھیر ان کی حکومت کو مستحکم سے مستحکم تر کرتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ ناکام ہوئے اور یزید کامیاب مگر چشم باطن سے دیکھا جائے تو کربلا کے میدان میں حسینؓ نے اپنے خون سے جو بادشاہت خریدی تھی اس کے پھریرے چار دانگ عالم میں لہرا رہے ہیں اور قیامت تک لہراتے رہیں گے۔ یزید کو عارضی طور پر جسموں کی فانی بادشاہت ملی مگر حسینؓ کے اقتدار کے نقارے تو دلوں اور روحوں کی مملکت میں بج رہے ہیں۔ یہی تو وہ بادشاہت تھی جس کے بارے میں کہنے والے نے ببانگ دہل کہا کہ۔

شاہ ہست حسینؓ بادشاہ ہست حسینؓ

اور فقیر چونکہ فقر حسینؓ کے وارث اور صبر حسینؓ کے رمز آشنا ہوتے ہیں اس لئے اس بادشاہت میں ان کا بھی حصہ ہے وہ مر کر بھی نہیں مرتے اور دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی دلوں اور روحوں پر حکومت کرتے ہیں۔

....

حضرت سلطان باہوؒ آج سے تقریباً پونے چار سو سال قبل 1038ھ میں بمقام شور کوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے آپ اعوان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کا شجرۂ نسب اوپر جا کر سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ سے جا ملتا ہے۔ والد ماجد کا نام محمد بازید تھا جنھیں فوجی خدمات انجام دینے کے عوض مغل بادشاہ شاہجہان نے جاگیر بھی عطا کی تھی۔ آپ کا نام "باہو" ایک کراماتی نام ہے جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی اس کا مطلب ہے اللہ والا۔ یہ نام آپ سے پہلے۔ کسی کا نہیں رکھا گیا یہی انفرادی حیثیت آپ کی والدہ ماجدہ کے نام کو بھی حاصل ہے۔ جنہوں نے بچپن ہی میں آپ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اپنی آغوش تربیت میں آپ کی پرورش کی اس زاہدہ و عابدہ خاتون کا نام بی بی راستی تھا۔ حضرت سلطان باہوؒ نے اپنے فارسی کلام میں یہ کہہ کر اس بزرگ خاتون کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

رحمت حق بر روان راستی

راستی با راستی آراستی!

(راستی کی روح پر رحمت حق کا نزول ہوا ے راستی! تو راستی سے آراستہ ہے)

حضرت سلطان باہوؒ مادر زاد ولی تھے۔ بچپن ہی سے آپ کے وجود باجود سے یمن و سعادت کے آثار ہویدا تھے۔ نبی امیﷺ کی پیروی میں آپ نے بھی کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی نہ کسی سے نوشت و خواند سیکھی مگر علم لدنی سے آپ ایسے مالا مال تھے کہ اپنی زندگی میں ایک سو چالیس تصانیف لکھیں۔ ان میں سے اکثر فارسی زبان میں تھیں۔ اسوقت آپ کی تقریباً تیس کتابیں دستیاب ہیں جن کا ترجمہ اردو زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ ان میں تصوف و معرفت کے جو علوم و حقائق بیان کیے گیے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ کا تعلق تصوف کے سلسلہ قادریہ سے تھا جس کے سرخیل حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ حضرت غوث الاعظمؒ سے انہیں جس درجہ محبت تھی' اس کا والہانہ اظہار جگہ جگہ ان کی شاعری میں بھی ہوا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں

بغداد شہر دی کیہ لے نشانی اچیاں لمیاں چیراں ہُو
تن من میرا پُرزے پُرزے جیوں درزی دیاں لیراں ہُو
اینہاں لیراں دی گل کفنی پا کے رلساں سنگ فقیراں ہُو
بغداد شہر دے ٹکڑے منگساں کرساں میراں' میراں ہُو

(بغداد شہر کی اس کے سوا میرے پاس کیا نشانی ہے کہ میرے دل میں لمبے چوڑے زخم پڑے ہوئے ہیں اور میرا قلب و جسم اس کے فراق میں ایسے ہے جیسے درزی کے ہاتھ میں کٹے ہوئے کپڑوں کے پرزے۔ میں انہی پرزوں کا کفن اپنے گلے میں پہن کر فقیروں کے گروہ میں شامل ہو جاؤں گا اور بغداد میں ٹکڑوں کی بھیک مانگ کر میراں میراں (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) کی صدا لگاؤں گا)

آپ نے دہلی کا بھی سفر کیا جہاں اتفاقاً آپ کی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر آپ نے بادشاہ کو جن ملفوظات سے نوازا وہ آپ کے رسالہ اورنگ شاہی میں محفوظ ہیں مگر قرب سلطانی سے آپ کو کوئی سروکار نہ تھا اور دنیا اور متاع دنیا سے آپ کو پیار نہ تھا۔ اس لئے اس جاگیر کا اکثر و بیشتر حصہ بھی غریبوں میں بانٹ دیا جو آپ کے والد ماجد کو مغل حکومت نے عطا کی تھی صرف اتنا اپنے پاس رکھا جو بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کیلئے کافی ہو۔ ترک دنیا کے معاملے میں آپ کی تعلیمات بڑی متوازن اور حقیقت پسندانہ ہیں اپنے کلام اور تصانیف میں جہاں آپ نے سگ دنیا بننے کی مذمت کی ہے وہاں اس کو بھی پسند نہیں کیا کہ کوئی شخص بالکل ہی تارک الدنیا بن کر راہبانہ زندگی گزارنی شروع کر دے۔ اپنی کتاب اسرار قادری میں لکھتے ہیں

دنیا سوائے پانچ چیزوں کے فضول ہے

اوّل۔ روٹی' جس سے زندگی قائم رہے۔
دوم۔ پانی' جس سے پیاس بجھے۔
سوم۔ کپڑا' جس سے ستر ڈھانپا جائے۔
چہارم۔ گھر' جس میں گزران ہو سکے۔
پنجم۔ علم' جس پر عمل ہو سکے۔

آپ صاحب کرامات تھے سینکڑوں ہزاروں غیر مسلموں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا

1102ھ آپ کا سال وفات ہے۔ پہلی مرتبہ شور کوٹ کے موضع قہرگاں کے ایک قلعہ میں آپ کو دفن کیا گیا جو دریائے چناب کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ 77 سال تک آپ کی قبر یہیں رہی مگر جب دریا کا پانی قلعہ تک پہنچ گیا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ آپ کی قبر کو نہ بہالے جائے تو آپ کے جسم مبارک کو نکال کر اس جگہ دفن کیا گیا جہاں اس وقت آپ کا مزار ہے اس سلسلے میں روایتیں حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں کہ جب آپ کے صندوق کو قبر سے نکالا گیا تو آپ کا جسم بالکل صحیح سالم تھا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را..........

ہر زماں از غیب جان دیگر است

حضرت سلطان باہوؒ یوں تو ایک کثیر التصانیف مصنف تھے اور فارسی زبان کے شاعر بھی (ان کا فارسی دیوان مطبوعہ صورت میں آج بھی موجود ہے) مگر ان کی اصل وجہ شہرت پنجابی زبان میں ان کے ابیات ہیں جو اپنی زبان کی مٹھاس، لہجے کے سوز اور مطالب کی گہرائی میں اپنی مثال آپ ہیں، مثنوی مولانا رومؒ کی طرح انہیں ایک مخصوص لے میں پڑھا جاتا ہے اور ہر مصرع کے آخر میں "ہو" کا لفظ ایک عجیب ذہنی فضا پیدا کرتا ہے۔ جب کلام باہو الاپنے والا یہ لفظ ادا کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دل سینے سے باہر نکل آئے گا۔ صوفیانہ شاعری میں اکثر اوقات مجاز کو حقیقت کا پیرایۂ اظہار بنایا جاتا ہے۔ اس سے بڑے سے بڑا صوفی شاعر مستثنیٰ نہیں۔ مشاہدۂ حق، کی گفتگو میں "بادہ و ساغر" کا ذکر لائے بغیر بات نہیں بنتی مگر حضرت سلطان باہوؒ کے کلام میں مجاز سرے سے ناپید ہے۔ یہاں حقیقت ہی حقیقت ہے اور معرفت ہی معرفت۔ اس کے باوجود اثر انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تمام ابیات کی تعداد دو سو کے قریب ہے یہ عام طور پر چار مصرعوں سے مرکب ہیں۔ میرے مطالعہ میں صرف ایک ہی بیت ایسا آیا ہے جس میں مجازی طرز بیان میں حق سے فراق کا تذکرہ ہے اس میں شاعر نے اپنے لئے صیغہ تانیث استعمال کیا ہے فرماتے ہیں۔

میں کوجھی میرا دل بر سوہنڑاں میں کیوں کر اس نوں بھانواں ہو
ویہڑے ساڈے وڑدا ناہیں پئی لکھ وسیلے پانواں ہو
ناں میں سوہنڑی ناں دولت پلے کیوں کر یار منانواں ہو
ایہہ دکھ ہمیشہ رہسی باہو..... رونڈڑی ہی مر جانواں ہو

(میں بدشکل ہوں اور میرا محبوب خوبصورت، میں کیسے اسے پسند آ سکتی ہوں، میں لاکھ واسطے دیتی ہوں مگر وہ میرے آنگن میں قدم نہیں دھرتا۔ نہ تو میں حسین ہوں نہ میرے پاس دولت ہے میں اپنے محبوب کو کیسے مناؤں۔ اے باہو ایسا لگتا ہے

جیسے یہ دکھ ہمیشہ رہے گا اور میں اسی غم ہی میں روتے روتے جان دے دوں گی)

کلام باہوؒ میں توحید اور ذات صمدیت سے عاشقانہ تعلق قائم کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے وہ عقل کو مسلمان کرنے کی تلقین کرتے اور دل کو خواہشات نفسانی سے پاک کرنے کی ہدایت کرتے ہیں ان کی شاعری میں دل کو مرکزی موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے ایک مشہور بیت میں فرماتے ہیں۔

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانڑیں ہُو
وچے بیڑے وچے جھیڑے وچے ونجھ موہانڑیں ہُو
چوداں طبق دلے دے اندر جتھے عشق تمبووَنج تانڑیں ہُو
جو دل دا محرم ہووے باہو سوئی رب پچھانڑیں ہو

(دلوں کی دنیا تو دریاؤں اور سمندروں سے بھی زیادہ وسیع وعریض ہے' ان کی تہ تک کون پہنچ سکتا ہے؟ ان میں کشتیاں بھی ہیں اور ملاح بھی ان میں وہ بانس بھی پائے جاتے ہیں جن کی مدد سے کشتیاں چلائی جاتی ہیں اور اس دل کے تو کیا ہی کہنے جس میں عشق خیمہ زن ہو جائے اس میں تو زمین آسمان کے چودہ طبق سما سکتے ہیں' اے باہوؒ! جو اپنے دل کا محرم ہو گیا بس وہی اپنے رب کو پہچان سکا)

وہ ریا کاری اور ظاہر پرستی کے سخت ترین نقاد ہیں۔ انہیں ان علمائے سو سے سخت چڑ ہے جو دنیا داری اور رسم پرستی میں مبتلا ہیں اور علم فروشی کا دھندا کرتے ہیں' فرماتے ہیں۔

حافظ پڑھ پڑھ کرن تکبّر ملاں کرن وڈیائی ہُو
ساونڑ ماہنہ دے بدلاں وانگوں پھرن کتاباں چائی۔ ہُو
جتھے ویکھن چنگا چوکھا اتھے پڑھن کلام سوائی ہُو
دوہیں جہانیں مٹھے باہوؒ جنہاں کھادی ویچ کمائی ہُو

(حافظ قرآن پڑھ پڑھ کر تکبر میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ملا غرور اور برائی کا شکار ہیں وہ ایسے کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں (دوسروں کو مرعوب کرنے کیلئے' جیسے ساون کے بادل بارش سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ جہاں کہیں تر مال دیکھتے ہیں وہاں زیادہ دل لگا کر قرآن پڑھتے ہیں۔ اے باہوؒ! جنہوں نے نیکی کی کمائی کو (متاع دنیا کے عوض)

فروخت کر دیا وہ دونوں جہانوں میں ذلیل وخوار ہو گئے)

وہ کہتے ہیں کہ تمام روحانی مرتبوں کے حصول کا دارومدار صفائے قلب اور تزکیہ باطن پر ہے اس کیلئے ظاہر داری اور رسمیت کی ضرورت نہیں۔

جے رب ناتیاں دھوتیاں ملدا تاں ملدا ڈڈاں مچھیاں ہُو
جے رب ملدا مون منایاں تاں ملدا بھیڈاں بکریاں ہُو
جے رب جتیاں ستیاں ملدا تاں ملدا داندا خصیاں ہُو
جے رب راتیں جاگیاں ملدا تاں ملدا کال کڑچھیاں ہُو
انہاں گلاں رب حاصل ناہیں رب ملدا دل دے اچھیاں ہُو

(اگر اللہ تعالٰی کا قرب نہانے دھونے سے حاصل ہوتا تو یہ مینڈکوں اور مچھلیوں کو حاصل ہوتا اگر رب بال بڑھا لینے سے ملتا تو بھیڑوں بکریوں کو ملتا۔ اگر حق تعالٰی کا دیدار مجرد ہونے پر منحصر ہوتا تو یہ ان بیلوں کے حصے میں آتا جنہیں خصی کر دیا جاتا ہے اور اگر اس کا دارومدار راتوں کے جاگنے پر ہوتا تو یہ کالے رنگ کے ان پرندوں کا نصیبہ بنتا جو ساری ساری رات جاگتے اور نغمہ ریز رہتے ہیں۔ اے باہو' حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالٰی ان باتوں سے نہیں ملتا وہ تو صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جن کے دل اچھے اور پاک صاف ہوتے ہیں۔

کلام باہوؒ کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس میں عارف اور سالک کیلئے شہباز کا لفظ جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے یہی پرندہ کلام اقبالؒ میں بھی مرد مومن کی علامت ہے کیا عجب کہ اقبال نے یہ استعارہ حضرت سلطان باہوؒ ہی سے مستعار لیا ہو۔ اقبالیات پر گہری نظر رکھنے والے دانشوروں کو اس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کرنی چاہیے۔

11 نومبر 82ء

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات

(1)

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کا عرس برصغیر پاک وہند میں 20' 21 جنوری کو منایا گیا' اس مناسبت سے آج ان کی مبارک زندگی اور تعلیمات پر کچھ گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ 634ھ میں پیدا ہوئے (آج سے تقریباً سات سو ساٹھ سال پہلے) ابھی پانچ سال ہی کے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا' والدہ ماجدہ زاہدہ وعابدہ خاتون تھیں' بڑی مشکلوں سے انہوں نے آپ کی پرورش کی کبھی کبھی تو ایسے دن آتے کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا آپ اپنے بیٹے کو یہ کہہ کر تسلی دیتیں کہ آج تو ہم اللہ کے مہمان ہیں' حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ شروع شروع میں تو مجھے اس مہمان داری سے بڑی تکلیف ہوئی لیکن آہستہ آہستہ میں اس کا عادی ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جب بہت دن گزر جاتے اور فاقے کی نوبت نہ آتی تو میں والدہ سے دریافت کرتا "اماں' ہم اللہ کے مہمان کب بنیں گے؟"

دلی اس زمانے میں علماء وفضلاء کا مرکز تھا' خوش نصیبی سے حضرت خواجہؒ کو مولانا خوارزمیؒ جیسا استاد مل گیا جو اپنے وقت کے ممتاز عالم تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ جو شاگرد درس میں حاضر نہ ہوتا دوسرے دن اس سے کمال محبت سے پوچھتے' بھائی! مجھ سے کیا قصور سرزد ہو گیا جو تم کل درس میں شریک نہیں ہوئے۔ ایک ایسے عالم باعمل کی شاگردی کے ساتھ ساتھ آپ کو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی صحبت بھی نصیب رہی جو ان دنوں دہلی میں مقیم تھے ان کے نظریہ حیات اور طرز فکر کو

سمجھنے کیلئے ان کی وہ گفتگو کافی ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ اپنے استاد سے کی تھی، جب وہ تعلیم و تدریس کیلئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو استاد نے پوچھا۔

"نجیب الدین متوکل تم ہو"؟

انہوں نے جواب دیا

"میں تو نجیب الدین متاکل (کھانے والا) ہوں متوکل ہونا کس کے بس میں ہے"

"تم شیخ الاسلام حضرت فریدالدین گنج شکر کے بھائی ہو" فرمایا

"میں تو برادر صوری ہوں (یعنی ظاہراً ان کا بھائی ہوں، برادر معنوی (عمل کے اعتبار سے بھائی) نہ جانے کون ہوگا"؟

حضرت شیخ نجیب الدین ہی کی صحبت میں حضرت خواجہؒ نے بار بار حضرت گنج شکر کا تذکرہ سنا اور آہستہ آہستہ ان سے محبت و عقیدت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ وہ اجودھن (موجودہ پاک پتن) کے مقام پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہاں قریب قریب ایک سال رہے اور اپنے مرشد کامل کی توجہات و عنایات کے طفیل ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس کی دولت سے بھی مالا مال ہو گئے جب آئے تھے تو صرف خواجہ نظام الدین تھے مگر جب اس خانقاہ سے رخصت ہوئے تو محبوب الٰہی بن چکے تھے۔

حضرت گنج شکرؒ سے خرقہ خلافت پانے کے بعد آپ دہلی کے قریب غیاث پور میں آباد ہوئے اور کافی مدت تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ شروع شروع میں یہ مقام، مقام تنہائی تھا کوئی خاص آبادی نہ تھی مگر آہستہ آہستہ اس لالہ صحرائی کی خوشبو دور دور تک پہنچنے لگی اور لوگ کشاں کشاں اس مقام پر آ کر آباد ہونے لگے، سلطان معزالدین کیقباد نے یہیں اپنا محل بنوالیا اور غیاث پور دیکھتے دیکھتے اچھا خاصا شہر بن گیا تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ یہ ہجوم دیکھ کر بہت پریشان ہوئے، کہیں دوسری جگہ جانے کا ارادہ کر لیا مگر پھر اللہ تعالیٰ نے دل میں یہ بات ڈال دی کہ مردانگی گوشہ گیری اور خلوت گزینی کا نام نہیں لطف اس میں ہے کہ آدمی دنیا میں رہے اور پھر آلائشوں سے پاک صاف ہو اس خیال کو آپ نے خود ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

"مخلوق خدا سے گوشہ گیری اختیار کرنا اور یاد خدا میں مشغول ہو جانا آسان ہے لیکن مردانگی اور بہادری یہ ہے کہ انجمن میں خلوت اختیار کی جائے اور خلق خدا کے ہجوم کے باوجود یاد خدا میں خلل واقع نہ ہو"

دلی کے قیام کے دوران خلق خدا نے حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ سے جس طرح فیض اٹھایا وہ تصوف کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے، تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی نے جو آپ کے ہم عصر تھے اپنی کتاب میں (ص 343)

ان اثرات کی چند جھلکیاں پیش کی ہیں وہ لکھتے ہیں

"اسی زمانے میں شیخ الاسلام نظام الدینؒ نے بیعت عام کا دروازہ کھول رکھا تھا یہ گناہگاروں کو خرقہ پہناتے تھے اور ان سے توبہ کراتے تھے ہر شخص خواہ خاص ہو یا عام، مالدار ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر، عالم ہو یا جاہل، شریف ہو یا بازاری، دیہاتی ہو یا شہری آزاد ہو یا غلام سب لوگ اپنے آپ کو حضرتؒ کا مرید اور خدمت گار سمجھتے تھے اور بہت سی ناکردنی باتوں سے پرہیز کرتے تھے اور اگر حضرتؒ کے یہاں آنے والوں میں سے کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو وہ بیعت کی تجدید کر کے توبہ کا خرقہ آپ سے لیتا تھا اور حضرتؒ سے مرید ہونے کی شرم بہت سے لوگوں کو کھلم کھلا یا چوری چھپے بہت سے منکرات کے ارتکاب سے بچاتی تھی اور خلق خدا عام طور پر تقلیداً یا اعتقاداً اطاعت اور عبادت کی طرف رغبت رکھتی تھی خواص اور عوام کے دلوں میں نیکی اور نیکوکاری نے جگہ پکڑ لی تھی، مرد عورت، بوڑھے، نوجوان، عامی، غلام اور نوکر سب نماز ادا کرتے تھے، زیادہ تر مرید چاشت واشراق کے پابند ہو گئے تھے"

آپ دلی میں تقریباً پچاس سال تک اپنے اخلاق فاضلہ اور اعمال حسنہ کے ذریعے تبلیغ وتزکیہ میں مصروف رہے، وقت کا بادشاہ عقیدت رکھتا تھا اس نے کئی بار ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر ادھر سے ہمیشہ، بے نیازی اور استغناء کا مظاہرہ ہوا تا کہ کل کا مؤرخ یہ شبہ بھی دل میں نہ لا سکے کہ ایک فقیر بادشاہانہ جاہ وجلال سے متاثر و مرعوب ہو گیا، بادشاہ نے کئی مرتبہ درخواست کی اور آپ ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیتے۔

"آنے کی ضرورت نہیں، میں غائبانہ دعا گو ہوں اور غائبانہ دعا اثر رکھتی ہے اگر بادشاہ نے تشریف آوری کی زحمت کی تو اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں، اگر بادشاہ ایک دروازے سے تشریف لائیں گے تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا"

"نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ" اس اصول پر آپ نے اپنی پوری زندگی، خلق خدا کی اصلاح اور خدمت کیلئے وقف کر دی، مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی آپ کے حسن اخلاق کے گرویدہ تھے اور آپ کا بھی مسلک یہ تھا کہ بلا امتیاز مذہب وملت سب کی غم خواری کی جائے فرمایا کرتے۔

"قیامت کے بازار میں کسی عمل کی اتنی مانگ نہ ہو گی جتنی دلوں کو راحت پہنچانے کی"

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا

"طاعت دو طرح کی ہوتی ہے لازمی اور متعدی، لازمی وہ ہے جس کا نفع صرف کرنے والے کی ذات کو پہنچے اور یہ نماز، روزہ، حج، درود اور تسبیح ہے اور متعدی وہ ہے جس

سے اوروں کو فائدہ ہو جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' شفقت' غیر کے حق میں مہربانی کرنا' اس دوسری طاعت کا ثواب بیشمار ہے"

ایک مرتبہ آپ کے کسی عزیز نے آپ کے سامنے کسی کا یہ قول نقل کیا کہ شیخ نظام الدین کو اس جہان میں کوئی غم اور فکر نہیں ' آپ نے فرمایا۔

"مخلوق میرے پاس آتی ہے اور اپنے رنج و غم بیان کرتی ہے ان سب کا بوجھ میرے دل و جان پر پڑتا ہے وہ عجب دل ہو گا جو مسلمان بھائی کا غم سنے اور اُس پر اثر نہ ہو"

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے آپ کیلئے بار گاہ خداوندی میں دعا کی کہ اے اللہ نظام الدین کو ایسا درخت بنا دے جس کے سائے میں ایک خلق کثیر آسائش و راحت پائے ان کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ مقبول و مستجاب ہوئے اور آپ زندگی ہی میں نہیں وفات کے بعد بھی ایک ایسے شجر سایہ دار بن گئے جس کے نیچے مادیت کی تپتی ہوئی دھوپ میں جھلسنے والے آج بھی سستا رہے ہیں۔ ان کی وہ تعلیمات آج بھی موجود ہیں جنہوں نے کل بھی لاکھوں انسانوں کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی اور آج بھی اگر صدق دل سے ان پر عمل کیا جائے تو معاشرے میں روحانی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

....

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیمات سے آگہی اور وقوف حاصل کرنے کے لئے سب سے اہم ذریعہ "فوائد الفواد" ہے جسے حضرت کے ایک مرید خاص امیر حسن علاء سنجری نے جنہیں خواجہ حسن دہلوی بھی کہتے ہیں ترتیب دیا ہے وہ پندرہ سال تک حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور جو کچھ آپ سے سنا اسے برابر قلمبند کرتے رہے' امیر خسرو کی طرح امیر حسن بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر تھے اور یہ بھی امیر خسرو کی طرح شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ فارسی شاعری میں انہیں جو مقام حاصل تھا اس کے پیش نظر انہیں "سعدی ہند" کہا جاتا تھا' کتاب "فوائد الفواد" میں انہوں نے اپنے پیر و مرشد کے ارشادات و فرمودات کو بڑی سلیس اور دل نشیں زبان میں محفوظ کر دیا ہے' اردو میں اس کا ایک بہت اچھا ترجمہ پروفیسر محمد سرور نے کیا تھا (جو اپنے وقت کے ایک ممتاز صحافی اور عالم فاضل بزرگ تھے اور جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا ہے) حضرت خواجہ کے ان ملفوظات میں روح دین سمٹ کر آ گئی ہے وہ حکایت بھی بیان کرتے ہیں تو اس میں امر واقعہ کا ایسا اظہار ہے کہ بڑے بڑے ضخیم علمی مجلات بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ جو لوگ اسلامی تصوف کو اپنے اصل رنگ میں دیکھنا چاہتے ہوں ان کیلئے "فوائد الفواد" کا مطالعہ ناگزیر ہے' کتاب کی انہی خوبیوں کے پیش نظر حضرت امیر خسرو نے فرمایا تھا کہ کاش! امیر حسن مجھ سے میری ساری کتابیں لے لیتے اور تنہا "فوائد الفواد" مجھے بخش دیتے ذیل میں اس کتاب سے جستہ جستہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی بعض تعلیمات پیش کی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے اور پھر اندازہ کیجئے کہ آج ان بزرگان دین کے نام لیوا جن خرافات میں مبتلا ہیں ان کا ان حقائق و معارف

سے کیا دور کا بھی تعلق ہے؟
آج مشائخ کرام قرب سلطانی کے کس طرح جویا ہیں' ایسا لگتا ہے سرکار دربار میں رسائی حاصل کرنے کی خاطر ان میں باقاعدہ ریس جاری ہے مگر اس بارے میں حضرت خواجہ کا عمل تو آپ سن چکے اب آپ کی زبان سے ایک حکایت کے پیرائے میں آپ کا مسلک بھی سن لیجئے' آپ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ

"ایک بزرگ تھے جنہیں شیخ علی کہتے تھے ایک دفعہ وہ اپنا خرقہ سی رہے تھے' انہوں نے اپنے پاؤں پھیلا رکھے تھے' خرقہ کا ایک پلہ اپنی ران پر ڈالے اس میں پیوند لگا رہے تھے' اس دوران میں لوگوں نے ان سے کہا کہ خلیفہ آرہا ہے' انہوں نے اپنا انداز نہ بدلا اسی طرح رہے جیسے کہ تھے اور کہا "آتا رہے" خلیفہ آیا سلام کیا اور بیٹھ گیا' شیخ نے سلام کا جواب دیا خلیفہ کے چوبدار نے جو اس کے ساتھ آیا تھا کہا "شیخ! اپنے پاؤں سمیٹ لیجئے" شیخ نے اس کی بات کی طرف بالکل دھیان نہ دیا' یہاں تک کہ اس نے یہی بات ایک دوبار دہرائی' الغرض جب خلیفہ واپس جانے لگا تو شیخ نے اپنے ایک ہاتھ میں چوبدار کا ہاتھ اور دوسرے ہاتھ میں خلیفہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا "میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لئے ہیں' اس لئے میرے لئے روا ہے کہ اپنے پاؤں نہ سمیٹوں' یعنی مجھے تم سے نہ پہلے کوئی طمع تھی نہ اب کوئی طمع رکھتا ہوں اور نہ تم سے کچھ لیتا ہوں' میں نے اپنے ہاتھ سمیٹ لئے ہیں اگر پاؤں نہ سمیٹوں تو اختیار رکھتا ہوں"

تصوف جہاں اپنے رب سے لو لگانے کا نام ہے وہاں وہ خلق خدا سے صحیح معاملہ کرنے کو بھی نظر انداز نہیں کرتا' حقوق العباد اس کی نگاہ میں اتنے اہم ہیں کہ ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کا اتلاف تو اس کیلئے ناقابل برداشت ہے ہی خیال اور قیاس کی دنیا میں بھی وہ ان کی ادائیگی کی نگہداشت کرتا ہے ایک اور حکایت ارشاد فرمائی کہ:

"ایک شخص خواجہ شیرازی کی خدمت میں حاضر ہوا اور مرید ہو کر خواجہ شیرازی کے فرمان کا انتظار کرنے لگا کہ دیکھئے آپ اسے نماز' روزہ اور اوراد و وظائف کے متعلق کیا ارشاد کرتے ہیں' حضرت خواجہ نے صرف یہی فرمایا کہ جو تم اپنے لئے روا نہیں رکھتے کسی دوسرے کیلئے بھی روا نہ رکھو اور اپنے لئے وہی چاہو جو کسی دوسرے کیلئے چاہتے ہو۔ وہ شخص واپس چلا گیا ایک مدت کے بعد پھر آیا اور خواجہ شیرازی کی خدمت میں اس نے عرض داشت کی کہ میں اس روز خدمت میں حاضر ہوا اور اس امر کا منتظر رہا کہ پیرومرشد مجھے نماز اور اوراد و وظائف کی تلقین فرمائیں لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا۔

آج میں پھر اس بات کا منتظر ہوں' خواجہ شیرازی نے کہا کہ اس روز تمہارا سبق کیا تھا مرید حیران رہ گیا اور کوئی جواب نہ دیا' خواجہ شیرازی مسکرائے اور فرمایا اس دن میں نے تم سے کہا تھا کہ جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے کسی دوسرے کے لئے بھی پسند نہ کرو اور اپنے لئے وہی چاہو جو تم کسی دوسرے کیلئے چاہتے ہو' تم نے وہ بات یاد نہیں رکھی اور چونکہ تم نے پہلا سبق درست نہیں کیا لہٰذا دوسرا سبق کیسے دوں؟"

بہت سے لوگ یاد خدا میں بھی مشغول رہتے ہیں لیکن حبِ دنیا کی سڑاند بھی ان کے سینوں میں پھیلی رہتی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کنواں پانی سے لبریز ہو اور اس میں ایک مردہ کتا بھی پڑا ہوا ہو' جیسے یہ پانی پینے کے ناقابل ہے ویسے ہی حب دنیا کے ساتھ یاد خدا کا بھی کوئی فائدہ نہیں' تصوف یہ ہے کہ پہلے اپنا دل دنیا کی محبت سے خالی کر دے لیکن اس کے لئے ترک دنیا ضروری نہیں بلکہ ضروری کیا صحیح بھی نہیں۔ اس کیلئے تو دنیا میں رہتے ہوئے اس کی محبت سے کنارہ کشی کرنی ہو گی ایسے ہی جیسے مرغابی پانی میں رہتی ہے مگر اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی' اس مضمون کو حضرت خواجہؒ کی زبان فیض ترجمان سے سنیئے' ارشاد فرماتے ہیں۔

"ایک پارسا بزرگ تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نماز' روزہ' تسبیح اور اوراد و وظائف دیگ کی جملہ ضروریات و لوازم ہیں' اصل چیز یہ ہے کہ دیگ میں گوشت ہو' جب دیگ میں گوشت ہی نہیں تو ان لوازم سے کچھ نہیں ہو سکے گا' لوگوں نے اس بزرگ سے کہا کہ آپ نے بارہا یہ مثال دی ہے ذرا اس کی شرح بھی کر دیجئے' اس بزرگ نے فرمایا کہ گوشت ترک دنیا اور نماز روزہ اور اوراد و تسبیح اس کی ضروریات و لوازم' آدمی کو سب سے پہلے تو یہ چاہئے کہ دنیا کو ترک کرے اور اس کا کسی چیز سے تعلق نہ رہے پھر خواہ نماز' روزہ اوراد اور دوسری چیزیں ہوں خواہ نہ ہوں کوئی پرواہ نہیں لیکن اگر اس کے دل میں دنیا کی دوستی اور محبت ہے تو دعاؤں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا"

بعد ازاں حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اگر گھی' سیاہ مرچ' لہسن اور پیاز دیگ میں ڈال کر بگھار دیں اور اس میں پانی ڈال کر شوربا بنا لیں تو اس شوربا کو لوگ جھوٹا اور جعلی شوربا کہتے ہیں پس اصلی شوربا وہ ہو گا جو گوشت سے بنے' خواہ اس میں دوسرے لوازم ہوں یا نہ ہوں۔

پھر ترک دنیا کی حقیقت کے بارے میں آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ صادر ہوئے کہ ترک دنیا یہ نہیں کہ کوئی شخص کپڑے اتار کر برہنہ ہو جائے مثلاً لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے ترک دنیا یہ ہے کہ وہ لباس بھی پہنے' کھانا بھی کھائے' البتہ جو کچھ اس کے پاس آئے اسے خرچ کرتا رہے' جمع نہ کرے اس کی طرف راغب نہ ہو اور دل کو کسی چیز سے وابستہ نہ کرے"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات

(2)

گناہ کے بعد توبہ کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کے موضوع پر ہمارے دینی لٹریچر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ عارفان شریعت نے اس سلسلے میں اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق بے شمار نکات بیان کئے ہیں لیکن جس دل پذیر اور عالمانہ رنگ میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اس پر کلام کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ سچ ہے عالم ضروری نہیں کہ عارف بھی ہو لیکن عارف اپنے وقت کا عظیم عالم بھی ہوتا ہے

حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا:

"راہ سلوک کی لغزشوں کی سات قسمیں ہوتی ہیں

1..........اعراض

2..........حجاب

3..........تفاصل

4..........سلب مزید

5..........سلب قدیم

6..........تسلی

7..........عداوت

آپ نے ان میں سے ہر قسم کو تمثیل و تفصیل سے واضح فرمایا' ارشاد ہوا کہ دو دوست ہوتے ہیں' عاشق

معشوق 'ایک دوسرے کی محبت میں مستغرق اس دوران میں اگر عاشق سے کوئی ایسی حرکت یا قول یا فعل سرزد ہوتا ہے جسے اس کا دوست پسند نہیں کرتا للذاوہ دوست اس سے اعراض کر لیتا ہے (یعنی منہ موڑلیتا ہے) اس وقت عاشق کے لئے لازم ہے کہ فوراً معافی مانگے اور معذرت کرے اس کے نتیجے میں اس کا دوست اس سے راضی ہو جائے گا اور وہ تھوڑا سا اعراض جو پیدا ہو گیا تھا ختم ہو جائے گا۔

اگر عاشق اس خطا پر اپنی ضد کے ساتھ قائم رہتا ہے اور معذرت نہیں کرتا تو یہ اعراض حجاب کی صورت اختیار کر لے گا اور معشوق اور عاشق کے درمیان ایک حجاب (یعنی پردہ) کھڑا کر لے گا۔ جب حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ حجاب کی تمثیل دیتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو آپ نے اپنا ہاتھ اونچا کیا اور اپنی آستین اپنے چہرہ مبارک کے سامنے کر لی اور فرمایا کہ محبّ و محبوب کے درمیان اس طرح حجاب اور پردہ واقع ہو جاتا ہے 'اس صورت میں محبّ کے لئے ضروری ہے کہ وہ محبوب سے معافی مانگے اور توبہ کرے 'اس بارے میں اگر وہ سستی اور سہل انگاری کرتا ہے تو یہ حجاب تفاصل (یعنی فاصلہ) میں بدل جائے گا۔ یعنی یہ ہو گا کہ وہ دوست اس سے جدائی اختیار کر لے گا پس شروع میں اعراض سے زیادہ کچھ نہ تھا جب خطا پر معذرت نہ کی اعراض نے حجاب کی شکل اختیار کر لی اور جب وہ اس ناپسندیدہ حرکت پر اڑا رہا تو حجاب تفاصل بن گیا' پھر اگر وہ دوست اس پر بھی معافی نہیں مانگتا تو سلب مزید ہو گا یعنی وہ مزید لذت جو اسے اوراد و وظائف ذوق طاعت و عبادت اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں ملتی ہے اس سے چھین لی جائے گی۔

پھر اگر وہ اس پر بھی معافی نہیں مانگتا اور اس شیخی پر اصرار کرتا ہے تو سلب مزید' سلب قدیم میں بدل جائے گا اور سلب مزید سے پہلے اسے جو طاعت و راحت حاصل تھی وہ بھی اس سے چھین لی جائے گی پھر اگر اس جگہ بھی توبہ میں کوتاہی ہوئی تو اس کے بعد یہ صورت تسلی بن جائے گی 'تسلی کیا ہے؟ اس کے دوست کے دل کا اس کی جدائی پر مطمئن ہو جانا' پھر اس مرحلے پر بھی معذرت میں سستی ہو گئی تو عداوت پیدا ہو جائے گی اور وہ تعلق جو پہلے کبھی محبت کی صورت میں تھا' عداوت میں بدل جائے گا۔ اللہ ہمیں اس سے بچائے"

حضرت خواجہ" کا مندرجہ بالا ارشاد حقیقت میں اس حدیث کی شرح ہے جس میں آنحضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے' وہ توبہ کر لے تو یہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر برابر گناہ ہی گناہ کرتا رہے تو یہ نقطے بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ پورے کا پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کے لئے فرمان باری ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

....

صوفیائے کرام کے نزدیک زندگی کی دو قسمیں ہیں 'ایک حیات جسمانی جس کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے اسے قائم رکھنے کے لئے خوراک اور آب و دانہ کی ضرورت ہوتی ہے دوسری حیات روحانی جس کا تعلق باطن سے ہوتا ہے یہ ذکر خداوندی سے جلا اور قیام پاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اچھا خاصا تندرست و توانا اور ہنستا کھیلتا ہوتا ہے لیکن بباطن اس کی موت واقع ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی

سے غافل ہوتا ہے صوفیائے کرام ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ ۔

ہر وہ لمحہ ہے مرا کفر میں شامل اے دوست
دل تیری یاد سے جس میں ہوا غافل اے دوست

حضرت خواجہؒ نے اس اہم نکتے کو ایک حکایت کی صورت میں بیان کیا' فرماتے ہیں '

"ایک بزرگ تھے جنہیں خواجہ میر گرامی کہتے تھے ایک درویش کو یہ آرزو ہوئی کہ وہ ان کی زیارت کو جائے 'اس درویش کی یہ کرامت تھی کہ جو بھی خواب وہ دیکھتا وہ صحیح ہوتا اور اس خواب کی تعبیر من وعن وہی ہوتی جو اس نے خواب میں دیکھا ہوتا ' الغرض جب اس درویش پر ان بزرگ کی زیارت کا شوق غالب آیا تو وہ اس طرف چل پڑا جدھر خواجہ میر گرامی رہتے تھے راستے میں درویش نے ایک جگہ منزل کی اور وہاں سو گیا' سوتے میں اس نے سنا کہ خواجہ میر گرامی وفات پا گئے جب صبح ہوئی تو وہ درویش اٹھا اور کہنے لگا "افسوس! ان کی ملاقات کی آرزو میں اتنا راستہ طے کیا اور ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب کیا کیا جائے' خیر اس جگہ چلتا ہوں جہاں وہ تھے ان کی قبر کی زیارت کرتا ہوں۔ جب وہ درویش اس جگہ پہنچا جہاں میر گرامی رہتے تھے تو اس نے لوگوں سے پوچھا ان کی قبر کہاں ہے؟ سب نے کہا وہ تو زندہ ہیں ' ان کی قبر کیوں دریافت کرتے ہو؟ یہ درویش حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ میرا خواب کیونکر جھوٹا ہو گیا؟ غرض وہ میر گرامی کی خدمت میں پہنچا اور انہیں سلام کیا۔ خواجہ میر گرامی نے سلام کا جواب دیا اور کہا "اے شخص! تمہارا خواب معناً صحیح تھا۔ میں برابر یاد خدا میں مشغول رہتا ہوں 'اس رات میں غیرِ خدا میں مشغول ہو گیا تھا اس لئے دنیا جہاں میں یہ صدا دے دی گئی کہ میر گرامی کا انتقال ہو گیا ہے"

رزق حلال کمانے اور کھانے والا انسان مستجاب الدعوات ہوتا ہے یعنی وہ جو دعا مانگتا ہے قبول ہوتی ہے ' افسوس ہے کہ اب مذہبی لوگوں نے اس ضمن میں کئی خانے بنا رکھے ہیں۔ زہد و عبادت پر بھی زور ہے ' ظاہری وضع قطع بھی متشرع ہے ' حج اور عمرہ بھی بار بار ہو رہا ہے۔ تسبیح ہزار دانہ بھی ہاتھ میں ہے ' درس و تبلیغ سے بھی شغف ہے لیکن اکل حلال کی فکر نہیں۔ تجارت میں سمگلنگ بھی ساتھ ساتھ جاری ہے 'بلیک کا دھندا بھی ہو رہا ہے۔ سودی کاروبار سے بھی پرہیز نہیں 'اب ایسے میں دعائیں مردود اور غیر مقبول نہ ہوں تو اور کیا ہوں حضرت خواجہؒ نے اپنے ارشادات میں رزق حلال کو نہ صرف روحانی اعتبار سے کلید معرفت قرار دیا ہے بلکہ دنیوی فلاح و بہبود اور معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کیلئے بھی لازم ٹھہرایا ہے۔

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں اس مسئلہ پر بڑی بحثیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے اسم اعظم کون سا ہے کسی کی کچھ رائے ہے کسی کی کچھ مگر حضرت خواجہؒ نے اس پر جس خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے حق یہ ہے کہ وہ اس موضوع پر حرف آخر ہے فرمایا:

"حضرت ابراہیم ادہمؒ سے لوگوں نے پوچھا " آپ کو اسم اعظم یاد ہے بتائیے وہ کون

سا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا ہاں! یاد ہے، معدے کو لقمہ حرام سے پاک رکھو اور دل کو دنیا کی ہوس سے خالی کر لو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو جس نام سے بھی یاد کرو گے وہی اسم اعظم ہے"

رزق حلال کے سلسلے میں لاہور شہر کی تباہی کا یہ روحانی راز کتنا چشم کشا ہے، فرمایا

"لاہور کے بعض سوداگر گجرات کاٹھیاوار کی طرف گئے۔ ان ایام میں گجرات پر ہندوؤں کا قبضہ تھا جب ہندوؤں نے اس کپڑے کو جو لاہور سے سوداگر لے کر گئے تھے خریدنا چاہا تو ان سوداگروں نے کپڑے کی زیادہ قیمت بتائی۔ مثلاً جس کپڑے کی قیمت دس درہم تھی اس کی قیمت بیس درہم بتائی اور جس کی قیمت بیس درہم تھی اس کی چالیس درہم بتائی۔ بعدازاں ان کپڑوں کو ان کی اصلی قیمت پر بیچ دیا یعنی جو قیمتیں بتائی تھیں ان سے نصف پر بیچ دیا۔ گجرات کے ہندوؤں کے ہاں یہ طریقہ نہ تھا وہ جس سامان کو بیچنا چاہتے اس کی ٹھیک قیمت بتاتے تھے اور ایک ہی بات کرتے تھے۔ الغرض جب گجرات کے ہندوؤں نے یہ لین دین دیکھا تو ان میں سے ایک نے سوال کیا کہ تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم لاہور کے ہیں۔ اس ہندو نے کہا "کیا تمہارے شہر میں اسی طرح لین دین ہوتا ہے؟" لاہور کے سوداگروں نے کہا کہ ہاں! اسی طرح، بعدازاں اسی ہندو نے کہا کہ کیا وہ شہر اب تک آباد ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! آباد ہے۔ ہندو کہنے لگا "وہ شہر جہاں اس طرح کاروبار ہوتا ہے آباد نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جب وہ سوداگر واپس ہوئے تو ابھی راستے ہی میں تھے کہ تاتاریوں نے لاہور پر حملہ کیا اور لاہور کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا"

مہمان نوازی اور مہمان داری کو ہمارے ہاں امور دنیا میں سے سمجھا جاتا ہے مگر خلق اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ملنے آ جائے تو اس کی بقدر استطاعت ضرور تواضع کی جائے۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک ارشاد کے حوالے سے (جو کم سے کم میری نظر سے اب تک کہیں نہیں گزرا تھا) بڑی حسین تعلیم دی ہے اگر اس پر کوئی معاشرہ عمل کرنے لگے تو ہر طرف محبت ہی محبت کا جلوہ نظر آئے گا۔

حضرت شیخ فرماتے ہیں۔

"ایک حدیث ہے "جو کسی زندہ آدمی کے پاس گیا اور اس کے ہاں کوئی چیز چکھی تک نہیں تو وہ گویا ایک مردہ آدمی کے پاس گیا"

اس سلسلے میں آپ نے شیخ بہاؤالدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر فرمایا جن کے ہاں یہ دستور نہ تھا۔ خلقت ان کے پاس جاتی مگر ان کے ہاں کھانے پینے کی کوئی چیز پیش نہ کی جاتی۔ ان سے ایک شخص نے سوال کیا کہ

آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تو اپنے ارشاد میں کچھ نہ کچھ کھلانے پلانے کی تاکید فرمائی ہے۔ شیخ بہاؤ الدین نے کہا ہاں! یہ ارشاد تو ہے۔ اس سوال کرنے والے نے کہا "پھر آپ اس حدیث پر کیوں عمل نہیں کرتے؟" شیخ نے جواب دیا کہ لوگ اس کے معنی نہیں جانتے۔ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک عوام اور خواص مجھے عوام سے کوئی سروکار نہیں البتہ جب خواص آتے ہیں میں ان سے خدا' اس کے رسولؐ، سلوک و معرفت اور اس طرح کے اور وسائل کے بارے میں گفتگو کرتا ہوں (اور یہ ان کی روحانی تواضع کا سامان ہوتا ہے)

اسی مناسبت سے آپ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صحابہ جب آپؐ کی خدمت میں آتے تھے تو ان کو کوئی نہ کوئی چیز ضرور پیش کی جاتی تھی۔ وہ اسے کھاتے اور پھر واپس جاتے۔ وہ چیز روٹی ہوتی یا کھجوریں یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ غرض جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں وہ جب بھی جاتے تو کچھ کھائے بغیر واپس نہ لوٹتے۔

بعد ازاں آپ نے فرمایا کہ شیخ بدر الدین غزنوی کے ہاں یہ دستور تھا کہ اگر ان کے پاس کوئی چیز موجود نہ ہوتی تو وہ کہتے کہ آنے والوں کو پانی ہی پلاؤ" ہمارے ہاں خدائی فوجدار بننے کا رجحان عام ہے۔ نکتہ چینی اور تنقید کرنے کو امر بالمعروف کا نام دیا جاتا ہے۔ لوگ سر عام دوسروں کو ٹوک کر تسکین نفس حاصل کرتے ہیں۔ بہت بڑا مجاہد وہ ہے، جو دوسروں کے سامنے کسی کے عیب اس پر ظاہر کر دے مگر صوفیائے کرام کے نزدیک یہ نصیحت نہیں، فضیحت ہے اور کسی مسلمان بھائی کی رسوائی چاہنا ہرگز ہرگز شریعت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا اس سلسلے میں آپ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ فرمایا:

"ایک دفعہ قاضی ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے اصحاب اور شاگردوں کو سبق کا املا کرا رہے تھے۔ وہ سر پر صوفیوں کی کلاہ پہنے ہوئے تھے وہ کلاہ سفید رنگ کی نہ تھی سیاہ رنگ کی تھی۔ لاطیہ نہ تھی ناشزہ تھی (لاطیہ کلاہ وہ ہوتی ہے، جو سر کے برابر اور اس کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہے اور ناشزہ کلاہ سر سے اونچی اور اوپر کو نکلی ہوئی ہوتی ہے)

ایک شخص آیا اور ان سے سوال کیا "کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس طرح کی کلاہ سر پر اوڑھی تھی؟" قاضی ابو یوسف نے کہا کہ ہاں پھر سوال کرنے والے نے پوچھا کہ آپ نے سفید کلاہ پہنی تھی یا سیاہ، انہوں نے کہا سفید۔ پھر اس شخص نے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کلاہ لاطیہ سر پر رکھی تھی یا کلاہ ناشزہ۔ قاضی ابو یوسف نے کہا کہ لاطیہ' اس پر سوال کرنے والے نے کہا کہ تم نے سر پر سیاہ اور ناشزہ کلاہ اوڑھ رکھی ہے اور اس طرح دو اعتبار سے تم نے آنحضور

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت کی مخالفت کی ہے۔ اس حالت میں آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی احادیث کا کیسے املا کرا رہے ہو۔ قاضی ابو یوسف کو اس سے رنج ہوا انہوں نے اس سوال کرنے والے سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات جو کہی ہے دو حال سے خالی نہیں ہے یا تم نے حق کی خاطر کہی ہے یا مجھے ایذا دینے کے لئے۔ اگر تم نے یہ بات حق کی خاطر کہی ہے تو چونکہ تم نے سب کے سامنے کہی ہے اس لئے تمہیں اس سے کوئی ثواب نہیں ملے گا اور اگر تم نے یہ بات مجھے اذیت دینے کے لئے کہی ہے تو تم پر افسوس ہے"

عیب بینی اور نکتہ چینی کے سلسلے میں حضرت شیخ کی یہ بات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ فرمایا۔

"اگر کوئی شخص دوسرے پر عیب لگاتا ہے تو سب سے پہلے اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ عیب خود اس میں بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ عیب خود اس میں ہے تو اسے شرم آنی چاہئے کہ جو عیب خود اس میں ہے وہ اس کا دوسرے کو طعنہ دے رہا ہے۔ اگر وہ عیب اس میں نہیں ہے تو خدائے عز و جل کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے اس عیب سے محفوظ رکھا ہے اس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اس کا دوسرے کو طعنہ دے"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات

(3)

بعض لوگ بظاہر عامی نظر آتے ہیں مگر ان کے باطن میں کچھ ایسے جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کا بڑا رتبہ اور مقام ہوتا ہے گدڑی پوش اور فقیر منش لوگوں کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے انہی میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر یہ کبھی کسی کام کے سلسلے میں حق تعالیٰ کے نام کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اس کام کو کرتا ہے ۔ بقول شاعر ۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(جہان کے خاکساروں کو حقارت سے مت دیکھ ، تجھے کیا معلوم ، ہو سکتا ہے اس گرد کے اندر کوئی سوار چھپا ہو)

حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے واقعات و حکایات سے اس مسئلے کو واضح کیا ہے ، فوائد الفواد کے مولف لکھتے ہیں۔

"نماز کے بعد قدم بوسی کی دولت حاصل ہوئی ، اتنے میں ایک ملنگ آیا گھڑی بھر بیٹھا اور اٹھ کر چلا گیا ، حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ، اس طرح کے لوگ شیخ بہاؤالدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں کم ہی پہنچ پاتے تھے البتہ شیخ الاسلام حضرت فرید الدین رحمتہ اللہ علیہ (گنج شکر) کی خدمت میں ہر طرح کے درویش اور

غیر درویش (بے تکلف) پہنچ جاتے تھے۔

بعدازاں فرمایا کہ عامیوں کے ہر مجمع میں کوئی نہ کوئی خاص موجود ہوتا ہے اس سلسلے میں آپ نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ شیخ بہاؤالدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ نے بہت سیر و سیاحت کی تھی ایک دفعہ وہ ملنگوں کی ایک جماعت میں پہنچے اور بیٹھ گئے۔ اس جماعت میں روشنی جلوہ گر ہوئی' اچھی طرح نظر ڈالی تو انہی میں سے ایک شخص نظر آیا جس کے یہاں سے وہ روشنی پھوٹ رہی تھی' آپ آہستہ سے اس کے پاس گئے اور اس سے کہا ان لوگوں کے درمیان تمہارا کیا کام؟

اس نے جواب دیا "اے زکریا! میں اس لئے ان میں شامل ہوں تاکہ تم جان لو کہ عامیوں کے ہر مجمع میں کوئی نہ کوئی خاص موجود ہوتا ہے"

....

نیکی میں ریا اور دکھاوا آ جائے تو وہ اس طرح ختم ہو جاتی ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو چاٹ جاتی ہے اس لئے اہل حق کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ نفلی عبادتیں خلق خدا سے چھپ کر اور چھپا کر کیا کرتے ہیں' اگر اللہ کے لئے کوئی عمل کرتا ہے تو اس کو اس کی خبر ہو ہی جاتی ہے خواہ وہ سات پردوں کے پیچھے کیوں نہ کیا جائے' ہاں اپنی پارسائی کا اشتہار دینا مقصود ہو تب دوسری بات ہے' حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے فرمودات میں اس پہلو پر بھی اظہار خیال کیا ہے' امیر حسن سنجری رحمتہ اللہ علیہ آپ کی ایک مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔

قرآن کی تلاوت کرنے اور قیام شب (رات کی عبادت کے لئے جاگنے) کا ذکر ہو رہا تھا' نیز اس گروہ کا ذکر ہو رہا تھا جو مسجد میں قیام شب کرتے ہیں' بندہ نے عرض کیا کہ اگر وہ اپنے گھر پر قیام شب کریں تو یہ کیسا رہے؟ آپ نے فرمایا اگر وہ گھر پر قرآن کا ایک پارہ پڑھیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ مسجد میں پورا قرآن ختم کریں بعدازاں ایک آدمی کا ذکر ہوا کہ وہ دمشق کی مسجد میں ہمیشہ شب بیدار رہتا تھا اور پھر رات قیام کرتا تھا تاکہ اسے شیخ الاسلامی کا منصب مل جائے یہ سن کر حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا

"پہلے شیخ الاسلامی کو آگ لگاؤ پھر خانقاہ کو اور بعد میں خود کو"

اسی دوران میں آپ نے فرمایا ایک سبزی فروش تھا وہ پچیس برس روزے سے رہا اور کسی کو اس کے حال کی خبر نہ ہوئی' یہاں تک کہ اس کے گھر والوں کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ روزے سے ہے اگر وہ گھر میں ہوتا تو یوں ظاہر کرتا کہ دکان میں اس نے کچھ کھایا اور اگر دکان میں ہوتا تو یوں ظاہر کرتا کہ گھر پر اس نے کچھ کھایا ہے' بعدازاں حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا

"دراصل صالح نیت درکار ہے اس لئے کہ لوگوں کی نظر تو عمل پر ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ کی نظر نیت پر ہوتی ہے۔ اگر نیت خدا کے لئے ہو تو تھوڑا سا عمل بھی پسندیدہ ہوتا ہے۔

ایک اور مجلس میں اس مسئلے کو اور واشگاف انداز میں بیان کیا' آپ سے سوال کیا گیا کہ جو لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے'
آپ نے فرمایا

"آہستہ ذکر کرنا بہتر ہے' جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن پڑھتے تھے تو اس طرح پڑھتے تھے کہ کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں جب آیت سجدہ آتی وہ سجدہ کرتے تو اس وقت معلوم ہوتا کہ وہ قرآن پڑھ رہے تھے"

ہمارے ہاں مذہبی حلقے اور نمازی پرہیزگار لوگ گناہ گاروں سے نفرت کرتے اور اپنے آپ کو ان سے برتر گردانتے ہیں مگر صوفیا کی تعلیم یہ ہے کہ گناہ گاروں سے بھی نفرت نہ کرو اور کسی بھی شخص سے اپنے آپ کو افضل اور نیک نہ سمجھو' کیا معلوم گناہ گار کا خاتمہ بالخیر ہو اور تم آخری وقت میں بھٹک جاؤ' صوفیائے کرام کے نزدیک گناہ گار گناہ کرتے وقت بھی تین اعتبار سے اطاعت گزار ہی رہتا ہے اول یہ کہ وہ گناہ کرتے وقت جانتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں صحیح نہیں دوسرے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ اسے گناہ کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے اور اس کا اسے علم ہے تیسرے اسے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہوتی ہے اور یہ تینوں عقیدے اطاعت گزاروں ہی کا شیوہ ہیں'
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ارشادات میں اس موضوع پر بڑے دل پذیر انداز میں روشنی ڈالی ہے' آپ فرماتے ہیں۔

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا گیا کہ آدمی کب برا بنتا ہے'
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا جب وہ اپنے آپ کو اچھا سمجھنے لگے"

اس مناسبت سے آپ نے یہ حکایت بھی بیان کی فرمایا

"فرزدق نام کا ایک شاعر تھا' ایک دفعہ وہ اور خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ دونوں ایک جماعت میں اکٹھے تھے' اس جماعت میں سے ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا
"اس جماعت میں ایک بہترین آدمی اور ایک بدترین آدمی موجود ہے"

اسی وقت فرزدق خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے کہا کہ آپ نے سنا یہ شخص کیا کہتا ہے؟ خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کیا معلوم بہترین آدمی کون ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے'

فرزدق نے کہا "حضرت! بہترین آدمی آپ ہیں اور بدترین آدمی میں ہوں"

جب فرزدق نے وفات پائی تو اسے کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے اس کا حال پوچھا۔ فرزدق نے بتایا کہ جب مجھے داور محشر کے سامنے لے گئے تو میں ڈر رہا تھا مگر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمان ملا کہ ہم نے تمہیں اسی دن بخش دیا تھا جس دن تم نے اپنے آپ کو بدترین آدمی سمجھا تھا"

خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے ہی سے آپ نے ایک اور اہم مسئلے کی بھی وضاحت کی ہے۔ بعض اوقات ظاہر میں اہل مذہب کسی شخص کی ظاہری صورت پر حکم لگا بیٹھتے ہیں تحقیق حال کے بغیر محض شک وشبہ کی بنیاد پر اسے فاسق وفاجر گردانے لگتے ہیں مگر یہ اہل حق کا شیوہ نہیں، فرمایا۔

"حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کہا کرتے تھے، میں نے جب بھی کسی شخص کو دیکھا اسے ہمیشہ اپنے آپ سے بہتر تصور کیا، سوائے ایک روز کے جس کا بدلہ مجھے مل گیا، ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک حبشی کو دیکھا وہ دریا کے کنارے بیٹھا ہے اس کے پہلو میں ایک صراحی رکھی ہے اور وہ اس صراحی سے بار بار کوئی چیز انڈیل کر پیتا ہے (آپ نے سمجھا ہوگا یہ شخص شراب پی رہا ہے) اس کے پاس ہی ایک عورت بیٹھی ہے (آپ نے سمجھا ہوگا یہ شخص رنگ رلیاں منا رہا ہے) یہ دیکھ کر میرے دل میں خیال گزرا کہ میں اس شخص سے تو بہرحال بہتر ہوں، اسی وقت ایک کشتی دریا میں ڈوبنے لگی اس میں سات آدمی سوار تھے، یہ ساتوں کے ساتوں دریا میں ڈوبنے لگے، وہ حبشی فی الفور دریا میں کودا اور چھ آدمیوں کو باہر نکال لایا اس کے بعد اس نے میری طرف رخ کر کے کہا "اے حسن! اس ایک آدمی کو تم باہر نکالو، حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا، اس کے بعد اس حبشی نے مجھ سے کہا کہ اس صراحی میں پانی ہے اور یہ عورت جو میرے پاس بیٹھی ہے میری والدہ ہے، میں تیرا امتحان لینے کیلئے یہاں بیٹھا تھا، بس اب جاؤ تم مرد ظاہر بین ہو"

....

بعض لوگ گناہ گاروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا کسر شان سمجھتے ہیں مگر اس تکبر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی اپنی عاقبت خراب ہو جاتی ہے، اس سلسلے میں آپ نے یہ حکایت بیان فرمائی۔

"اس سے پہلے میں دہلی شہر میں رہتا تھا۔ ان دنوں شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے اصحاب میں سے چند صوفی حضرات آئے۔ ان میں میاں سعید قریشی، علی کھوکھری اور کچھ طالب علم بھی تھے۔ بڑی اچھی اور دلچسپ مجلس تھی، کھانا سامنے لایا گیا۔ سب کے سب بڑی رغبت سے کھانے لگے، میرے پڑوس میں ایک شخص شرف پیادہ نام کا رہتا تھا وہ بھی سامنے آ گیا اور ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا، یہ شرف پیادہ

(مجعد) تھا (مجعد اس شخص کو کہتے ہیں جو گھونگھریالے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں چھوڑے رکھتا ہے) جب یہ اندر آیا اور ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوا سعید قریشی اور بعض دوسروں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے ان کیلئے شرف پیادہ کے ساتھ کھانا کھانا دشوار ہو گیا۔ سعید قریشی تو اٹھ کر مجلس سے باہر چلے گئے۔ میں حیراں ہو گیا کہ آخر انہیں کیا ہوا کہ انہوں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا کہ اس بیزاری کا سبب کیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص بعد میں ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا اس کی وضع قطع غیر شرعی تھی۔ مجھے ہنسی آگئی کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ کھانا نہیں کھانا چاہئے اور پھر اس حد تک دوسرے کو ذلیل اور حقیر سمجھنا کیا معنی؟"

اس کے بعد فوائد الفواد کے مؤلف امیر حسن علاء سنجریؒ کہتے ہیں کہ میں نے سعید قریشی کے بارے میں اپنا مشاہدہ حضرتؒ کی خدمت میں بیان کیا (امیر حسن کے مشاہدے میں ان کی خلاف شرع باتیں آئی تھیں) اس پر آپ نے فرمایا

"ہاں! ٹھیک ہے یہی برائی چاہنے کی شامت تھی کہ وہ بعد میں خود ایسی باتوں میں مبتلا ہو گیا"

بعد ازاں آپ نے فرمایا کہ جس کو بھی دیکھو اسے اپنے آپ سے بہتر تصور کرو اگرچہ تم خود اطاعت و عبادت کرنے والے ہو اور دوسرا عاصی و گناہ گار ہو۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری یہ اطاعت آخری اطاعت ہو اور اس کے بعد تم سے گناہ سرزد ہو جائے اور دوسرے کی معصیت آخری معصیت ہو اور اس کے بعد اس سے اطاعت عمل میں آجائے۔

بعض لوگ مرنے کے بعد کسی جائے خاص میں مدفون ہونے کی تمنا رکھتے ہیں حالانکہ بعد دفن کام آنے والی چیز مرنے والے کے اعمال ہیں اس میں خاص جگہ اور مقام کا کوئی دخل نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ مکے مدینے میں دفن ہوتے ہیں لیکن اس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور بعض اپنی بستی میں دفن ہوتے ہیں لیکن ان سے معاملہ یوں ہوتا ہے جیسے وہ مکہ مدینہ میں مدفون ہوں۔ اس بات کو حضرت خواجہؒ نے ایک حکایت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"بدایوں میں ایک بزرگ تھے جنہیں سراج الدین ترمذی کہتے تھے۔ وہ اس عزم کے ساتھ مکہ معظمہ گئے کہ اگر وہاں انہیں موت آگئی تو وہیں دفن ہوں گے۔ جب وہ زیارت کعبہ کے لئے گئے اور اس سعادت سے سرفراز ہوئے تو واپس آگئے اور بدایوں میں آکر پھر آباد ہو گئے۔ لوگوں نے ان سے کہا "کیا آپ اس نیت سے

نہیں گئے تھے کہ آپ وہاں رہیں گے اور جب آپ کی وفات ہو گی تو وہیں دفن ہوں گے" آپ نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ہوا یہ کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ مختلف اطراف واکناف سے جنازے لائے جا رہے ہیں اور انہیں مکہ معظمہ میں دفن کیا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض مردے جو مکہ معظمہ میں دفن ہیں ان کو وہاں سے نکال کر لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ جو اس جگہ دفن کئے جانے کے اہل ہیں وہ خواہ کہیں دور دراز جگہوں میں وفات پائیں ان کیلئے حکم ہے کہ وہ یہاں لائے جائیں اور وہ لوگ جو اس مقام میں دفن کئے جانے کے لائق نہیں خواہ وہ یہاں مدفون ہوں ان کو دوسری اطراف میں لے جانے کا حکم ہے مولانا سراج الدین ترمذی نے کہا کہ جب مجھے اس امر کی تحقیق ہو گئی تو میں اس بناء پر بدایوں میں لوٹ آیا کہ اگر میں مکہ معظمہ میں دفن کئے جانے کے لائق ہوں گا تو یہاں بدایوں میں رہ کر بھی میری غرض پوری ہو جائے گی"

....

اب کے کالم کی تین قسطوں میں، میں نے حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے مختصر حالات زندگی آپ کی سیرت اور تعلیمات پر گفتگو کی ہے۔ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان بزرگان دین کے قول وعمل میں ہمارے لئے کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے علمائے کرام ان بزرگوں کے احوال بیان کرتے وقت زور ان کی کرامات بیان کرنے پر دیتے ہیں حالانکہ ان کی پاکیزہ زندگیوں کا اصل جوہر ان کا نمونۂ عمل اور ان کی روشن تعلیمات ہیں جنہیں اگر آج بھی نکھار اور نتھار کر پیش کیا جائے تو یہ ہمارے تمام روحانی امراض کے لئے نسخۂ شفا ثابت ہو سکتی ہیں۔ بزرگان دین کی حقیقی عقیدت چادریں چڑھانا اور ان کے مزاروں کو غسل دینا نہیں ان کی تعلیم وتلقین پر عمل کرنا ہے۔ خدا کرے کہ علمائے کرام اور محکمہ اوقاف کے کارپردازان اس سلسلے میں اپنے فرائض منصبی ادا کر سکیں۔

خواجہ اجمیرؒ ....زندگی اور تعلیمات

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ سیرت و کردار کے زور سے پھیلا ہے اور اگر اس کا کوئی روشن اور بین ثبوت درکار ہے تو ہندوستان میں اسلام پھیلنے کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجئے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔

برصغیر میں سب سے پہلے 93ء میں محمد ابن قاسم کے ذریعے اسلام آیا اور جب محمد ابن قاسم واپس گیا تو ہر چند کہ سندھ میں مسلمان موجود تھے لیکن ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اسلام کا کوئی خاص چرچا نہ ہو سکا تھا۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے یہاں کئی حملے کئے وہ بگولے کی طرح اٹھا اور آندھی کی طرح چھا گیا لیکن اس کی فتوحات کا اثر بھی زیادہ دیر تک ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکا۔

ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا سہرا تلوار کے نہیں بلکہ کردار کے سر ہے۔ سب سے پہلے حضرت شیخ اسماعیل بخاریؒ اور پھر حضرت گنج بخش ہجویریؒ ہندوستان تشریف لائے اور ان کے فیض قدم سے اسلام پنجاب اور اس کے گردونواح میں پھیل گیا لیکن جو علاقہ ہندوؤں کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کا مرکز تھا وہاں تک اسلام کے قدم پھر بھی نہیں پہنچ سکے۔ قدرت کو یہ کام ایک اور صاحب سیرت بزرگ ایک مرد متقی اور ایک پابند شریعت ولی اللہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ سے لینا تھا جن کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کے صنم کدہ میں توحید کی اذان بلند ہوئی۔

سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان حملوں میں بھی بعض بزرگان دین کی تائید کا عمل دخل تھا۔ حضرت مولانا جامی اپنی کتاب " نفحات الانس " میں لکھتے ہیں کہ جب سلطان نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس دور کے نامور بزرگ حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ کو القاء ہوا کہ وہ سلطان کی مدد کریں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جو دعائیں کی ہوں گی وہ تو کی ہی ہوں گی وہ ستر سالہ معمر بزرگ ہونے کے باوجود اپنے درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ خود بھی سلطان کے لشکر میں شامل ہو گئے اور یہاں آکر باقاعدہ شریک جہاد ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ ان حملوں سے کفر کی شان و شکوہ پر ضرب کاری لگ جائے تاکہ اسلام کی آمد آمد کا راستہ ہموار ہو سکے۔

سلطان غزنوی کے حملوں نے ہندوستان کی سرزمین کو تہ و بالا کر دیا اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے اسے روند کر رکھ دیا مگر ان حملوں کے نتیجے میں یہاں کے رہنے والوں کے دلوں کی دنیا زیر و زبر نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے اس سے مسلمانوں کے دشمن ہونے کا تاثر تو اور گہرا ہو گیا ہو مگر اس سے سینوں میں اسلام کی تخم ریزی نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا آفتاب ولایت طلوع ہوا اور اس کی کرنوں سے شرک کے اندھیرے چھٹنے لگے۔ دلوں کی کدورتیں صاف ہوئیں اور ان کی پاکیزہ سیرت اور حسین تعلیمات کے ذریعے تھوڑے ہی عرصے میں اسلام ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا اور یہ صرف ہماری ہی رائے نہیں مشہور غیر مسلم عالم سرتھامس آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب " دعوت اسلام " میں لکھا ہے کہ " برصغیر میں اسلام کی اشاعت سیاسی اقتدار رکھنے والوں سے نہیں بلکہ خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسے اولیائے کرام کے ذریعے ہوئی ہے "

....

حضرت خواجہؒ کے حالات زندگی کے بارے میں کوئی مستند ذریعہ معلومات موجود نہیں۔ تذکروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ باہم دگر اتنا متضاد اور متصادم ہے کہ تاریخ پیدائش سے لیکر تاریخ وفات تک میں مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی تاریخ کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ 530ھ یا 537ھ یا 541ھ میں سجستان میں پیدا ہوئے جو خراسان کا ایک حصہ تھا۔ اسی نسبت سے آپ کو " سنجری " بھی کہا جاتا ہے جسے بعض لوگوں نے " سنجری " بنا دیا حالانکہ سنجر ایک مختلف علاقے کا نام ہے۔ علامہ اقبال مرحوم سے بھی یہی غلطی ہوئی انہوں نے بھی اپنی مثنوی اسرار و رموز میں حضرت شیخ ہجویریؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے خواجہ اجمیریؒ کو " پیر سنجر " کہا ہے۔

سید ہجویر مخدوم امم
مرقدِ اُو پیر سنجر را حرم

پندرہ سال کی عمر تھی کہ آپ کے والد فوت ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ورثے میں ایک باغ اور ایک پن چکی ملی۔ اس پر ان کی گزر بسر ہو رہی تھی کہ اس دور کے ایک مرد بزرگ

حضرت شیخ ابراہیم قندوزیؒ ان کے باغ میں تشریف لائے اور ان سے ملاقات کی جس سے ان کے دل کی دنیا ہی یکسر تبدیل ہو گئی۔ آپ نے علم دین حاصل کرنے کی ٹھانی اور اس مقصد کیلئے سارا اثاثہ راہ خدا میں لٹا کر سمرقند و بخارا کی راہ لی کہ اس دور میں حصول علم کے یہی دو بڑے مراکز تھے۔ تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو آپ نے خواجہ عثمان ہارونیؒ کی شہرت سنی۔ حضرت خواجہ ہارونی رحمتہ اللہ علیہ اپنے وقت کے صوفی صافی اور شریعت و طریقت کے جامع بزرگ تھے۔ علاقہ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ اپنی زندگی کا بیشتر وقت سیاحت میں گزارا۔ ایک روایت کے مطابق التمش کے زمانے میں ہندوستان بھی تشریف لائے۔ مکہ مکرمہ میں انتقال فرمایا اور وہیں آپ کی قبر مبارک ہے۔ حضرت خواجہؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیض حاصل کرنے کیلئے ان کے پاس ہی قیام کیا۔ کئی سال وہیں رہے۔ تربیت حاصل کی اور اپنے مرشد سے خلافت حاصل کرنے کے بعد مکہ مکرمہ کا رخ کیا۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد روضہ رسولؐ پر حاضری دی تو خواب میں آپ کو بارگاہ سرور کائنات سے حکم ہوا کہ ہندوستان جائیں اور اجمیر میں قیام کر کے اسلام کی تبلیغ کریں۔ آپ واپسی پر مختلف ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے لاہور و ملتان سے گزرتے ہوئے بشارت کے مطابق اجمیر شریف تشریف لے گئے۔ دوران سفر آپ بغداد سے بھی گزرے بلکہ ایک روایت کے مطابق جب آپ اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ سے بیعت ہوئے ہیں تو وہ بغداد میں ہی قیام فرما تھے۔ بعض تذکروں میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت ان کی خدمت میں بیس سال یہیں مقیم رہے۔

اس زمانے میں حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے آپ کی ملاقات کی روایت بھی ملتی ہے مگر یہ کہاں تک صحیح ہے اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ لاہور میں حضرت گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر انوار پر آپ کی چلہ کشی روایات متواترہ سے ثابت ہے اور اس شعر کی نسبت بھی آپ کی طرف صحیح معلوم ہوتی ہے کہ۔

گنج بخش فیض عالم، مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را راہنما

حضرت خواجہؒ جس زمانے میں اجمیر تشریف لائے ہیں اس وقت ہندوستان میں اجمیر مشرکانہ خیالات اور سیاسی اقتدار کا مرکز تھا۔ یہاں ایک ایسا مندر تھا جس کی زیارت کے لئے ہندوستان کے طول و عرض سے یاتری آیا کرتے تھے اور یہاں اتنا چراغاں ہوتا تھا کہ ایک رات میں منوں تیل جل جاتا تھا۔ اجمیر پر پرتھوی راج حکومت کر رہا تھا جو ایک افسانوی اور رومانوی حیثیت سے ہندوستان کی پوری تاریخ میں مثالی شہرت رکھتا ہے۔ اسے اس دور کے تمام بہادر راجے مہاراجے اپنا ہیرو بنائے ہوئے تھے۔ سلطان شہاب الدین غوری تراوڑی کے میدان میں اس سے شکست کھا چکا تھا اور اب از سر نو حملہ آور ہو کر اس شکست کا بدلہ لینے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ظاہر ہے ان ہنگامی حالات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے چالیس درویشوں کے ہمراہ اجمیر پہنچے ہوں گے تو پرتھوی راج کے دل میں کیا کیا خیالات نہیں گزرے ہوں گے۔

اسے یہ بھی خیال آیا ہو گا کہ یہ مسلمان فقیر دشمن کے جاسوس ہیں جو اسے اور اس کی حکومت کو نقصان پہنچانے کیلئے آئے ہیں۔ ان حالات میں اجمیر میں حضرت خواجہؒ کا قیام اور نہ صرف قیام بلکہ تبلیغ اسلام موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے مترادف نہ تھا تو اور کیا تھا؟

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

ایک طرف سیاسی حیثیت سے آپ کے قیام اجمیر کی یہ اہمیت تھی تو دوسری طرف سماجی اعتبار سے اس کا وزن یہ تھا کہ جس زمانے میں آپ وارد ہندوستان ہوئے ہیں اس زمانے میں پورا ہندوستان اونچ نیچ کا شکار تھا سوسائٹی برہمن، کھشتری، ویش، اور شودر نام کے چار طبقوں میں بٹی ہوئی تھی ان سب میں شودروں کی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی ان بیچاروں کو یہاں تک حق نہ تھا کہ وہ اپنی مذہبی کتاب پڑھ سکتے یا اس کے اشلوک ہی سن سکتے اگر کبھی ان کے کانوں میں وید کے بول پڑ جاتے تو ان میں سزا کے طور پر پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا، ہندوؤں کے مشہور ماہر قانون منوجی نے اس شودر کو قتل کرنے یا غیر معین مدت کیلئے قید کرنے کی سزا تجویز کی تھی جو بھولے سے بھی برہمن کے پاس سے گزر کر اس کا دھرم بھرشٹ کرنے کا باعث بن جاتا، برہمنوں کے خود ساختہ قوانین کے باعث انسانوں کی بہت بڑی نسل مسلسل نفرت و حقارت کا شکار تھی اور اس کے مقابلے میں کتوں، بلیوں، سانپوں اور گائے بیلوں کو خدا بنا لیا گیا تھا ان کی پرستش کی جاتی تھی، ظالمانہ عدم مساوات کا یہ دور تھا جب حضرت خواجہؒ ظلمت کدہ ہند میں تشریف لائے
...... تو آپ نے بہت پیار اور محبت سے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو سینے سے لگایا صدیوں سے ظلم و ستم کے شکار شودروں اور مفلس و قلاش جذام زدہ انسانوں کو اپنے دستر خوان پر اپنے ساتھ بٹھایا غریب غرباء کو امراء اور رؤسا کے ساتھ اپنی مجلسوں میں یکساں عزت بخشی یہی ادائے دل نوازی تھی جس کی وجہ سے آپ خواجہ غریب نوازؒ کہلائے اور یہ نام ایسا مشہور ہوا کہ آج تک آپ کو "خواجہ غریب نوازؒ" کہا جاتا ہے۔

....

حضرت خواجہؒ اجمیر تشریف لائے تو راجہ ان کی کڑی نگرانی کرانے لگا وہ سن چکا تھا کہ دوران سفر اجمیر کے گرد و نواح میں بہت سے لوگ آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کر چکے ہیں اجمیر میں آمد کے بعد قبولیت اسلام کا یہ سلسلہ اور بڑھا راجہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ وہ براہ راست آپ سے متصادم نہ ہو لیکن ایک واقعہ نے اس کا پیمانہ صبر لبریز کر دیا اور وہ آپے سے باہر ہو گیا ہوا یہ کہ راجہ کے دربار کا ایک برخاست شدہ ملازم آپ کی خدمت میں آیا اور اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی کے ازالے کیلئے آپ کی امداد کا طالب ہوا آپ نے راجہ کو ایک رقعہ لکھا اور اس برطرف شدہ ملازم کی بحالی کی سفارش کی، راجہ نے اس رقعہ کو دیکھا تو اسے اپنے اختیارات میں مداخلت قرار دے کر حکم دیا کہ آپ تین دن کے اندر اندر اجمیر چھوڑ کر چلے جائیں، جب راجہ کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا تو آپ نے فرمایا تین دن کی مدت ہی کیا ہے جانے

والا چلا جائے گا بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا؟

ما اُو را زندہ گرفتار کردیم و لشکر اسلام را دادیم

ادھر آپ نے یہ ارشاد فرمایا ادھر اسی رات شہاب الدین غوری نے خواب میں ایک نورانی صورت بزرگ کو دیکھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ صبح ہوئی تو سلطان نے اپنے وزیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کو جمع کر کے انہیں یہ خواب سنا کر مشورہ طلب کیا سب نے اسے اشارہ غیبی قرار دیا چنانچہ غوری اسی وقت ڈیڑھ لاکھ فوج لے کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا پرتھوی راج تین لاکھ فوج کے ساتھ مقابلے کیلئے نکلا مگر شکست فاش کھائی اور حضرت خواجہؒ کی پیش گوئی کے مطابق لشکر اسلام کے ہاتھوں گرفتار اور پھر مقتول ہوا اس طرح تین دن کے اندر اندر جس کو اجمیر سے جانا تھا وہ اجمیر سے چلا گیا' سلطان غوری نے فتح یابی کے بعد آپ کی خدمت میں حاضری دی اور جب اس نے آپ کو دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ خواب میں حملہ کی ہدایت کرنے والے خود خواجہ اجمیر رحمتہ اللہ علیہ تھے۔

....

حضرت خواجہؒ غریب نواز کی تعلیمات کیا تھیں؟ اسے جاننے کیلئے آپ کے زمانے کا کوئی تحریری ریکارڈ دستیاب نہیں ہے دو تین کتابیں آپ کی طرف منسوب ہیں لیکن محققین نے آپ کی طرف اس نسبت کو صحیح تسلیم نہیں کیا "دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ" کے نام سے تقریباً ڈیڑھ سو غزلیات پر مشتمل ایک مجموعۂ کلام بھی مشہور ہے لیکن اہل محققین نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ دیوان آپ کا نہیں ہرات کے رہنے والے ایک بزرگ ملا معین کاشفی کا ہے اندریں حالات آپ کی تعلیمات پر کوئی جامع اور مبسوط کتاب تو موجود نہیں البتہ بعض دوسرے مستند تذکروں میں جستہ جستہ آپ کے جو فرمودات نقل ہوئے ہیں ان سے اس موضوع پر روشنی پڑتی ہے مثال کے طور پر فرمایا۔

"چار چیزیں نفیس گوہر ہیں ان کا برابر لحاظ رکھنا!

1: درویشی میں اظہار دولت مندی

2: بھوک میں اظہار سیری

3: غم میں اظہار مسرت

4: دشمن سے اظہار دوستی

ایک اور موقع پر فرمایا!

"بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلانا غرباء کی فریاد سننا اور حاجت روائی کرنا اور درماندوں کی دستگیری کرنا عذاب دوزخ سے بچنے کی بہترین تدابیر ہیں"

نیکی اور گناہ کا تصور آپ نے یہ دیا کہ گناہ اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل و خوار کرنا" آپ فرمایا کرتے تھے۔

"خدا کا دوست وہ ہے جس میں یہ تین وصف ہوں

1: دریا جیسی سخاوت

2: آفتاب جیسی شفقت

3: اور زمین جیسی عاجزی

ان تعلیمات پر آپ نے خود کس حد تک عمل کیا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اجمیر سے دلی تک کا پیدل سفر محض اس لئے اختیار کیا کہ آپ بادشاہ وقت سے ایک کسان کی سفارش کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جو اس وقت دلی کے بے تاج بادشاہ تھے یہ سنا تو آپ سے عرض کیا "حضرت! آپ نے اس کام کیلئے اتنی زحمت کیوں اٹھائی مجھے حکم بھیج دیتے میں اس کسان کا کام کرا دیتا"

"کیا تم نے آنحضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جو مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لئے چالیس قدم چلتا ہے اللہ تعالیٰ اسے چالیس سال کی عبادت کا ثواب عطا فرماتے ہیں کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس حدیث کا مصداق نہ بنتا؟"

....

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد جب سلطنت کا مرکز دہلی میں آ گیا تو آپ نے تبلیغ اسلام کے لئے اپنے خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دہلی میں متعین فرمایا سلطان شمس الدین التمش نے ان کی حلقہ بگوشی اختیار کی سارا دہلی آپ کی عقیدت کا دم بھرتا لیکن استغناء اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ جو تحائف اور ہدایا ان کی خدمت میں بھیجتا وہ انہیں لوٹا دیتے آپ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو دیکھ کر شیخ الاسلام نجم الدین اندر ہی اندر آپ سے جلنے لگے جب خواجہ اجمیر ایک غریب کسان کی سفارش کرنے دلی تشریف لائے تو شیخ الاسلام نے آپ سے حضرت خواجہ قطب الدین کی شکایت کی آپ نے یہ شکایت سنی تو اپنے خلیفہ سے فرمایا۔

"خواجہ تم میرے ساتھ چلو میں کھڑا رہوں گا اور تم بیٹھے رہو گے میں تمہاری خدمت کروں گا فقیر کے لئے جائز نہیں کہ کسی ایک دل کو بھی آزردہ کرے"

حضرت خواجہ قطب الدینؒ نے عرض کیا:

"حضرت! آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر آپ نے یہ کیا ارشاد فرمایا میں تو آپ کے سامنے کھڑا ہونے کے لائق نہیں چہ جائے کہ آپ میرے سامنے کھڑے ہوں اور میں بیٹھا رہوں"

یہ کہا اور مرشد کے ساتھ چل کھڑے ہوئے سلطان اور اہل دہلی کو خبر ہوئی کہ آپ دہلی چھوڑ کر جا رہے ہیں تو سلطان اور اہل دہلی ننگے پاؤں پیچھے پیچھے دوڑے چلے آئے تاکہ ان کو منت سماجت کر کے دہلی واپس

لے جائیں جب حضرت خواجہ اجمیریؒ نے بادشاہ اور عوام کا یہ حال دیکھا تو خواجہ قطب الدینؒ سے فرمایا
"اچھا خواجہ! جاؤ اتنے لوگوں کا دل دکھانا ٹھیک نہیں"

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بعد تبلیغ اسلام کی یہ مسند بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے سنبھال لی پھر ان کے بعد یہ بارِ گراں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مضبوط کندھوں نے اٹھالیا اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہا اور کفر کے ظلمت کدے میں اسلام کا نور پھیلتا گیا یہاں تک کہ یہ عالم ہو گیا کہ

آنجا که بود نعرۂ فریاد مشرکاں
اکنوں خروش نعرۂ اللہ اکبر است

اس طرح چند فقیران بے نوا نے دلوں سے صدیوں کا زنگ دور کر دیا انہیں تخت و تاج کی طلب تھی نہ دنیاوی جاہ و حشم کی وہ غریب نوازی اور خوئے دل نوازی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دلوں کو فتح کرتے چلے گئے اسلام تلوار سے نہیں انہی نفوس قدسیہ کے کردار سے پھیلا ہے اور آج بھی اگر اسلام پھیلے گا تو ایسے ہی بے لوث اور بے نفس اہل دل کے ذریعے پھیلے گا۔

شخصیات

امام انقلاب حضرت آیت اللہ خمینیؒ

آخر وہی ہوا جس کا دھڑ کا لگا ہوا تھا' آیت اللہ روح اللہ حضرت امام خمینیؒ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے اٹھ جانے سے ایران کو تو جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ محتاج بیان نہیں پورا عالم اسلام ایک ایسے انقلاب آفریں راہنما کی ایمان افروز اور حیات پرور راہنمائی سے محروم ہو گیا جس کے نعرہ ہائے مستانہ سے کفر کے ایوانوں میں زلزلہ برپا تھا۔ یہی نہیں ان کے جانے سے موجودہ دور کی پوری انسانی تاریخ میں ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جو بظاہر اب عرصہ دراز تک پُر نہیں ہو سکے گا۔

"فریڈ ہالی ڈے" مغربی دنیا کا ایک نامور دانشور ہے اور ایران پر اس کی کتاب "ڈکٹیٹر شپ اینڈ ڈیولپمنٹ" علمی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن تو اس وقت شائع ہوا تھا جب ایران میں انقلاب کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا مگر ابھی انقلاب کی آمد آمد میں کچھ دیر باقی تھی اس لئے اس میں تو وہ امام کی تاریخ ساز جدوجہد پر روشنی نہیں ڈال سکا لیکن بعد میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں اس نے "آفٹر ورڈز" (مابعد) کے زیر عنوان انقلاب ایران پر ایک مبسوط تبصرہ کیا ہے۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ یہ انقلاب تین جہتوں سے حالیہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

(1) انقلابی جدوجہد کے دوران اس تحریک کے زیر اہتمام جو مظاہرے ہوئے ان میں کئی مرتبہ بیس بیس لاکھ سے زیادہ افراد نے شرکت کی ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں آج تک دنیا کے کسی ملک میں مظاہرین کا اجتماع نہیں ہوا

(2) دنیا میں پہلی بار ایک ایسی فوج کو جو کسی بیرونی جارحیت سے ٹکرا کر کمزور نہیں ہوئی تھی اور شہنشاہ کے زیر کمان ہمیشہ سے تروتازہ تھی مسلسل اور منظم عوامی عمل نے شکست فاش دی۔

(3) یہ انقلاب ایک ایسے ملک میں برپا ہوا جو اپنے مسائل کے باوجود دنیا کے بہت سے ملکوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھا و گرنہ آج تک انقلابات جن ملکوں میں آئے ہیں وہ اتنے ترقی یافتہ نہ تھے۔ مثال کے طور پر روس 1917ء میں چین 1949ء میں ' ویت نام 1975ء میں اور کیوبا 1959ء میں اتنا ترقی یافتہ نہ تھا۔ ان سب ملکوں میں محنت کشوں کی بڑی تعداد آباد تھی مگر ایران کی آدھی آبادی شہری طبقات پر مشتمل ہے اور مزدوروں کی تعداد صرف تیس لاکھ ہے۔ ایک ایسے ملک میں انقلاب کی آمد نے وقت کے بہت سے رائج تصورات بدل کر رکھ دیئے ہیں۔

فریڈ ہالی ڈے کے اس تجزیئے کی روشنی میں اگر ہم نے یہ کہا ہے کہ امام کی رحلت سے موجودہ دور کی پوری تاریخ انسانی میں خلاء پیدا ہو گیا ہے تو یہ کوئی مبالغہ آمیز دعویٰ نہ تھا اس پر اپنے ہی نہیں انصاف پسند بیگانے بھی شاہد عادل ہیں۔

تہران سے دو سو میل دور جنوب مغرب میں ایک معمر خاتون بستر مرگ پر دراز ہے اس کے خاوند کو ایک مقامی جاگیردار حشمت الدولہ نے کرائے کے قاتلوں کے ذریعے قتل کرا دیا ہے ' کچے گھر میں فلاکت و افلاس نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں ' غریب بیوہ اپنے رفیق زندگی کے ظالمانہ قتل سے اتنی غمزدہ ہے کہ اس کے بعد اسے جینا بے معنی دکھائی دیتا ہے وہ کچھ عرصہ اپنے معصوم بچوں کی خاطر زندہ رہی مگر جتنا عرصہ زندہ رہی اندر ہی اندر گھلتی رہی۔ نزع کا عالم طاری ہونے کو ہے مگر اس کے دل میں ظلم و عدوان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اپنے بیٹوں کو آخری وصیت اس کی یہ ہے کہ "میں تو رخصت ہو رہی ہوں مگر ظلم کی طاقتوں سے اپنے باپ کا انتقام لینا نہ بھولنا۔"

یہ اس وقت کے روح اللہ اور بعد کے آیت اللہ روح اللہ کی والدہ محترمہ کا ذکر ہے۔ حضرت آیت اللہ 1900ء میں پیدا ہوئے آپ کے دادا حضرت سید احمد موسوی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی انہوں نے حصہ لیا تھا۔ انگریز دشمنی ان کا مسلک تھا اور فرنگی راج کے سائے میں برضا و رغبت رہنے کو وہ کفر سے تعبیر کرتے تھے جب دیکھا کہ اب گوراشاہی مستحکم ہو گئی ہے اور اس کے خلاف جدوجہد بے سود ہے تو

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

کے مصداق نجف اشرف چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں مقیم رہے اور اس کے بعد ایران میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے صاحبزادے کا نام مصطفیٰ موسوی تھا اور انہی کے سب سے چھوٹے فرزند حضرت روح اللہ آیت اللہ خمینی ہیں۔ روح اللہ آپ کا پیدائشی نام ہے آیت اللہ اپنے مذہبی منصب کی وجہ

سے آپ کا لقب خاص بے معلوم تھا کہ یہ نام اور خطاب اتنا الہامی ثابت ہو گا کہ غربت اور یتیمی میں پلنے والا یہ مرد قلندر ایک دن ایران کی مردہ قوم میں نئی روح پھونک دے گا اور ثابت کر دے گا کہ

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

....

امام خمینی کے والد ایک مقامی جاگیردار حشمت الدولہ کے ظلم و ستم کے بالمقابل ڈٹ گئے۔ یہ جاگیردار شہنشاہ ایران کے والد رضاخاں کا قریبی دوست تھا۔ رضاخاں بھی عجیب آدمی تھا ایک ان پڑھ اور گدھوں پر سواری کرنے والا شخص "کاسک رجمنٹ" میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا' سفارت خانوں پر اردلی کے فرائض سرانجام دیئے' شدہ شدہ کرنل بن گیا اور برطانوی حکومت کی مدد سے ایک دن اس نے قاچار حکمرانوں کا آخری چراغ گل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ظلم و ستم میں شہنشاہ کی طرح اس کا بھی جواب نہ تھا۔ ایران کے سادات کے ایک چشم و چراغ سید طباطبائی کی مدد سے یہ سربراہ حکومت بنا اور فرمانروا ہوتے ہی اسی پر پہلا وار کیا۔ یہ تو خیر ہوئی کہ طباطبائی ملک ہی سے فرار ہو گیا ورنہ اس کا حشر خدا جانے کتنا دردناک ہوتا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسی برطانیہ نے روس کے ساتھ مل کر کرنل رضا خان اور بعد کے رضا شاہ کو ایران ہی سے نکال دیا اور بے چارا جنوبی افریقہ میں ڈرین کے مقام پر کسمپرسی کے عالم میں اپنے انجام کو پہنچا۔ پہلی تدفین قاہرہ میں ہوئی ہیرے جواہرات بھی ساتھ مدفون ہوئے بعد میں بیٹا لاش کو نکال کر ایران میں مقبرہ بنانے کے لئے لایا۔ خود اسی کا کہنا ہے کہ مال و متاع تابوت سے غائب تھا اور غائب کرنے والے چور کا نام "شاہ فاروق" اللہ رے بادشاہوں کی حرص و ہوس۔ ایک مرا تو سونا چاندی سینے سے چمٹائے قبر میں جالیٹا اور دوسرے نے زراندوزی کی ٹھانی تو قبر میں بھی نقب لگانے سے نہیں چوکا۔ مشہور ہے کہ شہنشاہ ایران' تہران سے بھاگا تو باپ کی لاش دوبارہ نکال کر ساتھ لیتا گیا کہ کہیں بعد میں اس کی بے حرمتی نہ ہو۔ میرا اپنا ایک شعر ہے۔

وفور نشۂ طاقت میں جھومنے والو!
مری نظر میں ہیں تاریخ کے عروج و زوال

تاریخ کے عروج و زوال کی تفسیر پہلوی خاندان کے عروج و زوال سے زیادہ کہاں نظر آئے گی۔
تو جاگیردار حشمت الدولہ انہیں کرنل رضاخان کا دوست تھا ظاہر ہے جاگیردار پھر بادشاہ کا دوست' کریلا اور نیم چڑھا' اس نے ظلم پر کمر کس لی۔ حضرت خمینی کے والد جناب مصطفیٰ موسوی سے اس کی مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ اس کے کرایہ دار تھے وہ انہیں مکان سے نکالنا چاہتا تھا۔ مقدمہ اسی سلسلے میں دائر ہوا اور اسی کی طرف سے دائر ہوا تھا ابھی قانونی جنگ جاری تھی کہ ظلم کے اعصاب جواب دے گئے اس نے "شارٹ کٹ" اختیار کیا۔ اجرتی قاتلوں کے ذریعے جناب موسوی کو بیدردی سے

شہید کرادیا۔ حضرت آیت اللہ کی عمر اس وقت نو ماہ کی تھی کچھ ہی عرصہ بعد والدہ بھی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ ایک خالہ تھیں انہوں نے اپنے یتیم بھانجے کو تعلیم دلائی' ہائی سکول سے فراغت پا کر اسلامی علوم حاصل کئے اور پھر علوم اسلامی کے مشہور مرکز قم میں معلم مقرر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے مجاہدانہ خطبات اور عالمانہ وجاہت کا چرچا ہونے لگا جبر و استبداد کے خلاف آپ شمشیر برہنہ بن گئے۔ حکومت کی غیر اسلامی حرکات پر کھلم کھلا تنقید کرتے اور اپنے سلیس اور دل میں اتر جانے والے خطبوں سے جذبات میں آگ لگادیتے۔ یہاں تک کہ اصل معرکے کا وقت آ گیا۔ یہ 5 جون 1963ء کی بات ہے۔ محرم کے ایام تھے حضرت روح اللہ نے شہنشاہیت کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ نام لے کر کہا شہنشاہ اس دور کا یزید ہے حسینؓ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" امام بار گاہوں اور مسجدوں سے لوگ جلوس در جلوس "مرگ بر یزید" اور "مرگ بر شہنشاہ" کے نعرے لگاتے ہوئے گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے۔ اس کا موقع شہنشاہ کے "سفید انقلاب" نے فراہم کیا تھا جس کے تحت مذہبی املاک اور اوقاف کو حکومت نے اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ بڑھتی ہوئی عریانی اس کا دوسرا محرک خاص تھی۔ اگلی صبح حضرت روح اللہ قم میں گرفتار کر لئے گئے ان کی گرفتاری کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ تین دن تک تہران میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا' بپھرے ہوئے ہجوم نے سرکاری املاک کو نذر آتش کر دیا۔ شہنشاہ ایران کا سوانح نگار "جیراڈ ڈی ویلرز" اپنی مشہور کتاب "دی امپیریل شاہ" میں لکھتا ہے۔

"اس روز دس ہزار سے شروع ہو کر مجمع چالیس ہزار تک پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خمینی کی بڑی بڑی تصویریں تھیں' عوام نے ہر اس چیز کو آگ لگادی جو راہ میں نظر آئی ہر اس عورت پر خشت زنی کی جو بے پردہ تھی' پورے ایران میں کارکن' طلبہ اور دانشوروں سمیت عوام سڑکوں پر آ گئے اور حکومت کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جب لوگوں نے ریڈیو سٹیشن کی بلڈنگ کو بھی آگ لگانی چاہی تو حتمی طور پر امپیریل گارڈ کو حکم ملا کہ وہ ہر قیمت پر بغاوت کو کچل کر رکھ دے۔ ٹینک اور آرمڈ گاڑیاں سڑکوں پر آگ برسانے لگیں' لوگ خوفزدہ ہو کر تتر بتر ہو گئے مگر وہ بھاگے نہ تھے کسی اور جگہ دوبارہ جمع ہو رہے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ آج کا معرکہ شاہ کے دستوں نے سر کر لیا ہے تو انہوں نے مایوسی اور غیض و غضب کا شکار ہو کر ٹیلیفون بوتھوں' سٹوروں اور ہوٹلوں ہر چیز کو آگ لگا دی۔ پھر وہ بازار کی طرف مڑے اور پورا شہر آتش زنی کی وجہ سے دھوئیں سے بھر گیا ادھر مارشل لاء لگانے کا اعلان کر دیا گیا اور بے رحمی سے قتل عام شروع ہو گیا۔ ایک اخبار نے لکھا کہ سینکڑوں آدمی مارے گئے۔ اپوزیشن کا کہنا تھا کہ مرنے والوں کی تعداد نو ہزار تک ہے۔" (ص..... 241 طبع دوم)

عام خیال یہی ہے کہ ان دنوں شہنشاہ نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ حضرت روح اللہ کو پھانسی دے دی جائے مگر رکاوٹ یہ پیدا ہو گئی کہ قم میں پانچ "آیات اللہ" نے مل کر حضرت روح اللہ کو "آیت اللہ" بنانے کا اعلان کر دیا۔ ایران میں مسلمہ رواج یہی ہے کہ کسی آیت اللہ کو حکومت موت کی سزا نہیں دے سکتی۔
اب شہنشاہ کے پاس ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ آیت اللہ خمینی کو جلاوطن کر دے چنانچہ انہیں ملک بدر کر کے ترکی بھیج دیا گیا مگر وہاں وہ صرف ایک ہی سال رہے۔ ترکی کی حکومت خود ان سے خوفزدہ تھی' ترک طلبہ وہاں بھی ان کے حق میں مظاہرے کرنے لگے آخر کار ترک حکومت نے بھی لال جھنڈی دکھادی اور آپ نجف اشرف آگئے۔
یہاں کے تیرہ چودہ سال کے قیام میں بھی آپ آرام سے نہیں بیٹھے' آپ کے خطبے ٹیپ ہو ہو کر ایران پہنچتے رہے اور اندر ہی اندر آگ لگاتے رہے۔ اس پر ظلم کی طاقتوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلانے کا فیصلہ کیا یہ آپ کے (والد کے نام پر اور انہیں کی طرح) بڑے صاحب زادہ مصطفیٰ کے قتل کا فیصلہ تھا۔
شہنشاہ کی بدنام زمانہ خفیہ پولیس "ساوک" نے عین عالم شباب میں انہیں عراق میں قتل کرا دیا۔ باپ بھی ظلم کی بھینٹ چڑھے تھے ان ہی کے ہم نام بیٹے کو بھی آیت اللہ خمینی نے اسلام کی نذر کر دیا اور خود سیدالشہداءؑ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جناب علی اکبر کی شہادت کی طرح مصطفیٰ کی شہادت پر بھی شکوہ و شکایت کا لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

بنا کروند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

1978ء میں حالات نے ایک اور کروٹ بدلی' ایران کے ایک سرکاری اخبار نے حضرت آیت اللہ کی شان میں ایک توہین آمیز مضمون شائع کر دیا۔ لاوا پہلے ہی پک چکا تھا' ملک کے طول و عرض میں آگ لگ گئی۔ طلبہ سڑکوں پر نکل آئے ادھر عراق کی حکومت پہلے ہی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی وہ عراق کی شیعہ آبادی پر حضرت آیت اللہ کے بڑھتے ہوئے اثر کو خطرے کی گھنٹی سمجھ رہی تھی اس نے انہیں عراق سے بھی نکال دیا۔ وہ کویت جانا چاہتے تھے مگر ڈر کے مارے کویت کی حکومت نے بھی انہیں اپنے ہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی۔ ناچار وہ پیرس آگئے مگر پیرس کا قیام اللہ کی جانب سے ایک نعمت ثابت ہوا۔ یورپ کے قلب میں بیٹھ کر وہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کی توجہات کا مرکز بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا ان کے نام اور پیغام سے گونجنے لگی۔ یہاں بیٹھ کر آپ ایران میں انقلابی تحریک کی راہنمائی کرنے لگے۔ ان کے خطبوں کے ٹیپ پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں گھر گھر میں سنائی دینے لگے۔ پیرس ہی میں ایرانی راہنماؤں کی ایک اور کھیپ بھی آپ سے آملی۔ ادھر آپ پیرس سے دنیا بھر میں انقلاب کی آمد آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ ادھر ایران میں ہر حربہ آزمانے اور ہر تیر چلانے کے بعد ہزاروں انسانوں کو موت کی نیند سلا کر شہنشاہ

ایران، شاہ پور بختیار کو وزارت عظمیٰ پر بٹھا کر ایران سے رخت سفر باندھ رہا تھا۔ ملک اس نے اس سے پہلے مصدق کے زمانے میں بھی چھوڑا تھا، عوام کی رنجش کا مزا وہ پہلے بھی چکھ چکا تھا مگر اب کے بات ہی دوسری تھی۔

بار ہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
لیکن اب کے سر گرانی اور ہے

....

مغربی ذرائع ابلاغ نے خمینی کی عہد آفرینی کو ضرور مانا ہے مگر اسی کے ساتھ انہیں اس رنگ میں پیش کیا جیسے وہ ایک مذہبی دیوانے ہوں اور بس...... ہمارے ملک میں بھی نام نہاد ذہین طبقہ اسی پراپیگنڈہ سے متاثر ہے مگر جن لوگوں نے انقلاب ایران کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیرس میں بیٹھ کر امام نے وقتاً فوقتاً ایرانی عوام کے نام جو ہدایات جاری کی ہیں وہ ایک بالغ نظر مدبر اور گہرے تاریخی شعور سے مالا مال دانشور کے سوا کوئی اور جاری نہیں کر سکتا۔ آج یورپ اور امریکہ میں گاندھی جی کی تحریک عدم تشدد کا کتنا چرچا ہے ابھی تک مغربی یونیورسٹیوں میں اس پر داد تحسین و تحقیق دی جا رہی ہے مگر کیا کسی نے اس پر بھی غور کیا کہ ایرانی فوج کا مقابلہ کرنے کیلئے امام خمینی نے ایران کے عوام کو کیا ہدایات جاری کی تھیں، انہوں نے فرمایا تھا:

"تم اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دو، فوج تمہاری ہے وہ گولی مارے تو اس پر پھول مارو، اتنی قربانی دو اتنی قربانی دو کہ خود فوجی جوانوں کا ضمیر ملامت کرنے لگے تم ان کے "وجدان" سے اپیل کرو، تشدد کا جواب تشدد سے نہ دو"

اس دور میں اس فراست کا ثبوت کس نے دیا۔ بڑے بڑے نامور سیاست دان اس میدان میں چاروں شانے چت نظر آتے ہیں مگر قم اور نجف اشرف کی خانقاہوں کا یہ درویش اس رمزِ سیاست کو جانتا تھا۔ آخر کار اس کی پالیسی کامیاب ہوئی اور پھر چشم فلک نے عجیب نظارہ دیکھا جس ملک سے اسے پندرہ سال پہلے جلا وطن کر دیا گیا تھا اسی میں وہ فضا کے دوش پر اس شان و شوکت سے داخل ہوا کہ مسلم و غیر مسلم ہر ملک کا بڑے سے بڑا اخبار نویس و صدا کار اس کی آمد کی کوریج کرنے کے لئے اس کے ہمرکاب تھا اور ایران تھا کہ زبان حال سے پکار رہا تھا

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

ایران کا انقلاب 79ء میں برپا ہوا اس وقت سے لے کر حضرت امام کی وفات تک کا زمانہ ایک عشرے پر محیط ہے۔ اس دوران وہ اپنے شہرۂ آفاق نظریہ "ولایت فقیہ" کے تحت ایران کے اقتدار اعلیٰ پر فائز رہے مگر ان کی تمام تر کوششیں اپنی آمریت قائم کرنے کی بجائے جمہوری اداروں کی تشکیل اور استحکام پر مرکوز

رہیں۔ ان کے بدترین مخالف بھی یہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ انہوں نے کسی طور بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کی ان کا رہن سہن انتہائی سادہ تھا' بیت المال پر انہوں نے بوجھ نہیں ڈالا' اقرباء پروری نہیں کی' وہ چاہتے تو اپنی وصیت میں اپنے صاحب زادہ جناب احمد خمینی کو اپنا جانشین نامزد کر سکتے تھے مگر انہوں نے حضرت علی المرتضیٰؓ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے یہ کام منتخب جمہوری اداروں پر چھوڑ دیا اور خوشی کی بات ہے کہ یہ مسئلہ کوئی بدنما صورتحال پیدا ہوئے بغیر خیر و خوبی سے حل ہو گیا جناب علی خامنہ ای ان کے جانشین قرار پائے اور جناب رفسنجانی صدر منتخب ہو گئے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ جدید و قدیم کا یہ امتزاج ایران کے لئے نیک فال ثابت ہو گا اور یہ دونو قائدین ایک لمبے عرصے تک ملت اسلامیہ ایران کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔

امام خمینی کا ایک اور عہد ساز اقدام ان کا وہ فتویٰ ہے جو انہوں نے شیطان رشدی کے خلاف صادر کیا۔ اسلام آباد میں شیطانی کتاب کے خلاف مظاہرہ ہوا تو امام اس رات ٹیلی ویژن پر خبریں سن رہے تھے۔ سات شہداء کی قربانی نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا انہوں نے اسی وقت کتاب کے بارے میں رپورٹ طلب کی اور پھر اگلے ہی دن تمام مصلحتوں اور مداہنتوں سے بالاتر ہو کر اس گستاخِ رسول کے خلاف وہ فتویٰ جاری کیا جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا عالم اسلام میں ایک ایسی یکجہتی پیدا ہوئی اور شیعہ اور سنی یک جان ہو کر عشقِ رسولؐ کے پلیٹ فارم پر یوں متحد ہو گئے کہ چشمِ فلک نے یہ منظر صدیوں سے نہ دیکھا ہو گا۔ یورپی ملکوں نے ایران کا سفارتی بائیکاٹ کر دیا مگر وہ مردِ حق اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان رشدی پر آج زمین تنگ ہو گئی ہے وہ جیتے جی مر چکا ہے۔ گھر سے باہر کی تازہ ہوا سے محروم ہے اور وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا اور پوری دنیا اپنی آنکھوں سے گستاخ رسول کا عبرت ناک انجام دیکھے گی۔

امام خمینی کی رحلت کے بعد ایرانی قیادت پر بڑی بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے توفیق دے کہ مذہبی فرقہ واریت اور باہمی اختلافات سے بالاتر ہو کر وہ ایک طرف ایران میں اسلام کا نظامِ عدل قائم کر سکے اور دوسری طرف عالمِ اسلام کو متحد کرنے کے لئے عملی اقدامات انجام دے تصورِ پاکستان کے خالق اقبالؒ نے تو بڑی حسرت کے ساتھ احیائے اسلام کے لئے عرب سے بھی زیادہ عجم کو اپنی توقعات کا مرکز بنایا تھا۔ ہم پاکستانیوں سے زیادہ اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کی خوشی اور کس کو ہو گی۔ اقبال نے کہا تھا

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمہ شوقم ہنوز بے خبر است

کچھ صدر غلام اسحاق کے بارے میں

میں نے صدر مملکت غلام اسحاق خان کو پہلی مرتبہ دسمبر 71ء کے آخری عشرے میں دیکھا وہ ان دنوں کیبنٹ سیکرٹری تھے' بھٹو صاحب نے چند ہی دنوں میں جناب وقار احمد کو کیبنٹ سیکرٹری بنا دیا اور خاں صاحب سٹیٹ بینک کے گورنر بن گئے' اپنی اس حیثیت میں بھی دو چار بار وہ کابینہ کے اجلاس میں شریک ہوئے ہوں گے مگر اس کا کوئی نقش میرے ذہن میں موجود نہیں البتہ جب وہ سیکرٹری جنرل ڈیفنس کے عہدے پر فائز ہوئے تو اکثرو بیشتر انہیں کابینہ کے اجلاس میں دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا' میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ اس آدمی کو اپنے کام سے غرض ہے نہ یہ پی آر کرتا ہے نہ دربار داری' کم آمیزی کا عالم یہ تھا کہ اسلام آباد میں رہتے ہوئے جہاں کا رہنے والا ہر بڑا افسر اسلام آباد کلب کا ممبر تھا انہیں کبھی کلب میں نہیں دیکھا (صدر بننے تک خاں صاحب کسی بھی کلب کے کبھی ممبر نہیں بنے) جب بھی کابینہ کے اجلاس میں ان کا کوئی آئٹم ایجنڈے پر ہوتا ان کی بحث سننے کے قابل ہوتی مسئلے کے جملہ پہلوان کی نظر میں ہوتے اور وہ اسے اس طرح پیش کرتے جیسے کوئی لائق وکیل عدالت میں اپنے دلائل پیش کرتا ہے مجھے کئی دفعہ محسوس ہوا کہ بھٹو صاحب کو ان کا غیر لچکدار رویہ پسند نہیں آرہا مگر خان صاحب اس کی پروا کئے بغیر اپنے موقف پر قائم رہتے پیپلز پارٹی کی حکومت کے آخری ایام میں سیکرٹری جنرل ڈیفنس ہونے کی وجہ سے قدرتا ان کا رابطہ جرنیلوں سے رہتا تھا۔ یہیں سے اس افواہ نے جنم لیا کہ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو بھٹو مرحوم کے اس فیصلے سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان کی جگہ کسی اور کو کمانڈر انچیف بنانا چاہتے ہیں۔ میں

نے اپنی کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں اس افواہ پر جو تبصرہ کیا ہے نامناسب نہ ہو گا اگر قارئین کا حافظہ تازہ کرنے کیلئے اسے ذیل میں بھی درج کر دیا جائے، میں نے لکھا تھا

"ایک سوال عوامی حلقوں میں یہ بھی زیر بحث رہتا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ بھٹو صاحب جنرل ضیاء الحق کو ہٹانے والے تھے انہوں نے ڈیفنس کے سیکرٹری جنرل غلام اسحاق خان سے بات کی تو انہوں نے آگے جنرل ضیاء الحق کو بتا دیا وہ الرٹ ہو گئے اور انہوں نے بھٹو صاحب کے وار سے پہلے خود ان پر وار کر دیا، اسی صلے میں غلام اسحاق خان کو مارشل لاء کے دور میں یہ اہمیت ملی کہ وہ سینئر منسٹر بن گئے اور اب تک جنرل ضیاء الحق کے نفس ناطقہ چلے آتے ہیں۔

جہاں تک جنرل ضیاء الحق کو ہٹانے کا تعلق ہے۔ بھٹو صاحب یقیناً یہ فیصلہ کر چکے تھے اس کا اشارہ وہ جنرل عبداللہ ملک کو بھی دے چکے تھے بلکہ بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جنرل عبداللہ ملک ہی کو جنرل ضیاء الحق کی جگہ مقرر کرنے والے تھے اور اس کیلئے وہ مناسب موقع کے منتظر تھے سیاسی تصفیہ ہو جاتا اور ملک میں امن وامان قائم ہو جاتا اقتدار پر ان کی کامل گرفت ہو جاتی تو تب وہ یہ اقدام کرتے مگر ابھی تو وہ مرحلہ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ذکر وہ کسی سے کرتے رازداری اور دل کی بات دل میں رکھنے کا انہیں حیرت انگیز ملکہ تھا اور پھر اگر وہ یہ بات کرتے بھی تو ٹکا خان سے تو کر سکتے تھے غلام اسحاق خان سے تو کسی صورت میں ایسی راز کی بات نہ کرتے۔

غلام اسحاق خان سے۔ بھٹو صاحب کی کبھی نہیں بنی مجھے وہ اجلاس یاد ہے جس میں (ریاست) دیر کے لوگوں کے خلاف آرمی ایکشن پر غور وخوض ہوا صوبوں کے گورنر بھی تھے اور کابینہ کے ارکین بھی، جنرل فضل حق علاقے کے کور کمانڈر تھے اس وقت بھی دبنگ آدمی تھے۔ انہوں نے بریفنگ دی، سب نے باری باری اظہار خیال کیا، غلام اسحاق خان کی باری آئی تو انہوں نے کہا "میں اس سے اتفاق نہیں کرتا آرمی ایکشن غلط ہے یہ صورتحال سول حکام کی مس ہینڈلنگ کا نتیجہ ہے، جنگلات کی کمائی پر ہی دیر کے عوام کی زندگی کا انحصار تھا آپ نے ان سے یہ حقوق چھین لئے وہ یہ بتانے کیلئے لانگ مارچ کرنا چاہتے تھے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کشمیر میں قربانیاں دی تھیں اب یہ پاکستان سے کس طرح ایسے منحرف ہو سکتے ہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں"

بھٹو صاحب کو حکومت کے ایک سیکرٹری کی طرف سے کھلم کھلا اس طرح کا اختلاف اچھا نہ لگا انہوں نے کہا

"جو لوگ حکومت کی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے وہ حکومت میں نہ رہیں" اگلے دن یہ خبر گرم تھی کہ غلام اسحاق خان استعفیٰ دے رہے ہیں پرائم منسٹر نے انہیں بلایا اور کہا

"میں آپ کی قدر کرتا ہوں مگر میں جرنیلوں کی موجودگی میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ کہیں یہ حکومت اور فوج کی غلطی ہے آپ استعفیٰ نہ دیں کل پریڈ ہے آپ میرے ساتھ ہیلی کاپٹر میں کاکول چلیں تاکہ کل کا تاثر ختم ہو جائے" اسی طرح کا ایک واقعہ 1977ء کے الیکشن کے بعد ہوا بھٹو صاحب نے آرمڈ فورسز کے سربراہوں سے اپنے حق میں ایک مشترکہ بیان جاری کرایا جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ہم حکومت کے ساتھ ہیں نیز یہ بھی کہا تھا کہ الیکشن فیئر ہوئے ہیں' جنرل ضیاءالحق یہ بیان جاری کرنے کے بعد غلام اسحاق خان سے کسی کام کے سلسلے میں ملے تو خان صاحب نے ان سے کہا

"آپ سے یہ بیان جاری کرنے کو کس نے کہا تھا"

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" جنرل ضیاء بولے

"یہ تو صحیح ہے کہ آپ حکومت کے ساتھ ہیں" غلام اسحاق خان نے کہا مگر آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ الیکشن فیئر ہوئے ہیں؟ یہ سرٹیفکیٹ آپ نے کس تحقیقات کے نتیجے میں جاری کیا؟"

اب معلوم نہیں جہاں خان صاحب بات کر رہے تھے وہاں ایسے آلات لگے ہوئے تھے یا کسی اور ذریعے سے. بھٹو صاحب کو اس کی اطلاع مل گئی وہ خان صاحب کی اس صاف بیانی پر بہت برہم ہوئے جس سیکرٹری سے. بھٹو صاحب کے اس طرح کے تعلقات ہوں اس کو اعتماد میں لے کر وہ جنرل ضیاء کو ہٹانے کا راز کیسے بتا سکتے تھے؟"

....

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد خان صاحب سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا

راہ میں ہم ملیں کہاں

بزم میں وہ بلائے کیوں

77ء سے 80ء تک کے طویل دور میں صرف دو دفعہ ان سے سامنا ہوا شروع کے زمانے میں شاید جنرل ضیاءالحق میں اعتماد کی کچھ کمی تھی یا وہ ان دنوں مشوروں کی کچھ زیادہ ضرورت محسوس کرتے تھے جب بھی وہ سیاست دانوں سے ملتے اپنے یمین و یسار موقع اور موضوع کی مناسبت سے ایک دو رفقائے کار کو ضرور بٹھا لیتے' ایک ایسی ہی میٹنگ میں صدر ضیاءالحق نے مجھ سے ملتے ہوئے جنرل عارف اور خان صاحب کو بھی

اپنے پاس بٹھا رکھا تھا' ظاہر ہے بات چیت تو صرف جنرل صاحب اور میرے درمیان ہوئی یہ اصحاب صرف زحمت سماعت ہی برداشت کرتے رہے مگر اس سے اندازہ ہوا کہ سویلین وزراء میں خان صاحب ان کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ دوسرا موقع اس وقت نکلا جب وہ وزیر خزانہ تھے اور میں انکم ٹیکس والوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھا ہوا یہ کہ مارشل لاء لگنے کے بعد اوپر کے اشارے سے محکمہ نے بھٹو صاحب کے قریبی ساتھیوں کے پہلے سے طے شدہ انکم ٹیکس کے کیس بھی پھر سے کھول لئے' بینک سے میرے پانچ سال کے اکاؤنٹس منگا لئے گئے اور ان میں سے ہر اس چیک کی جانچ پڑتال کی گئی جو پانچ ہزار یا اس سے زیادہ رقم کا تھا خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس ہر چیک کے جواز کا مکمل ثبوت تھا اس لئے اس میں تو محکمے کو منہ کی کھانی پڑی لیکن چونکہ بدقسمتی سے ہر دور میں محکمہ انکم ٹیکس کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہے اس لئے اسے اس معاملے میں بھی کچھ نہ کچھ کارگزاری دکھانا تو لازمی تھا راولپنڈی میں ان دنوں کوئی محمد داؤد خان صاحب انکم ٹیکس آفیسر تھے ان کے لئے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا یہ ایک نادر موقع تھا اور تو وہ کچھ نہ کر سکتے تھے کہ قانون کے مطابق اس کی گنجائش نہ تھی انہوں نے میرے زمانہ وزارت میں میرے گھر کے ٹیلیفون' بجلی' سوئی گیس اور کار کے پٹرول کے بلوں کو میری تنخواہ میں شامل کر کے پہلے تو انہیں آمدنی شمار کیا اور بعد میں ڈٹ کر انکم ٹیکس لگا دیا' یہ کھلم کھلا ایک انتقامی کارروائی تھی اس لئے مجبوراً میں نے وزیر خزانہ غلام اسحاق خان سے مل کر انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ سب کچھ ملاء اعلیٰ کے اشارے پر ہو رہا ہے مگر چونکہ یہ سارا کھیل قواعد کے مطابق نہ تھا اس لئے انہوں نے سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے چیئرمین (مسٹر این ایم قریشی) کو فون کر کے اس لاقانونیت کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی' خیر بعد میں میں نے اپیل کی اور فیصلہ میرے حق میں ہو گیا لیکن خان صاحب کے مزاج کا یہ پہلو کھل کر میرے سامنے آ گیا کہ وہ قانون کی پابندی ہر حال میں مقدم سمجھتے ہیں اور ایسا کرتے وقت یہ دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ اس سے کون خوش ہو گا اور کون ناخوش؟

....

خان صاحب اصلاً بیوروکریٹ تھے اور ایک آئیڈیل بیوروکریٹ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔ سینٹ کا چیئرمین بننے کے بعد انہوں نے جس انداز سے یہ ایوان چلایا اس سے یوں لگا جیسے ان کی پوری عمر ہی پارلیمینٹ کے خارزاروں میں گزری ہے میں مارچ 88ء میں سینٹ سے ریٹائر ہوا تو از راہ شفقت و خورد نوازی جناب چیئرمین اور اراکین نے اس موقع پر میری حقیر کارکردگی پر بڑے اچھے جذبات و احساسات کا اظہار کیا' اس موقع پر میں نے جو کچھ کہا اسے دہرا دینا یہاں بے محل نہ ہو گا' میں نے عرض کیا کہ

"میں 70ء میں قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا پھر 77ء میں اور اس زمانے میں چودھری فضل الہٰی جیسے منجھے ہوئے پارلیمینٹرین سپیکر کے فرائض انجام دیتے رہے

ہیں مگر مجھے یہ کہنے میں باک محسوس نہیں ہوتا کہ سینٹ میں چیئرمین غلام اسحاق خان کی زیر سرکردگی کام کرتے ہوئے جو لطف میں نے محسوس کیا اور جتنا کچھ سیکھا وہ اپنی مثال ہے خان صاحب نے اس ایوان کو جس محنت ' قابلیت اور دیانت سے چلایا ہے وہ ہماری پارلیمانی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے" میں نے سینٹ میں خان صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا واقعہ یہ ہے کہ نہ اس میں کوئی مبالغہ آمیزی تھی اور نہ کوئی رنگ آمیزی ' آپ سینٹ کا مطبوعہ ریکارڈ دیکھ لیں تحاریک التوا و استحقاق پر ان کے فیصلے اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کی بعض رولنگ تو ایک ایک گھنٹے کے دورانیئے پر محیط ہیں اور یہ اس قابل ہیں کہ دنیا بھر کی پارلیمانوں میں انہیں بطور سند پیش کیا جا سکتا ہے انہوں نے ہم اپوزیشن کے اراکین کی خواہشات کے خلاف حکومت کی سائڈ بھی لی تو اس خوبصورتی سے کہ ان کے دلائل پر ہزار کوشش کے باوجود حرف گیری نہیں کی جا سکتی ' ہم بہت کوشش کرتے کہ ان کے جذبات سے اپیل کریں انہیں یہ باور کرائیں کہ اس طرح کا کوئی فیصلہ دینے سے وہ تاریخ بنائیں گے لیکن وہ جذباتیت سے بالاتر ہو کر صرف دلائل و قواعد کی بنیاد پر اپنے فیصلے صادر کرتے ایک ایسے ہی موقع پر 12 فروری 86ء کو جب میں نے انہیں اپنی ایک تحریک استحقاق منظور کرنے کے لئے جذباتی اپیل کی اور کہا کہ آپ اس پر پریویلج موشن کو ایڈمٹ کر کے تاریخ بنائیں تو انہوں نے کہا (اور اس جواب سے آنے والے حالات کیلئے بھی ان کے طریق کار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے) کہ

"میں ایک عرض کر دوں میں تاریخ بنانے کا قائل نہیں ہوں اور نہ جذباتی ردعمل ظاہر کرتا ہوں ' اگر آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ استحقاق مجروح ہوا ہے "تو چشم ماروشن دل ماشاد" میں ضرور قبول کروں گا لیکن اگر نہیں ہوتا تو پھر میری مجبوری ہو گی کیونکہ قانون اور رولز کچھ اور کہتے ہیں"

کبھی کبھی وہ سینئر وزراء کی کھچائی بھی کر دیتے اور ایسا کرتے وقت اپنے تجربات کی روشنی میں بین السطور بعض نہایت اہم باتیں کہہ جاتے 10 فروری 86ء کے اجلاس میں میں نے ایک تحریک التواء پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ "حکومت نے ستر افراد کی جن میں بیشتر سیاسی لیڈر تھے ' ایک فہرست بنا رکھی ہے جسے "ایگزٹ کنٹرول لسٹ" کہتے ہیں اس فہرست میں شامل افراد کو ایئرپورٹ پر ہی بیرون ملک سفر کرنے سے روک دیا جاتا ہے مارشل لاء اٹھ جانے کے بعد بھی جب کہ بنیادی حقوق بحال ہو۔

چکے ہیں یہ پریکٹس جاری ہے، جو آئین کی کھلی خلاف ورزی ہے لہٰذا ایوان کی کارروائی روک کر اس پر بحث کی جائے" ان دنوں وزیر داخلہ جناب محمد اسلم خٹک تھے انہوں نے اپنے روایتی انداز میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اس طرح کی فہرست موجود تو ضرور ہے مگر یہ صوبائی حکومتیں بناتی ہیں جب ان کے خیال میں کسی فرد کا بیرون ملک جانا ملک کے مفاد میں نہیں ہوتا تو وہ اس کی اطلاع مرکزی حکومت کو دیتی ہیں اور مرکزی حکومت اس سلسلے میں متعلقہ محکموں کو ضروری ہدایات جاری کر دیتی ہے۔
وزیر داخلہ صاحب نے بحث کے دوران اپنا ایک پر لطف ذاتی واقعہ بھی بیان کیا' انہوں نے کہا

> "جناب والا ایک واقعہ سنانے کی مجھے بھی اجازت دیں میری بیوی امریکہ جا رہی تھی میں سابق گورنر تھا اسے کراچی ایئرپورٹ پر اتار لیا گیا کیونکہ وہ اس لسٹ میں شامل تھیں معلوم نہیں مجھے اور میری بیوی کو کس نے اس لسٹ میں ڈالا بہرصورت میں نے احتجاج کیا کہ ہم نے کون سا جرم کیا ہے کہ ہمیں اس لسٹ میں شامل کر دیا گیا ہے اس کے بعد روئداد خاں صاحب نے جو سیکرٹری داخلہ تھے اقدامات کئے اور خدا خدا کر کے میری بیوی کو جانے کی اجازت ملی"

اس پر ہمارے موجودہ صدر مملکت نے جو ریمارکس دیئے وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں اور ان سے ان کے دور حکومت کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا

> "اسی سے سبق لینا چاہئے' اپنے وقت میں جو آپ کریں گے وہی ہتھیار پھر دوسرے آپ کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں"

....

خان صاحب بہت سنجیدہ اور باوقار شخصیت ہیں اور طبعاً خاموشی پسند بھی' اس لئے اکثر لوگوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ وہ سخت خشک مزاج آدمی ہیں' اسی طرح کا تاثر بہاولپور کے مشہور صحافی علامہ منظور احمد رحمت کو بھی ہوا اور انہوں نے برملا اسے اپنے ہفت روزہ "مدینہ" میں شائع کر دیا یہاں یہ لکھنا اعتراف حقیقت کے مترادف ہو گا کہ علامہ صاحب ہماری علاقائی صحافت کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں کہ اگر وہ کسی مرکزی شہر کے کسی بڑے اخبار سے منسلک ہوتے تو ان کے قلم کے کاٹ کی وجہ سے بڑے بڑے نامور کالم نگاروں کا چراغ ان کے سامنے گل ہو جاتا) کالم دلچسپ تھا اور مجھے یقین تھا کہ چیئرمین صاحب کی نظر سے نہ گزرا ہو گا تفنن طبع کیلئے میں نے اس کا تراشہ ان کی خدمت میں ارسال کر دیا' اس پر ان کا جو گرامی نامہ موصول ہوا جہاں وہ ایک ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے وہاں اس سے خاں صاحب کی گرمی طبیعت

شوخیِ مزاج اور ذوقِ شعر و سخن پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے' خاں صاحب نے لکھا'

"جناب مولانا صاحب! اسلام علیکم "مدینہ" بہاولپور کے ایڈیٹر کی تحریر میں جس جرم کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک آدھ مرتبہ میں پہلے بھی مرتکب گردانا جا چکا ہوں اس لئے مجھے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی شوریٰ کے ایام تھے اور ایوان میں بجٹ پر بحث ہو رہی تھی اکثر حضرات بجٹ میں ردوبدل اور ٹیکسوں میں چھوٹ کا مطالبہ کر رہے تھے' ساتھ ہی میری "(سخت طبعی) اور (غیر تغیّر پذیری) کو ہدفِ تنقید بنائے ہوئے تھے ایک خاتون ممبر کی جب باری آئی تو انہوں نے بھی وہی راگ الاپنا شروع کر دیا اور تقریر ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وزیرِ خزانہ اگر ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تو نہ سہی جواب تو کم از کم مسکرا کر دے سکتے ہیں اور پھر ایوان سے سوال کیا کہ کیا آپ میں سے کسی نے ان کو مسکراتے دیکھا ہے؟ جواباً میں نے عرض کیا کہ بجٹ ایک فلاسفی اور ایک سٹریٹیجی کے تحت ترتیب دیا جاتا ہے اور اس میں غیر معمولی ردوبدل اصولوں سے سمجھوتے کے مترادف ہوتا ہے جس سے میں قاصر ہوں البتہ جہاں تک مسکرانے کا سوال ہے تو محترمہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا کہ

تو ہم بہ عشوہ گری کوش و دلبری آموز

اگر زما غزلِ عاشقانہ می خواہی!

اس کا ایوان پر جو اثر ہوا سو ہوا لیکن اس کے بعد محترمہ نے "نہ مسکرانے" کی شکایت نہ کی مگر ظاہر ہے "مدینہ" کے ایڈیٹر کو تو یہ جواب نہیں دیا جا سکتا لہٰذا جرم کا اعتراف ہی کرنا پڑے گا"

خاں صاحب کی ضرورت سے زیادہ سنجیدگیٔ طبع کا تاثر وہ لوگ لیتے ہیں جو ان کی محفلوں میں نہیں بیٹھے یہ لوگ اگر سینٹ کے اجلاسوں کی کارروائی ہی دیکھ لیتے تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ خاں صاحب کا ظاہر اخروٹ اور بادام کا چھلکا ہے جس کے اندر مغز اس سے قطعاً مختلف ہے میں یہاں سینٹ کے اجلاسوں کی دو چار مثالیں پیش کر کے توضیحِ مدعا چاہوں گا۔

خاں صاحب یوں تو اردو اور فارسی کے لٹریچر پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کا شعری و ادبی ذوق قابلِ رشک ہے مگر پٹھان ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی تذکیر و تانیث میں ان سے بھول چوک بھی ہو جاتی ہے ایک ایسے ہی موقع پر انہوں نے فرمایا

"ابھی میرا خیال ہے کہ اذان بھی ہونے والا ہے اور ایڈجرنمنٹ موشن کے لئے وقت پھر نہیں ہو گا"

اس پر میں نے اٹھ کر (ازراہ شرارت) کہا

"جناب والا! اذان ہونے والی ہے 'اذان مؤنث ہے"

اس پر ایوان میں جو مکالمہ ہوا وہ یہ تھا

جناب چیئرمین .... اذان پشتو میں مذکر ہے اور باقی دنیا میں پتہ نہیں مؤنث ہے یا مذکر ہے۔

کوثر نیازی .... آپ پٹھان کی حیثیت سے نہیں بول رہے' چیئرمین کی حیثیت سے بول رہے ہیں۔

جناب چیئرمین .... مگر پشتو میں بھی اذان کو اذان کہتے ہیں اور اذان اس میں مذکر ہے

میر نبی بخش زہری .... جناب یہ مذکر اور مؤنث کا الفاظ (نقل مطابق اصل) پٹھان اور بلوچ واقعی نہیں جانتے' ہمارے لئے ایک جیسا ہے۔

جناب چیئرمین .... ابھی چونکہ ایک منٹ ہے میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں ایک مولانا صاحب سے کسی نے پوچھا کہ مولانا صاحب نماز ادا کرتے وقت ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں' سینے پر یا ناف پر' انہوں نے کہا اگر ماں نے نماز پر کھڑا کیا ہے تو سینے پر باندھو اور اگر باپ نے کھڑا کیا ہے تو ناف پر باندھو۔ تو اذان اگر مرد دے رہا ہے تو مذکر ہے اور اگر عورت دے رہی ہے تو مؤنث۔"

ایک دوسرے موقع پر میں نے سینٹ کے اردو ترجمہ کے معیار پر نکتہ اعتراض اٹھایا میں نے عرض کیا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ یہاں ترجمے کا معیار بہت پست ہے لیکن اب تو شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آپ کے سیکرٹریٹ کی طرف سے جو اطلاع نامے اور مراسلے اجلاس کے سلسلے میں آتے ہیں ان میں اردو زبان کا جھٹکا کیا جارہا ہے ایک تازہ ترین مراسلہ میں جس میں ڈپٹی چیئرمین کے انتخاب کی اطلاع دی گئی ہے فرمایا گیا ہے کہ مخدوم صاحب گورنر پنجاب مقرر ہو گئے ہیں اور انہوں نے نئے عہدے کو 30 دسمبر سے سنبھال لیا ہے' "نئے عہدے کو سنبھال لیا" کہنا ایسے ہے جیسے وہ گر رہا تھا اور نیچے سے جا کر انہوں نے سنبھالا دیا اس کے بعد اور بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ فرماتے ہیں وہ سینٹ کے رکن نہیں رہے لہٰذا دستور کی دفعہ نمبر 103 کے تحت سینٹ میں ان کی نشست بشمولہ عہدہ بطور ڈپٹی چیئرمین خالی ہو چکا ہے۔ اس مرحلے پر میں نے پھر مزا لینے کیلئے جناب چیئرمین کو چھیڑا اور کہا

"اب یہ پتہ نہیں یہ آپ کا فیض صحبت ہے یا سیکرٹری صاحب کا کہ نشست بھی سینٹ میں خالی نہیں ہوتی خالی ہوتا ہے"

کوئی اور ہوتا تو اس چوٹ پر برامان جاتا مگر خان صاحب کی بذلہ سنجی بے مثال ہے انہوں نے ایک دوسرے

رخ سے بات کر کے مجھے لاجواب کر دیا' فرمایا

"جہاں تک اردو کے ترجمے کا تعلق ہے اس میں واقعی کمزوریاں اور خامیاں ہیں کوشش کے باوجود ہمیں ایسے آدمی میسر نہیں آئے جو کماحقہ اردو ترجمہ کر سکیں مگر جہاں تک مذکر اور مؤنث کا تعلق ہے مولانا کوثر نیازی کا ارشاد بجا میں نے پچھلی مرتبہ بھی ان کی خدمت میں اردو اور پشتو کا موازنہ پیش کیا تھا کہ کس زبان میں کیا مذکر ہے اور کیا مؤنث آج میں ان کو ایک اور مثال دوں گا کتاب عربی میں مذکر ہے اور اردو میں مؤنث' اب ایک طرف ہم قوم کو عربی اور دوسری طرف اردو سکھاتے ہیں مولانا کوثر نیازی مجھے یہ بتائیں کہ میں بچوں کو کتاب مذکر پڑھاؤں یا مؤنث؟"

اب تک کی گفتگو سے خان صاحب کے ذوق سخن کا اندازہ قارئین کو ہو چکا ہو گا' سینٹ کے اجلاس میں اپنی رد لنگز اور فی البدیہہ ریمارکس میں انہوں نے جس برجستگی سے فارسی اور اردو اشعار کا برمحل استعمال کیا ہے ہماری پارلیمانی تاریخ میں اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی انہیں بعض ایسے اشعار بھی یاد ہیں جو اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں نے نہیں پڑھے ہوں گے 27 فروری 86ء کو اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کا وہ حصہ زیر بحث تھا جو عقائد و عبادات سے متعلق ہے ہمارے دوست سردار خضر حیات خان تقریر کرتے ہوئے مسجدوں میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا ذکر کیا اور حکومت پر زور دیا کہ وہ مسجدوں کی نگہبانی کا فرض انجام دے اس پر خان صاحب نے ارشاد فرمایا۔

"جہاں تک مسجدوں کی نگہبانی کا سلسلہ ہے تو یہ تو بہت پہلے مولانا ظفر علی خان کے زمانہ تک پھیلا ہوا ہے' ہم ان دنوں کالج میں پڑھتے تھے لاہور میں ان دنوں ایک مسجد کے سلسلے میں بڑا ہنگامہ ہو رہا تھا مولانا ظفر علی خان کو بھی اس قضیہ میں قید کر دیا گیا' اس موقع پر ان کے کہے ہوئے یہ شعر مجھے آج تک یاد ہیں کہ

حق کے اظہار کی پاداش میں انگریزوں نے
کرم آباد میں پھر مجھ کو نظر بند کیا
جرم یہ تھا کہ مساجد کی نگہبانی کو
قوم نے تابع احکام خداوند کیا!"

اسی طرح 2 مارچ 86ء کے اجلاس میں میں کسی ریزولیوشن کی توضیح مزید کے لئے اس میں کچھ لفظوں کا اضافہ کرنا چاہتا تھا چیئرمین صاحب فرما رہے تھے کہ جب آپ اس میں کچھ لفظ بڑھائیں گے تو یہ ترمیم بن جائے گی اور اس کے لئے قواعد کے تحت الگ نوٹس کی ضرورت پڑے گی میں بار بار اس پر اصرار کر رہا تھا تو خان صاحب نے اپنے ارشاد کی وضاحت کیلئے ایک خوبصورت شعر کا سہارا لیا کہنے لگے

"یہ باتیں شاعری میں تو چل جاتی ہیں کہ
حرف و لفظ ہیں دنیا سے گفتگو کیلئے
کسی سے ہم سخنی کے مطالبے ہیں الگ
مگر یہ باتیں ریزولیوشن میں نہیں چلتیں"

23 فروری 86ء کو میری ایک تحریک استحقاق زیر بحث تھی جس کا متن یہ تھا کہ

"اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ پارلیمنٹ کے کمیٹی روم سے جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سابق وزیر اعظم پاکستان کی تصویر پر اعتراض کی وجہ سے تمام تصویریں اتار دی گئی ہیں یہ تصویریں بھٹو صاحب سمیت ان تمام شخصیتوں کی تھیں جنہوں نے سابقہ ادوار میں پارلیمنٹ کے اجلاسوں کی صدارت کی تھی جب یہ تصویریں لگائی گئیں تو بعض افراد نے جناب بھٹو مرحوم کی تصویر پر اعتراض کیا جس کی وجہ سے اگلے دن اچانک تمام تصاویر غائب کر دی گئیں۔ اس واقعہ سے نہ صرف پارلیمنٹ کا وقار مجروح ہوا ہے بلکہ اراکین قومی اسمبلی و سینٹ کو ان کی سابقہ پارلیمانی تاریخ کے مظاہرے سے بے خبر رکھنے کی اس کوشش سے ان کا استحقاق بھی مجروح ہوا ہے میں تحریک کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر ایوان میں غور کیا جائے۔

تحریک پر تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جناب چیئرمین اگر یہی کچھ ہوتا رہا تو یہ تو پھر وہی بات ہو گی کہ

ایک ایک نقش نگاہوں میں بسا لو ورنہ
جانے کل کون سی تصویر مٹا دی جائے

" آج ایک تصویر ہٹائی گئی ہے کل پھر یہ جھگڑا پیدا ہو گا کہ جو افراد آج بر سر اقتدار ہیں ان کی تصویریں لگائی جائیں یا ہٹائی جائیں۔

اس موقع پر میں نے اپنا ایک شعر پڑھا

حکمرانوں سے کہو ہوش میں آئیں کوثرؔ
ہم بھی بیٹھے تھے کبھی ایسے ہی ایوانوں میں

اس پر خان صاحب نے غالبؔ کا یہ شعر پڑھ کر رنگ محفل دوبالا کر دیا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

....

یہ تفصیلات جزئیات کی حد تک میں نے جان بوجھ کر پیش کیں، مقصد یہ تھا کہ اس عبوری نازک دور میں جو

شخصیت آئینی تقاضوں کے عین مطابق سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہوئی ہے اس کے مزاج، قانون کی پابندی، شگفتگی و ذہانت اور تجربہ کاری و خطابت سے اہل وطن کو کچھ نہ کچھ آگاہی حاصل ہو جائے ورنہ مجھے خوب معلوم ہے کہ جہاں تک پبلسٹی اور تشہیر کا تعلق ہے خان صاحب اس سے کوسوں دور ہیں نہ انہیں پریس کانفرنسیں کرنے کا شوق ہے نہ اخباری بیانات جاری کرنے کا اس سے بڑھ کر ان کے استغنا کا ثبوت اور کیا ہو گا کہ وہ ایوب خان کے زمانے سے حکومت کے اہم ترین عہدوں پر فائز چلے آ رہے ہیں مگر آج تک نہ کبھی ان کے اعزاز میں کوئی استقبالیہ منعقد ہوا ہے نہ عشائیہ، حد یہ ہے کہ علمی اور ادبی ذوق سے مالا مال ہونے کے باوجود انہوں نے غیر سیاسی مجلسوں میں بھی کبھی شرکت نہیں کی ایسے میں ان کے ارد گرد ایک عجیب سا پراسرار ہالہ بن گیا ہے مگر اب جبکہ وہ قومی ملکیت بن چکے ہیں قوم کا یہ حق ہے کہ وہ ان کی زندگی کے ہر پہلو سے جانکاری حاصل کر سکے۔

حضرت حکیم فاضل ظہیر

دنیا خدا کے نیک بندوں سے کبھی خالی نہیں رہی اگر ایسا ہو جائے تو خالق کائنات کو اس دنیا کے باقی رکھنے میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ کاروبار دنیا کا برابر چلتے جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی صالحین موجود ہیں، پھول جب تک ہیں باغبان ان کے صدقے میں کانٹوں کو بھی برداشت کرلے گا لیکن جب باغ میں پھول کی جگہ بھی کانٹے اگنے لگیں تو باغباں کو اس کی بقاء سے کیا غرض، شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے اگر کہا ہے۔

جہاں کے لوگ ہیں زندہ قلندروں کے طفیل
گلوں کے سائے میں کانٹوں کی کھل گئی تقدیر

نیکو کاروں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو جلوت اور انجمن آرائی کو پسند کرتے ہیں تعلیم و تعلم اور تبلیغ و تلقین کی خاطر شہرت اور ناموری کو ایک ناگزیر برائی سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں یہ جلسوں اور محفلوں سے خطاب کرتے اور تحریر و تقریر سے اپنے مقصد کی اشاعت کا کام لیتے ہیں، دوسرا طبقہ ان اصحاب کا ہے جو شہرت سے نفور اور اجتماعی کاموں سے دور ہوتے ہیں یہ لوگوں سے زیادہ اختلاط بھی پسند نہیں کرتے 'ان کا مزاج انہیں خلوت نشین اور تنہائی گزیں بنا دیتا ہے۔ بعض تو ان میں ظاہری شکل و صورت ایسی بنا لیتے ہیں کہ خلق خدا امور دین میں ان کی طرف رجوع ہی نہ کر سکے، صوفیاء میں ایک گروہ (ملامتیہ) کہلاتا ہے جو اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کیلئے بظاہر خلاف شرع حرکات کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا سبب اس کا بھی یہی مزاج ہے کہ کہیں لوگوں میں ان کی شخصیت مرجع خاص و عام نہ بن جائے،

اس کالم میں ذکر مرحومین کاملین کا اکثر ہوتا رہتا ہے قارئین پوچھتے ہیں اور بار بار تقاضا کرتے ہیں کہ کبھی تذکرہ کسی زندہ شخصیت کا بھی کرو جس سے کچھ فیض اٹھایا جائے ادھر دشواری یہ ہے کہ جو دو چار ہستیاں ایسی نظر میں ہیں وہ اپنے نام کا چرچا اور اشتہار پسند نہیں کرتیں، رہے مذہبی حلقے تو بد قسمتی سے ان پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

مگر ایک تقریب اب ایسی پیدا ہوئی ہے کہ اس طرح کا ایک نام بے اختیار نوک قلم سے ٹپکا چاہتا ہے۔
ابھی چند دن پہلے ایک دوست ایک کارڈ لیکر آئے، یہ کارڈ حضرت حکیم فاضل ظہیر کی طرف سے تھا جو لاہور میں مقیم ہیں، مال روڈ پر کاروبار کرتے ہیں کلین شیوڈ ہیں خوش خور، خوش پوش، خوش ذوق انسان ہیں، ابھی تین چار سال پہلے ان سے نیاز حاصل ہوا مگر چند ہی ملاقاتوں میں طبیعت ان سے بے حد مانوس ہو گئی، اب افسوس اور تعجب ہوتا ہے کہ ایک عمر لاہور میں ان سے شرف تعارف حاصل کئے بغیر کیوں اور کیسے گزار دی؟ لیکن اس کا باعث جہاں اپنے ذوق جستجو کی خامی ہے وہاں حضرت حکیم صاحب کی خلوت گزینی بھی ہے، اب بھی شاید ملک میں گنتی کے لوگ ہوں گے جو ان کے کمالات ظاہری و باطنی کا اندازہ رکھتے ہیں زہد و عبادت تو خیر خدا کے فضل و کرم سے ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے ہی خوش گفتاری میں بھی وہ جواب نہیں رکھتے بولنے پر آتے ہیں تو قرآن حکیم کی آیات ان کے نوک زبان ہوتی ہیں۔ بچپن سے بزرگوں کا فیض پایا ہے۔ بڑے بڑے اکابر کی آنکھیں دیکھی ہیں، موسیقی اور ہیئت کے علوم سے شغف ہی نہیں ان میں گہری بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ لکھنے لکھانے سے دلچسپی نہیں ہاں کبھی کبھی سال دو سال کے بعد اپنی پیش گوئیوں پر مشتمل چند سو کارڈ چھپوا کر اپنے احباب و رفقاء کے حلقے میں تقسیم کرا دیتے ہیں۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اگر کہیں وہ کسی مغربی ملک میں ہوتے تو بڑے بڑے ماہرین علم نفس کا چراغ ان کے سامنے گل ہو جاتا، ان کی باتیں مختصر ہوتی ہیں مگر بڑی جامع اور دل نشیں، ان کی روحانیت کا خلاصہ یہ دو جملے ہیں۔

"بنی نوع انسان اور کائنات کی ہر چیز کو اذیت سے بچانا، قلم، کلام، طعام اور نگاہ کو پابند آداب کرنا"

روپے پیسے کے بارے میں ان کے بول سونے میں تولنے کے قابل ہیں، وہ خود محنت مزدوری کر کے کسب حلال کرتے ہیں اس لئے اس حقیقت کے رمز آشنا ہیں، فرماتے ہیں۔

"زر آتا ہے تو ضرر لے کر آتا ہے جو زر ضرر دے کر آتا ہے، ضرر پیدا کرتا ہے جب افراط سے آتا ہے تو قوموں اور سربراہوں کو گمراہ کر دیتا ہے، جو زر مشقت سے آتا ہے وہ شفقت لے کر آتا ہے"

ان کے نزدیک قوموں کے عروج و زوال کا راز ان کے نفاق و اتفاق میں مضمر ہے، کہتے ہیں۔

"اتفاق آتا ہے تو کچھ لاتا ہے نفاق آتا ہے تو سب کچھ لے جاتا ہے"

مال و دولت دنیا کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ

"زر زینت دنیا ہے ضمانت اطمینان نہیں"

خود موت و حیات کی حقیقت کو انہوں نے بڑے حکیمانہ جملے میں یوں سمیٹا ہے کہ اس کی تشریح میں دفتر کے دفتر سیاہ کیے جا سکتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔

"یہ زندگی خوش فہمی ہے اور موت غلط فہمی"

دنیا میں انسان کو جو تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کے بارے میں ان مطمح نظر یہ ہے کہ

"اذیت دنیا جزو زندگی ہے اور دلیل خالق،

اس پر شکر بجالانا سعادت ہے"

موسیقی کے علوم سے انہیں اس لئے شغف ہے کہ وہ اسے "ضبط لذت" کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ہیئت فلکیات میں ان کی دلچسپی یوں ہے کہ وہ انہیں "ضبط اذیت" کا طریقہ گردانتے ہیں،

جون 1978ء میں انہوں نے جو کارڈ جاری کیا اس میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں انہوں نے صاف صاف لکھا کہ 78ء اور 80ء کے درمیان ملک میں کوئی الیکشن نہ ہو گا جب مارشل لاء انتظامیہ نے ملک میں الیکشن کرانے کے انتظامات شروع کئے اور اس کیلئے باقاعدہ تاریخ کا اعلان کر دیا تو ان کے نیازمندوں نے حکیم صاحب سے اس پیش گوئی کے بارے میں بار بار سوالات کئے مگر انہوں نے ہر بار یہی جواب دیا کہ الیکشن کا کوئی سوال نہیں، چنانچہ وہی ہوا۔ مقررہ تاریخیں آئیں اور گزر گئیں اور وقت نے حکیم صاحب کی پیش بینی کی تصدیق کر دی، ان کا دوسرا فرمودہ یہ تھا کہ 78ء اور 79ء کے سال بادشاہوں اور سیاست دانوں کے لئے بھاری ہوں گے، لوگوں نے دیکھا کہ اسی مدت کے دوران ایران میں بادشاہوں کے بادشاہ، کا عبرت آموز زوال ہوا اور اندرون ملک سیاست شجر ممنوعہ قرار پائی۔

حکیم صاحب کی ایک اہم پیش گوئی تیسری عالمگیر جنگ کے متعلق ہے وہ اسے 80ء سے 90ء کی دہائی میں چھڑتا دیکھتے ہیں ان کی شروعات مڈل ایسٹ اور ایشیا میں سامنے آجائیں گی، کیا عجب کہ کابل پر روس کا قبضہ، عراق و ایران کی جنگ اور اب بیروت کا خونیں ڈرامہ اس تیسری خوفناک ایٹمی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو، برطانیہ اور امریکہ میں تو اب ہونے والی ایٹمی جنگ سے بچاؤ کی تربیت کا بھی اہتمام ہو رہا ہے، ایسا لٹریچر گھر گھر بانٹا جا رہا ہے جس میں اس کی تباہ کاریوں سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے اس کیلئے باقاعدہ پروگرام ہوتے ہیں بعض کاروباری اداروں نے ایسے خصوصی گھر تیار کیے ہیں جن میں رہ کر ایٹم کے تاب کاری اثرات کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔ بڑے بڑے مصنفین اور علمائے دفاع و سیاست کے قلم سے ایسی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں "تھرڈ ورلڈ وار" کے ممکنہ آغاز اور اثرات پر بحث کی گئی ہے، یورپ کے اکثر اہل علم اس کیلئے 1985ء کی حد مقرر کر چکے ہیں مگر ان سب سے پہلے اس خوفناک جنگ

کی پیش گوئی حضرت حکیم صاحب نے کی ہے اور اب اگست 82ء میں انہوں نے جو کارڈ جاری کیا ہے اس میں وہ کھل کر کہتے ہیں کہ اس عالمگیر جنگ میں چین ایک سپر پاور کی حیثیت سے ابھرے گا۔ چین اور امریکہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور روس انجام کار اس طرح صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا کہ آنے والی نسلوں کو اس کے وجود کا سراغ تک نہ ملے گا۔ اس جنگ کے نتیجے میں پوری دنیا مشرقی اور مغربی دو باقاعدہ بلاکوں میں تقسیم ہو جائے گی اور 2025ء اور 2030ء کے درمیان سچائی اور امن پر مبنی ایک نیا عالمی نظام معرض وجود میں آئے گا جو صحیح معنوں میں انسانیت کی تعمیر اور خدمت کا فریضہ انجام دے گا۔

برصغیر پاک وہند میں بھی ان کی نگاہ دوررس کئی بنیادی تبدیلیاں دیکھتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر دونوں مل کر ایک آزاد ریاست میں تبدیل ہو جائیں گے، بنگلہ دیش اور آسام دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو کر "بنگ آسام" بن جائیں گے، اندرون ملک وہ 82ء میں مریخ میں زحل کے داخلے کی وجہ سے سیاست دانوں اور پوری قوم کو مبتلائے آزمائش دیکھتے ہیں اور آخری سہ ماہی میں بطور خاص دعا کی اپیل کرتے ہیں۔ یہ تھا حضرت حکیم فاضل ظہیر کا مختصر سا تعارف اور ان کی اہم پیش گوئیوں کا خلاصہ، اس کالم میں ان کا تذکرہ اس لئے ہوا تا کہ یہ ریکارڈ پر آ کر سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

(23 ستمبر 82ء)

حکیم محمد سعید دہلوی اور انٹرنیشنل سیرت کانگریس

الحاج حافظ حکیم محمد سعید صاحب دہلوی اور حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی بر صغیر پاک و ہند میں دو ایسے درخشاں نام ہیں جنہیں دین و دانش اور طب و ثقافت کا تذکرہ لکھتے وقت کوئی بھی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا، حکیم محمد سعید صاحب کی خدمات تو اہل وطن پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں، حکیم عبدالحمید صاحب ان کے بڑے بھائی ہیں اور ہندوستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن انہی کی زیر نگرانی کام کر رہا ہے، دہلی کے تغلق نگر میں ہمدرد نگر کے نام سے قائم کردہ ان کا عظیم ادارہ عالمی شہرت کا حامل ہے، اس میں تاریخ طب کا ایک عجائب گھر بھی واقع ہے اور انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز بھی، ابھی چند ماہ پیشتر حکیم سعید صاحب نے اپنے بڑے بھائی کی شخصیت پر "بھائی جان محترم" کے زیر عنوان قلم اٹھایا ہے اور ان کا یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع بھی ہو گیا ہے اس میں جہاں حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کی سیرت و کردار کے اور بہت سے روشن پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں عفو و درگزر کے ذیلی عنوان کے تحت انہوں نے حکیم صاحب کے بارے میں ایک عجیب سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے، لکھتے ہیں

"یہ میری شادی کے دنوں کی بات ہے 1943ء کا زمانہ تھا، حکیم عبدالحمید صاحب کے ایک دوست نے جوان کے ہم جماعت بھی رہے تھے دلی پولیس میں یہ اطلاع کر دی کہ ہمدرد گودام شکر سے بھرا ہوا ہے اور شکر کا جمع کرنا قانوناً جرم، معاملہ بہت آگے بڑھ گیا، مقدمات تک نوبت جا پہنچی اور قید و بند کے خطرات پیدا ہو گئے، بالآخر ہمدرد کو کامیابی ہوئی حکومت ہند کا قانون سقیم نکلا اور اس واقعہ کے بعد اس قانون میں

ترمیم ہوئی مگر میں نے دیکھا کہ وہ دوست حکیم عبدالحمید صاحب کے پاس آتے اور ملتے رہے، حکیم صاحب کی زباں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا اور نہ ان کے طرز سلوک میں ذرہ برابر فرق آیا حالانکہ مقدمات نے انتہائی اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا یہی دوست جب پریشان حال پاکستان آئے تو حکیم عبدالحمید صاحب کی اولین ہدایت تھی کہ ان کا بدرجہ اتم خیال رکھا جائے"

حکیم سعید صاحب ابھی بچے تھے کہ ان کے والد ماجد حکیم عبدالمجید صاحب دہلوی اللہ کو پیارے ہو گئے اس لئے عملاً تربیت انہوں نے اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید صاحب کے زیر سایہ ہی پائی چنانچہ وہ ساری خوبیاں جو اپنے بھائی پر لکھے جانے والے مقالے میں انہوں نے بیان کی ہیں خود ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔

خدا کے فضل و کرم سے وہ عفوو در گزر کے وصف سے بھی آراستہ ہیں اور اس بات پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے کہ کوئی شخص انہیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچا دے وہ اس سے اپنے تعلقات اسی طرح برقرار رکھتے ہیں اور اسی تپاک اور خلوص سے ملتے ہیں جو ان کی شخصیت کا طرہ امتیاز ہے۔

پاکستان میں انٹرنیشنل سیرت کانگریس 75ء میں منعقد ہوئی اس بات کو اب سات سال ہونے کو آئے ہیں اس دوران حکیم صاحب محترم سے دسیوں مرتبہ ملنا ہوا ہے (وہ میرے ان مہربانوں اور کرم فرماؤں میں سے ہیں جن کے احسانات سے میں زندگی بھر سبکدوش نہیں ہو سکتا میری اور ان کی دوستی کی سلور جوبلی ہو چکی ہے اور انشاءاللہ زندگی کے آخری سانس تک ان سے قائم شدہ رشتہ اخلاص میں فرق نہیں آئے گا) مگر اس سارے زمانے میں اپنے طرز عمل سے انہوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ انہیں میرے عہد وزارت کی کسی کارگزاری سے تکلیف بھی پہنچی ہے اب جو "ایک مسافر چار ملک" کے نام سے ان کا تازہ ترین سفرنامہ شائع ہوا ہے تو اس سے پہلی مرتبہ یہ راز کھلا' پہلے متعلقہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے پھر اس پر کچھ گزارشات پیش کروں گا۔ حکیم صاحب کتاب کے صفحہ 419 پر بات سے بات نکالتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> "امتیازی صاحب وزارت مذہبی امور میں سیکرٹری رہ چکے ہیں یہ وہی وزارت ہے کہ عوامی دور حکومت میں جہاں اس عاجز کی خدمات کی نفی کا سامان ہوتا رہا ہے ہدایات جاری ہوئیں کہ حکیم محمد سعید کے نام اور کام کا اخفاء کیا جائے اور کریڈٹ کا کوئی اظہار نہ کیا جائے یہ انداز فکر و عمل نقطہ عروج پر اس وقت پہنچا کہ جب کانگریس عالمی سیرت النبیؐ میری منصوبہ بندی کے نتیجے میں انعقاد پذیر ہوئی' ہمدرد اور وزارت شریک تھے نصف نصف اخراجات اصول عمل تھا' اس سارے مرحلے میں یہ عاجز اپنی عاقبت کی بہتری کی جدوجہد کرتا رہا اور سیرت کانگریس کو اقامت دین کا ذریعہ بنانے کی سعی مسلسل کرتا رہا مگر ہمارے دوست اس عظیم دینی پیش رفت کو سیاسیات میں ملوث کرنے کی فکر میں لگے رہے' اس اختلاف فکر نے شدید مسائل پیدا کئے' کردار

کشی میں ناکامی کی تان آ کر اس پر ٹوٹی کہ روداد سیرت کانگریس اس وزارت نے طبع و شائع کی اور ہمدرد کو اس میں حرف غلط قرار دے کر ظاہر نہ کیا' دیانت و امانت کے سارے رشتے منقطع ہو گئے عوامی وزیر وزارت کا یہی مزاج ہر مرحلے میں کار فرما رہا اگر امتیازی صاحب اس دور حکومت میں اس وزارت میں ہوتے تو شاید ایسا نہ ہوتا"

میں حکیم صاحب محترم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کئی سال کے بعد ہی سہی لیکن آخر اس آزردگیٔ خاطر کا اظہار کر ہی دیا جس پر اب تک ان کی وضع داری نے پردے ڈال رکھے تھے، مجھے اس کا بھی شکوہ نہیں کہ انہوں نے مجھ سے ذاتی طور پر کیوں بات نہیں کی اسے قرطاس و قلم کے حوالے کیوں کیا ہے' بات اجتماعیات سے متعلق تھی اس کا اظہار بھی اجتماعی پیمانے پر ہونا چاہئے تھا' ایسا نہ ہوتا تو مجھے وضاحت کا موقع بھی نہ ملتا اور ہماری قومی زندگی کی تاریخ میں جو جس کی کارگزاری تھی وہ اس کے کھاتے میں بھی نہ پڑتی مگر اصل موضوع پر بات کرنے سے پہلے مجھے نسبتاً ایک طویل تمہید باندھنی پڑے گی کہ اس کا موقع بھی حکیم صاحب محترم کی اس تحریر نے فراہم کر دیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہی ایک بااختیار وزارت مذہبی امور قائم کر دی جاتی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زیر صدارت جمعیت علمائے اسلام نے تو 1948ء میں باقاعدہ ایک قرارداد کے ذریعے اس کا مطالبہ بھی کیا تھا مگر بدقسمتی سے جہاں اور ہر شعبہ قومی کیلئے وزارت کا قلمدان موجود تھا وہاں دینی پہلو کو منظم کرنے کیلئے کوئی ہیئت حاکمہ قائم کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی' عالم اسلام میں اس گئے گزرے دور میں بھی کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں وزارت مذہبی امور موجود نہ ہو' مجھے معلوم ہے جناب غلام احمد پرویز کا مکتب فکر اور جماعت اسلامی دونوں اس طرح کی کسی وزارت کے قیام کی مخالفت کرتے رہے ہیں ان کا استدلال یہ تھا کہ دین ایک کل ہے جز نہیں' دین اور دنیا میں ثنویت نہیں پائی جاتی اس لئے امور دنیا سے الگ کسی وزارت مذہبی امور کا تصور اسلام کے منافی ہے لیکن نہ جانے یہ حضرات قرآن حکیم کی اس صریح ہدایت کو کیسے فراموش کر گئے جس میں " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر " کے لئے ایک باقاعدہ تنظیم بنانے کی صراحت کی گئی ہے بہرحال قیام پاکستان کے چھبیس سال بعد پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں کابینہ نے میری طرف سے پیش کردہ اس تجویز کو قبول کر لیا کہ یہ وزارت قائم ہونی چاہئے۔

کابینہ میں اس عنصر کی طرف سے جسے اسلام کے نام سے بھی چڑ تھی اس تجویز کی شدید مخالفت کی گئی مگر چونکہ اکثریت اس کے حق میں تھی اور خود وزیر اعظم کا ووٹ بھی اسی جانب تھا اس لئے مخالفین کی دال نہیں گل سکی' 74ء میں یہ وزارت بنی تو مجھے ہی اس کا قلم دان سونپا گیا مگر یہ صرف قلم دان ہی قلم دان تھا نہ اس میں سیاہی تھی نہ قلم' صرف حج کا محکمہ اس کی تحویل میں دیا گیا' محکمہ اوقاف جو ہر مسلمان ملک میں اسی وزارت کا حصہ ہوتا ہے اسے بدستور صوبائی سبجیکٹ رکھا گیا' یہ بعد کی بات ہے اور اس وزارت کی

کارکردگی کا نتیجہ کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ اور اسلامی مشاورتی کونسل بھی اس کی تحویل میں دے دیئے گئے محکمہ اوقاف کو اس وزارت کے سپرد نہ کرنے کا سبب یہ ذہنی تحفظ تھا کہ اس طرح کہیں یہ وزارت بہت طاقتور نہ بن جائے مگر حکومت کے خلاف عوامی تحریک کے چلنے سے بادل نخواستہ محکمہ اوقاف کو بھی صوبوں کی تحویل سے نکال کر وزارت مذہبی امور کے ماتحت کر دیا گیا' آئین کی رو سے اسلامی مشاورتی کونسل کی رپورٹ کو ہر سال لازماً قومی اسمبلی میں پیش ہونا چاہئے۔ جب میں نے کونسل کی کارگزاری میں سنجیدگی سے دلچسپی لی اور اس کی رپورٹ اسمبلی میں پیش کرنی چاہی تو کونسل کو وزارت مذہبی امور سے واپس لے کر وزارت قانون کے حوالے کر دیا گیا' اس موقع پر سابق وزیر اعظم سے میری جو خط و کتابت ہوئی اس کا عکس میرے پاس محفوظ ہے اور کسی صحبت میں وہ قارئین کی نذر کروں گا' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شروع شروع میں جب یہ وزارت بنائی گئی تھی تو اس کی حیثیت محض ایک شوپیس کی تھی اس کا دائرہ کار بہت محدود تھا' اختیارات صفر تھے بجٹ برائے نام تھا اس کی توسیع کے مخالف بہت با اثر تھے اس فضا میں قدم بہ قدم اسے ترقی دینے کے لئے مجھے حکومت میں رہ کر جو کشمکش کرنی پڑی اسے میں جانتا ہوں یا میرا خدا' میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس وزارت کے ذریعے سے میں ملک میں ایک ایسی دینی فضا پیدا کر دوں جس میں کوئی بھی لادینی نظریہ فروغ نہ پا سکے اور پارٹی اور حکومت دونوں اسلامی کاز کو اپنانے پر مجبور ہو جائیں۔

....

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں یہ خیال ڈالا کہ مسجد نبویؐ کے خطیب اور خانہ کعبہ کے امام کو باری باری پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی جائے' میں حرمین شریفین سے اہل پاکستان کی محبت سے خوب آگاہ تھا' مجھے معلوم تھا کہ ان کی آمد پر پاکستان میں عدیم النظیر اجتماعات ہوں گے اتنے بڑے اسلامی اجتماعات کہ آغاز اسلام سے لے کر اب تک کی پوری تاریخ میں وہ اپنی مثال آپ ہوں گے چنانچہ واقعات گواہ ہیں کہ خطیب مسجد نبویؐ اور امام صاحب خانہ کعبہ کی آمد پر کراچی میں جمعہ کے جو اجتماعات ہوئے ان کی حاضری بیس لاکھ سے بھی متجاوز تھی' اتنی بڑی تعداد صرف حج کے موقع پر عرفات میں جمع ہوتی ہے مگر با جماعت نماز میں یہ تمام لوگ بھی شریک نہیں ہو پاتے خانہ کعبہ میں نماز کا بڑا اجتماع ہوتا ہے مگر وہ بھی چار پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتا' اس طرح تاریخ اسلام کے یہ سب سے بڑے اجتماعات نماز اسی وزارت کے زیر اہتمام پاکستان میں منعقد ہوئے' اس کے لئے حکومت نے وزارت کو کوئی الگ بجٹ نہیں دیا۔ سارا خرچ عوامی تنظیموں اور شہروں کی استقبالیہ کمیٹیوں نے خود برداشت کیا مقصود اس تمام سرگرمی سے ملک میں احیائے دین کے جذبے کا فروغ تھا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بتمام و کمال حاصل ہوا۔

دوسرا خیال ماہ ربیع الاول میں ایک بین الاقوامی سیرت کانگریس کے انعقاد کا سوجھا جس میں عالم اسلام کے نامور مفکرین کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے فاضل متشرقین بھی شریک ہوں' پروگرام یہ بنا کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں کانگریس کے اجلاس منعقد ہوں مگر مشکل یہ تھی کہ اتنی بڑی تعداد میں بیرونی ملکوں سے مہمانوں

کی آمدورفت اور قیام وطعام نیز جلسوں کے انعقاد وغیرہ کے اخراجات کا برداشت کرنا وزارت کے بس سے باہر تھا' ——— میں نے کابینہ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی تو کسی کو اس کی مخالفت کی توہمت نہیں ہوئی کہ اس کا تعلق ذات رسولؐ سے تھا لیکن یہ واضح کر دیا گیا کہ اس مقصد کے لئے حکومت اپنے خزانے سے کوئی گرانٹ نہیں دے گی' میں نے اللہ کا نام لے کر یہ شرط منظور کرلی' میرے ذہن میں اس وقت حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کی علم دوست اور دین دار شخصیت تھی میں جانتا تھا کہ ان سے بات کروں گا تو وہ اپنے ہمدرد فاؤنڈیشن کے وسائل سے اس کام میں ضرور بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا میں نے حکیم صاحب مدظلہ سے بات کی تو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو گئے' طے پایا کہ نصف اخراجات ان کا ادارہ اٹھائے گا اور نصف وزارت مذہبی امور۔ میں نے وزارت کے افسران کو ہدایت کی کہ وہ اپنے موجودہ بجٹ میں جہاں جہاں کٹوتی کر کے رقم بچاسکتے ہوں بچائیں اور اسے انٹرنیشنل سیرت کانگریس کیلئے وقف کر دیں' خدا کا شکر ہے کہ اس بے سروسامانی کے باوجود پاکستان میں کانگریس کے ایسے ایسے اجلاس اور عام جلسے منعقد ہوئے کہ پوری دنیا میں دھوم مچ گئی' اسی کانگریس میں طے پایا کہ کانگریس ہر سال منعقد ہو اور باری باری مختلف ممالک اس کی میزبانی کریں چنانچہ اس کے بعد سے اب تک ترکی' قطر وغیرہ میں ذکر رسولؐ کا یہ بین الاقوامی اجتماع منعقد ہوا ہے اور امید ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

....

اگر اس سے پہلے اس کا اعتراف واعلان نہیں ہوا اور اس میں بیوروکریٹک انداز کار مانع رہا تو اس غلطی کی تلافی اب ہو جانی چاہئے کہ اس سیرت کانگریس کی تمام تر منصوبہ بندی کا سہرا حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کے سر تھا انہوں نے دل کھول کر اس کے لئے خرچ کیا' بیرون ملک مہمانوں سے خط وکتابت کی' اندرون ملک تمام پروگرام وضع کئے اگر وزارت مذہبی امور کے افسران نے کانگریس کی روداد مرتب کرتے ہوئے ہمدرد فاؤنڈیشن کا تذکرہ نہیں کیا تو یہ ان کے مخصوص سرکاری مزاج اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ حاشا وکلا غریب وزیر نے نہ اس کیلئے کوئی ہدایت دی نہ اسے اتنی فرصت تھی کہ وہ روداد کی اشاعت سے پہلے اس پر نظر ڈال لیتا۔ یہ ایک روٹین کا کام تھا ظاہر ہے وزیر کی سطح سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا حکیم صاحب موصوف کو اس سے تکلیف پہنچی' مجھے زمانہ وزارت میں اس کی اطلاع ملتی تو اسی وقت میں ان سے معافی مانگتا' اب سات سال بعد ان کی کتاب کے ذریعے سے اس کی تلافی کر رہا ہوں' ہماری قومی زندگی میں انٹرنیشنل سیرت کانگریس کے آغاز وانعقاد کا کریڈٹ اگر کسی شخص واحد کو جاسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف حکیم صاحب موصوف ہیں' رہا آخرت کے اجر کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کو تو اس سلسلے میں حکیم صاحب کی مساعی جمیلہ کا کامل علم ہے اس کے فرشتوں کے آگے کسی وزارت کے افسروں کی ضرورت سے زیادہ "اسمارٹ نیس" کام نہیں آسکتی۔

24 اکتوبر 82ء

مارکوس کا عبرتناک انجام

(1)

ادھر کچھ دنوں سے مارکوس اور فلپائن کا ذکر پھر سے ہمارے اخباروں کی زینت بن رہا ہے، چند دن پہلے جونیجو صاحب نے مشرق بعید کا دورہ کیا تو ٹیلی وژن پر فلپائن میں ان کے پرجوش استقبال کی جھلکیاں آنے لگیں۔ یہ خبریں شائع ہوئیں کہ فلپائن کے مرد آہن مارکوس کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور مسز اکینو نے مارکوس کی یہ درخواست مسترد کر دی ہے کہ اسے اپنی ماں کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کے لئے فلپائن آنے کی اجازت دی جائے۔ میں جونیجو صاحب کے دورہ سے چند دن پہلے منیلا میں تھا تو مجھے وہاں کے بعض سینیٹر صاحبان نے بتایا کہ مسز اکینو نے مارکوس سے کہا ہے "جتنی دولت اس ملک سے لے گئے ہو اس کا آدھا حصہ خزانے میں لوٹا دو (جس سے ہمارے تمام اقتصادی مسائل حل ہو جائیں گے) تو ہم تمہیں واپس آنے کی اجازت دینے کو تیار ہیں" پھر چند دن پیشتر بیگم بینظیر بھٹو نے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون لکھا ہے جس کے بعض اقتباسات ہمارے قومی پریس میں بھی شائع ہوئے ہیں اور اس میں بینظیر نے امریکہ کے اس کردار کا ذکر کیا ہے جو اس نے فلپائن میں حکومت کی تبدیلی لانے کے سلسلے میں ادا کیا تھا، ان باتوں کی وجہ سے فلپائن اور مارکوس کا نام ہمارے عوام کے حافظے میں ایک بار پھر تازہ ہو گیا ہے مگر شاید جس تفصیل اور گہرائی سے اسی خطے میں واقع اس ملک کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے ہمارے ہاں اب تک اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ آیئے آج مارکوس کی سرگزشت حیات پر ایک نظر ڈالیں مارکوس کی کہانی دنیا کے ہرڈکٹیٹر کی کہانی ہے۔

فلپائن 1565 سے سپین کی نو آبادی تھی' ایک سمندری جنگ میں امریکہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد یہ امریکی تسلط میں آ گیا بعد کے دنوں میں "فلپینوز" نے نئے سامراج کے چنگل سے نکلنے کیلئے جدوجہد کی' آزادی کی جنگ لڑی' سولہ ہزار آدمیوں کی جان کا نذرانہ پیش کیا' دو لاکھ افراد جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے قحط اور امراض کی لپیٹ میں لقمہ اجل ہوئے لیکن امریکی تاجر جو اس کالونی سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا چاہتے تھے' جرنیل جنہیں یہاں کے سمندر میں اڈے درکار تھے آسانی سے جانے والے نہ تھے ان کے پنجے ایسے گڑے کہ فلپائن کی رگ گلو تک ان کی گرفت میں آ گئی۔ 1934ء میں امریکی کانگریس نے "فلپائن کی آزادی کا ایکٹ" پاس کیا جس میں کامل آزادی سے پہلے دس سال کا "کامن ویلتھ پیریڈ" رکھا گیا مگر بیچ میں جنگ عظیم بھی تھی فلپائن کو امریکہ کے شانہ بشانہ اس جنگ میں حصہ لے کر قربانیاں بھی پیش کرنا تھیں' اس جنگ میں جاپانی حملوں کے نتیجے میں تقریباً دس لاکھ فلپینوز ہلاک ہوئے' اس کے پل' سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں تباہ ہو گئیں' جاپان نے اپنے قبضے کے دوران جو کرنسی جاری کی تھی امریکی فتح کے بعد وہ بے کار ہو گئی اس طرح فلپائن کا مالی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔
اب آزادی کی تاریخ قریب آ گئی تھی امریکہ اور فلپائن کے درمیان آزادی کے بعد کے تعلقات کی تفصیل پر بات چیت شروع ہوئی مگر ظاہر ہے یہ دو برابر کے ملکوں کی بات چیت نہ تھی' فلپائن جنگ کے دوران لگے ہوئے زخموں سے چور چور تھا اسے سہارے کی ضرورت تھی امریکہ نے اسے 620 ملین ڈالر کے عوض یہ سہارا مہیا کیا مگر اس کے عوض اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اس قیمت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا' فلپائن کے سمندر میں اڈے' اپنے باشندوں کیلئے فلپائن میں جائیداد کا مالک بننے اور یہاں رہ کر تجارت کر سکنے کی مراعات معاہدہ میں شامل تھیں' اس زمانے میں "ہکس" کے نام سے سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کی ایک گوریلا تنظیم بھی سرگرم عمل تھی مستقبل میں اس کے اثر ورسوخ کا انسداد تو امریکہ کے "فرائض" میں شامل تھا ہی اس لئے گو فلپائن نام کو آزاد ہو گیا مگر وہ امریکی تسلط کی گرفت سے نہ نکل سکا' ویسے بھی امریکی فارن آفس کے اس وقت کے تیار کردہ منصوبے کے مطابق مشرق بعید میں دو ملک ایسے تھے جنہیں امریکہ کسی صورت اپنے دائرہ اثر سے باہر نہیں دیکھ سکتا تھا' ایک جاپان دوسرے فلپائن یہی وجہ ہے کہ فلپائن کی آزادی کے بعد کی کہانی حقیقت میں امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا ایک طلسم ہوش ربا نظر آتی ہے۔
اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے سی آئی اے کا سب سے پہلا منصوبہ یہ تھا کہ فلپائنی کانگریس میں اپنے آدمی منتخب کرائے جائیں اور صدارت کا عہدہ کسی ایسے شخص کو دلایا جائے جو امریکہ کا "مُرغِ دست آموز" بن سکے' مسٹر "میگ سے" اس زمانے میں وزیر دفاع تھے اسے مستعفی کرا کے عہدۂ صدارت کا امیدوار بنا دیا گیا' سی آئی اے نے فلپائن میں امریکی سفیر کو پچاس لاکھ ڈالر امداد مہیا کرنے کی پیشکش کی تاکہ اسے انتخابی مہم پر خرچ کیا جا سکے مگر سفیر نے صرف دس لاکھ ڈالر لینے پر اکتفا کیا باقی کمی فلپائن میں قائم

امریکی تجارتی کمپنیوں اور کارپوریشنوں کے عطیات سے پوری کی گئی' یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس سلسلے میں سب سے بڑا عطیہ "کوکاکولا" نے دیا۔سی آئی اے نے "میگ سے سے" کو کامیاب بنانے کے لئے برسر عہدہ صدر "کورینو" کو عوام کی نظروں سے گرانے کے لئے بھی کئی اقدام کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ایک موقع پر جب اسے تقریر کرنی تھی اس کے مشروبات میں ایسی دوا ڈال دی گئی جس سے اس پر نشہ طاری ہو جائے اور بات کرتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا لڑکھڑا جائے۔ "میگ سے سے" کامیاب ہو کر امریکی مقاصد کو آگے بڑھانے کیلئے کام کرتا رہا مگر بدقسمتی سے وہ مارچ 57ء میں ایک ہوائی حادثہ میں مارا گیا اگلا صدر "میکاپاگل" تھا یہ بھی سی آئی اے کی مدد سے منتخب ہوا مگر 60ء کے الیکشن میں ایک ایسا امیدوار میدان انتخاب میں اترا جس نے امریکہ سے اپنے تعلقات کے ضمن میں پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے' یہ ایک ایسا حکمران ثابت ہوا جس نے فلپائن کی تاریخ کا رخ موڑ دیا' یہ صدارتی امیدوار سینیٹر فرڈیننڈ ای مارکوس تھا۔

1949ء میں پہلی مرتبہ نوجوان مارکوس فلپائن کانگریس کی رکنیت کیلئے امیدوار بنا تو اس کی تقریروں میں ٹیپ کا بندیہ تھا کہ "یہ قدم اول ہے' مجھے کانگریس کا ممبر منتخب کرو میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ میں بیس سال میں تمہیں ملک کا صدر بن کر دکھاؤں گا" اور کانگریس کا ممبر بننے کے بعد اس نے اپنا یہ عزم یوں پورا کیا کہ بیس سال کے بجائے سولہ سال کی مدت ہی میں وہ ملک کا صدر بن گیا' اس کا تعلق شمالی فلپائن کے علاقے سے تھا جہاں اس کی اچھی خاصی برادری تھی' اس کا باپ "مریانو" بھی اس سے پہلے کانگریس کا ممبر رہ چکا تھا۔ 64ء میں صدارتی الیکشن کے موقع پر مارکوس کی زندگی اور اس کے کارناموں پر ایک کتاب "ہر آنسو کے عوض ایک فتح" شائع ہوئی تھی۔ اس کا ٹائٹل اس واقعہ سے ماخوذ ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ جب مارکوس کے باپ کو جاپانی فوج نے قتل کر دیا تو اس کی ماں بہت روئی۔ اس پر مارکوس نے اس سے کہا "ماں! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے بہائے ہوئے ہر آنسو کے بدلے میں ایک فتح حاصل کروں گا" یہ الگ بات ہے کہ یہ واقعہ ہی سرے سے من گھڑت تھا' مارکوس کے باپ کو جاپانیوں نے نہیں بلکہ جاپان دشمن فلپائنی گوریلوں نے ہلاک کیا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مریانو جاپانیوں سے ملا ہوا ہے۔ کتاب میں یہ گپ بھی ہانکی گئی ہے کہ مارکوس نے جاپانیوں کے خلاف لڑائی میں جو داد شجاعت دی تھی اس کے عوض امریکی حکومت نے اسے کئی تمغوں اور فوجی اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ سالہا سال تو کتاب کے اس دعویٰ کو کسی نے چیلنج نہیں کیا مگر جب اپنے زوال سے متصل مارکوس اپنے اعمال کی وجہ سے امریکی رائے عامہ میں نشانہ بن گیا تو امریکی صحافیوں نے اس دعویٰ کی بھی دھجیاں بکھیر دیں۔ انہوں نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا کہ مارکوس کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے مگر اس طرح کی باتوں سے قطع نظر مارکوس کی زندگی پر اس کتاب سے اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

مارکوس اپنے زمانہ طالب علمی میں کھیلوں میں بے حد دلچسپی لیتا تھا وہ اپنے کالج کا مشہور پہلوان ' باکسر اور " گالف " کا کھلاڑی تھا وہ اچھا مقرر بھی تھا ' اکثر مباحثوں میں اس نے انعام حاصل کیا ' اس نے وکالت کا امتحان اعزاز سے پاس کیا اور آگے چل کر اس پر قتل کا جو مقدمہ قائم ہوا اس میں وکیل صفائی کے طور پر وہ خود ہی پیش ہوا۔ اس کتاب میں اس مقدمہ کی جو تفصیلات درج ہیں وہ تو بعض اور مندرجات کی طرح محض جھوٹ کا ایک پلندہ ہیں مگر غیر جانبدارانہ ذرائع سے جو حقائق منظر عام پر آئے ہیں ان کے مطابق مارکوس نے اپنے باپ کے مقابلے میں کانگریس کے انتخاب میں کامیاب ہونے والے ایک امیدوار " نلنداسن " کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اس وقت مارکوس کی عمر اٹھارہ سال تھی ' کہتے ہیں کہ مسٹر نلنداسن مارکوس کے باپ کو شکست دینے کے بعد بینڈ باجوں کے جلوس کے ساتھ مارکوس کے گھر سے گزرا اس کے حامی مارکوس خاندان کے لئے اہانت آمیز نعرے لگا رہے تھے۔ نوجوان مارکوس اس توہین کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے 20 ستمبر 35ء کی رات کو مسٹر نلنداسن کو اس وقت گولی کا نشانہ بنا دیا جب وہ اپنے گھر کی کھڑکی کھول کر ڈنر کے بعد اپنے دانت صاف کر رہا تھا۔ تقریباً تین سال تک قتل کی تحقیقات ہوتی رہی آخر 7 دسمبر 38ء کو مارکوس الزام قتل میں پکڑا گیا ' اس وقت وہ ایک طالب علم لیڈر کی حیثیت سے خاصا مشہور تھا عدالت نے دو ماہ کی کارروائی کے بعد اسے سترہ سال قید کی سزا سنائی ' سپریم کورٹ کی اپیل کے دوران مسٹر مارکوس نے اپنا قانونی دفاع خود کیا اور کہتے ہیں کہ اس کی وکیلانہ صلاحیتوں نے بڑے بڑے مشہور وکلاء کو انگشت بدنداں کر دیا۔ کورٹ میں اس کے قانونی نکتوں اور تقریروں کو پریس نے اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دی۔ سپریم کورٹ نے مارکوس کی اپیل کو منظور کرتے ہوئے اسے باعزت بری کر دیا۔

یہ ساری کہانی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے زمانہ طالب علمی میں بھی مارکوس بحیثیت وکیل اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔

1960ء میں صدارتی الیکشن لڑنے سے پہلے مارکوس تین دفعہ ہاؤس اور ایک دفعہ سینیٹ کا ممبر رہ چکا تھا ' میکا پاگل اور اس کے درمیان سی آئی اے کیلئے خوب تر امیدوار کا انتخاب خاصا مشکل کام تھا کیونکہ دونوں امریکی پالیسیوں کے زبردست حامی تھے ' عام طور پر تاثر یہی ہے کہ اس الیکشن کے دوران سی آئی اے کی طرف سے بھیجی جانے والی رپورٹوں میں مارکوس کی خداداد ذہانت و فطانت کے جو گن گائے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا جھکاؤ کس جانب تھا۔ مارکوس نے یہ الیکشن کس طرح لڑا اس میں کون سے ہتھکنڈے استعمال کئے یہ سب امور بہت دلچسپ ہیں اور اس کا مختصر سا بیان ہم ضرور کریں گے مگر اس سے پہلے اتنا جان لیجئے کہ مارکوس کو منصب صدارت تک پہنچانے میں خود اس سے بڑھ کر اس کی رفیقہ حیات امیلڈا مارکوس کا ہاتھ تھا جس کی شخصیت سے تعارف کے بغیر نہ تو مارکوس کے عروج و زوال کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ماضی قریب میں فلپائن کی تاریخ کے مدوجذر کو۔

امیلڈا 21 جولائی 1929ء کو فلپائن کے ایک دور افتادہ جزیرے میں پیدا ہوئی اس کے والدین ایک ناکام شادی کے اعصاب شکن مرحلوں سے گزر رہے تھے' بڑا ہو کر اس نے قانون میں گریجوایشن کیا اور 23 سال کی عمر میں منیلا آ گئی' وہ خاتون جس نے منیلا کے قصرِ صدارت کو چھوڑا ہے تو ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کے برابر پوشاکیں 'ایک ہزار جوتے' عطریات' انگوٹھیوں ، ہیرے جواہرات کے کانوں کے بندے اور گلے کے ہاروں کے لاتعداد صندوق اس کے محل سے برآمد ہوئے ہیں اس کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ اپنا آبائی گھر چھوڑ کر پہلے پہل منیلا وارد ہوئی ہے تو اس کا کل اثاثہ ایک سوٹ کیس میں بند تھا۔ اس کے پاس کوئی زیور نہ تھا اس کے پاس صرف پانچ پیسے تھے (فلپائن کے سکے کو پیسہ کہا جاتا ہے اور یہ ہمارے ہاں کے ایک روپے کے برابر ہے)' منیلا پہنچ کر وہ کچھ عرصہ ایک میوزک سٹور میں ملازم رہی جہاں وہ گا بجا کر پیانو فروخت کیا کرتی تھی۔ بعد میں وہ سنٹرل بینک میں کلرک بن گئی۔ اس کی خوبصورتی اور گلیمر کی خوشبو آہستہ آہستہ پورے دارالحکومت میں پھیلنے لگی مگر اسے چار چاند اس وقت لگے جب وہ مقابلہ حسن میں "مس منیلا" منتخب ہوئی اور اسے سیاست دانوں اور اونچی سوسائٹی کے عیش پرستوں سے میل جول کے مواقع دستیاب ہوئے اس زمانے میں فلپائن کے مشہور جریدہ "منیلا کرانیکل" کے ٹائٹل پر اس کی ایک دلکش تصویر شائع ہوئی جس نے دل پھینک طبقے میں ہلچل مچا دی' کانگریس کے کیفے ٹیریا میں انہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا مارکوس دن بھر کی ذہنی مشقت کے بعد کیفے میں داخل ہوا تو اس کی نظر امیلڈا پر پڑی وہ اس کی تصویر پہلے ہی دیکھ چکا تھا وہ سیدھا اس کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ وہ ذرا کھڑی ہو جائے پھر اس نے اس کے کندھوں کے ساتھ کندھا ملا کر اپنے اور اس کے قد کا موازنہ کیا' امیلڈا کا قد اس سے ایک آدھ انچ کم نکلا مارکوس نے کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے اپنے ایک ممبر دوست سے کہا "مجھے اپنا مطلوب مل گیا ہے میں اس سے شادی کروں گا" ایک امریکی اخبار نویس نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی دلچسپ بات کہی ہے' وہ کہتا ہے اس دن اتفاق سے اگر امیلڈا نے اونچی ایڑی کا جوتا پہن رکھا ہوتا تو فلپائن کی تاریخ آج سے کتنی مختلف ہوتی! مطلب یہ ہے کہ نہ ان دونوں کا ملاپ ہوتا اور نہ مارکوس صدر بن کر وہ "کارہائے نمایاں" انجام دیتا جن کا خمیازہ آج تک فلپائن کے عوام بھگت رہے ہیں۔

....

صدارتی الیکشن لڑنے سے پہلے مارکوس لبرل پارٹی کا ممبر تھا' الیکشن سے قریب وہ "نیشنلسٹ" پارٹی میں شامل ہو گیا' پہلا مرحلہ یہ تھا کہ "نیشنل کنونشن" میں اسے پارٹی کی طرف سے صدارتی امیدوار نامزد کیا جائے اس کے لئے اس نے بے دریغ روپیہ صرف کیا جیسا کہ بعد میں کنونشن کے ایک مندوب نے کہا "یہ تو ایک نیلام گھر تھا جس نے سب سے زیادہ بولی لگائی وہ جیت گیا" اور مارکوس کیوں نہ جیتتا جہاں اس کے مدمقابل سینڈوچ کھلا رہے تھے وہ پارٹی کے مندوبین کے اعزاز میں مرغ پارٹیاں دے رہا تھا جہاں شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی لفافوں میں بند پیسوں کے تحائف اس پر مستزاد تھے' نائٹ کلبوں کی ضیافتیں

اس کے علاوہ تھیں اور ان سب امور کی انچارج امیلڈا تھی جس نے بعد کے سالوں میں اپنے ایک دورہ کے دوران امریکی وائس پریذیڈنٹ مسٹر ہمفرے کو اپنے تجربات کی روشنی میں بعض بہت مفید مشورے عطا کئے تھے، مسٹر ہمفرے اس زمانے میں 1968ء کی شکاگو کنونشن میں پارٹی امیدوار نامزد ہونے کیلئے کنویسنگ کر رہے تھے امیلڈا نے واشنگٹن میں ساؤتھ ایسٹ کے اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ولیم کو طلب کیا چند منٹوں کے لئے اس سے فلپائن حکومت کی امداد کے مسئلہ پر بات چیت کی اور پھر اس سے کہا کہ وہ مسٹر ہمفرے کو اس کی طرف سے یہ مشورہ پہنچا دے کہ جس جگہ کنونشن ہو رہا ہے اس کے کارندوں پر اس کا مکمل کنٹرول ہونا چاہئے، ہمارے ہاں جب پارٹی کنونشن میں امیدوار نامزد ہونا تھا تو ویٹروں سے لے کر لفٹ آپریٹروں تک اور صفائی کرنے والوں سے لے کر ڈیسک کلرکوں تک سب کے سب ہمارے ہاتھوں بک چکے تھے، وہ ہر مندوب سے کہہ رہے تھے "مارکوس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا" اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ٹیلیفون آپریٹر ہمارے آدمی تھے، جو مخالف فریق کی کال ہی ملا کر نہیں دیتے تھے۔
پارٹی کنونشن سے صدارتی امیدوار نامزد ہونے کے بعد مارکوس کیلئے دوسرا مرحلہ مسٹر لوپز کو "جو صدارت کے لئے پارٹی کی طرف سے نامزد نہیں ہو سکے تھے) وائس پریذیڈنٹ کے طور پر الیکشن لڑنے کے لئے آمادہ کرنا تھا، مسٹر لوپز کے پاس عزت بھی تھی اثر و رسوخ بھی اور دولت بھی وہ اس سے پہلے کئی سال تک ملک کے نائب صدر رہ چکے تھے، ان کا ایک بھائی منیلا کے مشہور اخبار "منیلا کرانیکل" کا مالک تھا مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے اہل خاندان یہاں تک کہ ان کی بیوی بھی نمبر دو کی حیثیت میں ان کے الیکشن میں حصہ لینے پر کسی طور رضامند نہ تھے۔ مسٹر لوپز نے مارکوس کی تجویز مسترد کر دی، پھر ایک شام کیا ہوا کہ امیلڈا منیلا ہوٹل میں مسٹر لوپز کے شاندار سوٹ میں داخل ہوئی۔ .... ڈرامائی طریقے سے اس کا ایک گھٹنا زمین پر ٹکا ہوا تھا آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ع لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ...... کے انداز سے کون مسخر نہ ہو جاتا سو مسٹر لوپز نے بھی مارکوس کا نمبر دو بننے پر رضامندی ظاہر کر دی۔
انتخابی مہم کو منظم کرنے کا کام بھی امیلڈا نے انجام دیا اس نے نیلی پوش خوبصورت خواتین کے دستے ترتیب دیئے جو تقریروں کے ساتھ گا بجا کر بھی ووٹروں کا دل بہلاتے، ادھر مارکوس اپنی خوش بیانی سے فلپینوز کے دل موہ رہے تھے "میں تمہیں وہ سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو تم چاہو گے، بس ایک اپنی بیوی تمہیں نہیں دے سکتا" اس کا کہنا تھا کہ وہ پسماندہ دیہاتی طبقوں کی غربت کو ختم کر دے گا۔ امیر اور غریب کا فرق مٹا دے گا۔ رشوت اور اقرباء پروری کی لعنتوں کو برقرار نہیں رہنے دے گا ...... سی آئی اے کا کہنا تھا کہ ان نعروں سے کمیونزم کا مقابلہ کیا جا سکے گا، یہ الگ بات ہے کہ مارکوس کے زمانے میں ان خرابیوں میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو گیا مگر وقتی طور پر امیلڈا اور مارکوس کی کوششیں رنگ لائیں، مارکوس صدر منتخب ہو گیا، اسی لاکھ ڈالے جانیوالے ووٹوں میں اسے اپنے مخالف پر ساڑھے چھ لاکھ ووٹوں کی اکثریت حاصل تھی۔

مارکوس کا عبرتناک انجام

(2)

صدارت کے بعد کے سال مارکوس کے کیسے گزرے' یہ داستان ہوا وہوس مضمونوں میں نہیں کتابوں میں سمائے گی' بس اتنا سمجھ لیجئے کہ فلپائن اس زمانے میں شخصی حکومت کا بدترین نمونہ تھا' امیلڈا دونوں ہاتھوں سے قوم کو لوٹنے میں مصروف رہی کبھی کلچرل سنٹر کے قیام کے نام پر کبھی تعلیمی مقاصد کے لئے وہ عطیات کے نام پر پوری ڈھٹائی کے ساتھ روپیہ سمیٹتی رہی' اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ مختلف تجارتی کمپنیوں اور سرمایہ کار اداروں کو ایک دن پیشگی ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیتی کہ کل تمہارے ہاں سے میرا آدمی فلاں رفاہی سکیم کیلئے فنڈ لینے آئے گا خط میں اس فنڈ کی رقم کا تعین بھی کر دیا جاتا اور پھر اگلے دن اس کے آدمی جا کر رقم وصول کر لاتے جو انکار کرتا اس کا لائیسنس منسوخ کر دیا جاتا یا انکم ٹیکس والے اس کا جینا حرام کر دیتے ٹیکس کمشنروں کی الگ ڈیوٹی تھی کہ وہ ٹیکس گزاروں سے بطور خود بھی رقوم حاصل کریں اور براہ راست امیلڈا کے حضور پیش کریں' مارکوس کے ایک ایگزیکٹو اسسٹنٹ مسٹر جیم فیرر کی روایت ہے کہ اس نے ایک دن ایک ٹیکس کمشنر کو دو بڑے سوٹ کیسوں کے ساتھ قصر صدارت میں جاتے دیکھا اس نے اس سے پوچھا "یہ سوٹ کیس کس کے لئے ہیں؟"

"خاتون اول کیلئے" ٹیکس کمشنر نے جواب دیا

اس نے پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

کہا "پچاس لاکھ روپیہ" (اس زمانے میں یہ رقم ساڑھے بارہ لاکھ امریکی ڈالروں کے برابر تھی)

جب ٹیکس کمشنر واپس لوٹا تو مسٹر جیم نے دیکھا وہ پسینے سے شرابور ہے اور اس کا جسم کانپ رہا ہے اس نے پوچھا "خیر تو ہے؟" ٹیکس کمشنر نے جواب دیا "خاتون اول اس رقم سے مطمئن نہیں ہیں"

حد یہ ہے کہ امریکی امداد کی بھاری بھاری رقوم خزانے میں جمع ہونے کے بجائے مارکوس اور امیلڈا کے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتیں' اس کی مثال اس وقت سامنے آئی جب امریکی سینٹ کی سب کمیٹی کو پتہ چلا کہ ویت نام میں فلپینی فوج بھیجنے کے عوض امریکی حکومت درپردہ 39 ملین ڈالر مارکوس حکومت کو دے چکی ہے جب یہ بات سب کمیٹی کی طرف سے منظر عام پر لائی گئی تو مارکوس نے جس نے یہ بات اپنے عوام سے چھپا رکھی تھی دیدہ دلیری سے اس کی تردید کی رقم شیر مادر کی طرح ہضم ہو چکی تھی۔ رہا اس کا حساب کتاب تو از روئے معاہدہ امریکی حکومت کو یہ استحقاق ہی نہیں تھا کہ وہ مارکوس کو دی جانے والی رقوم کا اکاؤنٹ چیک کر سکتی۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹا جانے والا یہ سرمایہ جہاں مارکوس اور امیلڈا کے بیرونی بینک اکاؤنٹس میں محفوظ ہو رہا تھا وہاں اس کا کچھ حصہ اندرون ملک سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے پر بھی صرف ہوتا' اسی اثناء میں اگلے عام انتخابات منعقد ہوئے تو مارکوس کی نیشنلسٹ پارٹی کو فتح یاب کرنے کیلئے روپے کو پانی کی طرح بہایا گیا اس الیکشن میں جس طرح ووٹوں کی خرید و فروخت ہوئی اور دھاندلیوں کا جو عالمی ریکارڈ قائم کیا گیا اس کے متعلق مشہور امریکی جریدہ "نیوز ویک" کے مسٹر مارٹن نے لکھا۔

"میں نے متعدد ایشائی ملکوں کے انتخابات دیکھے ہیں جہاں بلاشبہ کئی غلط ہتھ کنڈے استعمال کئے گئے مگر جو کچھ میں نے فلپائن میں دیکھا اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی"

دولت کی حرص' عیاشی اور ستم رانی' جھوٹ اور فریب کے ان ننگے مظاہروں کا عوام میں جو ردعمل ہونا چاہئے تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں' مارکوس اور امیلڈا بتدریج اپنے ملک میں گالی بنتے چلے گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا سرپرست امریکہ بھی عوامی تنقید کا ہدف بن گیا' کیمونسٹوں کی گوریلا تنظیم "ہکس" سے ہمدردیاں بڑھنے لگیں محنت کشوں' کاشتکاروں اور طلبہ کے جلوس برسر عام مارکوس مردہ باد کے نعرے لگانے لگے یہ کارل مارکس لینن اور ماؤزے تنگ کے نظریات سے متاثر نہیں تھے یہ اس ظالمانہ سماجی اور معاشی نظام کے مخالف تھے جس نے ان کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔

....

فلپائن 1930ء کے آئین میں صدر پر یہ پابندی تھی کہ وہ دو میعادوں کے بعد الیکشن نہیں لڑ سکتا' مارکوس کو یہ فکر لاحق تھی کہ کس طرح آئین میں ترمیم کر کے یہ پابندی ختم کرائی جائے' مشکل یہ تھی کہ 71ء کے جعلی انتخابات اور ان میں ہونے والی دھاندلیوں کے نتیجے میں جو تین سو بیس مندوبین منتخب ہوئے تھے وہ مارکوس کے حق میں یہ فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے' ادھر یہ مطالبہ بھی زور پکڑتا جا رہا تھا کہ آئین میں امریکی بحری اڈوں کو جو تحفظ دیا گیا ہے اور امریکی تاجروں کو سرمایہ کاری کی جو مراعات دی گئی ہیں ان کا خاتمہ کیا جائے' اس صورتحال سے امریکہ بھی پریشان تھا اور مارکوس بھی اور یہ دونوں کسی

ایسی تدبیر کی تاک میں تھے جس سے صورتحال پوری طرح قابو میں آجائے۔

ایک مشکل یہ بھی تھی کہ مسٹر اکینو کی لبرل پارٹی عوام میں مقبولیت حاصل کرتی جارہی تھی اس سے پہلے پارٹی کی ایک کانفرنس میں بموں کے دھماکوں سے اکینو کی جان لینے کی کوشش ناکام ہوچکی تھی وہ اتفاقاً کانفرنس میں وقت مقررہ سے کچھ دیر بعد پہنچے اس سے پہلے بم پھٹ چکے تھے اور اس میں 9 جانیں ضائع ہوچکی تھیں، انتخابات میں پارٹی کے آٹھ امیدوار بھی ان دھماکوں کے نتیجے میں شدید زخمی ہوئے۔ اس واقعہ سے عوام میں غیض وغضب پھیل گیا اور مسٹر اکینو اور لبرل پارٹی کا دائرہ اثر اور پھیل گیا' مسٹر مارکوس نے حسب معمول اس تخریبی کارروائی کیلئے کمیونسٹوں کو ذمہ دار قرار دیا مگر سب جانتے تھے کہ یہ سب کچھ خود حضرت کا کیا دھرا ہے۔

اس صورتحال کا علاج مارکوس نے یہ سوچا کہ مارشل لاء لگا دیا جائے مگر اس سے پہلے ملک میں بدامنی، دہشت پسندی اور لاقانونیت کے وہ حالات پیدا کرنے ضروری تھے جو اس اقدام کیلئے وجہ جواز فراہم کر سکیں۔ سب سے پہلے تو یہ خبر آئی کہ حکومت نے ایک بڑی کشتی پکڑی ہے اور پھر منیلا میں دھماکوں اور تخریبی کارروائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پراسرار موٹر سائیکل سوار آتے اور عمارتوں پر بم پھینک کر غائب ہوجاتے' مارچ میں دو موٹر سائیکل سوار آئے اور انہوں نے او کا بلڈنگ پر بم پھینک کر گراؤنڈ فلور پر تباہی مچا دی اس کے ایک ماہ بعد امپالا میں سوار چار افراد نے فلپائن کی اورینٹ ایئرویز کو بموں کا نشانہ بنایا' مئی میں جنوبی ویت نام کے سفارتخانہ میں دو دستی گرینیڈ پھٹے' جون میں فلپائن ٹرسٹ کمپنی کے دفتر میں تباہی مچی' جولائی میں تین الگ الگ حادثے ہوئے اور ایک ہفتے کے بعد ایک بم سینٹ کی عمارت میں موجود پایا گیا' ظاہر ہے ایک طرف مارکوس کے کارندے اس طرح آبادی میں خوف وہراس پیدا کر کے مارشل لاء کیلئے حالات ساز گار بنا رہے تھے اور دوسری طرف وہ امریکہ کو کمیونسٹوں کی دہشت پسند سرگرمیوں سے ڈرا رہے تھے تاکہ وہ مارشل لاء کے نفاذ میں رکاوٹ نہ بننے پائے' اس زمانے میں فلپائن امریکی سفیر مسٹر بائی روڈ تھے' جن اصحاب نے میری کتاب "اور لائن کٹ گئی" کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے نام سے ناواقف نہیں ہوں گے' یہی وہ صاحب ہیں جنہیں 5 جولائی 77ء سے چند دن پہلے تبدیل کیا گیا تھا اور جن کے اعزاز میں اس وقت چیف آف آرمی سٹاف اور مستقبل کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے الوداعی ضیافت دی تھی' مارکوس فیملی سے ان کے تعلقات اتنے قریبی تھے کہ ان کی اکثر راتیں امیلڈا کے ساتھ ناؤنوش اور رقص وطرب میں گزرتیں' مسٹر کسنجر نے جو اس وقت سیکرٹری آف سٹیٹ تھے امیلڈا کو "بائی روڈ کی گرل فرینڈ" کا نام دے رکھا تھا جب بھی اس کا ذکر آتا وہ بائی روڈ سے کہتے "تمہاری گرل فرینڈ اس مسئلہ میں کیا کہتی ہے" مارکوس کو مسٹر بائی روڈ کا کہنا یہ تھا کہ امریکہ مارشل لاء کو پسند نہیں کرے گا' اگست میں مارکوس اپنے وزیر دفاع کے ساتھ آنے والے دو ماہ میں مارشل لاء لگانے کا فیصلہ کرچکا تھا اس کے لئے تاریخ بھی طے کی جاچکی تھی ایک ایسی تاریخ جو یا تو کسی ماہ کی سات تاریخ

ہو یا جسے سات سے تقسیم کیا جاسکے کیونکہ سات ہندسے کو مارکوس اپنے لئے بہت سعد اور مبارک سمجھتا تھا' اس میٹنگ کے بعد سے اس نے امریکی سفیر سے اکثر مارشل لاء کے نفاذ اور اس پر امریکہ کے ممکنہ ردعمل سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے بات چیت کی تھی۔ بائی روڈ نے ان گفتگوؤں کے دوران اسے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ اگر ایسا ہوا تو امریکہ اپنی امداد بند کر دے گا وہ صرف یہی کہنے پر اکتفا کرتا کہ امریکہ اسے پسند نہیں کرے گا آخر جب مارکوس نے اس سے باقاعدہ سرکاری ردعمل معلوم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ واشنگٹن روانہ ہو گیا جہاں صدر نکسن اور سیکرٹری کسنجر سے ملنے کے بعد اس نے مارکوس کو ان الفاظ میں امریکی ردعمل کی اطلاع دی کہ اگر مارشل لاء کے نفاذ کا مقصد کمیونسٹوں کے اثرات کا خاتمہ کرنا ہو تو امریکہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

امریکہ سے گرین سگنل موصول ہو جانے کے باوجود مارکوس ابھی ملک میں ہنگامی حالات پیدا کرنے میں مصروف تھا' اگست میں کئی دھماکے ہوئے جن میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں' ستمبر میں عوامی مفاد کے مراکز کو نشانہ بنایا گیا' 11 ستمبر کو بجلی کے ایک مرکز میں دھماکہ ہوا جس سے منیلا کا بڑا حصہ تاریکی میں ڈوب گیا اگلے دن صبح پانی سپلائی کرنیوالی پائپ لائن کو دھماکے سے اڑا دیا گیا جس سے ہزاروں گھر پانی سے محروم ہو گئے دھماکوں سے شہر کا وہ ہال بھی محفوظ نہ رہا جہاں آئینی کمیٹی آئین میں اہم ترامیم پر غور کر رہی تھی اور اس وقت تو فلپائن بھر میں تشویش و اضطراب کی لہر دوڑ گئی جب ڈیفنس منسٹر مسٹر این رائل کی کار پر جو باقاعدہ محافظ گاڑیوں کے جلوس میں رواں دواں تھی' نقاب پوش حملہ آوروں نے گولیاں برسادیں کار کے فرنٹ شیشے کرچی کرچی ہو گئے مگر این رائل بچ گئے وہ اپنی کار کے بجائے محافظ گاڑی میں تشریف فرما تھے' ظاہر ہے مصنف خود تو اپنی تصنیف کی زد میں نہیں آسکتا تھا۔

اس آخری حادثہ کے بعد مارشل لاء کے نفاذ کا رستہ ہموار ہو چکا تھا' اسی رات لبرل پارٹی کے لیڈر سینیٹر اکینو کو گرفتار کر لیا گیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

....

ہمارے ملک کے وہ سیاسی راہنما جو پاکستان میں قیام جمہوریت کیلئے "امریکی کارڈ" سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں شائد یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے ہوں کہ جب فلپائن میں مارشل لاء لگا اور امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے اخباری نامہ نگاروں نے اس کا ردعمل دریافت کیا تو جواب تھا "نو کمینٹس"

.........اور اگر ہم ماضی قریب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ڈکٹیٹروں کے ساتھ امریکہ کے ہنی مون کی داستان خاصی طویل نظر آتی ہے' 1970ء میں کمبوڈیا میں پرنس سہانوک کو جنرل لون نول نے اقتدار سے بے دخل کر دیا وہ امریکہ کو ویت نام کی جنگ میں اپنے ملکی وسائل کے استعمال کی اجازت دینے سے انکاری تھا امریکہ اس تبدیلی کے پس پردہ نہ ہو لیکن جنرل سے استوار ہونے والے بعد کے امریکی تعلقات اس فوجی انقلاب کیلئے امریکی حکمرانوں کے رضا و ایما کی ضرور چغلی کھاتے ہیں ایک سال بعد تھائی لینڈ میں

وہاں کے جرنیلوں نے آئین ختم کر دیا پارلیمنٹ برخاست کر دی گئی مارشل لاء نافذ ہو گیا مگر فوجی حکمرانوں نے اعلان کیا کہ وہ تھائی لینڈ میں موجود پانچ بڑے امریکی ہوائی اڈوں سے کوئی تعرض نہیں کریں گے تھائی لینڈ میں جرنیلوں کے اس انقلاب پر امریکہ نے خموشی اختیار کئے رکھی' فلپائن میں مارشل لاء لگا دیا گیا اس پر اپوزیشن لیڈر مسٹر سیم نے بڑا معنی خیز تبصرہ کیا تھا اس نے کہا "جب فلپائن میں مارشل لاء لگا اور امریکہ خاموش رہا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ حادثہ میرے ملک میں بھی ضرور ہو کے رہے گا" یہی صورتحال السلواڈور میں پیدا ہوئی جب ملٹری نے "کرسچین ڈیموکریٹس کے جمہوری دور کو ختم کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی امریکہ کا رد عمل اس وقت بھی سکوت کے سوا کچھ نہ تھا' چلی میں تو جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے خود نکسن اور کسنجر سازشوں میں شریک تھے کیونکہ اس کے منتخب صدر کا قصور یہ تھا کہ وہ کمیونسٹ تھا اور اس کی جگہ برسر اقتدار آنے والا ایک جرنیل تھا جو امریکی مفادات کا تحفظ کر سکتا تھا آج سولہ سال ہونے کو ہیں اور وہی جنرل آگسٹو اب بھی چلی کا حکمران ہے' اس سے پہلے ایران کو دیکھئے وہاں مصدق جیسے منتخب جمہوری وزیراعظم کو نکلوا کر سی آئی اے نے شہنشاہ جیسے ڈکٹیٹر کو بٹھا دیا کیونکہ وہ ان کے نزدیک کمیونزم کا کٹر مخالف تھا اور ایران میں کمیونسٹوں کی سرکوبی کر سکتا تھا' آئزن ہاور کی حکومت نے گوئٹے مالا کی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے میں جرنیلوں کی مدد کی تھی کیونکہ اس کے صدر نے کمیونسٹوں کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا تھا اور اپنے ملک میں زرعی اصلاحات کر رہا تھا' امریکہ کیلئے اصل مسئلہ دوسرے ملکوں میں جمہوریت کا قیام نہیں اپنے مفادات کا تحفظ اور کمیونزم کے خطرے کا مقابلہ ہے اس سلسلے میں ڈکٹیٹر زیادہ مفید مطلب ثابت ہوتے ہیں اس لئے جمہوریت پسندوں سے زیادہ وہ امریکہ کو عزیز ہیں۔

رہا کمیونزم کا خطرہ تو اس کیلئے ضروری نہیں کہ کسی ملک میں واقعی کمیونسٹ پارٹی اتنی سرگرم عمل اور با اثر ہو کہ وہ اپنی کارروائیوں سے حکومت وقت کا تختہ الٹ کر اس پر قابض ہو سکے۔ اس کیلئے سرخ جھنڈے لہرانے والے مزدور' معاشرتی' سماجی اور معاشی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے نوجوانوں کے مظاہرے ہی بہت کافی ہیں' یہ تحقیق کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ان غیر مطمئن بے بس اور مجبور انسانوں کا سرچشمہ افکار اشتراکیت ہے بھی کہ نہیں۔ امریکہ کی یہ ایسی دکھتی رگ ہے کہ اسے جس بھی ڈکٹیٹر نے چھیڑا جواباً امریکہ کی اشیرباد اور امداد دونوں سے مالا مال ہوا مارکوس ہی کو لے لیجئے آج خود امریکی جائزہ نگار لکھتے ہیں کہ جب وہ مارشل لاء کیلئے زمین ہموار کر رہا تھا تو اس دوران منیلا میں امریکی سفارت خانہ کے باہر بھی کئی زبردست مظاہرے ہوئے مگر یہ بات اب طے ہو چکی ہے کہ ان مظاہروں کے جملہ انتظامات اور اخراجات خود مارکوس کی خفیہ پولیس نے برداشت کئے تھے مقصد امریکی حکومت کو کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خائف کرنا تھا اسی طرح جب مارشل لاء کے نفاذ کے وقت مارکوس نے اپنا مشہور PROCLAMATION - 108 جاری کیا تو اس میں بھی یہ کہا گیا تھا کہ "چونکہ یہاں وہ عناصر مسلح جدوجہد کر رہے ہیں جو ملک میں آئینی حکومت کا خاتمہ اور ایک ایسے نظام کا قیام چاہتے ہیں جو ہمارے تصور خدا اور مذہب

کے خلاف ہے اور جس کی اساس مارکس لینن اور ماؤ کے نظریات ہیں اس لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ ان کی سرکوبی کے لئے ملک میں مارشل لاء لگایا جائے ظاہر ہے کہ امریکہ ایک ایسے مقدس مقصد کے حصول کے لئے مارشل لاء کے نفاذ کی مخالفت کیسے کرتا؟

مارکوس کا عبرتناک انجام

(3)..........................

مارشل لاء لگاتے وقت مارکوس نے اعلان کیا کہ وہ فلپائن میں عدل وانصاف کی بنیاد پر ایک نیا معاشرہ تعمیر کرے گا" "پرائیویٹ آرمیز" کو ختم کر دے گا' رشوت ستانی کا نام ونشان مٹا دے گا۔ بے زمینوں کو زمین دی جائے گی' بے گھروں کیلئے گھر تعمیر کئے جائیں گے اور اس میں شبہ نہیں کہ شروع کے دنوں میں اس نے بعض ایسے نمائشی اقدامات بھی کئے جن سے عوام میں یہ امید بندھی کہ شاید ان کے دن پھر جائیں مثال کے طور پر غیر قانونی اسلحہ کے خلاف جو زبردست مہم چلائی گئی اس کے نتیجے میں چھ لاکھ رائفلیں 'بم وغیرہ برآمد کئے گئے' گو اس میں بھی زیادہ نشانہ فلپائنی مسلمان بنے جو آبادی کا کل پانچ فیصد تھے' اسی طرح جرائم کی شرح میں زبردست کمی آ گئی 'منیلا میں اس طرح کی وارداتوں میں نوے فیصد تخفیف ہو گئی' کرفیو آدھی رات سے لے کر صبح تک مؤثر کر دیا گیا' تاکہ لوگ آدھی رات سے پہلے پہلے گھروں میں واپس آ جائیں اور کلبوں اور شراب خانوں میں وقت برباد نہ کریں اس سے بیویوں کو جو خوشی ہو سکتی تھی وہ محتاج بیان نہیں' سالہا سال میں پہلی مرتبہ ان کے خاوند آدھی رات سے پہلے پہلے اپنا وقت گھروں میں گزارنے پر مجبور تھے 'طلبہ کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے قانونا روک دیا گیا' والدین نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب ان کی اولاد دلجمعی سے تعلیم حاصل کر سکے گی 'مذہبی راہنما خوش ہو گئے جب مارکوس نے بلیو فلموں کو خلاف قانون قرار دے دیا اور جوا خانوں پر پابندی لگا دی مگر ان ظاہری اور عارضی اقدامات کے ساتھ ساتھ مارکوس اپنے اصل ہدف سے غافل نہیں تھا اس نے چن چن کر اپنے سیاسی مخالفین کو

جیلوں میں ڈال دیا' تقریباً تیس ہزار سیاسی کارکن گرفتار کر لئے گئے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کمیونسٹوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی جبکہ گرفتار ہونے والوں میں پادریوں' صحافیوں اور اخبارات کے پبلشروں کی بڑی تعداد بھی شامل تھی' اخبارات اور پرائیویٹ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشنوں پر پابندی لگا دی گئی اور ہر مخالف آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

مارشل لاء لگانے کے بعد مارکوس کی پہلی ترجیح آئین میں اپنی من پسند ترامیم کرانا تھا وہی نمائندے جو پہلے قوم پرست رائے عامہ کے زیر اثر اسے آنکھیں دکھا رہے تھے مارشل لاء کے بعد یک لخت اس کے ہاتھوں پر بیعت کرنے لگے' امریکیوں کے بحری اڈے اور ان کا حق تجارت محفوظ کر دیا گیا' آئین کو صدارتی کے بجائے پارلیمانی رنگ دے دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مارکوس کسی میعاد کی قید کے بغیر وزیر اعظم بن سکتا ہے' یہ حق بھی آئین میں اسی کو دے دیا گیا کہ وہ جب بھی مناسب سمجھے (اور اس میں کسی مدت کی قید نہ تھی) وہ پہلے پارلیمانی الیکشن منعقد کرا سکتا ہے' ان آئینی ترامیم پر عوامی تائید کی مہر ثبت کرنے کیلئے ڈکٹیٹروں کے من پسند "ریفرنڈم" سے ملتا جلتا ایک عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا' ایک طرف مارشل لاء کے ضابطوں کے تحت ان ترمیموں پر اظہار خیال کا ہر رستہ بند کر دیا گیا اور دوسری طرف پندرہ سال اور اس سے اوپر کی عمر کے لوگوں پر مشتمل اسمبلیوں میں ان پر بحث و تمحیص کرائی گئی جن کا اہتمام و انعقاد انتظامیہ کے سپرد تھا' ان اسمبلیوں میں کسی خفیہ طریقے کے بجائے ہاتھ کھڑے کرا کر آئینی ترامیم کیلئے رائے شماری کرائی گئی' سوالات اور ان کے سرکاری جوابات کچھ اس طرح کے تھے۔

1: کیا آپ کو اس طرح کی اسمبلیوں کے انعقاد کے ذریعے اپنی عوامی حکومت کے قیام کی بنیاد فراہم کرنا منظور ہے؟ (ہاں......639'290'15 ووٹ نہیں 852'462 ووٹ)

2: کیا آپ کو نیا آئین منظور ہے؟۔ (ہاں........ 561'976'14 ووٹ۔نہیں 689' 743 ووٹ)

3: کیا آپ چاہتے ہیں کہ نومبر 73ء میں الیکشن کرائے جائیں؟ (نہیں 431'14 ووٹ ہاں.......... 721'206'1)

4: کیا آپ مارشل لاء کے حق میں ہیں؟...... (ہاں 518'224'15 ووٹ۔نہیں 051' 843 ووٹ)

اس "منصفانہ" اور "غیر جانبدارانہ" ریفرنڈم ٹائپ رائے عامہ کے اظہار کے بعد کسی اور تردد کی ضرورت ہی کیا تھی مارکوس نے آئین کا حلیہ بھی بگاڑ دیا اور اسے کالعدم اور منسوخ بھی نہیں کیا۔

....

فوری طور پر آئین کے محاذ سے فارغ ہوتے کے بعد مارکوس اور امیلڈا جلب زر اور دولت کے ذخائر اکٹھے کرنے میں جت گئے' مارشل لاء سے پہلے امیلڈا نے لازم کر دیا تھا کہ ہر بڑی کمپنی کے منافع میں اسے

دس فیصد حصہ دیا جائے اب منافع کی یہ شرح 25 فیصد تک جا پہنچی اپنے یوم ولادت کی تقریب پر امیلڈا ہر سال پانچ لاکھ ڈالر کے عطیات اکٹھے کرتی یہ عطیات زیادہ تر چینی تاجروں سے اکٹھے کیے جاتے جنہیں ٹیکس کمشنر ایسا کرنے پر مجبور کرتے اور اگر کوئی زیادہ "چوں چرا" کرتا تو وہ اگلے دن دیکھتا کہ اس کا ویزا جو کئی سال کے لئے تھا یک لخت منسوخ کر دیا گیا ہے' مارشل لاء سے پہلے سی آئی اے نے جو سروے کیا تھا اس کے مطابق صرف 1969ء تک مارکوس اور امیلڈا کئی سو ملین ڈالر جمع کر چکے تھے۔ 76ء میں جو جائزہ لیا گیا اس کے مطابق فلپائن میں تین درجن سے لے کر چار درجن تک بڑی تجارتی کمپنیوں کی مالک امیلڈا تھی اور ان میں کئی بینک بھی شامل تھے۔ دسمبر 75ء میں "کاسموپولیٹن میگزین" نے دنیا کی دس متمول ترین خواتین کے فوٹو شائع کئے' ان میں ملکہ الزبتھ اور کرسٹینا اوناسس کے ساتھ ساتھ امیلڈا کا فوٹو بھی شامل تھا میگزین نے لکھا کہ ہو سکتا ہے ان خواتین میں بھی سب سے زیادہ دولتمند خاتون امیلڈا مارکوس ہو۔

اکتوبر 77ء میں نیویارک کے دورے کے دوران امیلڈا نے ایک دن جو شاپنگ کی اس کی تفصیل خود امریکی اخبارات کے مطابق یہ تھی ایک پلاٹینم کا ہار جو پچاس ہزار ڈالر کا تھا' پچاس ہزار ڈالر ہی میں ایک اور ہیروں کا ہار ڈائمنڈز کے ساتھ ایک پن سیٹ اٹھاون ہزار ڈالر' اس کے دو ہفتے بعد اسی طرح کی ایک اور شاپنگ میں اس نے سونے اور زمرد کے ایک نیکلس اور بریسلیٹ کیلئے ساڑھے چار لاکھ ڈالر خرچ کئے' تین لاکھ ڈالر کی ایک انگوٹھی خریدی اور تین لاکھ ڈالر کے اس نے بعض دوسرے زیورات خریدے گویا ایک دن میں اس نے دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کی شاپنگ کی۔

یہ تو امیلڈا کے صرف ایک دورہ امریکہ کی شاپنگ کی تفصیل ہے اس نے مارشل لاء کے زمانے میں امریکہ کے کئی سرکاری اور غیر سرکاری دورے کئے' اس کے خاوند کو کئی بار سرکاری دعوت پر امریکہ میں شاہانہ استقبال کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ ان سارے مواقع پر اس کی طرف سے کی جانے والی خرید و فروخت' شاندار عمارتوں کے سودے سب امریکی اخبارات کی زینت بنے آج بھی یہ جوڑا اپنے اسی زمانے کی خرید کردہ عالیشان قیام گاہ میں امریکہ کی ایک ریاست میں داد عیش دے رہا ہے "شاید دنیا بھر کے ڈکٹیٹر اپنے برے دنوں کیلئے پہلے ہی سے امریکہ میں اپنے لئے شاندار رہائش کا انتظام کر لیتے ہیں) اس دوران نکسن' کسنجر' گورنر ریگن اور دوسرے بہت سے امریکی اعلیٰ حکام منیلا بھی آتے رہے اور ان کے استقبالیوں اور عیش و عشرت کیلئے مارکوس اور امیلڈا نے جو شاہانہ انتظامات کئے ان کی تفصیل پڑھی جائے تو لگتا ہے جیسے ہم کسی الف لیلوی فضا میں سانس لے رہے ہیں سینیٹر اکینو مارشل لاء کورٹ سے سزائے موت پا کر جیل کی کال کوٹھری میں بند تھے۔ اخبارات پر پابندی تھی' ملک میں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ گو ہر چہار طرف مارکوس کے خلاف نفرتیں پھیلی ہوئی تھیں مگر ہر دوسرے ملک کے ڈکٹیٹر کی طرح مارکوس بھی اسی خیال خام میں مبتلا تھا کہ وہ ملک کا نجات دہندہ ہے اور عوام کے دلوں پر راج کر رہا ہے۔ ایسے میں اس نے عام

انتخابات کا اعلان کر دیا' اپریل 78ء کے یہ انتخابات مارکوس کے خلاف رائے عامہ کے غیض و غضب کا بھرپور اظہار ثابت ہوئے' اس نے دھاندلی کی انتہا کر دی۔ منیلا میں جہاں امیلڈا مارکوس بھی امیدوار تھیں مارکوس کے صوبے سے دو لاکھ بوگس ووٹر درآمد کیے گئے' (یہ امریکی سفارتخانہ کی اس رپورٹ کا حصہ ہے جو اس نے واشنگٹن کو بھیجی تھی) ان میں سے ہر بوگس ووٹر کو ایک سو سے لے کر دو سو پیسے ادا کیے گئے تھے۔ رپورٹ میں یہ بھی تھا کہ مارکوس نے دس لاکھ جعلی بیلٹ پیپر بھی چھپوا رکھے تھے جن کا بے دریغ استعمال ہوا' ٹیچر جو الیکشن سپروائزر کے طور پر کام کر رہے تھے مارکوس پارٹی کی طرف سے دو دو سو پیسے کے حق دار ٹھہرے اس بات کا چرچا ہوا تو لوگ "ٹیچر (استاد) کو چیٹر (دھوکہ باز) کہنے لگے' انتخابات میں ان جعل سازیوں کا زبردست عوامی ردعمل ہوا' پادری تک مارکوس کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے' گرجا گھروں میں مسلسل گھنٹیاں بجنے لگیں ڈرائیوروں نے لگاتار ہارن بجانے شروع کر دیئے' عورتوں نے گھروں میں باورچی خانے کے برتن بجانے شروع کر دیئے۔ طوائفیں بھی پیچھے نہ رہیں وہ بھی احتجاجی جلوس نکالنے لگیں پولیس اور فوج حرکت میں آ گئی۔ سینکڑوں سیاسی کارکن اور مظاہرین گرفتار کر لئے گئے اس زمانے میں صدر کارٹر امریکہ میں حکمران تھے جنہیں بنیادی حقوق کا جتنا درد تھا سب کو معلوم ہے مگر امریکی سفارت خانہ کی ان رپورٹوں کے باوجود الیکشن کے نتائج پر امریکی حکومت کا تبصرہ یہ تھا "A STEP TOWARDS EVENTUAL RESTORATION OF REPRESENTATIVE GOVERNMENT"

(یہ الیکشن نمائندہ حکومت کی بحالی کی طرف ایک قدم ہے)

....

78ء کے الیکشن کے بعد کے سال فلپائنیوں کے لئے قیامت کے سال تھے' امیلڈا کو منیلا کا گورنر بنا دیا گیا اسے کابینہ میں باقاعدہ وزیر بنا دیا گیا اور اس کے زرخیز ذہن نے سیاسی قیدیوں کی اذیت رسانی کیلئے ایسے ایسے نادر طریقے ایجاد کیے کہ جن کی تفصیل سن کر انسانیت خون کے آنسو روتی ہے' امریکی ذرائع ابلاغ میں اے بی سی (A B C) نیٹ ورک کا جو مقام ہے سب جانتے ہیں اس کے ایک نمائندے کو منیلا کے ایک جیل خانے میں کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا اس نے پچیس قیدیوں کے انٹرویو ریکارڈ کیے جو بعد میں امریکہ میں نشر ہوئے تو کھلبلی مچ گئی' قیدیوں نے بتایا کہ کس طرح انہیں ننگا کر کے اور پانی چھوڑ کر بجلی کے شاک لگائے جاتے ہیں بعض صورتوں میں ان کی شرم گاہوں کے ساتھ تار جوڑ کر یہ شاک دیئے جاتے' عورتوں کی چھاتیاں بھی اس سے محفوظ نہ رہتیں' مارکوس گورنمنٹ نے امریکن براڈ کاسٹنگ کمپنی سے یہ انٹرویو نشر ہونے کے خلاف امریکی حکومت سے احتجاج کیا تو اسے پیشکش کی گئی کہ وہ فلپائن کے مثبت پہلوؤں پر مبنی اپنا پروگرام بھی جوابی کارروائی کے طور پر پیش کر سکتی ہے۔ مسٹر اکینو بھی جیل میں تھے کہ انہیں سینے میں شدید درد اٹھا سرکاری ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ انہیں فوری طور پر بائی پاس کی ضرورت ہے ورنہ ان کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ مارکوس اگر فلپائن میں کسی شخص سے خائف تھا تو وہ اکینو تھے اس نے فوراً امیلڈا کو جیل خانے میں اکینو سے ملاقات کیلئے بھیجا' اسے ڈر پیدا ہو گیا کہ اگر یہ شخص

کہیں جیل میں مر گیا تو عوامی احتجاج کے طوفان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا ادھر امریکی حکومت سے اس نے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ اگر اکینو کو امریکہ بھیج دیا گیا تو فلپائن کے اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے نہ تو مسٹر کارٹر اسے انٹرویو دیں گے اور نہ ہی اسے کوئی سرکاری استقبالیہ دیا جائے گا۔ پریس پر بھی نظر رکھی جائے گی کہ وہ اسے زندہ شہید کا درجہ نہ دے دے۔ امریکہ کی یقین دہانیوں سے مطمئن ہو کر مئی 1980ء میں سینیٹر اکینو کو رہا کر کے امریکہ جلاوطن کر دیا گیا تاکہ وہ وہاں علاج کرائیں اور باقی ماندہ عمر وہیں گزار دیں۔

اسی سال کارٹر کا دور ختم ہوا اور ریگن امریکہ کے صدر منتخب ہوئے، ریگن اور نینسی ریگن 1969ء سے مارکوس اور امیلڈا کے دوست چلے آرہے تھے، ریگن کی فتح مارکوس کی ذاتی فتح تھی ابھی ریگن سرکاری طور پر وائٹ ہاؤس میں نہیں پہنچ پائے تھے کہ امیلڈا امریکہ پہنچ گئی اس نے ریگن سے ایک گھنٹہ ملاقات کی اس سے قبل ریگن کو حلف اٹھانے سے پہلے صرف ایک ہی غیر ملکی راہنما مل سکا تھا اور وہ جرمنی کا وائس چانسلر تھا مگر اس کی ملاقات بھی صرف پندرہ منٹ کی تھی امیلڈا واپس فلپائن پہنچی تو اس کے خاوند نے ریگن کے حلف اٹھانے سے پہلے فلپائن سے مارشل لاء اٹھانے کا فیصلہ کر لیا، ایک ماہ بعد پوپ بھی فلپائن آنے والے تھے اور مارکوس نہیں چاہتے تھے کہ ان کے دورے کے دوران جبکہ دنیا بھر کی توجہ فلپائن کی جانب ہوگی، یہاں پر مارشل لاء نافذ رہے لیکن مارشل لاء اٹھانے سے پہلے مارکوس نے مارشل لاء کے دور کی تمام طاقت اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مکمل انتظام کر لیا، اس نے مارشل لاء کے دور کے تمام ضابطوں کو قانونی شکل دے دی سب سے بڑھ کر اس نے یہ کام کیا کہ 73ء کے آئین میں (ہاں ہاں فلپائن میں بھی 73ء کا آئین تھا) اس نے چھٹا ترمیمی بل منظور کرایا (خیال ہے کہ یہ آٹھواں ترمیمی بل نہیں تھا چھٹا ترمیمی بل تھا) جس میں کہا گیا تھا کہ

"WHENEVER IN THE JUDGEMENT OF THE PRESIDENT THERE EXISTED A GRAVE EMERGENCY OR THREATOR WHEN THE ASSEMBLY FAILS OR IS UNABLE TO ACT ADEQUATELY ON ANY MATTE FOR ANY REASON THAT IS HIS JUDGEMENT REQUIRES IMMEDIATE ACTION THE PRESIDENT MAY ISSUE THE NECESSARY DECREES, ORDERS ORDERS OR LETTERS OF INSTRUCTION WHICH SHALLL FORM PART OF THE LAW OF LAND."

یعنی جب کبھی صدر کے فیصلے کے مطابق ہنگامی یا خطرناک صورتحال ہو یا جب کبھی اسمبلی ناکام ہو جائے یا وہ مناسب انداز میں کام کر سکنے کے ناقابل ہو یا صدر کے اندازے کے مطابق کوئی بھی بات اور کوئی بھی سبب اس بات کا متقاضی ہو صدر ضروری قوانین واحکام اور ہدایت ناموں کا اجراء کر سکتا ہے جو فوری طور پر ملکی قانون کا حصہ بن جائیں گے"

اس چھٹے ترمیمی بل پر 82ء میں جنیوا کے "انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس" نے بڑا شاندار تبصرہ کیا تھا' کمیشن نے کہا کہ جب تک یہ ترمیم موجود ہے فلپائن میں نارمل جمہوری حکومت کا قیام ناممکن ہے اس کے ہوتے ہوئے مارشل لاء اٹھانے یا نہ اٹھانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

مارکوس کا عبرتناک انجام

(4)

مارشل لاء اٹھانے کے بعد مارکوس نے صرف اسی چھٹے ترمیمی بل پر اکتفا نہیں کیا' 81ء میں اس نے آئین میں ایک اور بنیادی ترمیم کی۔ 73ء کے آئین میں آئینی کمیٹی نے پارلیمانی نظام اختیار کر لیا تھا' مارکوس کی ترمیم سے ملک پھر 35ء کے آئین کے مطابق صدارتی نظام کی طرف پلٹ گیا تھا' اسے نواں ترمیمی بل کہا گیا' اس کی رو سے صدر کے عہدے کی میعاد چھ سال کر دی گئی اور ایک آدمی کیلئے لاتعداد مرتبہ صدر بننا ممکن بنا دیا گیا اسے یہ بھی اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کر سکے اور اسمبلی کو توڑ سکے' صدر کی کم سے کم عمر پچاس سال طے کر دی گئی' مقصد یہ تھا کہ اس طرح اکینو میدان میں نہ آ سکے جو اگلے صدارتی الیکشن کے وقت مطلوبہ عمر سے چند ماہ چھوٹا ہوتا اس ترمیمی بل کیلئے ملک میں ریفرنڈم کرایا گیا اور آمروں کے ریفرنڈم کی جو شان ہوتی ہے وہ کس کو معلوم نہیں۔ توقع کے مطابق ننانوے فیصد عوام نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیا اب اگلا مرحلہ صدارتی الیکشن کا تھا۔ جون 81ء میں یہ ڈرامہ بھی رچایا گیا' اپوزیشن پارٹیاں اس سارے منظر سے اتنی دل برداشتہ تھیں کہ انہوں نے الیکشن میں حصہ لینے کی بھی تکلیف نہیں کی۔ مارکوس 86 فیصد ووٹوں کی اکثریت سے صدر منتخب ہو گئے۔ امریکہ کا ردعمل اس موقع پر بھی بے حد دلچسپ تھا' امریکی ایوان نمائندگان میں مارشل لاء اٹھانے پر مارکوس کو مبارکباد پیش کرنے کی ایک قرارداد منظور ہوئی اور قرارداد کس نے پیش کی جمہوریت کے مشہور چیمپئن سینیٹر سولارز نے! صدر ریگن نے مارکوس کی کامیابی پر تہنیت کا ذاتی پیغام بھیجا اور حلف وفاداری کی تقریب میں نائب صدر بش شریک ہوئے جہاں

مارکوس کیلئے جام صحت تجویز کرنے کیلئے انہوں نے ارشاد فرمایا۔
"WE LOVE YOUR ADHERENCE TQ DEMOCRATIC PRICIPLE AND TO DEMOCRATIC PROCESSESS"
(ہمیں آپ کے جمہوریت کے ساتھ ثابت قدم لگاؤ اور جمہوری طور طریقوں پر ناز ہے)

....

اور جمہوریت کے ساتھ مارکوس کے ثابت قدم لگاؤ کا حقیقی مظاہرہ 21 اگست 83ء کو ہوا جب مسٹر اکینو کی لاش منیلا ایئرپورٹ پر تڑپ رہی تھی"
مسٹر اکینو کافی عرصہ سے وطن واپس جانے کیلئے بیتاب تھے۔ ان کی واپسی کی افواہیں سن کر امیلڈا نیویارک پہنچی اور اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یہ ارادہ دل سے نکال دے "کمیونسٹ دہشت پسند بہت سرگرم ہیں" امیلڈا نے کہا "تمہاری واپسی پر کچھ بھی ہو سکتا ہے' میں تمہیں امریکہ میں بزنس کیلئے منہ مانگی رقم دے سکتی ہوں' فلپائن واپس آکر کیا کرو گے؟" مگر اکینو نے یہ پیشکش مسترد کر دی وہ وطن واپسی کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔
اصل میں 83ء کے اوائل ہی سے اسے یہ اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ مارکوس سخت بیمار ہے وہ کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ ایسے میں امیلڈا کیلئے میدان کھلا چھوڑنا عقل مندی نہیں ہو گی چنانچہ جب نیویارک ٹائمز میں اکینو نے خبر پڑھی کہ مارکوس تین ہفتے کیلئے خلوت گزیں ہو رہا ہے تاکہ وہ اپنی دو کتابیں مکمل کر سکے تو اکینو کو یقین ہو گیا کہ مارکوس ہسپتال میں داخل ہو رہا ہے اس لئے اس وقت فلپائن کو اس کی ضرورت ہے۔ اکینو جانے کو تو جا رہا تھا مگر اسے اندازہ تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔ فلپائن میں اس کے جانے کو بڑی شہرت ملی' اخبار نویسوں اور کیمرہ مینوں کی ایک پوری جماعت اس کے ہمراہ تھی اس نے دوران سفر جاپانی ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین کو کہا
"تمہیں اپنے کیمرے کے ساتھ ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت ہو گی' کیونکہ تین چار منٹ میں ہی میرا خاتمہ ہو سکتا ہے' کہیں ایسا نہ ہو میں مارا جاؤں اور تم اس منظر کو فلما ہی نہ سکو"
جہاز سے اترنے سے کچھ ہی وقت پہلے وہ باتھ روم میں گیا اس نے اپنے سفاری سوٹ کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہنی اور باہر نکل کر کہا "اب گولی صرف میرے سر ہی میں ماری جا سکتی ہے" اور بعینہٖ یہی کچھ ہوا' وہ جہاز سے اتر ہی رہا تھا کہ بائیں کنپٹی میں اسے گولی مار دی گئی وہ وہیں ڈھیر ہو گیا' اس کے قریب ہی مبینہ حملہ آور "رولانڈو گالمن" کی لاش گری جسے اکینو کی حفاظت کیلئے آنے والے فوجی دستہ نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا' کہا گیا کہ قاتل کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا اور وہ ایک مانا ہوا تخریب کار تھا۔
سی آئی اے کی رپورٹ کے مطابق قتل کا منصوبہ فلپائن کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ویر نے بنایا تھا۔
WALTZING WITH A DICTATOR
کے مصنف کے مطابق مارکوس نے قتل کی رات سونے سے پہلے اور اس صبح جاگنے کے بعد جس آدمی سے بات کی وہ جنرل ویر تھا' مارکوس اور جنرل ویر دونوں بچپن کے دوست اور ساتھی تھے۔ جب پہلے پہل

مارکوس کانگریس کاممبر منتخب ہواتو ویر جواس وقت کافٹیلری میں کیپٹن تھااس کاباڈی گارڈ اور شوفر مقرر ہوا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد قصر صدارت کی سکیورٹی کاانچارج مقرر کیا گیا۔ 81ء میں وہ نیشنل انٹیلی جنس اور سکیورٹی ایڈ منسٹریشن کاسربراہ اور چیف آف آرمی سٹاف مقرر ہوا۔ شواہد یہ ہیں کہ اکینو کے قتل سے سترہ دن پہلے جنرل ویر نے جس کی سالانہ تنخواہ پانچ ہزار ڈالر سے زیادہ نہ تھی لاس اینجلز میں پچاس لاکھ ڈالر کاایک ہوٹل خریدا اور اکینو کے قتل کے دوماہ بعد اس کی داشتہ مسز کم نے نیویارک کے فیشن ایبل علاقوں میں تین بنگلے خریدے' یہ دولت یک لخت جنرل ویر کے پاس کہاں سے آگئی تھی اس کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں' جنرل ویر' قتل کے منصوبے میں براہ راست ملوث تھا اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس نے کچھ وقت پہلے ایئر فورس کے جہازوں کو فضا میں بھیجا تھا تاکہ وہ اکینو کے جہاز کو دوسرے ہوائی اڈے پر اتار سکیں جہاں عوام کا ہجوم نہ تھا اور آسانی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا۔

امریکہ کے لئے فلپائنی عوام کے زبردست ہیجانی ردعمل کو ہضم کرنا آسان نہ تھا' اکینو کا قتل مارکوس سے امریکہ کی برگشتگی کا نکتہ آغاز بن گیا' امریکی حکومت نے سخت ترین الفاظ میں اکینو کے قتل کی مذمت کی گو اس میں مارکوس حکومت پر کوئی الزام نہ تھا لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے تھے کہ فلپائنی عوام کے اعصاب پر بوجھ بن جانے والا مارکوس اب زیادہ عرصہ امریکی حکومت کا چہیتا نہیں رہے گا' صدر ریگن چند ہفتوں بعد انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کے ساتھ فلپائن کا دورہ کرنے والے تھے مگر انہوں نے امریکی پریس کے زبردست تنقیدی رجحان سے بچنے کیلئے پورا دورہ ہی منسوخ کر دیا' پھر بھی مارکوس ابھی تک حرف غلط نہیں بن پایا تھا' امریکی نائب صدر بش نے دورے کی منسوخی کے بعد" اے بی براڈ کاسٹنگ" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا

"ہم ایک ایسے دوست سے کس طرح مقاطعہ کر سکتے ہیں جو بنیادی حقوق کے معاملے میں کتنا ہی غلط کار کیوں نہ ہو مگر بہر حال ہمارے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔"

یہ بلعینہ ویسے ہی الفاظ تھے جو ایک زمانے میں صدر روز ویلٹ نے گوا کے ڈکٹیٹر مسٹر سموزا کے مجوزہ دورہ امریکہ پر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ردعمل کے جواب میں کہے تھے۔ مسٹر روز ویلٹ نے کہا

"HE MAY BE A SON OF A BITCH BUT ATLAST HE IS OUR SON OF A BITCH

"وہ کتیا کا بچہ ہو سکتا ہے مگر کم سے کم وہ ہمارا اپنا کتیا کا بچہ ہے"

....

امریکی حکومت واشنگٹن میں اس حادثہ پر آتش زیر پا ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر فلپائن میں امریکی سفارت خانہ ضرور مارکوس کے کنٹرول سے آزاد ہو گیا' مسٹر آرماکوسٹ اس وقت امریکی سفیر تھے وہ مسز اکینو سے ملے اور امریکی حکومت کی طرف سے ان کے ساتھ تعزیت کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے رائے عامہ کے مارکوس مخالف حلقوں سے بھی ملاقاتیں شروع کر دیں۔ گو آٹھ مہینے کے اندر ان کا تبادلہ ہو گیا اور امیلڈا

نے اس تبادلے کو اپنی ذاتی کوششوں کا نتیجہ قرار دیا لیکن پھر بھی آرماکوسٹ امریکی حکومت سے یہ منوانے میں کامیاب ہوگئے کہ مارکوس کو ملک میں جمہوریت بحال کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ہر ممکن دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے' وہ چاہے اپنے قائمقام کے طور پر اپنے وزیر دفاع جنرل این رائل کو نامزد کر دے یا (امیلڈا مارکوس کے سوا) کسی اور کو مگر اب اسے اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ جوں جوں امریکی دباؤ بڑھتا جارہا تھا مارکوس کے ظلم وستم اور آمرانہ ہتھ کنڈوں میں شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ قتل وغارت کا بازار ایک مرتبہ پھر گرم ہو گیا' مخالفین کو چن چن کر ٹھکانے لگایا جانے لگا' جو وکلاء ایسے مقدمات لیتے انہیں یا تو گرفتار کر لیا جاتا یا نامعلوم لوگ انہیں گولی کا نشانہ بنادیتے وہ چرچ اور پادری بھی جو مارکوس کے خلاف مظاہرین کے اجتماع میں متحرک تھے اس داروگیر سے نہ بچ سکے۔ امریکی دباؤ اور اندرون ملک ان وارداتوں اور پھیلتی ہوئی بے چینی نے مارکوس کو مریض بنادیا وہ صرف چار گھنٹے کام کرتا باقی وقت آرام کرنے یا لایعنی گفتگو میں گزار دیتا۔ حکومت عملاً امیلڈا کے ہاتھ میں تھی اور وہ اپنے من پسند شغل، دولت سمیٹنے میں ہمہ تن مشغول تھی۔

مارکوس آئینی طور پر 87ء تک صدر کے عہدے پر فائز رہ سکتا تھا وہ چاہتا تو اس کے بعد جنرل این رائل یا اپنے بیٹے اور بیٹی کو اپنی جگہ نامزد کر سکتا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں زوال دبے پاؤں آتا ہے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ مارکوس کو امریکہ پر اپنی مقبولیت ثابت کرنے کیلئے اینٹرم انتخابات کرانے کی سوجھی' امیلڈا ان دنوں سوویت یونین کے دورے پر تھی' کہتے ہیں اس سے مشورہ کئے بغیر امریکی ٹیلی ویژن کے مشہور "برنکلے شو" میں مارکوس نے عبوری الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا۔ معروف کالمسٹ جارج دل نے سوال کیا۔

"مسٹر پریذیڈنٹ! عام طور پر سمجھا جارہا ہے کہ اب آپ کا مینڈیٹ ختم ہو گیا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ آپ الیکشن کی تاریخ مقرر کر کے اپنا حق ثابت کر دیں کیا آپ آٹھ مہینوں میں الیکشن کرانے کو تیار ہیں؟"

مارکوس نے بپھر کر جواب دیا۔

"میں آٹھ مہینوں سے بھی پہلے الیکشن کرانے کو تیار ہوں بلکہ تین مہینوں میں یا اس سے بھی کم عرصے میں"

دوسرے نامہ نگار نے پوچھا

"مسٹر پریذیڈنٹ! کیا اس میں ہر شخص حصہ لے سکے گا' مثال کے طور پر کیا کوری اکینو الیکشن لڑ سکے گی؟"

"ہاں ہاں ہر شخص کو آزادی ہو گی" مارکوس نے کہا۔

7 فروری الیکشن کی تاریخ مقرر ہوئی تو پورا فلپائن مارکوس کے خلاف حرکت میں آ گیا پادری' طلبہ' خواتین' مزدور سبھی طبقات متحد ہو گئے' اپوزیشن پارٹیوں نے مسٹر اکینو کی بیوہ مسز کوری اکینو کو اپنا امیدوار نامزد کر

دیا' ادھر مارکوس سے ایک غلطی یہ بھی ہوئی تھی کہ "بر نکلے شو" میں نامہ نگاروں کی اکساہٹ پر اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کے تحت مارکوس نے بیرونی مبصرین کو بھی فلپائن آکر انتخابات دیکھنے کی دعوت عام دے دی' نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندے ہزاروں کی تعداد میں فلپائن میں جمع ہو گئے۔ الیکشن میں دھاندلی جتنی بھی ہو سکتی تھی' ہوئی مگر بپھرے ہوئے عوامی طوفان کے سامنے اس کی کیا حقیقت تھی۔ نیشنل اسمبلی نے ووٹوں کے بعد جعل سازی کی انتہا کر دی اعلان ہوا کہ مارکوس جیت گیا ہے۔ اس نے 5308 ووٹ حاصل کیے ہیں۔ ادھر کوری اکینو نے اعلان کر دیا کہ میں جیت گئی ہوں اور میں نے 60 اور 70 فیصد کے درمیان ووٹ حاصل کیے ہیں۔ اب فلپائن دو حصوں بلکہ دو متوازی حکومتوں میں بٹ گیا۔ ایسے میں فوج کے ایک حصے نے بھی مارکوس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جنرل این رائل جو اب تک مارکوس کا نفس ناطقہ تھا' بغاوت کا علم لے کر میدان میں آ گیا۔ مارکوس کی فوجیں باغی فوجوں پر حملہ کرنے نکلیں تو فلپائنی عوام ٹینکوں کے بالمقابل آ گئے۔ صدر ریگن اور ان کی حکومت یہ نقشہ دیکھ کر پہلے ہی مارکوس کی حمایت سے دست بردار ہو چکے تھے۔ مگر ریگن نے پھر بھی دوستی نبھائی وہ نہیں چاہتا تھا کہ مارکوس شہنشاہ ایران کی طرح مارا مارا پھرے۔ کوئی ملک اس کو داخل ہونے کی اجازت دینے کو تیار نہ ہو اس نے مارکوس کو پیشکش کی کہ امریکہ اسے پناہ اور بحفاظت فلپائن سے اخراج کی ضمانت دینے کو تیار ہے۔

ایک رات نو بجے منیلا میں چار امریکی ہیلی کاپٹر اترے' قصر صدارت سے مارکوس امیلڈا ان کے بچوں اور جنرل ویر کو بٹھا کر یہ ہیلی کاپٹر پھر سے محو پرواز ہو گئے۔ ان کا رخ امریکہ کی جانب تھا جہاں فلپائن کا یہ فرعون اپنی زندگی کے ایام کسمپرسی میں گزارنے جا رہا تھا۔ دور امریکی سفارت خانے کی چھت سے امریکی سفیر مسٹر باسورتھ اپنے رفقاء کے ساتھ ہیلی کاپٹروں کو اڑتے دیکھ رہا تھا۔ جونہی وہ فضا میں بلند ہوئے باسورتھ ٹیلیفون کی طرف دوڑا وہ کوری اکینو کو فون کر رہا تھا۔

"مادام پریذیڈنٹ! آپ کو بہت بہت مبارک ہو"

....

مضمون میں جو واقعات اور حوالہ جات آئے ہیں ان کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔

(1) WALTZING WITH DICTATOR (2) THE MAN WHO RAPED A NATION

مزید تفصیلات کیلئے قارئین ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

سیاسیات

بھارتی جریدے سے میرا انٹرویو

ماضی میں زندہ رہنا نہ فرد کے لئے اچھی چیز ہے نہ کسی قوم کے لئے ' حال اور مستقبل کی فکر اس سے زیادہ دامن گیر ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالم میں ماضی کے مباحث میں بہت کم چھیڑتا ہوں۔ تحریروں میں اس جانب کہیں کہیں اشارے ہوتے ہیں اور بس 'مگر پچھلے دنوں ایک مشہور بھارتی جریدے "دہلی ریکارڈر" کے ایڈیٹر مسٹر راج پال چودھری مجھ سے ملنے آئے تو ان کیلئے دلچسپی کا یہی ایک موضوع تھا اور مہمان کے پاس خاطر سے مجھے اس پر روشنی ڈالنی پڑی ' ویسے بھی دیکھا جائے تو ذوالفقار علی بھٹو کی موت ہماری تاریخ سیاسیات کا کوئی معمولی واقعہ نہیں اس نے ہمارے ماضی ہی کو نہیں حال اور مستقبل کو بھی بے طرح متاثر کیا ہے اس کے اسباب و عوامل پر تو شاید بے لاگ تبصرہ مستقبل کے مورخ ہی کریں گے لیکن چند سوال ایسے ہیں، جو ہر سوچنے سمجھنے والے شخص کو آج بھی پریشان کرتے ہیں ' میں نے اپنے انٹرویو میں کسی پر الزام لگانے کے بجائے یہی سوال اٹھانے کی کوشش کی تھی ہمارے پریس میں خبر رساں ایجنسیوں کے حوالے سے اس انٹرویو کا جو خلاصہ شائع ہوا ہے اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ آج کی صحبت میں "دہلی ریکارڈر" کے اسی انٹرویو کا مکمل متن پیش کیا جا رہا ہے مگر اس سے پہلے قارئین اپنے ذہنوں میں وہ سوال تازہ کر لیں جن کے بغیر اس المیے کی صحیح تصویر نہیں کھینچی جا سکتی ' وہ سوال یہ ہیں۔

1: کالعدم پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد مذاکرات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے تصادم کا راستہ اختیار کیوں کیا؟

2: عدالت عالیہ کا بائیکاٹ کرنے کے بجائے یہ کیس قانونی بنیادوں پر کیوں نہیں لڑا گیا؟

3: مقدمہ لڑنے کے لئے کسی فوجداری قانون کے ماہر وکیل کا انتخاب کرنے کے بجائے اس دور کے

ٹارنی جنرل (جو بذات خود شریف اور محب وطن پاکستانی ہیں) کو نامزد کیوں کیا گیا جو بوجوہ عدلیہ کے حلقوں میں زیادہ مقبول نہیں تھے؟

4: اگر کیس کو سیاسی رنگ ہی دینا مقصود تھا تو بعد کے مرحلوں میں اس تسلسل کو جاری کیوں نہیں رکھا گیا؟

5: بھٹو مرحوم کی زبان سے سپریم کورٹ پر کامل اعتماد کا اظہار کیوں کرایا گیا؟

6: عدالت میں مرحوم سے یہ بیان دلانے کی کیا ضرورت تھی کہ انہوں نے حسنہ شیخ سے شادی نہیں کی؟

7: سپریم کورٹ میں شعر خوانی اور لمبی لمبی تقریروں کے ذریعے کیس کو اتنا لمبا کیوں کھینچا گیا کہ وہ دو جج ریٹائر ہو گئے، جو اگر بنچ پر رہتے تو شاید فیصلہ میں عددی اکثریت کسی اور طرف ہوتی؟

8- جیل میں مرحوم سے پارٹی کے ان لوگوں کو کیوں ملنے نہیں دیا گیا جو تصادم کے بجائے مصالحت پر یقین رکھتے تھے، صرف وہی افراد کیوں ملتے رہے، جو صرف فوج سے تصادم چاہتے تھے اور جو مرحوم کو آخری وقت تک یہی یقین دلاتے رہے کہ کوئی آپ کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتا؟

9: جب میں نے مس بینظیر بھٹو سے مل کر جنرل ضیاء الحق اور مسٹر بھٹو میں مفاہمت کرانے کی پیشکش کی اور پھر اسے پشاور کی ایک میٹنگ میں بھی دھرایا (جو باقاعدہ ریکارڈ پر ہے) تو اس پیشکش کو کیوں مسترد کر دیا گیا؟

10: مجھے اپنی مصالحانہ کوششوں کی وجہ سے بغیر چارج شیٹ دیئے بیگم صاحبہ نے پارٹی سے کیوں نکال دیا؟ حالانکہ میں پارٹی کا سیکرٹری جنرل تھا اور وہ اس طرح کے کسی اقدام کی آئینی طور پر مجاز نہیں تھیں۔

11: میری یہ مصالحانہ کوششیں عدالت کے فیصلے پر تو اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں لیکن صدر مملکت سے رحم کی اپیل کے وقت ان کا نتیجہ بر آمد ہو سکتا تھا۔

12: جب سپریم کورٹ سے سزائے موت کی توثیق ہو گئی تو اس وقت سڑکوں پر نکلنے اور تصادم کے عمل کو جاری رکھنے کے بجائے یک لخت مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے رحم کی اپیل کرنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟

13: اگر صدر سے مذاکرات کرنا جرم تھا تو فیصلہ سزائے موت کے بعد پارٹی کے ایک دو لیڈروں نے صدر سے کیوں ملاقات کی اور اس موقع پر اپنے بیانوں کے ذریعے قوم کو کیوں یہ یقین دلایا کہ سزائے موت پر عملدرآمد نہیں ہو گا؟

یہ چند سوال ایسے ہیں جن کا صحیح جواب حاصل کئے بغیر کوئی بھی مؤرخ اس المیے کا باب قلمبند نہیں کر سکتا۔ بھارتی صحافی سے گفتگو کرتے ہوئے یہی سوالات میرے ذہن میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور میں ان کی روشنی میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ جب آخری لمحوں میں مرحوم کو پھانسی چڑھایا جا رہا ہو گا تو وہ یہی کہہ رہے ہوں گے کہ۔

لاؤ تو قتل نامہ ذرا! میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

ان ابتدائی گزارشات کے بعد اب انٹرویو کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے (اصل انٹرویو انگریزی زبان میں تھا)

س: نیازی صاحب، کیا آپ ہمیں مسٹر بھٹو کے آخری دنوں کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟

ج: اس سلسلے میں بہت سی بے سروپا داستانیں مشہور ہیں کہ ان پر جیل میں تشدد کیا گیا اور انہیں مارا پیٹا گیا۔

مجھے کہنے دیجئے کہ یہ سب کہانیاں بے بنیاد ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ آخری ایام میں ایک یکہ و تنہا انسان تھے ایک ایسے انسان جنہیں ان کے قریب ترین دوستوں نے بھی حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ جس روز انہیں پھانسی دی گئی، بعض لوگ ان کے دو قریبی دوستوں کے ہاں اظہار تعزیت کیلئے پہنچے، انہیں یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ وہ دونوں قہقہے لگا رہے تھے اور جام پر جام لنڈھا رہے تھے، انہیں اس واقعے کا سرے سے کوئی احساس نہیں تھا اصل میں ان لوگوں کا اندازہ یہ تھا کہ مردہ بھٹو ان کی سیاست کے لئے زیادہ کار آمد ہو گا اور وہ اس کے مرنے کے بعد اس کی مقبولیت اور اس کے وسائل سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

س: کیا یہ لوگ ابھی تک کالعدم پیپلز پارٹی کے ممبر ہیں۔

ج: جی ہاں! جناب نہ صرف ممبر ہیں بلکہ یہی لوگ تو پارٹی چلا رہے ہیں۔ تحریک چلانے کا مناسب وقت تو وہ تھا جب سپریم کورٹ نے سزائے موت کی توثیق کر دی تھی، اس وقت پارٹی کی قیادت نے لوگوں کو باہر نکلنے کیلئے کیوں نہیں کہا؟ وہ مظاہرۂ طاقت جو اِس وقت کالعدم پی پی پی کی قیادت نے سندھ میں کیا ہے اگر اُس وقت کیا جاتا تو حالات یقیناً مختلف ہو سکتے تھے جب سپریم کورٹ نے فیصلہ سنا دیا تو پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس تین دن تک اسلام آباد میں ہوتا رہا، میں اس وقت پارٹی میں نہیں تھا اس لئے میں نے اس اجلاس میں شرکت نہیں کی تاہم میں نے ایک پیغام کے ذریعے پارٹی کی مرکزی قیادت کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ لوگوں کو مظاہرے کرنے کی کال دے لیکن تین دن کے اجلاس کے بعد پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ صدر مملکت سے رحم کی اپیل کی جائے، اگر سارے مسئلہ کا حل رحم کی اپیل ہی تھا تو پھر ہمیں صدر سے مذاکرات کا راستہ شروع ہی سے بند نہیں کر دینا چاہئے تھا۔

"مساوات" اخبار پارٹی کا ترجمان تھا اور وہ اپنے پاس سے بیگم بھٹو کے نام پر بیان لگا دیا کرتا تھا لیکن اس موقع پر اس نے بھی بیگم صاحبہ کے نام پر عوام سے کوئی اپیل نہیں کی۔

س: کیا بیگم بھٹو بھی اس سازش کا حصہ تھیں؟

ج: یقیناً وہی تو سارے معاملے کی انچارج تھیں، وہ پارٹی کی سربراہ بھی تھیں اور پورے کیس کی نگران بھی۔

س: مگر بیگم صاحبہ اراداً ایسا کیوں کریں گی؟

ج: اس کے بہت سے اسباب ہیں، یوں سمجھئے یہ ایک ناگفتہ بہ داستان ہے۔

س: کیا آپ اس میں کوئی نیت کی خرابی دیکھتے ہیں

ج: میرا خیال ہے کہ جس طرح مقدمہ کی کارروائی چلائی گئی جس طرح مارشل لاء سے تصادم کا راستہ اختیار کیا گیا کہ اس نکتے سے واپسی کا امکان ہی نہ رہا اور جس طرح مرحوم کو اندھیرے میں رکھا گیا یہ سارا کچھ بہت حیران کن ہے میں اس سارے معاملے کے بارے میں تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔

س: یہ سب کچھ بہت اندوہناک ہے!

ج: کیا مسٹر چودھری! میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ یہ پہلا موقع ہے جب میں اس موضوع پر بر سر عام بات کر رہا ہوں۔ میرے بعض قریبی احباب میرے ان خیالات سے ضرور واقف ہیں لیکن عوام کے سامنے ابھی

تک میں نے اپنا نقطہ نظر پیش نہیں کیا میرے خیال میں یہ کہانی پاکستان کے سیاسی مستقبل سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے۔

س: کیا آپ بینظیر کے بارے میں بھی ایسا ہی کہیں گے؟

ج: نہیں، میں نہیں سمجھتا کہ اس سارے معاملہ سے اس غریب کا کوئی تعلق ہے وہ تو بچی ہے اسے ان ساری تفصیلات کا کیا علم؟ میں تو بیگم بھٹو پر بھی باقاعدہ کوئی الزام نہیں لگا رہا میں تو صرف اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر رہا ہوں۔

س: بیگم بھٹو سے اس وقت یہاں جو ہمدردی پائی جاتی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: ہمدردی غلط لفظ ہے، موجودہ جدوجہد بھٹو کیلئے نہیں ہے صرف اپنے اقتدار کے لئے ہے، بیگم صاحبہ نے اس وقت تو کچھ نہ کیا جب وہ غریب اندر تھا یہ لوگ جو آج جمہوریت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اس وقت آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے جب مرحوم کو پھانسی دی جا رہی تھی، مقدمہ تک غلط انداز میں لڑا گیا۔ ہائیکورٹ کی کارروائی کا بائیکاٹ کیا گیا اور اسے سیاسی رنگ دے دیا گیا۔ سپریم کورٹ میں قانونی جنگ لڑنے کی کوشش کی گئی مگر اب بہت تاخیر ہو چکی تھی، پھر مقدمے کو اتنی طوالت دی گئی کہ دو ججوں کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ پہنچا جو اگر موجود رہتے تو صورتحال مختلف ہو سکتی تھی جہاں تک میرے پارٹی سے اختلافات کا تعلق ہے (میرے بعد بہت سے دوسرے اراکین اسمبلی و سینیٹ نے بھی پارٹی چھوڑ دی تھی) تو بیگم صاحبہ نے مجھے چارج شیٹ دیئے بغیر پارٹی سے نکالنے کا اعلان کر دیا کیونکہ میں ہی وہ آدمی تھا جو مسٹر بھٹو اور فوجی حکومت کے درمیان مصالحت و مفاہمت کرانا چاہتا تھا تا کہ مسٹر بھٹو کی زندگی بچ جائے اور دوسرے بیگم صاحبہ کو شبہ تھا کہ میں نے مرحوم کا نکاح بیگم حسنہ شیخ سے کرانے میں کوئی حصہ لیا ہے۔ آپ خود سوچیں جب ایک عورت اپنے خاوند کے بارے میں ایسا سوچتی ہے تو پھر اس کے دل میں اس کے بارے میں کس قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بیگم صاحبہ یہ بھی جانتی تھیں کہ مرحوم کے بعد اصل طاقت انہی کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جائے گی۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کالعدم پیپلز پارٹی موجودہ حکومت کے بالمقابل کوئی متبادل نظام فراہم کر سکتی ہے؟

ج: میرا خیال ہے کہ یا تو الیکشن نہیں ہوں گے یا کالعدم پیپلز پارٹی نہیں ہوگی اور خود پارٹی اس بات کو جانتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ انتخابات کے بجائے تخریبی کارروائیاں چاہتی ہے وہ اپنے اوپر اعتماد کھو چکی ہے اور اسے یہ بھی خیال ہے کہ وہ پاکستان میں اب حکومت نہیں بنا سکے گی یہ "الذوالفقار" کے نام پر کارروائیاں اس کی اسی سوچ کا نتیجہ ہیں جیسا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے الیکشن کمیشن نے بعض سیاسی پارٹیوں کو الیکشن کی غرض سے رجسٹرڈ کیا ہے لیکن کالعدم پیپلز پارٹی نے خود کو رجسٹرڈ نہیں کرایا کیونکہ وہ رجسٹریشن کی شرائط کو پورا نہیں کر سکتی تھی نہ وہ اپنی تنظیم میں انتخابات کرانا چاہتی ہے نہ اپنے حسابات کو جانچ پڑتال کیلئے پیش کر سکتی ہے اس کا سارا کاروبار نامزدگیوں پر چلتا ہے شوہر پھر بیوی پھر بیٹی، اس لئے جب بھی الیکشن ہوں گے کالعدم پیپلز پارٹی بحیثیت جماعت ان میں حصہ نہیں لے سکے گی۔

س: مگر کیا کالعدم پیپلز پارٹی اپوزیشن کی واحد نمائندہ جماعت ہے؟

ج: کالعدم پیپلز پارٹی کسی جماعت کا نام نہیں ایک ہجوم کا نام ہے اور چونکہ یہ ہجوم اپنی قیادت کے اصل چہرے نہیں دیکھ سکا وہ سمجھتا ہے کہ یہ لیڈر مسٹر بھٹو کے بڑے بہی خواہ اور ہمدرد تھے اور بیگم صاحبہ نے بھی ان جذبات سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے میں نے صدر ضیاء الحق سے ملاقات میں ان سے کہا ہے کہ وہ کالعدم پیپلز پارٹی کو بھی الیکشن لڑنے کی اجازت دے دیں اور اگر وہ اسے ملک دشمن سمجھتے ہیں تو پھر سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کر کے اسے خلاف قانون قرار دے دیں مجھے یقین ہے کہ اس طریقہ کار پر دوسری اپوزیشن پارٹیوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر کالعدم پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی تو یہ انتقام لے گی؟

ج: یقیناً وہ ایسا کرے گی اور اس کے لیڈر یہ بات بارہا کہہ چکے ہیں خود مسٹر بھٹو نے اپنی کتاب ”اگر میں مارا گیا“ میں لکھا ہے کہ میرے مرنے کے بعد اگر میری اولاد نے اس کا بدلہ نہ لیا تو ان کی رگوں میں میرا خون نہیں ہو گا بلکہ گندی نالی کا پانی ہو گا اب آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ کیا کوئی ملک اپنی عدلیہ اور فوج سے اس طرح کا انتقام لینے کی کسی کو اجازت دے سکتا ہے؟

س: آپ پارٹی سے کیوں الگ ہوئے؟

ج: ہمارے درمیان دو بنیادی اختلافات تھے میں نے بیگم بھٹو سے کہا تھا کہ وہ پارٹی کی قیادت کا فیصلہ کرنے کیلئے پارٹی میں الیکشن کرائیں، میں نے کہا تھا کہ پارٹی کو ایک جمہوری پارٹی ہونا چاہئے کسی خاندان کا مزارع نہیں ہونا چاہئے 'اس بات کو ظاہر ہے بیگم صاحبہ نے ناپسند کیا۔

دوسرا نکتہ اختلاف فوجی حکومت کے ساتھ ہماری روش کے بارے میں تھا، میں تصادم کی پالیسی کو ملک کیلئے اور خود مسٹر بھٹو کیلئے ضرر رساں سمجھتا تھا 'اس پر بھی بیگم صاحبہ کے خیالات مختلف تھے۔

س: آپ موجودہ حکومت کا تقابل بھٹو حکومت کے ساتھ کیسے کریں گے؟

ج: جہاں تک مسٹر بھٹو کی ذہانت 'قابلیت' کشش 'خطابت اور بین الاقوامی معاملات میں ان کی مہارت کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری سیاست میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں لیکن بدقسمتی سے اپنے جاگیردارانہ پس منظر کی وجہ سے اس کے طرز حکومت میں بہت سی غلط باتیں آ گئی تھیں 'اس کی سیاست اور انتظامیہ میں تشدّد کا عنصر صاف دیکھا جا سکتا ہے اس حکومت کے زوال کی وجہ ہی یہ تھی کہ ایک عام آدمی عدمِ تحفظّ میں مبتلا ہو گیا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ کسی بھی وقت سیاسی وجہ سے اس کے ساتھ زیادتی کی جا سکتی ہے 'یہاں تک کہ پارٹی لیڈران اور قومی اسمبلی کے ممبران تک کو بے عزت اور ذلیل کیا گیا۔ ان کی بیویوں اور بیٹیوں کو تھانوں میں بلایا گیا یہاں تک کہ ممتاز بھٹو اور مسٹر جتوئی کے گھروں تک کی تلاشی لی گئی' مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آج ایک عام آدمی اپنے آپ کو اس زمانے کی نسبت زیادہ محفوظ تصوّر کرتا ہے 'آپ یقین مانیں کہ میں مارشل لاء کا دل و جان سے مخالف ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ جنرل ضیاء نے اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ شرافت کا سلوک کیا ہے۔

(23 اگست 1980ء)

صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے مذاکرات

یہ غالباً مئی 77ء کی بات ہے۔
ایک شام پرائم منسٹر ہاؤس سے اے ڈی سی نے مجھے فون کیا۔
"آپ...... مغرب تک یہاں پہنچ جائیں' پرائم منسٹر نے آپ کو بلایا ہے"۔
میں نے پوچھا
"کیا کوئی خاص بات ہے"؟۔
جواب ملا۔
"سر! اس پیغام کے سوا مجھے کچھ معلوم نہیں"۔
میں وقت مقررہ پر پرائم منسٹر ہاؤس پہنچا تو عبدالحفیظ پیرزادہ اور میر افضل خان بھی یہاں موجود تھے۔
تھوڑی دیر بعد مسٹر بھٹو بھی تشریف لے آئے اور کہنے لگے "آیئے! چلیں"۔ ہم سب ان کی گاڑی میں بیٹھ گئے' ملٹری سیکرٹری ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے' اگلے اور پچھلے حصے کے درمیان شیشہ تھا۔ اسے اوپر چڑھا لیا گیا۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی تو بھٹو صاحب نے کہا "ہم سہالہ جا رہے ہیں"۔
سہالہ میں اس زمانہ میں پی این اے کے رہنما نظر بند تھے۔ حکومت مسلسل کوشش کر رہی تھی کہ انہیں مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کیلئے آمادہ کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے کویت اور متحدہ عرب امارات کے وزرائے خارجہ بھی مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں سے بات کر چکے تھے مگر انہیں رضامند کرنے میں سب

سے زیادہ دخل سعودی عرب کے سفیر شیخ ریاض الخطیب مرحوم کا تھا۔ جو پاکستانیوں سے بھی زیادہ پاکستانی تھے اور اپنے سینے میں ایک دل درد مند رکھتے تھے۔ پورا راستہ خاموشی میں کٹا۔ بھٹو صاحب کوئی بات نہیں کر رہے تھے انہوں نے انگلی اپنے منہ پر رکھ کر ہمیں بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بعد میں اس کی مصلحت کھلی 'ان کا کہنا تھا کہ ملٹری سیکرٹری آرمی کا میجر جنرل ہے اس کی معرفت پوری رپورٹ آرمی کو پہنچ سکتی ہے۔ گویا مئی کے مہینے ہی سے بھٹو صاحب اور آرمی کے درمیان شکوک وشبہات کی فضا پیدا ہو چکی تھی۔

سہالہ میں مفتی محمود مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ چائے کا دور چلا' طے پایا کہ سردار عبدالقیوم خان دوسری جیلوں میں جا کر ملیں اور ان سے مذاکرات کی منظوری حاصل کریں۔ چند دن بعد باقاعدہ مذاکرات شروع ہوئے۔ دونوں طرف سے تین تین کی ٹیم ان میں حصہ لے رہی تھی۔ تقریباً ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ معاہدہ طے پا گیا۔ مذاکرات کی کامیابی کا اعلان خود پروفیسر غفور احمد صاحب نے اخباری نمائندوں کے سامنے کیا مگر معلوم ہوتا ہے پی این اے کی ٹیم کو اپنی جنرل کونسل سے معاہدے کی منظوری حاصل کرنے میں خاصی دقت پیش آئی۔ وہ دوبارہ ہمارے پاس آئے وہ معاہدے کے نفاذ کیلئے چند تحفظات کے طلب گار تھے۔ پرائم منسٹر' مفتی محمود مرحوم 'نواب زادہ نصراللہ خان اور پروفیسر غفور کو مذاکرات کے کمرے میں بٹھا کر مجھے اور مسٹر پیرزادہ کو مشورے کیلئے اپنے دفتر میں لے گئے۔ میری رائے یہ تھی کہ اپوزیشن کے پیش کردہ ان نکات کو فی الفور منظور کر لیا جائے اور اسی وقت فریقین معاہدے پر دستخط کر کے اسے پریس کو جاری کر دیں۔ میں فضا میں آرمی کے قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔ وزیراعظم خود اس خطرے سے بے خبر نہ تھے مگر وہ شاید اتنی جلد اسے ظہور پذیر ہوتا نہیں دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"یار! ہم ان نکات کو مان لیں گے مگر اتنی بھی کیا بے صبری 'ہم ان لوگوں کو یہ تاثر کیوں دیں کہ ہم معاہدے کیلئے اتنے بے تاب ہیں۔ اس سے تو ہماری کمزوری ظاہر ہوتی ہے"۔

ہم مذاکرات کے کمرے میں واپس آئے اور پی۔ این۔ اے کے لیڈروں کو اطلاع دی کہ ان نکات پر مزید غور وخوض کے بعد ہم چند دنوں میں اپنی رائے دیں گے۔ بس یہ چند دن ملک کی تقدیر کیلئے فیصلہ کن بن گئے۔ دونوں پارٹیوں کے بعض لیڈروں کے بیانات سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ فضا میں قدرے کشیدگی آ گئی اور 4 اور 5 جولائی کی درمیانی رات کو آرمی نے ٹیک اوور کر لیا۔

یہ سیاستدانوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی روداد تھی۔ ساڑھے چھ سال کے بعد اب کے دوبارہ مذاکرات ہو رہے تھے۔ مگر یہ مذاکرات سیاستدانوں کے درمیان نہ تھے۔ فوجی حکومت اور سیاستدانوں کے درمیان تھے۔

چند لمحوں کی غفلت نے جمہوریت کی منزل کو سالہا سال دور کر دیا۔ وہی بات ہوئی جسے فارسی زبان کے ایک شعر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(میں رکا کہ اپنے پاؤں سے کانٹا نکالوں اتنے میں سواری ہی نظر سے غائب ہو گئی۔ میں ایک لحظہ کیلئے غافل ہوا مگر میرا سفر سو سال طویل ہو گیا)۔

یا پھر اردو زبان کا ایک خوبصورت شعر اس صورتحال کی ترجمانی کرتا ہے کہ

ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

چند دنوں پہلے پریذیڈنٹ ہاؤس سے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر درانی نے فون کیا کہ پریذیڈنٹ صاحب آپ کی ٹیم سے 20 اکتوبر کو گیارہ بجے دن اپنی قیام گاہ پر ملاقات کریں گے۔

چاروں صوبوں سے ہمارے رفقاء اور احباب اسلام آباد آ چکے تھے۔ ہم مقررہ وقت پر صدر صاحب کی قیام گاہ پر حاضر ہو گئے۔ ملٹری سیکرٹری نے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا اور صدر صاحب کے ڈرائنگ روم کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ یہاں جناب محمود اے ہارون، راجہ ظفر الحق اور جنرل کے ایم عارف کے ساتھ صدر صاحب پہلے ہی موجود تھے۔

محمود اے ہارون ملک کے پرانے سیاستدان ہیں بلکہ اب شاید پرانی نسل کے سیاستدانوں میں مسٹر غوث بخش بزنجو کے سوا کوئی دوسرا اتنا سیاسی تجربہ نہیں رکھتا جتنا وہ رکھتے ہیں راجہ صاحب نوجوان قانون دان اور مسلم لیگ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اوّل و آخر پاکستانی ہیں۔ جنرل کے ایم عارف اکثر خاموش رہتے ہیں بولتے کم اور سوچتے زیادہ ہیں اور صدر صاحب کی موجودگی میں تو بس سوچتے ہی ہیں بولتے بالکل نہیں (مگر کم لوگوں کو علم ہو گا کہ وہ اچھے شاعر بھی ہیں اور ان کا مجموعہ کلام عنقریب شائع ہو رہا ہے) کابینہ کے سینئر وزیر خان غلام اسحٰق خان صاحب اس دن بیمار تھے اس لئے تشریف نہ لا سکے۔ صدر صاحب نے اپنے ایک اور ماہر سیاست رفیق راؤ فرمان کے بارے میں پوچھا "عارف صاحب! معلوم تو کیجئے راؤ صاحب آرہے ہیں کہ نہیں"۔ جنرل صاحب نے فون کیا تو معلوم ہوا وہ بھی کہیں اور مصروف ہیں۔

اب بات چیت شروع ہوئی۔ صدر صاحب نے فرمایا۔ مسائل پر آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟ الیکشن کب ہوں؟ جماعتی ہوں یا غیر جماعتی؟ ایک ساتھ ہوں یا الگ الگ؟ میں نے ان تمام مسائل پر پون گھنٹے کی ایک مفصل تقریر کی۔ میری تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانا چاہتے ہیں تو میں مؤدبانہ عرض کرونگا کہ نہ یہ نظریاتی اعتبار سے صحیح ہو گا نہ افادیت کے لحاظ سے مزید برآں میری سوچ کے مطابق ایسا کرنا اب آپ کیلئے ممکن نہیں۔ جہاں تک نظریاتی بحث کا تعلق ہے اگر بعض علماء نے

آپ کو یہ رائے دی ہے کہ اسلام میں جماعت سازی کی کوئی گنجائش نہیں تو انہوں نے انتہا پسندی سے کام لیا ہے۔ قرآن حکیم میں اشاعت خیر کیلئے نہ صرف جماعت سازی کی اجازت دی گئی ہے بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے اور سیاسی جماعتوں کا منتہائے مقصود بھی لوگوں میں شعور پیدا کرنا اور ملک و قوم کی خدمت کرنا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی اشاعت خیر کا ذریعہ بنتی ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک اسلامی ریاست یا مسلم معاشرہ میں ایسی جماعت کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے جو غیر اسلامی نظریات پر قائم ہوتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ عہد رسالت' اور خلافت راشدہ میں سیاسی جماعتوں کا وجود نہ پا کر یہ حکم لگاتے ہیں کہ سیاسی جماعتیں غیر اسلامی ہیں تو اس زمانے میں تو انہیں بہت سی چیزیں نہیں ملیں گی۔ نہ اس زمانے میں یہ الیکشن تھے' نہ پارلیمنٹ' نہ سیکرٹریٹ تھا نہ باقاعدہ تنخواہ دار فوج' مختلف سیاسی نظاموں نے ارتقائی قائم کیے ہیں۔ پھر بھی تاریخ اسلام میں بنوامیہ اور بنوہاشم' مہاجر اور انصار' اوس اور خزرج' شیعہ اور سنی یہ سب ایک طرح کی سیاسی جماعتیں ہی تو تھیں اور جب آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہود مدینہ سے معاہدہ کیا ہے تو اس پر بعض قبائل کے نمائندوں نے جماعتی حیثیت ہی سے تو اپنے دستخط ثبت کئے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلامک سسٹم میں جماعتوں کی کوئی گنجائش نہیں حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

میرا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ اگر الیکشن میں پارٹیوں کو شمولیت کی اجازت نہ دی گئی تو فرقہ واریت' برادری اور علاقائیت کے فتنے سر اٹھائیں گے۔ گلی محلوں کے مسائل حل کرنے کیلئے بلدیاتی انتخابات کی بات دوسری ہے ان کی سطح بالکل مختلف ہے۔ ان انتخابات کیلئے کسی قومی منشور اور مینی فسٹو کی ضرورت نہیں لیکن صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں ان کیلئے باقاعدہ قومی پروگرام اور منشور کی ضرورت ہے لیکن غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کے نتیجے میں ایسی بھیڑ اکٹھی ہو جائے گی جن کے پاس نہ کوئی منشور ہوگا نہ پروگرام۔ وہ سرمائے اور برادری کے بل بوتے پر آگے آئیں گے اور ان پر مشتمل پارلیمنٹ میں نہ تو کوئی ڈسپلن ہوگا اور نہ ان کا احتساب کرنے والی کوئی طاقت پھر غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کیلئے آپ نے امیدواروں کا جو معیار مقرر کیا ہے۔ اس سے ایسا لگتا ہے کہ وہ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر سے اہلیت کا سرٹیفکیٹ لیکر الیکشن لڑیں گے۔ یا پھر انہیں کسی امام مسجد کی سند اپنی درخواست کے ساتھ لگانا ہوگی کہ یہ امیدوار صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ صدر صاحب نے اس مرحلہ پر مداخلت کرتے ہوئے فرمایا کہ نہیں اسکی کوئی ضرورت نہیں ہوگی بہت لوگ گھر میں بھی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا' آپ کی یہ خواہش بڑی نیک ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے والے لوگ صالح اور پارسا ہوں لیکن آپ یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ کس معاشرے کے نمائندے ہیں۔ جیسا دودھ ہوگا ویسا ہی مکھن نکلے گا۔ ایک گناہگار مسلم معاشرہ کی نمائندگی عمر فاروقؓ اور علی المرتضیٰؓ تو نہیں کریں گے۔ گناہگار مسلمان ہی کریں گے ہاں اس پر ضرور پابندی لگایئے کہ اسلام کا کوئی باغی یا مخالف اسلام نمائندہ بن کر نہ کھڑا ہو۔

محمود ہارون صاحب نے سوال اٹھایا "فرض کیجئے کوئی آدمی اسلامی سوشلزم کا نظریہ لیکر الیکشن لڑتا ہے اس کا کیا ہو گا"۔

میں نے عرض کیا

"آپ اسے مخالف اسلام نہیں ٹھہرا سکتے ہاں اگر وہ صرف سوشلزم یا سائینٹیفک سوشلزم کی بات کرتا ہے تب دوسری بات ہے۔ میرا تیسرا نکتہ یہ تھا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانا موجودہ حالات میں ممکن بھی نہ ہو گا۔ آج سے دو سال پہلے تو ایسا ہو سکتا تھا لیکن اب جبکہ مارشل لاء کی گرفت ڈھیلی ہو چکی ہے۔ سندھ ہنگاموں کی زد میں ہے، تمام سیاسی جماعتیں جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے کے مطالبے میں ہم خیال و یک زبان ہیں، غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرانے پر اصرار چاروں صوبوں میں بے اطمینانی اور اضطراب کی لہر دوڑا سکتا ہے۔ جس کا مقابلہ کرنا انتظامیہ کے بس سے باہر ہو گا۔

عرض کیا گیا کہ اس لئے اب قابل عمل راستہ ایک اور صرف ایک ہے کہ آپ تمام سیاسی جماعتوں کو بحال کر دیں۔ انہیں منظم ہونے اور اپنی سرگرمیاں شروع کرنے کا موقع دیں اور اگر کسی سیاسی جماعت کو آپ ملک دشمن یا مخالف اسلام سمجھتے ہیں تو آئین کے مطابق اس کا ریفرنس سپریم کورٹ کو بھیج دیں۔ پارٹیوں کی رجسٹریشن کھول دیں تاکہ جو پارٹیاں رجسٹریشن کرانے سے رہ گئی ہیں وہ بھی رجسٹریشن کرا سکیں۔

عرض کیا گیا کہ بدقسمتی سے حکومت کے انتخابی اعلانات پر عوام کو اعتماد نہیں رہا وہ سمجھتے ہیں جس طرح پہلے الیکشن ملتوی ہوتے رہے ہیں اب بھی ملتوی ہو جائیں گے۔ انہیں یہ اعتماد بخشنے کیلئے حکومت کو ابھی سے چند اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ الیکشن کیلئے مارچ 85ء تک کی مدت زیادہ ہے اسے اور کم کر دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ 84ء کا سال ہی الیکشن کا سال ہو گا۔ دوسرے یہ کہ سیاسی پارٹیوں سے پابندی اٹھالی جائے اور انہیں کم سے کم محدود سرگرمیوں ہی کی اجازت دے دی جائے۔ تیسرے یہ کہ سیاسی لیڈروں کو رہا کر دیا جائے اور جو لوگ تخریب کاری کے الزام میں گرفتار ہیں ان پر باقاعدہ مقدمے چلائے جائیں۔

اور چوتھے یہ کہ فیڈرل کونسل (یعنی مجلس شوریٰ) کو 31 دسمبر 83ء تک توڑ دیا جائے اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ موجودہ اجلاس اس کا آخری اجلاس ہو گا سندھ کی صورتحال پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس کے سیاسی محرکات اور مضمرات بھی زیر بحث آئے۔ ہماری طرف سے عرض کیا گیا کہ حکومت کو سندھی عوام خصوصاً نوجوان نسل کا ممنون ہونا چاہئے کہ ان کی اس تحریک سے وہ دبی ہوئی بے اطمینانی اور بے چینی ابھر کر سامنے آگئی ہے جو ابتک اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ ہنگامے علامت ہیں۔ بذات خود مرض نہیں۔ علامت کو رفع کرنے کیساتھ ساتھ مرض کا ازالہ کرنے کی بھی ضرورت ہے اس مقصد کیلئے ایک اعلیٰ اختیار

کی کمیٹی قائم ہونی چاہئے جو سندھی عوام کی شکایات کی تحقیق کر کے کم سے کم مدت میں رپورٹ پیش کرے۔ اس رپورٹ میں زمینوں کی الاٹ منٹ' ڈومیسائل سرٹیفکیٹوں کا ناجائز اجراء اور ملازمتوں کے کوٹے میں سندھیوں کی حق تلفی کے مسئلے کا بطور خاص تحقیقی جائزہ لیا جائے اس رپورٹ کے ذریعے معلوم ہو سکے گا کہ اہل سندھ کی شکایات کہاں تک درست ہیں۔ اگر ان میں صداقت پائی جاتی ہے تو انہیں فی الفور رفع کیا جائے اور اگر یہ غلط ہیں تو کم سے کم اس طرح ان کی غلط فہمی تو دور کی جا سکتی ہے۔

آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ ہم نے کبھی نہ اس سے پہلے آپ سے وزارت مانگی ہے نہ ہم اب مارشل لاء کے تحت کسی سیاسی حکومت کے قیام کے حق میں ہیں۔ بعض لوگ اس طرح کی سیاسی حکومت کو قومی حکومت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ قومی حکومت کسی ہنگامی صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے بنائی جاتی ہے۔ جیسے خدانخواستہ کوئی جنگ چھڑ جائے اور وہ بھی ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ دو چار سیاسی جماعتوں کی حکومت کو قومی حکومت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اب جبکہ آپ الیکشن کا اعلان کر چکے ہیں اس طرح کی کوئی بھی حکومت عوام کے ذہنوں میں شکوک و شبہات تو پیدا کر سکتی ہے انہیں اطمینان و اعتماد عطا نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر آپ الیکشن کرانے کیلئے کوئی کیئر ٹیکر گورنمنٹ بنانا چاہیں تو اس کی بات دوسری ہے۔

....

صدر صاحب اس دوران تمام اہم نکات کے نوٹس لیتے رہے' میرے علاوہ میرے دوسرے تمام دوستوں نے بھی بعض موضوعات پر اظہار کیا۔ ان میں سندھ' پنجاب' بلوچستان اور سرحد کی الگ الگ صورتحال کے علاوہ وکلاء اور پریس کے مسائل بھی شامل تھے میں نے آخر میں صدر صاحب سے عرض کیا کہ آپ سے اس ملاقات کے بعد مجھے پریس سے بھی ملنا ہے۔ اخبار نویس مجھ سے پوچھیں گے تم نے جو کچھ کہا اس پر صدر صاحب کا ردعمل کیا تھا؟ فرمایا تم ان سے کہہ سکتے ہو کہ

○ ...... میں اسلامی نظام قائم کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہوں۔

○ ...... ارزاں اور جلد انصاف مہیا کرنا میرا مشن ہے۔

○ ...... پرامن انتقال اقتدار کا تہیہ کر چکا ہوں اور میں یہ سارے ہی کام کروں گا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

صدر ضیاء الحق سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کیا جائے لیکن ان کی سادگی اور عاجزی سے ان کا کٹر سے کٹر مخالف بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ آج تک اسی مکان میں رہتے ہیں جس میں فوج کے چیف آف سٹاف کی حیثیت سے رہائش پذیر تھے جس ڈرائنگ روم میں ہم بیٹھے وہ سادگی کا آئینہ دار تھا۔ قرآن حکیم کی تفسیریں اور بعض دوسری دینی کتابیں سلیقے سے ایک الماری میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ صرف اسلام کا نام ہی نہیں لیتے اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ مذاکرات کے دوران میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا تھا لیکن نماز ظہر

اور عصر کے درمیان اتنا وقت ہوتا ہے کہ مذاکرات ختم کر کے ہم بھی نماز ادا کر سکتے تھے۔ جنرل صاحب نماز کا وقت ہوتے ہی خاموشی سے اٹھے اور چند منٹ کے بعد واپس آئے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نماز کیلئے اٹھے ہیں۔ میں نے اور میرے دوستوں نے بہت صاف اور کھری باتیں کیں۔ بعض دوستوں کا انداز قدرے جارحانہ بھی تھا لیکن جنرل صاحب نے کہیں بھی ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا وہ پورے صبرو تحمل سے تمام باتیں سنتے رہے۔ مجلس برخاست ہوئی تو وہ باہر برآمدے میں خدا حافظ کہنے کے بعد اس وقت تک ہاتھ باندھے کھڑے رہے جب تک ہماری گاڑیاں روانہ نہیں ہو گئیں۔

خدا کرے کہ ذاتی زندگی میں یہ خوبیاں رکھنے والا انسان اجتماعی زندگی کے مسائل بھی قوم کی خواہشات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق حل کرنے میں کامیاب ہو ورنہ کون جانتا ہے ان کے بعد کون آئے گا اور وہ کس اخلاق و کردار کا مالک ہو گا۔

غریبی بہت بڑا جرم ہے

غریب ہونا بھی بہت بڑا جرم ہے اور اگر کہیں اس کے ساتھ صلاحیت اور قابلیت جمع ہو جائے تو پھر تو یہ اور بھی ناقابل معافی بن جاتا ہے، اسی دور پر موقوف نہیں صدیوں پہلے رسولؐ آخرالزمان کی تشریف آوری کے وقت بھی معاشرے کے کھاتے پیتے طبقے نے اسی ذہن کا مظاہرہ کیا تھا، کسی اشتراکی مفکر نے نہیں قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ آپ کی صداقت، دیانت اور امانت کی قسمیں کھانے کے باوجود رؤسائے کفار کو تکلیف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کے ہوتے ہوئے ایک غریب اور یتیم کو وحی اور رسالت کیلئے کیوں منتخب کر لیا ہے۔ طبقاتی برتری کے اسی احساس نے ان میں سے بہت سوں کو عمر کے آخری لمحے تک اسلام قبول کرنے سے روکے رکھا، کچھ نے تو مارے باندھے بادل نخواستہ اسلام کی سطوت کے آگے سر تو جھکا دیا مگر وہ اس کی حقیقت اور اصلیت کو اپنے قلب و روح میں جاگزیں نہ کر سکے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب دین کے معاملے میں امیر کو غریب سے اتنا حسد ہے تو دنیا اور سیاست کے معاملے میں ایک غریب گھرانے کے فرد کے متعلق اس کی ذہنی کیفیات کیا ہونگی؟ اس کا رستہ روکنے، اسے استعمال کرنے اور اسے بدنام کرنے کیلئے وہ کیا کیا جتن نہیں کریگا۔ مثالوں کی ضرورت ہو تو پاکستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ پاکستان کی ننانوے فیصد آبادی غریبوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوئر مڈل کلاس کے لوگ ہیں یا مڈل کلاس کے، جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ بمشکل ایک فیصد ہو گا ایک زمانہ میں بیس بائیس خاندانوں کا چرچہ تھا کہ وہ یہاں کے وسائل پر قابض ہیں اب چند اور خاندانوں کا اضافہ ہو گیا ہو گا اس کے باوجود عظیم

ترین اکثریت بنیادی طور پر غریب لوگوں کی ہے مگر کیا ان بتیس سالوں میں ایک غریب نوجوان بھی الیکشن کے رستے سے ملک کا سربراہ منتخب ہوسکا؟

جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہے' سیاست اور حکومت پر قبضہ جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ کا رہا۔ اس نے اپنے تمام تر وسائل اس بات کیلئے وقف کر دیئے کہ غریب گھرانوں کا جوہر قابل اجتماعی میدانوں میں آگے نہ بڑھ پائے۔ ایسا کوئی شخص سامنے بھی آیا تو خود غریب طبقات میں اس کے زر خرید ایجنٹوں نے اس کی کردار کشی کی اور اسے اپنی کلاس کے لوگوں کیلئے بھی ناقابل قبول بنا دیا۔

ہر طبقے اور کلاس کا اپنا اپنا مزاج ہے اور اپنی اپنی نفسیات۔ ہمارے ہاں کے غریب اور متوسط طبقے کو باور کرا دیا گیا ہے کہ "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کیلئے" اچھا رہن سہن 'اچھا لباس اور اچھی سواری یہ ان لوگوں کا حق ہے جو منہ میں چاندی کا چمچہ لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ اجتماعی اداروں کی رکنیت ' سفارت اور وزارت کے بھی وہی اہل ہیں جو بڑے خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں اگر کوئی غریب آدمی اپنی محنت اور صلاحیت کے بل پر اس کوچے میں آجائے تو جاگیردار اور سرمایہ دار ہی نہیں خود اسی کے بھائی بند اسی کلاس کے لوگ اس کی ٹانگ کھینچنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ زندہ قوموں اور معاشروں میں سیلف میڈ' "خود ساز" ہونا بہت بڑی خوبی ہے مگر ہمارے ہاں ایسے آدمی کو مرتے دم تک معاف نہیں کیا جاتا اس کے شجرہ ہائے نسب تک کھنگال دیئے جاتے ہیں وہ بیچارا مکان بھی بنالے تو اسے تاج محل سے زیادہ افسانوی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ابھی پچھلے دنوں کراچی میں میرے دوست نے مجھ سے پوچھا "آپ کے گھر میں تو سوئمنگ پول ہے آپ تو مزے سے پیراکی کرتے ہوں گے" عرض کیا "بھائی! کہاں کا سوئمنگ پول میں کرایہ کے ایک مکان میں رہتا ہوں۔ لاہور میں 1940ء میں اپنا مکان بنایا تھا۔ زمانہ وزارت میں اسے بیچ کر اور یونائیٹڈ بنک سے قرض لیکر اسلام آباد میں گھر بنایا اور قرض اتارنے کیلئے اسے کرایہ پر چڑھا دیا' اب تک وہ گھر کرایہ پر چڑھا ہوا ہے خود ایک معمولی مکان میں رہتا ہوں جس میں اتنی گنجائش بھی نہیں کہ کسی مہمان کو ٹھہرا سکوں ' میری کتابیں تک گیراج میں بکھری پڑی ہیں اتنی جگہ نہیں کہ لائبریری بنا سکوں " یہ تفصیلات سنیں تو وہ دوست حیران ہو کر رہ گئے' کہنے لگے میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ کا گھر عرب شیوخ کے محلات کی مانند ہے۔ جی ہاں بجا فرمایا' سیاست کے میدان میں جاگیرداروں کے بالمقابل آنے والے ایک خود ساز اور خدا ساز آدمی کا جو گھر ٹھہرا۔ دنیا کے آٹھویں عجوبے کی طرح گلی گلی اُس کا چرچا کیوں نہ ہو۔

جاگیردار اور سرمایہ دار ٹولے کا ایک حربہ اور بھی ہے پروپیگنڈے اور افواہوں کے طوفان اٹھا کر سارے عیب ان لوگوں کے ذمے لگادو جن سے تمہاری قیادت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ خود تم میں وہ سارے عیب ہوں غریب طبقوں کے لوگ تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اس لئے کہ تمام عیوب تمہارا

پیدائشی حق ہیں مگر جب انہی کے طبقے کے کسی خطرناک آدمی کے ذمے وہ باتیں لگادی جائیں گی تو اس پر اتنی دھول اڑے گی اتنی خاک ڈالی جائے گی کہ حقیقت کا چہرہ مستور ہو کر رہ جائیگا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک شخص کے جھوٹا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ ایک بات سنے اور آگے بلاتحقیق بیان کر دے، پاکستان کے غریب طبقات نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ان کی صفوں سے اٹھنے والے قائدین کے بارے میں جاگیردارانہ سیاست کے پروپیگنڈے کی اصل اور بنیاد کیا ہے۔ انہیں تو بس یہ باتیں چٹ پٹی لگیں اور وہ ان کی جگالی کرنے لگے۔ اس سے بڑھ کر ایک شخص کی مظلومی کیا ہوگی کہ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے کوئی بات دیکھی نہیں اور محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے آپ نے مزے اور چٹخارے لے لے کر اسے آگے بیان کرنا شروع کر دیا۔

....

پاکستان میں جاگیردارانہ سیاست کی سازشوں کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ اس نے غریب طبقات کو امیر راہنماؤں اور اپنی کلاس سے اٹھنے والے اہل سیاست کے جانچنے کیلئے الگ الگ پیمانے دیئے ہیں امیر اور جاگیردار راہنما میں دنیا بھر کے عیب ہوں وہ ظالم ہو، قاتل ہو صرف یہ دیکھو کہ جاگیردار ہے اور سرمایہ دار خاندان سے تعلق رکھتا ہے مگر تمہاری صف سے اٹھکر کوئی آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو فقط اس کے ذاتی عیبوں پر نظر ڈالو اس کی قابلیت، نمائندگی کی صلاحیت، عوام دوستی، دردمندی، ظلم وستم کے تصور سے بھی دوری۔ ان باتوں کا خیال نہ کرو صرف ان قصے کہانیوں اور جاگیردار سیاست اور اس کے گماشتوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو سامنے رکھو جو اس کی نجی زندگی کے بارے میں رات دن زور شور سے پھیلائی جاتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ ساتھ ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلاں تو ختم ہو چکا، اس کا تو اب اثر ہی باقی نہیں رہا اس کی تو اب اجتماعی زندگی میں حیثیت ہی کچھ نہیں۔ ارے بندۂ خدا! مرے کو مارے شاہ مدار، ایک شخص کا وجود ہی باقی نہیں تو ہر وقت اسی کی غیبت کرنے اسی کی چغلی کھانے، اسی میں کیڑے نکالنے میں کیوں لگے ہو!

بے عیب خدا کی ذات ہے خطائیں لغزشیں گناہگاری اور سیاہ کاری تو ہر شخص کے ساتھ لگی ہوئی ہے یہ بندے کا اور خدا کا معاملہ ہے اس پہلو میں کسی پر لعن طعن وہ کرے جسے اپنی معصومیت کا گھمنڈ اور اپنے زہد اور تقویٰ پر ناز ہو اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی شخص کے ان حقیقی یا غیر حقیقی عیوب کی تشہیر نہ کرو جو کسی نگاہ کے سامنے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ستار العیوب ہے۔ انفرادی گناہوں کا پردہ پوش ہے تم بھی اپنے اندر یہی صفت پیدا کرو ورنہ اس کے بندوں پر الزام تراشی کرو گے یا انہیں ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کرو گے تو آخرت میں خود ذلیل ورسوا ہو کر اٹھو گے۔ اَنَا خَیرٌ مِّنہُ

میں اس سے بہتر ہوں یہ ابلیس کا دعویٰ تھا جو اس نے آدم کے مقابلہ میں کیا تھا تم آدم کی اولاد ہو جس نے مسجود ملائک ہو کر "رَبَّنَا ظَلَمنَا اَنفُسَنَا" کا اعتراف عجز پسند کیا تھا، ذاتی اور انفرادی زندگی کے

معاملے میں ہمیشہ اپنی کوتاہیوں کو سامنے رکھو اور دوسروں کو اپنے سے بہتر سمجھو ابو بکر صدیقؓ کی طرح چڑیا کو دیکھو اور یہ آرزو کرو کہ کاش میں چڑیا ہوتا جو ایک درخت سے اڑ کر دوسرے درخت پر جا بیٹھتی ہے مگر قیامت کے دن کی جوابدہی سے آزاد ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی طرح تنکے کو زمین سے اٹھاؤ اور یہ خواہش کرو کہ کاش میں تنکا ہوتا اور قیامت کے دن مجھ سے حساب کتاب نہ لیا جاتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ بن جاؤ کہ گاؤں والے قحط سے تنگ آ کر بارش کی دعا کرانے آئیں اور آپ فرمائیں "یہ سارا عذاب اس لئے ہے کہ گاؤں میں بہت ہی گناہگار شخص رہتا ہے اور وہ گناہگار شخص میں ہوں، میں اس گاؤں سے نکل جاتا ہوں تاکہ یہاں نزول رحمت ہو جائے"۔

انفرادی خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں کی پوزیشن یہ ہے البتہ ایسے جرائم کی نوعیت دوسری ہے جن کا تعلق اجتماعی اور قومی زندگی سے ہے۔ کسی شخص نے ظلم کیا ہے کسی کا حق مارا ہے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کسی کو بے عزت کیا ہے، کسی کی جان لی ہے تو اسے معاف نہ کرو مگر یہ جرائم تو پاکستان کی تاریخ میں تمہیں جاگیردار قیادت ہی میں نظر آئیں گے۔ وہ حکومت میں ہوں تو پھر ان جرائم کی گرم بازاری کے کیا ہی کہنے لیکن حکومت میں نہ ہوں تب بھی اپنی جاگیر میں اپنے کارخانے میں اپنے علاقے میں ظلم ڈھانا، حق مارنا، لوگوں کو بے عزت کرنا، ڈاکے ڈلوانا، غریبوں کے مویشی چوری کرانا یہاں تک کہ قتل کرا دینا ان کیلئے روزمرہ کی بات ہے، مجھے تو یوم آزادی سے لیکر آج تک کسی غریب گھرانے سے اٹھا ہوا کوئی سیاست دان ایسا نظر نہیں آتا جسکا دامن ان جرائم سے داغدار ہو۔ اگر کسی کا دامن داغدار ہے تو وہ بھی کسی جاگیردار سیاستدان کا آلہ کار بننے کیوجہ سے ہے، غریب گھرانے کے لوگوں پر تو ایک ہی الزام لگتا ہے یا آسانی سے لگایا جاسکتا ہے "جی اس نے مال بنایا ہے" "ثبوت کیا ہے"۔ "جی کپڑے سفید پہنتا ہے" اس کا گھر بھی ہے "اسے کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا گیا" اگر اس نے مال بنایا ہے تو اس پر مقدمہ چلاؤ۔ انصاف کے تقاضے پورے کر کے اسے صفائی کا پورا موقع دیکر سزا سناؤ لیکن اگر اس کے مخالف وزارتیں بنائیں اس کے خلاف تحقیقات کرائیں پھر بھی کوئی ایسا ثبوت نہ ڈھونڈ سکیں کہ اسے راستے سے ہٹا سکیں تو شرافت یہی ہے کہ پھر الزام تراشی سے باز رہیں، لوگوں کا کیا ہے وہ تو کیا کیا اندازے نہیں لگاتے مگر کسی شخص کے درپردہ حالات کیسے ہیں ان کی خبر تو صرف خدا ہی کو ہو سکتی ہے، بقول اکبر

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

....

ہمارے ہاں سرمایہ دارانہ طبقے کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا عالم یہ ہے کہ غریب گھرانے کا فرد سیاست میں ہو تو اس کا ہر اقدام خود اسی کے طبقے کے لوگوں کو روپہلی مصلحتوں کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ جاگیردار لیڈر ارباب حکومت سے رات دن ملے اور اندر خانے گڑ گڑا گڑ گڑا کر ماتھا ٹیک کر

ادنیٰ سے ادنیٰ مفادات کا طلبگار ہو باہر اس کی خبر چھپے گی تو لوگ سمجھیں گے برابر کا آدمی برابر کے آدمی سے ملا ہے۔ مگر غریب طبقے کا سیاستدان دعوت افطار میں بھی کسی وزیر دوست کو بلا لے گا تو ڈھنڈورا پٹ جائے گا ضرور کوئی سودا بازی ہوئی ہے۔ .... سودے بازی کس چیز کی ہو سکتی ہے، ہم غریب گھرانوں سے اٹھنے والے اجتماعی زندگی میں ٹھوکریں کھا کھا کر اپنی راہ بنانے والے فقیر لوگ سودا رکھتے ہی کون سا ہیں، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دماغ ہے یا دل 'جبتک زندگی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے دماغ میں ملک وملت کی تخریب کا کوئی کیڑا نہ پلنے دیں گے، رہا دل تو اس میں زندگی بھر نہ ماسوا اللہ کا خوف سمائے گا نہ ڈر 'اے اہل وطن! ہماری تقریریں بھی چھان پھٹک لینا اور ہماری تحریریں بھی! اگر ہم جادہ راستی سے بھٹکنے لگیں خدا اور عوام سے غداری کریں تو اس دن تمہیں اختیار ہے شوق سے یقین کر لینا ہماری رگوں میں غریب ماں باپ کا نہیں کسی جاگیر دار اور وڈیرے کا خون ہے۔

....

ہماری قومی زندگی میں ایسا بھی ہوا ہے کہ خود جاگیر دار طبقے سے نکل کر بعض لوگوں نے غریب عوام کے حقوق کی بات کی ہے یہ بات خلوص پر مبنی تھی یا غریبوں ہی کے استحصال کا جدید انداز 'اس کا فیصلہ تو وقت کریگا یا خود غریب عوام جب ان کے سامنے حقائق کھل کر سامنے آئیں گے مگر اتنا یقینی ہے کہ اس نعرے کی کشش نے غریب گھرانے کے بہت سے باصلاحیت نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا اور انہوں نے اسے کامیاب بنانے کیلئے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں

مگر جب یہ پروگرام غائب ہو گیا اور اس کی جگہ محض جاگیر دارانہ انا اور ہٹ دھرمی نے لے لی تو ہم غریب اہل سیاست کسی خاندان یا گھرانے کے مزارع تو نہ تھے کہ اس سے چمٹے رہتے 'سیاست میں وفاداری کا عہد اپنے نظریئے 'عقیدے اپنے ملک اور وطن سے ہوتا ہے 'گھرانوں اور 'خاندانوں سے نہیں 'سیاست عشق ہے۔ کوئی بھی خاندان اہل بیت نہیں کہ اس کی غلامی اختیار کر لی جائے اگر پروگرام وہی غریب طبقات کو عدل وانصاف لیکر دینا ہوتا تو اس میں جان بھی چلی جاتی غم نہ تھا مگر بدلہ اور انتقام 'وہ بھی کس سے ملک اور قوم سے۔ وہ بھی کس سے اپنی ہی عدلیہ اور اپنی ہی فوج سے، نہ کبھی یہ سیاست کی ہے نہ کبھی یہ سیاست کریں گے یہ اندازِ سیاست جاگیر داروں ہی کو مبارک ہو 'غریب سیاسی کارکنوں نے تو بڑی قربانیاں دیکر یہ ملک حاصل کیا ہے وہ اس کے مزید حصے بخرے ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

....

جاگیر دارانہ طرز سیاست کا یہ اسلوب بھی خوب ہے کہ کوئی غریب اپنے ہی طبقے کی محبت میں کسی پروگرام کا ساتھ دے تو اسے خاندانی غلام سمجھ لو 'تمہیں تو اس نے لیڈر مان لیا کہ تم قابل تھے تجربہ کار تھے پڑھے لکھے تھے، اول اول یہی لگتا تھا کہ تم دل سے جاگیر داری کا نظام ختم کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارے بعد وہ ایک خام اور ناپختہ کار ایک گھرانے کی پوری قطار کی قطار 'لیڈر شپ کے آگے کیسے سجدہ ریز ہو جائے؟! اگر

یہ گھرانہ یہ سمجھتا تھا کہ عوامی سیاست میں سب نور ظہور اس کا ہے سب لوگ اس کے ساتھ ہیں تو ہم ایسے دیوانوں کے الگ ہو جانے سے فرق ہی کیا واقع ہو سکتا ہے لیکن نہیں، ایسا لگتا ہے چوٹ، بہت سخت پڑی ہے۔ تنظیم میں اس علیحدگی سے ایسی دراڑیں پڑی ہیں کہ اب کبھی ان کی مرمت نہ ہو سکے گی اسی لئے تو بیرونی پریس نے یہ بیان شائع کئے ہیں کہ ایک "ڈیتھ لسٹ" بنی ہے ان لوگوں کی فہرست تیار ہوئی ہے جنہیں موت کی سزا دی جائے گی، مجھ سے بیرون ملک ایک ایجنسی کے نمائندے نے کہا "سنا ہے ایک ڈیتھ لسٹ بنی ہے آپ کا نام سر فہرست ہے" میں نے عرض کیا۔

"جی ہاں ایک ڈیتھ لسٹ کا تو مجھے علم ہے وہ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے اس میں یقیناً میرا نام بھی ہے اور ان جعلی ڈیتھ لسٹ بنانے والوں کا بھی مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پہلے کس کا نام ہے اور بعد میں کس کا"۔

....

جاگیردارانہ طرز سیاست میں ممد و معاون ایک عنصر اور بھی ہے وہ مذہبی پاپائیت کا ہے 'اسلام سے بڑھ کر نہ کوئی پیغام انقلاب ہے نہ نظام انقلاب اس نے "خواجگی" اور سرمایہ داری کے بتوں کو چکنا چور کر کے بنی نوع انسان کو عدل و مساوات کے سنہری اصول عطا کئے مگر مسلمانوں کی تاریخ میں حکمرانی کے منصب پر مخصوص سرمایہ دار گھرانوں کے افراد کی جو اجارہ داری رہی اس نے اپنی ضروریات کیلئے مذہب میں بھی ایک اجارہ دار طبقہ پیدا کر دیا جو سرمایہ داری کا پشتیبان اور نگہبان بنکر حکمرانوں کے ہر غلط طرز عمل کا جواز شریعت سے پیش کرتا تھا۔ علمائے حق ہر دور میں رہے ہیں ان کے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی تاریخ کی محرابوں کو منور کر رہی ہے۔ یہ ان کی بات نہیں ان کے تو پاؤں کی خاک بھی ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے یہ اس مذہبی پاپائیت کا تذکرہ ہے جو غیر محدود بلکہ لامحدود ملکیت کی ترجمان اور قافلۂ سرمایہ داری کی حُدی خواں ہے اس نے ہر دور میں جاگیردار طبقات کے مخالفین کو بدنام اور رسوا کرنے کی منصوبہ بندی کی ہے ہمارے ہاں بھی اس کے کارکنوں کا شیوہ ہر گھڑی ایسے ہی لوگوں کی "غیبت کاری" ہے۔ غیبت جسے حضورؐ نے زنا سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ اور غیبت ہے کیا؟ کسی شخص کا حقیقی عیب اس کی پیٹھ پیچھے بیان کرنا اور اگر اس میں وہ عیب نہ ہو اور اسے بیان کیا جائے تو یہ بہتان ہے اور شریعت میں اس کیلئے باقاعدہ سزا مقرر ہے۔ ...... تو یہ لوگ اسلام کے نزدیک زناکاروں سے بڑے گناہگار ہیں جو قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق مردار بھائی کا گوشت کھاتے ہیں اگر وہ مذہب کا نام لیکر ملکی اور غیر ملکی جاگیردار اور سرمایہ دار طاقتوں کا حق نمک ادا کرنے کیلئے معاشی انصاف مانگنے والوں پر رات دن کیچڑ اچھالتے ہیں تو حدیث نبویؐ کی روشنی میں ان مظلوموں کے گناہ ان کے کھاتے میں لکھ دیئے جائیں گے اور ان کی نیکیاں چھین کر انہیں عطا کر دی جائیں گی۔

....

اوپر جو کچھ کہا گیا وہ میرے تاثرات نہیں مشاہدات ہیں۔ زندگی رہی تو خود اپنی سرگذشت کے آئینے

میں غریب طبقے کو اس کے حقیقی خدوخال دکھاؤں گا سیاست فی الوقت .... پابند ہے مگر آنے والے دور کیلئے زیر زمین تیاریاں ابھی سے شروع ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ قوم جاگیرداروں کی سیاست سے کب آزاد ہوتی ہے کب اس ملک کے ننانوے فیصد غریب عوام کے قابل سپوت اس کے ترجمان اور حکمران بنتے ہیں۔ ہمارا بھلا اسی میں ہے کہ یہاں جمہوریت ہو اور جمہوریت مٹھی بھر سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کی حکومت کو نہیں کہتے پسے ہوئے غریب طبقات کی بالادستی کو کہتے ہیں۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

23 جولائی 1981ء

چین، ماؤزے تنگ کے بعد

1973ء کے اوائل میں پیکنگ کیلئے پی آئی اے کی پرواز کا آغاز ہوا تو اس کی افتتاحی فلائٹ پر حکومت پاکستان نے ایک سرکاری وفد بھی خیر سگالی کے دورے پر چین بھیجا، میں بھی اس وفد کا رکن تھا، وفد نے ایک ہفتہ چین کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اس دورے کے دوران میں نے جو کچھ دیکھا دل و دماغ نے جو اثرات قبول کئے اسکا تذکرہ میں نے اپنی ایک مختصر سی کتاب "ایک ہفتہ چین میں" کیا ہے۔ اب اس کا اعادہ یہاں تحصیل حاصل کے مترادف ہو گا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ مشرق و مغرب میں گھوما ہوں لیکن جو سادہ اور تصنع سے پاک منظم اور مربوط معاشرہ میں نے چین میں دیکھا وہ اور کہیں نظر نہیں آیا۔ چین دنیا کی آبادی کا تقریباً چوتھائی حصہ ہے۔ اس کا رقبہ پورے براعظم یورپ کے رقبے سے بڑا ہے۔ اس کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل ہے۔ کمیونسٹ انقلاب سے پہلے یہاں جہالت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، غربت و فلاکت عام تھی، صنعتیں نام کو نہ تھیں۔ ماؤ کی قیادت اور چو این لائی کی حکومت میں چین نے حیرت انگیز ترقی کی، تعلیم کی روشنی گھر گھر پھیلنے لگی، مضبوط صنعتیں قائم ہوئیں، کاشت کاری کے جدید طریقے اختیار کئے گئے۔ نوجوان نسل کو ایک مقصد زندگی عطا کیا گیا۔ معاشرے کو عیاشی اور فحاشی کی لعنت سے پاک کر کے عورت کی عظمت بحال ہوئی۔ وہی چین جس میں اس سے قبل قدم قدم پر چکلے قائم تھے اور عورت کے گوشت کی منڈیاں لگی ہوئی تھیں اسی میں نظریہ محنت کو عام کر کے نگاہوں کی وہ پاکیزگی عام کی گئی کہ آج وہاں عورت کو میلی آنکھ سے دیکھنے والا نہیں ملتا،

چینی کمیونسٹ پارٹی 1921ء میں قائم ہوئی اور اٹھائیس سال کی تاریخی جدوجہد کے بعد اسے 1949ء میں چین میں اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع ملا' ماؤزے تنگ 1974ء میں فوت ہوئے اس طرح تقریباً مزید اٹھائیس سال چین کی تعمیر اور استحکام میں صرف ہوئے نصف صدی کا عرصہ قوموں کی زندگی میں کوئی بڑا عرصہ نہیں مگر اس مختصر سی مدت میں چین نے جو تاریخ بنائی ہے اس پر کوئی بھی زندہ قوم فخر کر سکتی ہے۔ تاریخ سازی کے اس عمل میں یوں تو لاکھوں کارکنوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ لانگ مارچ ہوا جس میں ایک سال کے عرصہ میں چھ ہزار سے زائد میل کا سفر سرخ فوج نے پاپیادہ طے کیا۔ رستے میں برف باری بھی ہوئی' دھوپ بھی چمکتی رہی' پہاڑوں کی چٹانیں بھی رکاوٹ بنیں لیکن آہنی عزم رکھنے والے انسانوں کے حوصلے میں کمی نہیں آئی۔ اس لانگ مارچ کے دوران سامان خورد ونوش کی کمی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات انہیں کھانے کی جگہ درختوں کے پتے چبانے پڑے اور پانی کی جگہ اپنا پیشاب پینا پڑا مگر پھر بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ کارکنوں کے علاوہ اس انقلاب میں ان متعدد رہنماؤں کی قربانی اور حکیمانہ بصیرت کا بھی دخل ہے۔ جنھوں نے تحریک کی قیادت بھی کی اور وقت آنے پر اس کیلئے جان کا نذرانہ بھی پیش کیا لیکن چینی تاریخ کے مطلع پر ستاروں کے اس ہجوم میں دو نام آفتاب وماہتاب بن کر چمک رہے ہیں۔ ماؤزے تنگ اور چواین لائی' ماؤ نہ ہوتا تو اس تحریک کو فکر کی روشنی ہی نہ ملتی اور چواین لائی نہ ہوتا تو جدید چین کی حکومت کو اقوام عالم کی حکومتوں میں یہ بلند مقام ہی نہ ملتا'

چین میں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران تین مرتبہ چواین لائی کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ایک مرتبہ ہم ان کی طرف سے دی جانیوالی ضیافت میں شریک ہوئے دوسری مرتبہ وہ ہماری طرف سے دی جانے والی جوابی ضیافت میں تشریف لائے تیسری مرتبہ ان سے ملنا اس چینی گیسٹ ہاؤس میں ہوا جہاں ہمارا وفد ٹھہرا ہوا تھا' مسٹر چواین لائی وفد سے ملنے کیلئے گیسٹ ہاؤس آئے تھے' ان کی باخبری اور شخصیت کی دلکشی کا نقش ایک معمولی واقعہ سے دل پر قائم ہوا۔ ہمارا وفد جس روز پیکنگ پہنچا اس رات کا عشائیہ پیکنگ کے میئر کی جانب سے تھا' عشائیہ چینی معیار سے خاصا پر تکلف تھا۔ کھانوں کے سات کورس ہوئے مگر حیران کن بات یہ تھی کہ اس میں مرچیں نہ تھیں ادھر ہم پاکستان میں جن چینی کھانوں سے متعارف تھے ان میں سبز مرچوں سے لیکر تیز لال مرچوں تک کئی قسم کی مرچیں ہر کھانے میں ڈالنے کیلئے پیش کی جاتی ہیں۔ میں سادگی میں اپنے میزبانوں سے مرچوں کا پوچھ بیٹھا بات آئی گئی ہو گئی مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ اتنی دور جا پہنچے گی۔ اگلے دن مسٹر چواین لائی کی طرف سے ضیافت تھی کھانے کی میز پر ان کی داہنی جانب بیگم بھٹو کی نشست تھی اور بائیں جانب میری۔ کھانا شروع ہوا تو میں نے دیکھا انواع واقسام کے کھانوں کے ساتھ ساتھ کئی قسم کی مرچیں بھی میرے لئے موجود تھیں اور مسٹر چواین لائی انہیں لے کر خود مجھے پیش کر رہے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے جاتے تھے کہ "چیئرمین ماؤ کو بھی مرچیں بے حد پسند ہیں"۔

بات چھوٹی سی تھی لیکن اس سے چواین لائی کی باخبری' خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی حسن تھا جس نے انہیں چین ہی میں نہیں چین سے باہر بھی محبوب خلائق بنا رکھا تھا اور زندگی ہی میں نہیں موت کے بعد بھی انکے اوصاف ذاتی کے باعث انکا یہ مقام محفوظ کا محفوظ ہے' مسٹر چواین لائی نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں جس طرح اپنے وطن اور ابنائے وطن کی خدمت کی ہے بیرونی ملکوں سے تعلقات استوار کئے ہیں' اپنے سنجیدہ اور نپے تلے لہجے میں جس طرح ملکی اور بین الاقوامی امور و مسائل پر لب کشائی کی ہے اور بیرونی وفود سے گفت و شنید کی ہے' ان سب باتوں سے نہ صرف ان کی شخصیت کو چار چاند لگے ہیں چین کی عظمت و شہرت بھی ہمالیہ کی بلندیوں کو چھونے لگی ہے۔

....

مگر ان جملہ اوصاف و خدمات کے باوجود چواین لائی کو حکومت کی تشکیل و تنظیم میں کتنا ہی دخل کیوں نہ رہا ہو ان کی چھاپ چینی معاشرے پر اتنی گہری نہیں پڑی جتنی چیئرمین ماؤزے تنگ کی پڑی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ان کی شخصیت فی الاصل ایک نرم' نسبتاً جمہوری اور سیاسی شخصیت تھی۔ وہ ایک مفکرانہ اسکالر سے زیادہ ایک اعلیٰ درجہ کے سیاسی بیوروکریٹ تھے اور ویسے بھی چیئرمین کی پیروی جس خلوص اور کاملیت سے انہوں نے اپنی زندگی میں کی ہے شاید ہی کوئی دوسرا چینی لیڈر اس کی مثال پیش کر سکے یہ ٹھیک ہے کہ شروع شروع میں جدوجہد کے دوران ایک مرحلہ پر ماؤزے تنگ کیساتھ ان کے اختلافات بڑی شدید نوعیت اختیار کر گئے تھے مگر بعد میں انہوں نے ماؤ کو کاملاً اپنا رہنما" تسلیم کر لیا۔ ماؤ سے ان کی ذاتی وفاداری کا عالم یہ تھا کہ جب 1945ء میں 18 سال کی مخالفانہ جدوجہد کے بعد ماؤزے تنگ 'جنرل چیانگ کائی شیک سے مذاکرات کی غرض سے ان کے مہمان ٹھہرے تو چواین لائی اس مہمان داری کے دوران پیش آنے والے سامان خورد و نوش کو ماؤ سے پہلے خود چکھ کر اس بات کا اطمینان حاصل کرتے کہ اس میں زہر تو نہیں ملا دیا گیا"۔

اس لئے جہاں چین پر بات کرتے وقت چواین لائی کی سیاسی خدمات اور ذاتی قربانیوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا وہاں یہ دعویٰ بھی بلاخوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ جدید چین کو سب سے زیادہ 'بحیثیت مجموعی جس قائد نے شخصی اور فکری طور پر اپنے رنگ میں رنگا ہے وہ صرف اور صرف چیئرمین ماؤزے تنگ ہیں' ماؤ ایک کسان باپ کا بیٹا تھا' زمانہ طالب علمی میں ایک دفعہ دوران سفر ایک دست شناس اور ماہر علم قیافہ خاتون نے اسے بتایا کہ

"تم ایک بڑے افسر' وزیر اعظم اور ایک بڑے ڈاکو بن سکتے ہو' تم بہادر ہو تمہاری تمنائیں اتھاہ ہیں مگر تمہارا سینہ جذبات سے خالی ہے۔ تم دس ہزار یا ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کر دو گے مگر تمہارے جسم کا ایک بال کھڑا نہ ہو گا' تم میں صبر اور برداشت کی بڑی طاقت ہے اگر تم 35 سال کی عمر میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل نہ کر دیئے گئے تو پچاس سال تک کی عمر کو پہنچ کر تم محفوظ ہو جاؤ گے اور اس کے بعد روز بروز

خوش قسمت ہوتے چلے جاؤ گے پچپن سال کی عمر میں تم بہت زیادہ خوش نصیب ہو گے تمہاری چھ بیویاں ہوں گی مگر زیادہ بچے نہ ہوں گے اور نہ تمہارا کوئی مستقل گھر ہو گا"۔

بعد کے واقعات نے بتایا کہ یہ پیش گوئی بڑی حد تک صحیح تھی واقعی ماؤ میں حیرت انگیز قوت برداشت تھی وہ روزانہ صبح برف باری میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہاتا' جدوجہد کے دوران اسکی قوت کار کا عالم یہ تھا کہ اس کا ایک پرانا ساتھی لکھتا ہے کہ ہم اس زمانے میں ماؤ کو "پاگل ماؤ" کہہ کر پکارتے تھے۔ لانگ مارچ کے دوران اس نے جو مصائب برداشت کئے وہ ایک عام آدمی کے اعصاب کو چٹخا رکھ دینے کیلئے کافی ہیں' اس کی بیوی اور چھوٹی بہن کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا وہ دو بچوں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا واپسی ہوئی تو ان کا سراغ ہی نہ لگا' وہ سرخ فوج کا کمانڈر تھا مگر اس لانگ مارچ میں اسکے شب و روز کیسے گزرے تھے اس کا اردلی لکھتا ہے کہ

"اس زمانے میں ماؤ کی ملکیت دو پلنگ پوش اور کاٹن کی ایک چادر تھی دو معمولی خاکی رنگ کی جیکٹیں اور دو پتلونیں جنہیں وہ وردی کے طور پر استعمال کرتا ایک خاکی سویٹر ایک پرانا اوور کوٹ ایک چھاتا ایک مگ اور ایک خاکی ہی رنگ کا بریف کیس جس کے نو خانے نقشوں کاغذات اور کتابوں سے پُر تھے مارچ کے دوران بریف کیس اور چھاتا وہ خود اٹھاتا اور دوسری چیزیں میں' کیمپ لگتا تو میں لکڑی کے دو تختوں کو جوڑ کر ان پر پلنگ پوش اور چادر ڈال دیتا اور ماؤ کی وردیوں کا تکیہ بنا دیتا۔ سر شام لیمپ جل جاتا اور ماؤ بعض اوقات صبح تک اسکی روشنی میں کام کرتے رہتے"۔

چینی کمیونسٹ پارٹی 1921ء میں تشکیل پذیر ہوئی۔ ماوزے تنگ اس کے بارہ بانیوں میں سے ایک تھا۔ پارٹی میں اسے کئی طرح کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا تاہم وہ 1935ء میں اس کا چیئرمین بن گیا۔ اٹھائیس سال کی جانگسل جدوجہد کے بعد کمیونسٹ پارٹی کو چین میں مکمل کامیابی حاصل ہو گئی تو ماؤ اس عظیم ملک کا بے تاج بادشاہ تھا۔ ستائیس سال تک وہ سیاہ و سفید کا مالک رہا لیکن آپ جانتے ہیں عوامی خزانے سے وہ تنخواہ کتنی لیتا تھا کل چھ سو یوآن یعنی نوے ڈالر ماہوار۔ 1970ء میں اس میں بھی بیس فیصد کٹوتی کر دی گئی اس کی اصل آمدنی کتابوں کی رائلٹی سے تھی۔

چیئرمین ماوزے تنگ کی انقلابی قیادت کا راز اس کی زوردار شخصیت تو ہے مگر اس کا سرا اس کے افکار کے سر بھی ہے۔ وہ اشتراکیت کا پہلا مفکر ہے جس نے مارکسزم کو آسان بنا کر اور مقامی رنگ دیکر پیش کیا کمیونزم جو مارکس اور لینن کے نزدیک صرف کارخانے کے مزدوروں کے ہی ذریعے آ سکتا تھا ماوزے تنگ نے کسانوں کو بھی اس کی طاقت بنا دیا۔ وہ ایک بہترین شاعر' مفکر اور ادیب تھا۔ اس کے مجموعہ ہائے نگارشات "سلیکٹڈ ورکس آف ماوزے تنگ" کے نام سے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر

لاکھوں انسانوں تک پہنچ چکے ہیں۔ ستمبر 1970ء میں یحییٰ خان کے مارشل لاء کے طفیل مجھے پانچ سال قید بامشقت کی سزا ملی تو میں نے گھر سے قرآن حکیم کے علاوہ ماؤزے تنگ کے سلیکٹڈ ورکس بھی منگائے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد ماؤ کے افکار کا مطالعہ کیا کرتا تھا اس ضمن میں اگر میں یہ کہنے کی جسارت کروں تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ اسے میری شوخ چشمی قرار دیتے ہوئے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگانے سے بھی دریغ نہ کریں لیکن یہ میرے دل کی آواز ہے اور میں اسے کسی خوف اور ڈر کیوجہ سے چھپانا جرم عظیم سمجھتا ہوں کہ ماؤزے تنگ کی بعض تحریروں میں غیر شعوری طور پر قرآنی فکر کی چھاپ نظر آتی ہے کئی مقامات پر تو اس وقت میں نے حاشیئے میں قرآن حکیم کی متعلقہ آیات بھی لکھ ڈالی تھیں۔ ماؤ کی تعلیمات کا ایک اہم نکتہ پارٹی اور معاشرے کو تضادات سے پاک کرنا ہے وہ جگہ جگہ اس پر زور دیتے ہیں یہ عین اسلامی نظریہ کے مطابق ہے مگر افسوس کہ اسے قرآن حکیم کے مطالعے کی سعادت نہ ملی ورنہ جس طرح چین میں رائج الوقت مذاہب کی اپنی تحریروں میں اس نے مذمت کی ہے وہ اسلام کی انقلابی تعلیمات سے ضرور متاثر ہوتا اسلام کے بارے میں اس کا مبلغ علم صرف سنی سنائی باتوں تک محدود تھا۔ وانگ منگ جو اپنے وقت کے ایک مقبول چینی لیڈر اور ماؤ کے معاصر بلکہ کشمکش اقتدار میں حریف تھے اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ

> "ماؤ نے کئی دفعہ مجھ سے "ماوزے تنگ ازم" کی ترویج پر زور دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ شروع شروع میں لوگ نئے ازموں کو قبول نہیں کرتے مگر ہمیں محمدؐ کی مثال سامنے رکھنی چاہئے جس نے ایک نیا عقیدہ طاقت کے بل پر رائج کیا۔ اسکے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور ایک ہاتھ میں قرآن"
>
> (بحوالہ ماؤ دی پیپلز ایمپرر، ص 223)

کاش ماؤ صحیح معنوں میں محمدؐ کی مثال سامنے رکھتا وہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا" کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنی فکر کو جبر کے ذریعے نہ پھیلاتا تو آج ایشیا کی تاریخ مختلف ہوتی مگر اپنی تمامتر شخصی اور فکری عظمتوں کے باوجود اس نے ایک آمر کا راستہ منتخب کیا۔ محمدؐ کی جمہوریت اور شورائیت کی پیروی نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی وفات کے بعد اس کی شخصیت کا وہ طلسم باقی نہ رہ سکا، اس کے کئے گئے باقی اقدامات سے خود اس کی پارٹی نے اظہار بریت کیا اور اس کی بیوی کو اپنے ساتھیوں سمیت جیل کی ہوا کھانی پڑی۔

....

ماؤ نے یوں تو اپنے دور اقتدار میں کئی غلطیاں کی ہیں مگر اس کی سب سے سنگین غلطی اسکا "ثقافتی انقلاب" تھا اس کا آغاز ایک معمولی واقعہ سے ہوا۔ ڈپٹی میئر آف پیکنگ مسٹر وو ہن نے ایک پلے لکھا جس کے بین السطور میں نام لئے بغیر قدیم چینی شہنشاہیت کے حوالے سے ماؤ کی آمریت پر تنقید کی گئی تھی، ماؤ نے اسے اپنے شخصی اقتدار کیلئے خطرے کی گھنٹی سمجھا اور اس نے فوج اور طلبہ کی مدد سے پارٹی اور بیوروکریسی

کی تطہیر کے نام پر ایک زبردست مہم شروع کی۔ یہ مہم جو دس سال کے عرصہ پر محیط ہے جدید چین کی تاریخ میں تشدد بربریت ظلم و ستم اور شخصی آمریت کی بدترین مثال پیش کرتی ہے۔ گو ماؤزے تنگ نے پارٹی کی سنٹرل کمیٹی سے برائے نام اس کی منظوری حاصل کی جو معمولی اکثریت سے اسے مل بھی گئی لیکن اس آڑ میں اپنے سے اختلاف رائے رکھنے والے پارٹی رہنماؤں کا جو حشر کیا اس دردناک داستان کی صدائے بازگشت اب تک سنائی دے رہی ہے۔ دن دہاڑے ری پبلک کے باقاعدہ منتخب شدہ چیئرمین اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے وائس چیئرمین مسٹر لیوشاؤچی کے گھر پر حملہ کیا گیا اس کی بیوی کو سرعام گھسیٹا گیا اور ماؤ کی بیوی چیانگ چنگ نے کھلم کھلا ان اقدامات کی حمایت کی۔ چیانگ چنگ جو شروع میں ایک فلم ایکٹرس تھی اور "لن پنگ" یعنی نیلا سیب کے نام سے موسوم تھی اس ثقافتی انقلاب کی سربراہ تھی اس کے بعض خطوط اور تصویریں وغیرہ بعض آرٹسٹوں کے پاس محفوظ تھیں جن سے اس کی پہلی زندگی پر روشنی پڑتی تھی۔ یہ دستاویزات حاصل کرنے کیلئے متعدد لوگوں کے گھروں پر چھاپے مارے گئے انہیں حراست میں لیکر تشدد کا نشانہ بنایا گیا یہاں تک کہ کئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ماؤ کی وفات کے بعد ان کی بیگم پر اس کے ساتھیوں سمیت جو مقدمہ چلایا گیا ہے اس کی روداد نیو ورلڈ پریس چائنا نے "اے گریٹ ٹرائیل" کے نام سے شائع کر دی ہے اس روداد سے ثقافتی انقلاب کے دوران ہونے والے مظالم کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے ملزموں کو جو فرد قرار دادِ جرم دی گئی اس میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے سات لاکھ انتیس ہزار پانچسو گیارہ افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا اور چونتیس ہزار آٹھ سو افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔

....

لیکن داد دیجئے چین کی زندہ قوم کو جس نے ماؤ کی وفات کے بعد، اس کی لاتعداد خدمات اور فکری اور شخصی عظمت کی وجہ سے اس کی بیوی کو سر پر نہیں چڑھایا بلکہ اس کا احتساب کیا اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا اور جرم ثابت ہو جانے پر اسے عبرت ناک سزا دی، یہی نہیں چین کی کمیونسٹ پارٹی بھی شخصیت پرستی کے خول سے باہر نکلی اس نے ماضی کی غلطیوں کا باقاعدہ جائزہ لیا اور پارٹی کی گیارہویں مرکزی کمیٹی کے چھٹے مکمل اجلاس میں ایک مبسوط قرارداد منظور کی جس میں ماؤزے تنگ کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا اور ثقافتی انقلاب کی سنگین غلطی پر اس کی گرفت بھی کی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ پارٹی کی قیادت نے اپنی اس خامی پر بھی قوم سے معافی مانگی کہ جب ماؤ نے یہ مہم چلائی تو اس کے اراکین نے اس کا ساتھ دیا۔ یہ قرارداد "چینی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کے بارے میں قرارداد" کے نام سے عوامی جمہوریہ چین کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر نے کتابی صورت میں شائع کر دی ہے اور اس وقت اس کا اردو ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ ملاحظہ کیجئے ایک زندہ قوم تلخ تجربات کی بھٹی سے گزرنے کے بعد کس طرح کندن بن جاتی ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے۔

"محض اس بنا پر کہ کامریڈ ماؤزے تنگ نے زندگی کے آخری برسوں

میں غلطیاں کیں فکر ماؤزے تنگ کی سائینٹیفک قدر وقیمت کی نفی کی کوشش کرنا اور ہمارے انقلاب اور تعمیر میں اس کے رہنما کردار سے انکار کرنا قطعی غلط بات ہوگی اور اس طرح یہ بات بھی بالکل غلط ہوگی کہ کامریڈ ماؤزے تنگ کے اقوال کے بارے میں عقیدہ پرستی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ انہوں نے جو کچھ کہا اسے ایسی ناقابل ترمیم صداقت تصور کیا جائے جس کا ہر جگہ میکانکی انداز میں اطلاق کیا جاسکتا ہو اور دیانتداری کے ساتھ یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ انہوں نے زندگی کے آخری سالوں میں غلطیاں کیں اور نئی کارروائیوں کے دوران بھی ان کی غلطیوں پر اڑے رہنے کی کوشش کی جائے۔" (صفحہ۔ 9)

چینی قوم نے اس تجربے سے جو قیمتی سبق حاصل کیا وہ تمام قوموں کیلئے نسخہ کیمیا ہے' قرارداد میں کہا گیا ہے کہ

"ثقافتی انقلاب کے اسباق اور پارٹی میں موجود صورتحال کے پیش نظر یہ امر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ پارٹی کے اندر جمہوری مرکزیت کا ٹھوس نظام قائم کیا جائے' ہمیں ایسے رہنماؤں پر مشتمل اجتماعی پارٹی قیادت کے مارکسی اصول پر عمل کرنا چاہئے جو عوامی جدوجہد میں ابھرے ہیں اور ہمیں ہر نوع کی شخصیت پرستی کی ممانعت کر دینی چاہئے"۔

آپ نے ایک زندہ قوم کا طرز عمل دیکھ لیا۔ غلطی ہوئی تو شرح صدر کے ساتھ اسکا اعتراف کیا۔ اس غلطی سے سبق سیکھا۔ لیڈر کے اہل خانہ کو اس لئے حکومت اور پارٹی کی قیادت نہیں سونپ دی کہ وہ اس سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں لیڈر کی خامیوں اور خوبیوں' غلطیوں اور کارناموں کا متوازن جائزہ لیا اسی سائینٹفک طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ آج چین پہلے سے زیادہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے اس میں ثقافتی انقلاب کے دور کی پابندیاں نہیں رہیں' آزادیٔ خیال کی روایت جنم لے رہی ہے۔ شخصیت پرستی کی بجائے اجتماعی قیادت کا تصور ابھر رہا ہے۔ کاش پاکستان کے عوام بھی چینی قوم کے اس انقلابی اقدام سے کچھ سیکھ سکیں۔ اقتدار کو کسی لیڈر کا خانہ زاد نہ سمجھیں اس پر تنقید کرنے کو اس سے غداری قرار نہ دیں اور شخصیت پرستی کے طلسم سے نکل کر اجتماعی قیادت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(16 ستمبر 1982ء)

اندرا گاندھی کے بعد

آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا، بھارت میں فرقہ واریت کے خون آشام عفریت نے اندرا گاندھی کو نگل لیا، سکھوں نے اپنا انتقام لیکر حالات کو پہلے سے بھی زیادہ سنگین تر بنا دیا اور اب معلوم نہیں یہ خونی چکر کہاں جا کر رکے۔ ہندوؤں نے اشتعال میں آکر جو جوابی کاروائی کی اس کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ سکھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، لاکھوں بے گھر ہو گئے، مشرقی پنجاب، دہلی اور بعض دوسرے متاثرہ علاقوں میں جو صورتحال پیدا ہوئی اسے دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا جیسے 1947ء کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے فرق اتنا تھا کہ اس میں مرنے والے زیادہ تر سکھ تھے، مشہور صحافی سردار خوشونت سنگھ نے جنہیں خود اندرا گاندھی نے یجسلیچر کارکن نامزد کیا تھا اپنے ایک انٹرویو میں اس کی جو نقشہ کشی کی ہے وہ یوں ہے کہ

"آج بھارت میں سکھ ایسے ہیں جیسے نازی جرمنی میں یہودی، کیا اس کے بعد بھی کوئی سکھ اپنے آپ کو ہندوستانی کہلا سکتا ہے؟"

ادھر سکھوں کی رگ انتقام ابھی تک پھڑک رہی ہے، ان کا کہنا ہے کہ اندرا گاندھی ہی تنہا، ہمارا نشانہ نہ تھیں، ابھی راجیو گاندھی اور صدر ذیل سنگھ کی باری بھی آنے والی ہے، گویا حکمت و تدبیر کے بجائے معاملات و مسائل کے حل کیلئے ابھی تک قاضئ شمشیر کی طرف ہی دیکھا جا رہا ہے اور کون نہیں جانتا کہ یہ قاضی بڑا ہی سنگدل اور اندھا ہے جب یہ اپنے فیصلے سنانے لگتا ہے تو بیگانوں کیساتھ اپنے اور گناہگاروں کے ساتھ معصوم بھی ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ بدقسمتی سے تیسری دنیا کے ملکوں میں تشدد اور قتل و غارت

کے ذریعے حصول مقصد کی کوششیں اتنی عام ہیں کہ مہذب دنیا ہمیں جاہل اور وحشی گردانے لگی ہے، علم و تہذیب سے جگمگاتے معاشروں میں اول تو اس رجحان کی مثالیں بہت خال خال ہیں لیکن اگر وہاں کبھی کوئی حادثہ ہو بھی جائے تو سسٹم اتنا "بلٹ پروف" ہوتا ہے کہ افراد کے جانے سے کوئی فرق رونما نہیں ہوتا، ہمارے ہاں افراد کو "بلٹ پروف" بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ سسٹم کو "بلٹ پروف" نہیں بنایا جاتا افراد آنے جانے والی چیز ہیں، فانی ہیں، کوئی کتنا ہی محفوظ و مامون زندگی کیوں نہ گزار رہا ہو ایک دن اسے دنیا سے جانا ہے۔ ہمارے ہاں جب وہ لوگ رخصت ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں زمام کار اور عنان اقتدار ہوتی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے سسٹم بھی انکے ساتھ رخصت ہو گیا۔ کوئی شک نہیں کہ بھارت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، اس میں ایک سسٹم بھی موجود ہے اسکے تحت راجیو گاندھی برسراقتدار بھی آ گئے لیکن اس سسٹم میں کمزوری یہ ہے کہ ابھی تک وہاں بھی قیادت کیلئے ایک مخصوص خاندان کی طرف دیکھا جا رہا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ خاندان باقی نہ رہا تو پھر کیا ہو گا؟۔

....

اندرا گاندھی تقریباً بیس سال کسی نہ کسی انداز میں بھارت کی اجتماعی زندگی میں نگاہوں کا مرکز رہیں۔ وہ "ایمرجنسی" کے نفاذ کے نتیجے میں اقتدار سے محروم بھی ہوئیں لیکن انہوں نے "جنتا حکومت" کی طرف سے ہونے والے اقدامات پر اپنے اعصاب کو قابو میں رکھا۔ اشتعال میں آ کر غیر جمہوری رستہ اختیار نہیں کیا۔ کوئی ایسی روش نہیں اپنائی جسے حکومت التوائے انتخابات کیلئے بہانہ بنا سکتی، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ رائے عامہ کی تائید سے دوبارہ برسراقتدار آ گئیں، پاکستان کو انہوں نے ہمیشہ "ذہنی تحفظ" کیساتھ دیکھا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ذہن و قلب نے پاکستان کے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ وہ اول و آخر "اکھنڈ بھارتی" تھیں اور انہیں ہونا بھی چاہئے تھا جس سیاسی پارٹی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی اسکا مطمع نظر بھی شروع سے یہی رہا ہے، انہوں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کیلئے بھی بڑا اہم رول ادا کیا۔ پاکستان کیساتھ جنگیں بھی کیں۔ یہ سارے اقدامات پاکستانی نقطہ نظر سے جتنے بھی غلط کیوں نہ ہوں بھارتی سوچ کے عین مطابق تھے۔ ان کی وجہ سے اپنے ملک میں انہیں بڑا درجہ ملا۔ بھارتی عوام نے انہیں "دیوی" کا رتبہ دیا۔ وہ پڑوسی ملکوں کیساتھ جیسی بھی کیوں نہ رہی ہوں اپنے ملک کی انہوں نے دل و جان سے خدمت کی، زراندوزی نہیں کی۔ اپنے لئے کچھ نہیں بنایا۔ اپنی زندگی کو دیش کی سیوا کیلئے وقف کئے رکھا۔ یہاں تک کہ سکھ دہشت گردوں کیخلاف کارروائی کرتے ہوئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دی۔ کوئی اور ہوتا تو دربار صاحب کو مسلح کارروائیوں کا مرکز بننے سے روکنے کیلئے اس جرأت و ہمت کا مظاہرہ کبھی نہ کر پاتا، لیکن اندرا آہنی اعصاب کی مالک تھیں انہوں نے یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لیا، انہیں معلوم تھا اس کا نتیجہ ذاتی طور پر ان کے حق میں اچھا نہیں نکلے گا لیکن انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ مرنا تو انہوں نے ایک دن تھا ہی، ان کی طبعی عمر زیادہ سے زیادہ دو چار سال اور باقی تھی مگر اپنے آدرش اور اپنے دیش

کیلئے مظلومی کی حالت میں گولی کا نشانہ بن کر وہ تاریخ میں امر ہو گئیں۔ اپنے باپ سے بھی بڑی لیڈر بن گئیں۔ ان کے قتل پر اندرون ملک جو رد عمل ہوا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکثریتی ووٹروں کو ان کے جانے کا کتنا صدمہ ہوا ہے' دوسرے ملکوں میں بھی بعض رہنما قتل ہوئے ہیں' پھانسی چڑھے ہیں مگر کیا رد عمل ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔

شاید آنجہانی اندرا کی دلی خواہش تھی کہ ان کے بعد انکے بیٹے ان کے جانشین ہوں' سنجے گاندھی میں وہ ساری صلاحتیں موجود تھیں جو انہیں اپنی ماں کا قائم مقام بنا سکتی تھیں مگر وہ عین عنفوان شباب میں ایک حادثے کا شکار ہو گئے' ماں کی حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں' راجیو ایک پیشہ ور ہوا باز اور ایک ٹیکنو کریٹ تھے۔ سیاست سے دور کا تعلق نہ تھا بلکہ سیاست سے طبعاً نفور تھے۔ مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی ہی طرز زندگی کے دل دادہ یہاں تک کہ شادی بھی ایک اطالوی خاتون سے کی۔ ماں نے سنجے کی وفات کے بعد راجیو سے استعفیٰ دلایا اور اسے اپنے پاس رکھ کر سیاست کی تربیت دینی شروع کی اور اب وہ چار سال سے ان کے زیر سایہ سیاست اور حکمرانی کے رموز و اسرار سیکھ رہے تھے اپوزیشن کے لیڈر برملا اس خوف اور خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ اندرا گاندھی راجیو کو اپنا جانشین بنا رہی ہیں مگر وہ یہ چاہتے ہوئے بھی بربنائے مصلحت اس سے انکار کر رہی تھیں' اگر وہ جیتے جی ایسا کرتیں تو انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا مگر جس شان سے وہ مریں اور جو جذباتی فضا وہ پیچھے چھوڑ گئیں' اس میں راجیو بآسانی وزیر اعظم بن گئے' اب تک روایت یہ تھی کہ وزیر اعظم کے انتقال کے بعد صدر کابینہ کے کسی سینئر رکن کو وزیر اعظم بننے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری کی وفات پر یہی طریق کار اختیار کیا گیا تھا لیکن اب کے قرعہ فال راجیو کے نام پڑا جنہیں جمہوری تقاضے پورے کرنے کیلئے اس سے پہلے پارلیمنٹ کا رکن چن لیا گیا تھا' یہ سب کچھ ایسے آناً فاناً اور ایسے فطری انداز میں ہوا کہ بھارت کی وزارت عظمیٰ کو ایک خاندان میں محدود و مرکوز دیکھنے پر بڑے بڑے نکتہ چینی اور تنقید کرنے والے بزرگ سیاستدان بھی دم بخود رہ گئے' فضا میں جذبات کی گمبھیرتا اتنی رچ بس گئی تھی کہ چرن سنگھ کے سوا کسی کو زبان کھولنے کا حوصلہ نہ رہا' گویا وہ خواہش جو اندرا گاندھی اپنی زندگی میں پوری نہ کر سکتی تھیں اور کرتیں بھی تو انہیں اس کیلئے مخالفتوں کے بڑے بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑتا ان کی موت سے چشم زدن میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی گویا ایک طرف اندرا نے اپنی موت کی صورت میں دیش کو جان کی قربانی کا نذرانہ پیش کیا اور دوسری طرف راجیو کو ماں کی ممتا کا آخری تحفہ' اب راجیو ماں کی اس عطا کو سنبھال کر کہاں تک رکھ سکتے ہیں یہ وقت بتائے گا۔ 24 دسمبر کو بھارت کے انتخابات ہونے والے ہیں اگر تو یہ وقت پر ہوئے تو اس المناک واقعہ کی وجہ سے انہیں جو عوامی ہمدردیاں حاصل ہیں وہ یقیناً وزیر اعظم منتخب ہو جائیں گے اور اگر کہیں بعض برخود غلط مشیروں کی رائے سے انہوں نے الیکشن ملتوی کر دیئے تاکہ انہیں مسائل سے عہدہ برآ ہونے

اور الیکشن کی تیاری کرنے کیلئے کچھ مزید وقت مل جائے تو پھر وہ اس حقیقی موقع کو ہاتھ سے گنوا دیں گے' بعد میں کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ قسمت ان کی یاوری کرتی ہے یا نہیں'

راجیو آگے چل کر روس سے اسی طرح قریبی تعلقات قائم رکھیں گے اور وہی خارجہ پالیسی اپنائیں گے جو ماں سے انہیں ورثہ میں ملی ہے یا اس میں کچھ تبدیلی آئے گی اس کے متعلق مغربی مبصرین نے (بالخصوص) بڑی خوش گمانیاں قائم کر رکھی ہیں۔ روس کو بھی اس کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ اندرا تو پکی سوشلسٹ تھیں۔ باقاعدہ نظریاتی پس منظر رکھتی تھیں اس لئے انہوں نے روس سے بڑے ہی خاص تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ امریکہ کو وہ ایکسپلائٹ ضرور کرتی تھیں مگر اس سے فاصلہ کسی نہ کسی رنگ میں برابر قائم رکھا۔ ماضیٔ قریب میں (1981ء) بھارت امریکہ تعلقات میں یہ سرد مہری خاص طور پر اس وقت نکتۂ عروج کو پہنچ گئی جب امریکہ نے پاکستان کو ایف 16 طیارے دینے کا معاہدہ کیا۔ اندرا نے جوابی اقدام کے طور پر فی الفور روس سے اس سے بھی بڑھیا طیارے لینے کا ایگریمنٹ کر لیا' امریکہ اس سارے زمانے میں سفارتی محاذ پر اندرا کو راضی کرنے میں لگا رہا اب گذشتہ چند ماہ سے تعلقات کچھ روبہ اصلاح ہو چلے تھے امریکہ سے بھارت کو کمپیوٹر اور صنعتی ساز و سامان بھی ملنے والا تھا کہ اندرا گاندھی آنجہانی ہو گئیں ان کا بیٹا راجیو مغربی تعلیم اور طور اطوار کے سانچے میں ڈھل کر آگے بڑھا ہے وہ شروع سے سیاست میں نہ تھا بادل ناخواستہ گذشتہ چار سال سے اس میدان میں آیا ہے' اس کا کوئی نظریاتی کومٹمنٹ نہیں اس کا ذہن ایک "کلین سلیٹ" ہے' ہو سکتا ہے وہ روس کے بجائے امریکہ سے زیادہ تعلقات استوار کرنا پسند کرے' ہو سکتا ہے وہ دونوں کو برابر کی اہمیت دے' یہی خوف تھا جس کی وجہ سے روسی ذرائع ابلاغ نے اندرا گاندھی کے قتل کے فوراً بعد سی آئی اے کو اس میں ملوث کر کے باقاعدہ پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر راجیو امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا بھی چاہے تو امریکہ کو اپنی ماں کا قاتل سمجھ کر ایسا نہ کر سکے' لیکن معلوم ہوتا ہے بھارت میں عوامی سطح پر اس پروپیگنڈے کو کچھ زیادہ قبول عام حاصل نہیں ہو سکا ورنہ اس کے نتیجے میں کم سے کم امریکی سفارت خانہ اور سفارت کاروں کی تو خیر نہ تھی تادمِ تحریر اس طرح کے کسی مظاہرے کی کوئی خبر نظر سے نہیں گزری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روس کا یہ تیر خطا گیا ہے۔

راجیو گاندھی کی شخصیت کے بارے میں ایک ٹھوس بات صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کہی ہے' انہوں نے کہا ہے کہ اندرا گاندھی تقسیم ہند سے پہلے سیاست میں وارد ہوئیں اس وقت کی ساری تلخیاں ان کی شخصیت کا حصہ بن چکی تھیں جبکہ راجیو تقسیم کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے قدرتاً ان کا ذہن ان تمام تلخیوں اور تعصبات سے صاف اور آزاد ہو گا جو اس دور کا خاصہ تھیں۔ اب اس صاف ذہن کے ساتھ راجیو اپنی خارجہ پالیسی کو نئے خطوط پر استوار کرتے ہیں اور پڑوسی ملکوں بالخصوص پاکستان کے

ساتھ کس ذہنی روش کا مظاہرہ کرتے ہیں' اس کا جواب آنے والا وقت دے گا' ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں تبدیلی برائے بہتری کی طاقت اور ہمت عطا فرمائے۔

....

پنڈت جواہر لال نہرو' اندرا گاندھی' راجیو گاندھی تینوں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ماں' بیٹا اور نانا......... مگر تینوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ماں اور نانا لیڈر بن کر حکمران بنے جبکہ راجیو کو حکمران بن کر لیڈر بننا پڑا ہے' لیکن کیا مسائل کا وہ جنگل اسے لیڈر بننے کی مہلت بھی دے گا جو بھارت کے طول و عرض میں سبزۂ بیگانہ بن کر پھیلتا جا رہا ہے۔

- ......علاقائی خود مختاری بلکہ علیحدگی پسندی کے نعرے
- ......آسام' پنجاب' کشمیر وغیرہ میں انتظامی افراتفری
- ......فرقہ وارانہ فسادات
- ......بڑھتی ہوئی غربت بلکہ فاقہ زدگی
- ......پڑوسی ملکوں' بالخصوص پاکستان' سری لنکا اور بنگلہ دیش سے ناخوشگوار تعلقات
- ......اور اب ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان منافرت اور عداوت کی مستقل خلیج چند ایسے مسائل ہیں جو وقت طلب بھی ہیں اور وقت طلب بھی' ان میں صوبوں اور مرکز کے تعلقات کا مسئلہ خاص طور پر بڑا نازک ہے۔ اس سے عہدہ بر آ ہونے کیلئے راجیو کے پاس دو راستے ہیں ان میں سے ایک ان کے نانا نے اور دوسرا ان کی ماں نے اختیار کیا پنڈت جواہر لال نہرو مضبوط مرکز کے حامی تھے مگر اسی کے ساتھ انہوں نے صوبوں کو بھی مکمل اختیارات دے رکھے تھے' اندرا گاندھی صرف مضبوط مرکز کی حامی تھیں وہ صوبوں میں ان وزرائے اعلیٰ کو برسر اقتدار دیکھنا چاہتی تھیں جو ان کے اشارۂ ابرو پر کام کریں' پہلا راستہ صحیح راستہ ہے مگر اس پر چل سکنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں اس کیلئے پنڈت نہرو جیسے اسٹیٹسمین کی ضرورت ہے۔ دوسرا راستہ شارٹ کٹ ہے مگر انجام کار وہ ملک کو ایک خطرناک منزل تک پہنچا دیتا ہے اور اس کیلئے اندرا جیسی آہنی اعصاب رکھنے والی شخصیت کی ضرورت ہے' راجیو نہرو جیسے اسٹیٹسمین ہیں نہ اندرا جیسے مضبوط اعصاب رکھنے والے سیاستدان۔ وہ اس مسئلہ کو کیسے حل کریں گے اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا' اتنا ضرور ہے کہ ایک ٹیکنو کریٹ ہونے کے ناطے ان سے ڈسپلن اور تنظیم کی اچھی توقع کی جا سکتی ہے۔

....

اگر خدانخواستہ راجیو ناکام ہوتا ہے تو بھارت کو کئی قسم کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلا خطرہ یہ ہے کہ کہیں بھارت سیکولرازم کی جگہ ہندو واج کے نرغے میں نہ آ جائے' اندرا گاندھی کے وقت بھی سیکولرازم کے باوجود کبھی کبھی ہندو راج کی پرچھائیاں زیادہ طاقت پکڑ لیتی تھیں۔ روز افزوں مسلم کش

فسادات اس کی علامت تھے اب سکھوں سے آویزش اور تصادم کے اس رجحان کو اور تقویت ملے گی، ایسی متعصب ہندو جماعتیں ملک میں پہلے سے موجود ہیں (اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ بعض علاقوں میں اچھا خاصہ عوامی اثرورسوخ بھی رکھتی ہیں) جو مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دے کر انہیں ملک بدر کرنے کا پروگرام رکھتی ہیں اب سکھ بھی ان کے نزدیک ملک دشمن قرار پائیں گے اور مسلمان اور سکھ دونوں سے .... نجات پانے کا ایک ہی راستہ ان کی سمجھ میں آئے گا کہ بھارت میں "عریاں" ہندوراج قائم کر دیا جائے جس دن ایسا ہو گیا اور بری بھلی سیکولرازم بھارت کے نظام سے خارج ہو گئی وہ دن بھارت کی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہو گا اس کے نتیجے میں اقلیتوں پر مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹیں گے ان کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ خدانخواستہ مسلمان ترک وطن کر کے بھارت سے بھاگنے لگے تو پاکستان انہیں کہاں تک پناہ دیگا؟ دوسرا خطرہ کمیونزم سے ہے۔ بھارت میں کمیونسٹ پارٹی اچھی خاصی مضبوط ہے۔ بعض ریاستوں میں اس کی حکومت بھی قائم ہو چکی ہے۔ اب بھارت میں انتشار پیدا ہوا قیادت ناکام رہی تو اس انتشار سے کمیونزم کو فروغ مل سکتا ہے۔ غربت اور فاقہ زدگی پہلے سے موجود ہے اسے بھی بآسانی ایکسپلائٹ کیا جاسکتا ہے بھارتی فوج اور پریس میں بھی روسی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سارے عوامل بھارت کو کمیونزم کی گود میں پھینک سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو افغانستان اور بھارت دونوں جانب سے پاکستان سینڈوچ بن کر رہ جائیگا۔

تیسرا خطرہ پاکستان کیلئے فوری اور براہ راست ہے اور وہ ہے کہ بھارت میں انتشار بڑھتا چلا گیا تو عوام کی توجہات اپنے مسائل سے ہٹانے کیلئے ایک کمزور بھارتی حکومت پاکستان پر حملہ بھی کر سکتی ہے۔

....

اندریں حالات پاکستان نے بھارت کی جانب سے خیرسگالی کا ہاتھ بڑھانے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اسے سراہے بغیر نہیں رہا جاسکتا، ہماری خواہش اور کوشش یہی ہونی چاہئے کہ راجیو گاندھی کے زیر قیادت بھارت کو استحکام نصیب ہو وہ جمہوریت اور سیکولرازم کے راستے سے انحراف نہ کرے وہاں تشدد کی سیاست کو فروغ حاصل نہ ہو اس میں بھارتی عوام کا بھی بھلا ہے اور پاکستان کی بھی بہتری ہے کیوں کہ ایک منتشر بھارت ہمارے لئے ایک مضبوط بھارت سے کہیں زیادہ خطرے کا باعث ہے۔

(22 نومبر 1984ء)

اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتیں (۱)

انسانی سوسائٹی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیام جماعت کی چند مقررہ صورتیں ہیں جن کے مطابق جماعت سازی کا کام ہوتا ہے' ان مقررہ صورتوں میں پہلی صورت یہ ہے کہ خالق کائنات اپنی مخلوق میں سے اپنے کسی پسندیدہ بندے کا خود ہی انتخاب کر کے اس دور میں موجود انسانی جماعت کا سربراہ بنادے اور اس جماعت کی اصلاح وہدایت پر اس ہستی کو مامور کر دے ایسی ہستی کو رسول اور اس کے پیروکاروں کو امت کہا جاسکتا ہے' مثلاً مختلف اقوام وامم کو تاریخ کے چار مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ نے چار ایسے مقدس انسان عطا فرمائے جنہیں الگ الگ مواقع پر ان کی جماعت کیلئے ایک ایک کتاب دستور بھی عطا فرمائی' حضرت داؤدؑ کو زبور' حضرت موسیٰؑ کو توریت' حضرت عیسیٰؑ کو انجیل اور خاتم الانبیاءؐ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن حکیم دیا گیا۔

جماعت سازی کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کچھ برگزیدہ افراد کو مختلف اوقات میں مختلف قوموں کی ہدایت کیلئے مامور کر دے اور ان کو کوئی مستقل مجموعہ دستور نہ دے بلکہ وہ لوگوں کو پہلے سے دیئے گئے کسی دستور پر عملدرآمد کرنے کی تلقین کریں اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کو نبی کہا جاتا ہے۔

نبی یا رسول جس جماعت کو مخاطب کر کے خدا کا پیغام سناتے اور ان سے پیغام الٰہی پر عمل کراتے ہیں اسے امت کہتے ہیں' اس اعتبار سے حضرت داؤدؑ کے پیروکار الگ امت' حضرت موسیٰؑ کے جانثار الگ امت' حضرت عیسیٰؑ کے پرستار علیحدہ امت اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فداکار ایک جداگانہ

امت ہیں' چونکہ جماعت سازی کا یہ کام خود خدا کے ہاتھوں انجام پاتا ہے اس لئے کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ امت میں ایک نئی امت کھڑی کرے اس کام کیلئے خدا جس شخص کو مقرر کرتا ہے وہی اس امت کا ہادی و راہنما ہوتا ہے ایک ہی وقت میں نہ دو ہادی و راہنما ہو سکتے ہیں نہ دو امتیں' یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی امت نے جب خدا کے احکام کو فراموش کر دیا تو ان کے بعد آنے والے بہت سے نبی آئے مگر انہوں نے اس دستور کو نہیں بدلا جو حضرت موسیٰ کو کتاب کی صورت میں دیا گیا تھا بلکہ اس دستور کو علیٰ حالہ قائم رکھتے ہوئے اس کے فراموش کردہ حصے قوم کو از سر نو یاد کرنے اور انہیں زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کی دعوت دی پھر سب انبیاء و رسل کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آخری نبی کی حیثیت میں انسانیت کی طرف مبعوث فرما کر آپ کو قرآن حکیم کی صورت میں آخری کتاب ہدایت عطا فرمائی مگر جس طرح پہلی امتیں غیر معصوم تھیں اسی طرح یہ اُمت بھی غیر معصوم تھی اور جس طرح گذشتہ امتوں نے غفلت کے باعث انبیاء کی تعلیمات کو فراموش کر دیا تھا اسی طرح یہ بھی ایک فطری بات تھی کہ اس امت سے بھی عملی اور نظری لغزشیں سرزد ہوئیں چنانچہ اب نبوت کی جگہ خلافت اور نیابت کا منصب قائم کیا گیا تاکہ نیابت و خلافت کی قوت و طاقت سے دستور الٰہی قرآن حکیم کے تمام اجزاء پر لوگوں سے عملدر آمد کرایا جائے اور قوم غفلت کے باعث کتاب و سنت کے جس جس حصے کو بھول جائے یا جن احکامات کو فراموش کر دے اسے دوبارہ ان احکامات کی یاد دہانی کرائی جائے اور اس طرح اس کتاب ہدایت کے ایک ایک جز پر قیامت تک عملدر آمد ہوتا رہے۔

یہی خلافت یا نیابت جماعت اور اس کا نظم، نظم جماعت ہے اسلئے سرور کائنات نے فرمایا کہ میری امت کے اہل علم انبیائے بنی اسرائیل کی طرح ہیں یعنی جو کام ان انبیاء کے ذمے تھا یہی کام میری امت کے صاحب علم لوگوں کے ذمے ہو گا مگر انبیائے بنی اسرائیل اور امت محمدیہ کے علماء کے مقام اور کام دونوں میں فرق ہے۔ انبیائے بنی اسرائیل کے سامنے دستور الٰہی کی صورت میں منقول دلائل کے علاوہ براہ راست خدائی راہنمائی بھی ہوتی تھی جبکہ اس امت کے اہل علم کے سامنے کتاب و سنت کی صورت میں منقولات تو موجود ہیں مگر براہ راست خدائی راہنمائی ان کے حصے میں نہیں آئی' کیونکہ ان میں سے کوئی فرد نبی یا رسول نہیں البتہ اس راہنمائی کا بدل ضرور ہے اور وہ ہے نت نئے مسائل کو حل کرنے کیلئے قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد۔

ان ہی تین بنیادوں کتاب و سنت اور اجتہاد کے ذریعے یہ اہل علم مسائل کو سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں' اس کی واضح مثال ہمیں حضرت معاذؓ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ سے ملتی ہے جب انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجنا چاہا تو آپ نے سوال کیا

"معاذؓ! بتاؤ تم فیصلے کس طرح کرو گے" حضرت معاذؓ نے عرض کیا "میں ہر فیصلہ قرآن کے

مطابق کرونگا" آپ نے دوبارہ استفسار کیا "اگر تمہیں قرآن سے دلیل نہ ملے تو کیا کروگے" عرض کیا "پھر آپ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرونگا" آپ نے پھر پوچھا "اگر میری سنت یعنی میرے طریقے سے بھی کوئی نظیر نہ ملے تو اس صورت میں تم کیا کروگے، کہا "پھر میں قیاس سے فیصلہ کروں گا" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا!

"سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے اپنے رسول کے رسول کو ایسی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول خوش ہو گیا" ۔ اس بحث سے یہ بات طے ہو گئی کہ امت تو ایک ہی ہوتی ہے امت میں نئی امت کھڑی نہیں کی جاسکتی مگر یہ بات کہ امت میں مختلف جماعتیں قائم ہو سکتی ہیں یا نہیں ہمیں اس کا جائزہ لینے کیلئے کتاب و سنت اور اہل علم کے اجتہادات کا مطالعہ کرنا ہو گا مگر قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر گفتگو کروں، تمہید در تمہید کے طور پر اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں بھی چند ابتدائی گذارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

....

حضور خاتم الانبیاءؐ کی بعثت انسانی شعور کے بلوغ کا اعلان تھا، یہ دو زمانوں کے درمیان حد فاصل تھی۔ آپؐ کی بعثت سے پہلے کا انسان کائنات اور مظاہر کائنات سے ترساں و لرزاں تھا، آپؐ کی بعثت کے بعد وہ کائنات کو مسخر کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگا، آپؐ سے پہلے کے انسان کو قدم قدم پر وحی کی ضرورت تھی آپؐ کے بعد وحی کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ

> "آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی
> نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا"
> (القرآن)

اور یہ اعلان اس لئے ہوا کیونکہ زندگی اب اپنے عہد شباب میں پہنچ چکی تھی انسانیت جو اب تک اپنے بچپن کے عالم میں تھی اب جوان ہونے والی تھی اسے اب انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہ رہی تھی وہ وحی کے عطا کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اب نت نئے پیش آنے والے مسائل کی گرہ خود ہی کھول سکتی تھی، مولانا محمد علی جوہر نے خوب کہا ہے

جب اپنی پوری جوانی پہ آ گئی دنیا
تو زندگی کے لئے آخری نظام آیا

اس آخری نظام، اس تکمیل دین اور اس اتمام نعمت کا منطقی تقاضہ یہ تھا کہ انسانیت کو بنیادی اصولوں کا ایک ایسا "فریم ورک" دے دیا جائے جس میں "تغیر و ثبات" کا بیک وقت ایسا عمدہ اہتمام ہو کہ اس کے بنیادی اصول تو ہمیشہ ثابت و قائم و دائم رہیں مگر تفصیلات و جزئیات میں وہ زمانے کے ارتقاء اور بدلتے ہوئے حالات میں تغیر کا وصف بھی اپنے اندر رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ اخلاق، عبادات اور معاملات میں تو اس نے

تفصیل سے کھول کھول کر واضح احکام عطا فرمائے مگر معاشرت کے بارے میں چند اصول دیکر انسان کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ مختلف ادوار میں اپنی ضروریات اور مقتضیات کے مطابق کوئی سی بھی روش اختیار کر لے بس اتنا خیال رہے کہ وہ وحی الٰہی کی بنیادی تعلیمات سے متصادم نہ ہو' آپ قرآن حکیم کو دیکھیں اس میں روزہ 'نماز' حج' زکوٰۃ' طواف' عمرہ' وضو تیمم' پاکی' ناپاکی' لین دین' قرض وغیرہ کے بارے میں آپ کو جملہ تفصیلی احکام مل جائیں گے مگر اسلامی نظام سیاست کے بارے میں آیات کے ان تین ٹکڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ ملے گا کہ

1۔ ان الحکم الا للہ .... اصل اتھارٹی اللہ کی ہے

2۔ وشاورہم فی الامر .... اور ان سے معاملات میں مشورہ کیجئے

3۔ وامرھم شوریٰ بینھم .... اور ان کا کام ایک دوسرے سے مشورہ کرنا ہے

یہ آیات جس ماحول میں نازل ہوئیں

وہ قبائلی نظام کا ماحول تھا۔ اتھارٹی ہر قبیلے کے شیخ کے پاس تھی' قبیلے کے نظم ونسق کے چلانے میں اس کا حکم حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا اسلام نے آ کر قبیلوں کو تو برقرار رکھا لیکن اتھارٹی کے بارے میں صاف کہہ دیا کہ فائنل حکم اللہ تعالیٰ کا ہے شیخ کا حکم اس کے تابع ہو تو بجا' اس کے خلاف ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ رہا مشورے کا حکم تو اس اجمال کی تفصیل دو وجوہ سے بیان نہیں کی ایک تو اس لئے کہ اس زمانے میں ادارے اور تنظیمیں ابھی عالم طفولیت میں تھیں۔ "آرگنائزیشنل سٹرکچر" اپنے ابتدائی دور میں تھا' اسے ترقی کی کتنی ہی منازل طے کرنی تھیں۔ اگر مشاورت کی کوئی باقاعدہ معین صورت طے کر دی جاتی تو یہ آنے والے ادوار کے ارتقاء کا ساتھ نہ دے سکتی اور اس طرح خدانخواستہ یہ تاثر پیدا ہو جاتا کہ اسلام کا دیا ہوا نظام ناقابل عمل ہے اس لئے اس حکم کو مجمل چھوڑ دیا گیا تاکہ مسلمان آنے والے ادوار میں ہر اس سیاسی نظام کو اپنا سکیں جس میں روح مشاورت کار فرما ہو اور جو ان کے حالات اور ضروریات کے مطابق ہو۔

دوسری وجہ اس اجمال کی یہ تھی کہ جس معاشرے میں یہ حکم دیا جا رہا تھا وہ معاشرہ مشاورت کے تصور سے نہ صرف پوری طرح آشنا تھا بلکہ اس نے اپنے ہاں اس کا ایک عملی نظام بھی تشکیل دے رکھا تھا' عام طور پر ہمارے سیرت نگاروں اور اہل قلم نے زمانہ بعثت کے عربوں کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے دنیا جہاں کی خرابیاں ان میں بھر دی ہیں اور ان جائز خوبیوں کا اعتراف وادراک نہیں کیا جو اس کے ضمیر میں گندھی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ معاشرہ ایک آزاد معاشرہ تھا' کوئی بادشاہت وہاں قائم نہ ہوئی تھی جو لوگوں کو غلام بنا کے رکھتی کوئی غیر ملکی غلبہ واستیلاء نہ تھا جو انہیں ذلتوں سے دوچار کرتا ایک آزاد قوم کے مزاج میں جتنی خوبیاں تھیں وہ ساری اس قوم میں پائی جاتی تھیں۔ دوسرے یہ ایک صحرانشین قوم تھی۔ صحرائی اقوام میں قدرتی طور پر فراخدلی' شجاعت' محنت' سخت کوشی اور فیاضی ومہمان نوازی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں

بقول اقبال

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی!

نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس قوم میں بعثت کا سبب جہاں ان کی تہ در تہ خرابیاں تھیں وہاں ان کے کردار کی یہ خصوصیات بھی اس کا باعث بنیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک اور روشن پہلو اس قوم کا مشاورتی نظام تھا، شیخ قبیلہ کو جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا اپنے قبیلہ کے سربر آوردہ افراد کی مجلس مشاورت طلب کرتا، پھر تمام قبائل کے شیوخ پر مشتمل ایک "مجلس شیوخ" تھی، جو بین القبائل مسائل پر باہمی مشورہ کرتی اسے "الملاء" کے نام سے پکارا جاتا تھا یہ گویا "ہاؤس آف لارڈز" تھا۔ ابن درید کی الاشتقاق (ص 155) پر ہے کہ اس کے ارکان کے انتخاب کیلئے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کی عمر چالیس سال سے کم نہ ہو، مکہ میں اس مجلس کا صدر دفتر تھا جسے "دار الندوہ" کہتے تھے اس کا ایک دروازہ خانہ کعبہ میں کھلتا تھا، کبھی کبھی جنرل کونسل کا بھی اجلاس ہوتا جسے "نادیٔ القوم" کہا جاتا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ج 3 ص 38 - 39) کے مطابق یہ اجتماع کعبہ کے ملحق میدان میں منعقد ہوتا اور اس میں ہر بالغ شہری کو شریک ہونے کی اجازت ہوتی۔

اسلام آیا تو اس نے عربوں کے اس مشاورتی نظام کو بادنیٰ تغیر نہ صرف برقرار رکھا بلکہ آگے بڑھایا "دار الندوہ" کی جگہ شوریٰ نے لے لی "نادی القوم" کی جگہ مسجد نبوی کے اجتماعات نے لے لی، اسلام کے پہلے خلیفہ کا انتخاب بھی اس طرح کی ایک "نادیٔ القوم" یعنی جنرل کونسل میں ہوا جو ثقیفۂ بنی ساعدہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔

اس دور کے سیاسی نظام میں جماعتیں موجود تھیں یا نہیں اور اسلام نے آ کر انہیں ختم کر دیا یا برقرار رکھا اس کا جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے تو ہم اس نکتے کو ذہن میں رکھیں کہ ہر وہ چیز جسے از روئے کتاب و سنت ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا گیا ہے جائز ہے اور اس کا موجود نہ ہونا اس کیلئے مستلزم نہیں ہے کہ وہ غلط ہے مثال کے طور پر باقاعدہ سیکرٹریٹ اور سرکاری محکمے ایک تنخواہ دار فوج، ویزا پاسپورٹ سسٹم مختلف ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی الگ الگ حکومتیں اس زمانے میں موجود نہ تھیں، نہ اس طرح کے عام انتخابات تھے نہ لوکل باڈیز کا الیکشن تھا مگر صرف اس بنیاد پر ان تمام چیزوں کو ناجائز اور حرام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ یہ چیزیں اس زمانے میں موجود نہ تھیں۔ اسی طرح جہاں تک سیاسی تنظیموں کا تعلق ہے یہ بھی اپنی موجودہ شکل و صورت میں خالصتاً ماضی قریب کی پیداوار ہیں اور ان کے زمانہ قیام کو ڈیڑھ پونے دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا اس لئے کتاب و سنت سے ان کے بارے میں کوئی صاف اور واضح حکم تو منقول نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی ممانعت موجود

نہیں بلکہ قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ میں کتنے ہی ایسے اشارات پائے جاتے ہیں جن سے سیاست میں بھی اجتماعیت اور تنظیم سازی کی واضح گنجائش نکلتی ہے، چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ قبائل جو اس دور میں جماعتوں کا درجہ رکھتے تھے اسلام نے انہیں توڑنے کی بجائے ان کی خرابیوں کا ازالہ کر کے انہیں باقاعدہ تسلیم کیا۔ یہ بات کہ یہ قبائل جماعتوں کا درجہ رکھتے تھے۔ جنگ خندق سے بھی واضح ہے۔ جس میں مختلف قبائل نے حصہ لیا۔ قرآن میں اس پر سورہ "الاحزاب" اتری اسی لئے اس غزوہ کو بھی غزوۂ احزاب" یعنی " جماعتوں کی جنگ " کہا جاتا ہے۔ قبائل کے جماعتی تنظیم ہونے کا ایک اور ثبوت واقعۂ شعب ابی طالب ہے۔ جب کفار نے آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقاطعہ کرتے ہوئے تمام بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا تو اس کیلئے ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں کی کوئی تخصیص نہ تھی جو بھی بنی ہاشم سے تعلق رکھتا تھا وہ آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے اس کی زد میں آیا بچا تو صرف ابولہب بچا جو اس سازش میں قریش مکہ کے ساتھ برابر کا شریک تھا جو صحابہ کرام بنی ہاشم سے تعلق نہ رکھتے تھے یہ مقاطعہ ان کے خلاف نہ تھا کیونکہ اس سے بنی ہاشم کے علاوہ بعض دوسرے قبائل بھی لپیٹ میں آجاتے مثلاً اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بائیکاٹ کیا جاتا تو سارے بنی عدی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اگر عثمان ابن عفانؓ کا بائیکاٹ ہوتا تو سب کے سب بنی امیہ مقابلے پر آجاتے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک قبیلہ کس درجے کی مضبوط تنظیم اور جماعت ہوتا تھا اعلان نبوت سے قبل آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبیلوں اور ان جماعتوں پر مشتمل ایک متحدہ محاذ بھی تشکیل دیا تھا جسے تاریخ میں " حلف الفضول " کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام اسلئے پڑا کہ اس انجمن کے کئی ارکان کے نام میں لفظ " فضل " شامل تھا۔ اس میں بنی ہاشم، بنی اسد، بنی زہرہ اور بنی تیم شامل تھے اور ان سب نے مل کر حلف اٹھایا تھا کہ وہ ملک سے بدامنی دور کریں گے غریبوں کی دستگیری کریں گے، مظلوموں کی حمایت کریں گے اور مسافروں کی حفاظت کریں گے۔ یہ ایک اچھے مقصد کیلئے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر جماعت سازی کی پہلی شکل ہے۔ جس کا مظاہرہ آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے فرمایا!

آنخضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبائلی تنظیموں اور جماعتوں کا کس طرح احترام فرمایا، اس کی ایک مثال "نصب حجر اسود" کا واقعہ بھی ہے جب سیلاب سے کعبۃ اللہ کی دیواریں گر گئیں اور خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے وقت حجر اسود کے دوبارہ نصب کرنے کا سوال درپیش ہوا تو ہر قبیلے کی یہ خواہش تھی کہ یہ شرف اسے حاصل ہو، بات تکرار تک جا پہنچی قریب تھا کہ تلواریں نیام سے نکل آتیں کہ ایک معمر شخص ابوامیہ کی تجویز پر یہ طے پایا کہ جو شخص کل صبح سب سے پہلے خانہ کعبہ میں آئے اس کو تصفیہ کرانے کیلئے حاکم مان لیا جائے۔ خانہ کعبہ میں صبح سب سے پہلے آنے والی ہستی محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اور کس کی ہو سکتی تھی آپؐ نے چادر پھیلا کر حجر اسود کو اس پر رکھا اور تمام قبائل کے نمائندوں سے فرمایا کہ

وہ مل کر چادر پکڑ لیں یہاں تک کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر خانہ کعبہ میں نصب فرما دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب فساد کا خطرہ ہو تو مسئلے کے تصفیہ میں تمام جماعتوں اور گروہوں کو شامل کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

اعلان نبوت سے قبل کے ان حالات و کوائف کے بعد اب ہم اعلان نبوت کے بعد کی تعلیمات سے رجوع کرتے ہیں، ظاہر ہے ان تعلیمات کا اولین سرچشمہ قرآن حکیم اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اب یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی نیا نبی آ کر آپ کی امت میں ایک نئی امت پیدا کر لے لیکن جہاں تک ملت اور امت کے امور اور اچھے مقاصد کیلئے جماعتوں اور تنظیموں کا تعلق ہے ان پر کوئی قدغن نہیں بلکہ حکم ہے کہ انہیں منظم کیا جائے۔ وہ مشہور زمانہ آیت قرآنی آپ کے پیش نظر ہو گی جس میں فرمایا کہ

"اور تم میں ایک جماعت تو ضرور ایسی ہونی چاہئے جو اچھائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے" (القرآن)

سوال یہ ہے کہ اگر اشاعت خیر کیلئے ایک جماعت قائم ہو سکتی ہے تو کئی جماعتیں قائم ہونے میں کیا مضائقہ ہے؟

امت اور ملت کے علاوہ جس کی تشکیل انبیاء کے ہاتھوں ہوتی ہے قرآن حکیم میں چھوٹی بڑی علاقائی اور قومی سطح کی جماعتوں کیلئے گیارہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان جماعتوں کی تشکیل انبیاء کے علاوہ دوسرے افراد امت کے ہاتھوں ہوتی ہے، یہ الفاظ یہ ہیں۔

"قوم رہط قبیلہ، طائفہ، شعب، حزب، اصحاب، شیوع، فوج، جند"

قرآن حکیم کی یہ آیت ملاحظہ فرمایئے، یہ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 122 ہے اس میں اہل ایمان کے درمیان مختلف گروہوں اور جماعتوں کے وجود کا ذکر ہے فرمایا:۔

"اور مومنوں کیلئے مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب نکل پڑیں تو کیوں نہ ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کر سکیں"۔

سورۂ حجرات کی آیت نمبر 9 میں مسلمانوں کی ایسی دو جماعتوں کا ذکر ہے جو نہ صرف آپس میں اختلاف کرتی ہیں بلکہ ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں اس کے باوجود وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں،

"اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو"۔

قرآن نہ صرف آپس میں اختلاف کرنے والی اور باہم دگر بر سر جنگ دو مسلمان جماعتوں کا ذکر کرتا ہے بلکہ سورۃ النساء کی آیت نمبر 59 میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا تصور بھی موجود ہے فرمایا:۔

"اے اہل ایمان ! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحب امر ہیں (ان کی اطاعت کرو) اور اگر کسی مسئلہ میں تم میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف رجوع کرو"۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی با اختیار اور بے اختیار جماعتوں میں نزاع بھی پیدا ہو سکتا ہے اور نزاع تبھی پیدا ہو گا جب ارباب اختیار کے کسی حکم یا کسی پالیسی پر دوسرا گروہ تنقید کرے گا' اس کی اپوزیشن کرے گا اس آیت کی رو سے ارباب اقتدار پر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی رنگ میں تنقید کا بھی حق ملتا ہے اور اپوزیشن کا بھی۔

اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتیں............(2)

سیاسی جماعتوں کے قیام پر قرآنی تعلیمات کی رو سے ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے ملت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور قرآن حکیم نے تفرقے کے خلاف بڑی وعیدیں سنائی ہیں' میں عرض کروں گا کہ قرآن حکیم میں جس تفرقہ کی مذمت کی گئی ہے یہ وہ تفرقہ ہے جو دین میں پیدا کیا جاتا ہے جسے ہم فرقہ واریت کہتے ہیں گویا اسلام میں مذہبی فرقے بنانا ناجائز ہے۔

اس کا مصداق وہ سیاسی جماعتیں نہیں بن سکتیں جن کا مذہبی فرقہ واریت سے کوئی تعلق نہیں اور جو لوگوں میں شعور پیدا کرنے اور ملت کی فلاح و بہبود کیلئے بہتر سے بہتر پروگرام پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان آیات قرآنی کو ملاحظہ فرمایئے ان کا تعلق صاف صاف فرقہ واریت سے ہے' فرمایا

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ

"دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو"

فرمایا "اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے تفرقہ پیدا کیا اور اس کے بعد بھی اختلاف کیا جبکہ ان کے پاس واضح تعلیمات آچکی تھیں ایسے ہی لوگوں کیلئے دردناک عذاب ہے" (3/104)

"اور ان مشرکوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے دین میں تفرقہ

پردازی کی اور وہ فرقوں میں بٹ گئے"

فرمایا "جن لوگوں نے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقوں میں بٹ گئے ان کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں"

(6/160)

ان آیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں دینی مکاتب فکر تو ہو سکتے ہیں جو کسی مسئلے پر مختلف الرائے ہوں انکا الگ الگ مسلک ہو مگر مذہبی فرقوں کی اسلامی ریاست میں کوئی گنجائش نہیں، ہمارا المیہ یہ ہے کہ ان واضح آیات قرآنی کے باوجود ہم مذہبی فرقوں کو تو گوارا کرتے ہیں انہیں آئینی تحفظ عطا کرتے ہیں لیکن سیاسی جماعتوں کے قیام کی مخالفت کر رہے ہیں جو ملت کے اندر تنظیم اور اجتماعیت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو سیاسی جماعتوں کا وجود افراد کے بے نہایت اور مجہول اختلافات کو محدود متعین اور منضبط کر دیتا ہے اور اس طرح ملت کی اہم خدمات انجام دیتا ہے، مثال کے طور پر اس وقت لوگوں میں گرانی اور معاشی مشکلات کا ایک اضطرابی احساس پھیلا ہوا ہے جماعتیں نہ ہونے کی صورت میں یہ احساس ایک مبہم بے چینی کی صورت میں کام کرے گا اکثر لوگ جذباتی طریقے سے حکومت کو ہدف بناتے رہیں گے ادھر ادھر جگہ جگہ کھسر پھسر ہوتی رہے گی اور بے چینی کا لاوا پورے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کرتا رہے گا غلط سے غلط آراء نمودار ہوں گی مگر عوام کے پاس کوئی طاقت نہ ہوگی جو ان کی روک تھام کر سکے۔ جماعتیں یہ تعمیری کام کرتی ہیں کہ وہ لوگوں کو مجہول بے چینی سے نکال کر ان کے سامنے اصل مسئلے کی وضاحت کرتی ہیں اور پریشان خیال افراد کی بڑی تعداد کو کسی ایک مدلل رائے پر جمع کرتی ہیں پھر ان کے واسطے سے عوام کے مختلف حلقوں کا ذہن نمایاں ہو کر حکومت کے سامنے آ جاتا ہے اور وہ یا تو جوابی دلائل دے کر لوگوں کو مطمئن کرتی ہے یا رائے عامہ کو ملحوظ رکھ کر مناسب اقدامات کرتی ہے، جماعتیں نہ ہونے کی صورت میں رائے عامہ کا صحیح مطالعہ کرنا اور یہ دیکھنا کہ کون سا رجحان اور کون سا عنصر کس حد تک اثر رکھتا ہے نہایت مشکل ہو جاتا ہے ایسے میں ایک طرف خوشامد پیشہ مصاحبین یا کارِ خاص کے مامورین ہی خالات کا مطالعہ کرنے کا ذریعہ رہ جاتے ہیں اور یہ ذریعہ اکثر و بیشتر حکمرانوں کو مغالطے میں ڈال دیا کرتا ہے، سیاسی جماعتیں باہمی مسابقت کی وجہ سے ایک دوسرے کی کمزوریوں پر بھی گرفت کرتی ہیں اس طرح حکومت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے یہ عوام میں جا کر ایک ایک سیاسی مسئلہ کی وضاحت کرتی ہیں رائے دہندگان میں شعور پیدا کرتی ہیں اور اس طرح ان کا وجود اچھی خاصی سیاسی تربیت گاہ کا کام کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر اختلافی رجحانات کو سیاسی جماعتوں کی صورت میں کام کرنے کا کھلا موقع حاصل رہے اور عوام مطمئن رہیں کہ وہ آئینی ذرائع سے حکومت میں تبدیلی لا سکتے ہیں تو سازشی انقلابوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے بعد آنحضورؐ کے ارشادات اور آپؐ کی حیات مبارکہ میں ہونے والے بعض واقعات کا جائزہ لیا جائے تو ان سے بھی نہ صرف جماعتی تنظیموں کا سراغ ملتا ہے بلکہ جائز حدود میں ان کے وجود کو تقویت ملتی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلام دینِ اجتماعیت ہے اسکی فرض کردہ نماز، نماز با جماعت ہے اس کا حج ایک امیرِ حج کا مقتضی ہے اس کی زکوۃ اجتماعی زکوۃ ہے وہ تنظیم اور اجتماعیت کو یہاں تک بڑھاتا ہے کہ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا (ابو داؤد کی روایت ہے) کہ

"جب تم میں سے تین آدمی سفر کیلئے نکلیں تو چاہئے کہ ایک کو اپنا امیر بنالیں"

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"ایسے تین آدمیوں کیلئے جو کسی بیابان میں ہوں جائز صرف یہ بات ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنا کر رہیں تمہارا اس طرح مختلف گھاٹیوں اور میدانوں میں منتشر رہنا صرف شیطان کی وجہ سے ہے"۔

آپؐ کا یہ ارشاد بھی بہت شہرت رکھتا ہے

" یداللہ علی الجماعت
....
جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے"

الجماعت اور جماعت میں جو فرق ہے وہ میری نظر میں ہے لیکن کم سے کم اس ارشادِ رسولؐ سے انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت کی برتری صاف صاف ثابت ہوتی ہے۔

ان ارشادات رسولؐ کے بعد آپ کے عہد میں پائے جانے والے بعض طبقات پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر چند انہیں عرف عام میں جماعتیں نہیں کہا جاسکتا مگر ان کے جماعتی تشخص اور امتیاز میں بھی اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ جنگ خندق کا مشہور واقع ہے کہ اس موقع پر کھدائی کا کام کرنے والوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کو الگ الگ کر کے فرمایا:۔

"تم دو جماعتیں ہو فلاں فلاں حصے میں الگ الگ کام کرو" حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ! میں نہ مہاجر ہوں نہ انصاری میں کہاں جاؤں" فرمایا۔ "سلمان منی سلمان مجھ سے ہے" اور پھر آپؐ نے حضرت سلمانؓ کو اپنے ساتھ ملا کر فرمایا۔ "یہ ہماری جماعت ہے" اس دلیل سے مقصد یہ ہے کہ جماعت کا وجود فطری خواہشات کا فطری مظہر ہے خواہ وہ عارضی کام کیلئے بنائی گئی ہو۔

جیسے جنگ خندق میں کھدائی کا کام تھا یا وہ تا دیر کام کیلئے مامور ہو جیسے مہاجر اور انصار تھے جو مختلف مواقع پر اپنے اپنے جماعتی تشخص کے ساتھ دینی اور سیاسی کام کرتے تھے حتی کہ فتح مکہ کے وقت مختلف

جماعتوں کے جھنڈے بھی الگ الگ تھے اور حضورؐ نے کسی پر یہ اعتراض نہ کیا کہ تم نے مختلف طبقوں میں بٹ کر امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

سنہ ۱ھ میں مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اس میں آپؐ نے یہود مدینہ سے معاہدہ کیا اس میثاق کی تفصیلات پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سیاسی طاقت اور جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کے حلیف بن رہے تھے اس لئے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم بھی اپنی سیاسی تنظیم قائم کر سکتے تھے اور

چونکہ اس معاہدہ کی رو سے انہیں مذہبی آزادی کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور ان سے اسلام کے دشمنوں کے خلاف مسلمانوں کے ساتھ مل کر کارروائی کرنے کا عہدہ لیا گیا تھا اسلئے اس سے یہ استنباط کرنا غلط نہ ہو گا کہ وہ ان حدود میں رہتے ہوئے ایک اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ میں بھی نمائندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر قرآن اور سنت کے خلاف وہ کوئی فیصلہ نہیں کرا سکتے، جیسا کہ اس معاہدہ میں کہا گیا تھا کہ اگر شرکائے معاہدہ میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسولؐ کریں گے' یہ بات بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس معاہدہ پر یہود مدینہ کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے مہاجر انصار اور بعض دوسرے قبائل بھی جماعتی حیثیت میں شریک تھے اور ان کے نمائندوں نے اس معاہدہ پر باقاعدہ اپنے دستخط ثبت کئے تھے اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست مختلف تنظیمی اداروں کے اتحاد سے چلائی جا سکتی ہے۔ اس میثاق کے ذریعے آنحضورؐ نے اسلامی جماعت' یہود اور دوسرے عناصر کے درمیان دستوری معاہدہ استوار کر کے انہیں ایک ہیئت سیاسیہ میں جمع کر دیا لیکن اس میں سیاسی' قانونی اور دفاعی لحاظ سے آخری اختیار حضورؐ نے اپنے لئے تسلیم کرا لیا تھا گویا اسلامی ریاست میں متعدد سیاسی واحدے پائے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ سب کے سب اختلافات اور نزاعات کے حل کیلئے اللہ اور اس کے رسولؐ کو آخری اتھارٹی تسلیم کرتے ہوں۔

اسلامی ریاست میں مختلف جماعتوں کے وجود کی گنجائش آنحضورؐ کے اس طرز عمل سے بھی ثابت ہوتی ہے جو آپؐ نے وفد ہوازن کی آمد کے موقع پر اختیار فرمایا، آپؐ چاہتے تو اس وفد سے خود ہی بات چیت کر کے فیصلہ صادر فرما دیتے مگر اس اجتماعی معاملے میں آپؐ نے تمام مسلمانوں کو شریک فرمایا اور ہدایت کی کہ سب مسلمان قبیلے اپنے اپنے عرفاء کا انتخاب کر لیں تاکہ ان کی تائید و تصویب سے مسئلہ زیر بحث کا تصفیہ کیا جائے اسی طرح آپ نے بیعت عقبہ کے موقع پر مسلمانوں کو مختلف قبائلی گروہوں میں منظم کیا اور ان کے الگ الگ نقیب (یعنی نمائندہ لیڈر) مقرر کئے بلکہ بسا اوقات میدان جنگ میں جنگی دستوں کی ترتیب میں بھی ان وحدتوں کو آئینی حیثیت دی اور مشاورتوں میں بھی سب کے تناسب نمائندگی کا خیال فرمایا، آپؐ کے اس نمونۂ عمل کی رو سے اہل ایمان میں کئی جماعتوں کے وجود کی گنجائش بھی نکلتی ہے اور ان کے منتخب نمائندوں کے ذریعے سے کاروبار مملکت میں مشاورت کا طریقہ بھی سامنے آتا ہے۔

آنحضورؐ کے وصال کے بعد خلافت راشدہ قائم ہوئی تو یہ زمانہ سعادت بھی مختلف سیاسی مسلک رکھنے والے گروہوں اور جماعتوں سے کاملاً خالی نہیں رہا مہاجرین اور انصار کے درمیان خلیفۂ اول کے انتخاب کے موقع پر سقیفۂ بنی ساعدہ میں جو بحث وتمحیص ہوئی اس سے بہت کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے اس موقع پر دونوں جماعتوں نے اسلام کیلئے اپنی اپنی خدمات کا حوالہ دیا یہاں تک کہ ایک انصاری نے تو یہ بھی تجویز کر دیا کہ اگر کسی متفق علیہ امیر کا انتخاب ممکن نہیں ہے تو ایک امیر تم میں سے ہو ایک ہم میں سے' اس موقع پر الائمۃ من قریش کا جو ارشادِ رسولؐ پیش کیا گیا اس سے بھی جملہ اہل ایمان کے اندر حکومت کی اہلیت اور صلاحیت کے معاملے میں ایک خاص جماعت کی برتری ثابت ہوتی ہے پھر خلافت راشدہ ہی کے دور میں شیعانِ علیؓ کی جو ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی اسے اگر اس عہد کے مخصوص معاشرتی اور سیاسی پس منظر میں ایک ابتدائی طرز کی سیاسی حزب اختلاف کا نام دے دیا جائے تو ہو سکتا ہے اس سے طرح طرح کی فرقہ وارانہ بحثیں چھڑ جائیں مگر ان سے نفس واقعہ کا انکار پھر بھی سخت مشکل ہو جائے گا اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت حسینؓ و یزید کے ساتھیوں کو بھی دو الگ الگ جماعتیں کہہ کر پکارا جائے تو ممکن ہے بہت سے محتاط لوگوں کے جذبات کی جراحت کا سامان ہو جائے لیکن اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں اس طرح کے جو سیاسی اختلافات رونما ہوئے ان سے سیاسی جماعتوں کے وجود اور تشکیل کے زوردار فطری عمل پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔

ہو سکتا ہے خلافت راشدہ میں ظہور پذیر ہونے والے ان واقعات کی کوئی اور توجیہ بھی کر لی جائے بلکہ اس طرح کی ہونے والی کئی توجیہات خود میری نظر میں ہیں، لیکن سیدنا علی مرتضیٰؓ کے عہد میں اس سلسلے میں جو واقعہ پیش آیا اور حضرت علیؓ جیسے اسلامی دستور کے ماہر اور عارف نے اس پر جو ردعمل ظاہر کیا اس کی تو اس کے سوا اور کوئی دوسری تاویل ممکن نہیں کہ اسلامی ریاست' مقبول اور مسلمہ نظریات سے ہٹ کر تشکیل پانے والی سیاسی تنظیموں کے وجود کو آئینی طور پر تسلیم کرتی ہے یہ واقعہ حضرت علیؓ کے عہد میں خوارج کے ظہور کا واقعہ ہے' خوارج اسلام میں ایک نیا سیاسی مدرسۂ فکر تھا یہ ایک منظم سیاسی پارٹی تھی مذہبی لحاظ سے بھی اس کے بعض عقائد و نظریات سواد اعظم کے معتقدات سے کھلم کھلا متصادم تھے ان کے خلاف سیدنا علیؓ تین صورتیں اختیار کر سکتے تھے انہیں مرتد قرار دے دیتے ان کو باغی ٹھہراتے یا انہیں محارب اور برسرِ جنگ ڈیکلیئر کرتے لیکن آپ نے ان تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی ایک صورت اختیار نہیں فرمائی۔ بلکہ ان کی باقاعدہ منظم حیثیت کو ایک باقاعدہ ڈیکلیریشن کے ذریعے معین فرما دیا اس ڈیکلیریشن میں کہا گیا تھا کہ

1۔ خوارج کو مساجد میں نماز ادا کرنے سے نہ روکا جائے گا

2۔ ان کے خلاف جنگی اقدام کرنے میں پہل نہیں کی جائے گی

3۔ انہیں فے میں سے حصہ ملے گا"

اگر ملت میں سیاسی جماعتیں بنانا جرم ہوتا تو حضرت علیؓ خوارج کو ارتداد یا ترک اسلام کا مجرم قرار

دے دیتے اگر اسے اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت سمجھتے تو ان کے مقابلے میں اسی طرح کی جنگی کارروائی کرتے جیسے ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف کی تھی اگر انہیں محارب گردانتے تو انہیں سنگین سے سنگین فوجداری سزا دے سکتے تھے اگر ایمرجنسی کا سہارا لیتے (اور کون نہیں جانتا کہ ان کا پورا دور ہی ایمرجنسی میں گزرا) تو انہیں خلاف قانون قرار دے دیتے لیکن وہی حضرت علیؓ جو لا اینڈ آرڈر کے نفاذ کیلئے جنگ جمل کے میدان میں خود شمشیر بدست اتر آئے تھے خوارج کے معاملے میں بالکل دوسری راہ اختیار کرتے ہیں ان کو نہ تو شہری حقوق سے محروم کرتے ہیں اور نہ ان کو اختلافی سیاسی نظریات کی بناء پر تعزیر کا نشانہ بناتے ہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سیدنا علیؓ جیسا مزاج شناس شریعت خوارج تک کی دینی اور سیاسی تنظیم کو گوارا کرتا ہے تو تعمیری مقاصد کیلئے بننے والی سیاسی تنظیموں کو کیسے خلاف اسلام قرار دیا جاسکتا ہے؟

بعض لوگ اس سلسلے میں ان خرابیوں کا تذکرہ بڑے شدومد سے کرتے ہیں جو سیاسی جماعتوں میں پائی جاتی ہیں یا جن کا اظہار ان کے زمانہ اقتدار میں ہوا ہے یا جو انتخابات کے دوران ان سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں دھڑا بندی کا بھی ذکر ہوتا ہے اور قومی انتشار کی بھی بات ہوتی ہے۔ مگر میں عرض کروں گا کہ یہ تمام خرابیاں تو معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کا عکس ہیں' کیا ہمارے وہ الیکشن جو جماعتوں کے بجائے انفرادی حیثیت سے لڑے جاتے ہیں ان خرابیوں سے پاک ہوتے ہیں؟ اصل حقیقت یہ ہے کہ خیانت کا روگ سارے معاشرہ میں موجود ہے' آپ اگر سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیں تو مختلف طبقوں یا اداروں میں یہ جوں کا توں موجود رہے گا اگر بالفرض آپ یک جماعتی نظام حکومت بنالیں تو کوئی واحد نمائندہ جماعت بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے گی بلکہ اگر باقاعدہ حکمران پارٹی نہ ہو اور محض بیوروکریسی کی جتھہ بندی سے کام چلانے کی کوشش کی جائے تو اس جتھہ بندی میں تو خیانت کا زہر اور بھی زیادہ پھیلے گا کیوں کہ حزبِ اختلاف موجود نہیں ہوگی جس کی تنقید ایک حد تک نگران اور محتسب کا کام کرتی ہے اس لئے اصل علاج طلب مرض خیانت ہے نہ کہ سیاسی جماعتیں! سیاسی سرگرمیوں کے دوران ظاہر ہونے والی خرابیوں کا علاج معاشرے کی اصلاح اور اس میں پائی جانے والی خرابیوں کا ازالہ ہے اس کا یہ حل جس بقراط نے بھی سوچا ہے کہ مسلم معاشرے میں سیاسی جماعتوں کے وجود اور گنجائش ہی کا سرے سے انکار کر دیا جائے تو یہ اس طرح کا علاج ہے جیسے کسی شخص کے ہاتھ پاؤں پر پھوڑے نکل آئیں تو پھوڑوں کا علاج کرنے کے بجائے اس کے ہاتھ پاؤں ہی کاٹ دیئے جائیں اور یہ دلیل پیش کی جائے کہ اگر ہاتھ پاؤں نہ ہوتے تو پھوڑے بھی نہ نکلتے یا جیسے کسی شخص کو سر درد لاحق رہنے لگے تو کوئی ارسطوئے زماں اس کیلئے یہ نسخہ تجویز فرمائے کہ اس کا سر ہی کاٹ دیا جائے تاکہ درد کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہوجائے۔

اگر آپ ملت کے موجودہ پھیلاؤ کو دیکھیں زمانے بھر میں برپا نظریاتی تصادموں پر نظر ڈالیں، حالات کی تبدیلیوں' اجتماعی تحریکوں اور اداروں کے نوبہ نو تجربوں کو دیکھیں تو اصولی بنیادوں پر یکساں

ایمان رکھنے کے باوجود تفصیلی پروگرام میں اختلافات کوایک قدرتی امر قرار دیں گے۔ تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو نظر آئے گا کہ اعتقادی، فلسفیانہ اور کلامی مسائل میں ہمارے اندر متکلمین 'اشاعرہ، مرجیہ، ماتریدیہ، اور صوفیاء کے گروہ پیدا ہوئے سیاسی لحاظ سے اوائل ہی میں اہلسنت شیعہ اور خوارج کے تین مسلک پیدا ہو گئے 'قانونی نظام کے دائرے میں پانچ بڑے مدارسِ فقہ نمودار ہوئے اور اب تک قائم ہیں۔

پھر جب سے زمانہ ٔحال میں ہمارے موجودہ حالات ' اسلامی نظریات اور مغربی تصورات کے درمیان کش مکش شروع ہوئی ہے ملت کے سوچنے کا کوئی ایک ہی لگا بندھا طرز باقی نہیں رہا ایک عنصر مغرب پرستانہ ذہن رکھتا ہے ایک عنصر حالات کو پیچھے لے جانا چاہتا ہے ایک عنصر راہ اعتدال پر چلنے میں عافیت دیکھتا ہے' یہ تینوں عناصر جملہ تفصیلات میں مختلف پروگرام رکھتے ہیں۔ مثلاً آج مالیاتی اور زرعی نظام کے مختلف نقشے ملت میں زیر غور ہیں سود کی اصولی حرمت کے باوجود تفصیلی نقطہ ہائے نظر الگ الگ ہیں۔ ازدواجی معاملات میں تعبیر احکام میں بڑا بھاری فرق پایا جاتا ہے۔ خارجہ امور کے دائرے میں کئی زاویہ ہائے خیال موجود ہیں۔ مکسڈ اکانومی ہو یا خالص سرمایہ دارانہ طرز معیشت اس پر الگ الگ سوچ پائی جاتی ہے جب یہ سارے اختلافات موجود ہیں تو مختلف منشور رکھنے والی تنظیموں کو یہ حق کیوں نہ دیا جائے کہ وہ کھل کر اپنا نقطہ نظر عوام کے سامنے رکھیں اور عوام جس جماعت کے پروگرام سے زیادہ متاثر ہوں اسے بر سر اقتدار لے آئیں۔

انفرادی انتخابات میں تو امیدواروں کی طرف سے کسی پروگرام کی بنیاد پر الیکشن لڑنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تو زیادہ تر عہدہ و اقتدار کی اس ہوس سے سرشار ہوتے ہیں جسے اسلام اور شارع اسلام نے کسی منصب سے نا اہلی کیلئے اولین بنیاد قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس سیاسی جماعتیں اس ہوس اقتدار پر پہرے بٹھاتیں اور ایک سیٹ کیلئے ٹکٹ کے لاتعداد امیدواروں میں سے کسی بہتر و برتر نمائندے کا انتخاب کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں۔

اس مختصر سی گفتگو کے نتیجے میں اب تک جو حاصل کلام ابھر کر سامنے آیا ہے اسے آخر میں ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے

1...... اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا وجود درجۂ وجوب میں نہ سہی درجہ اباحت میں ہے اور جو چیز مباح ہو اسے حرام اور ناجائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

2...... ۔ قرآن ٔحدیث ٔتعامل صحابہ اور تاریخ سے بعض ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے ایک اسلامی ریاست میں تنظیموں کے وجود کا نہ صرف سراغ ملتا ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

3...... ۔ ایک اسلامی ریاست میں فرقہ وارانہ مذہبی سیاست کی کوئی گنجائش نہیں۔

4...... ۔ اسلامی ریاست میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی بھی گنجائش ہے بشرطیکہ دونوں اس اصول قرآنی کو سامنے رکھیں کہ

تعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

نیکی اور اچھائی کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

5...... ۔ ایک اسلامی ریاست میں بنیادی اسلامی نظریئے کے خلاف کوئی پارٹی تشکیل نہیں دی جا سکتی البتہ اسلام کے معاشی و معاشرتی اصولوں کی تشریح میں مختلف زاویۂ نظر رکھنے والی جماعتیں پائی جا سکتی ہیں۔

6...... ۔ غیر مسلموں کو بھی اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے جماعت سازی کی اجازت ہے اور وہ اپنے دائرہ کار میں مسلم ریاست کی پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

7...... ۔ سیاسی جماعتوں کو اسلامی حدود میں رکھنے کیلئے قانون سازی کی جا سکتی ہے البتہ ان کی فی الجملہ اصلاح کا انحصار خود معاشرے کی اصلاح پر ہے۔

اہل علم کی مجلس میں اس موضوع کو اظہار خیال کے لئے منتخب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی مدد سے بعض حلقوں کے پیدا کردہ اس تاثر کو ختم کیا جا سکے کہ خدانخواستہ اسلام سیاسی تصورات میں اس ارتقاء کا ساتھ دینے سے قاصر ہے جو انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے اور جن میں جاری و ساری روح مشاورت اور جمہوریت کی در حقیقت سب سے پہلے اس نے داغ بیل ڈالی تھی۔ بیداری اور شعور کے اس سائنسی دور میں مسلم معاشرہ کو سیاسی تنظیموں کی تشکیل کے حق سے اسلام کے نام پر محروم کرنے کی کوشش غیر علمی ہی نہیں افسوس ناک بھی ہے۔ کاش کہ یہ حضرات اسلامی تعلیمات میں دل پسند تعبیر و تشریح کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کی حقیقی روح کے مطابق بدل لیتے تاکہ ان پر اقبالؒ کا یہ شعر صادق نہ آتا کہ

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

پنجاب کے "نادان دوست"

کرنل سلیری آجکل اس بندۂ عاجز پر بہت برہم ہیں۔ ذکر کسی کا ہو،تان اسی پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ کوثر نیازی بڑا نابنجار ہے۔ اصل تکلیف کا ذکر وہ اپنے ایک مضمون میں کر چکے ہیں کہ میں نے سینیٹ میں صدر صاحب پر سخت تنقید کی ہے۔ اب اس تنقید پر تو وہ کچھ کہنے سے رہے کہ اس میں ہر بات دلیل سے کہی گئی ہے، البتہ جا و بیجا اپنے طول طویل مضمونوں میں گھما پھرا کر ذاتی الزام تراشی کی کیچڑ اچھالنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک مثال میں اپنے پچھلے کالم میں عرض کر چکا کہ میری مشہور کتاب "دیدہ ور" کے بارے میں ان کی معلومات کا عالم یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں اسے مارشل لاء کے ڈر سے ادھر ادھر کر دیا گیا حالانکہ مارشل لاء کے دور میں بھی اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اب ایک اور الزام انہوں نے اپنے تازہ کالم "بلے بلے" میں لگایا ہے کہ میں صدر ایوب کی جماعت میں شامل رہا مگر وہاں میری دال نہیں گلی۔ اب اسے میں سفید جھوٹ نہ کہوں تو کیا کہوں۔ دنیا جانتی ہے کہ میں کبھی کنونشن مسلم لیگ میں شامل نہیں رہا اگر سلیری صاحب اس کا ثبوت فراہم کر دیں تو ان کا اور ان کے ممدوح کا دردِ سر ختم ہو جائے میں خود ہی سیاست سے علیحدہ ہونے کا اعلان کر دوں گا۔

ذاتیات پر انہوں نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جو صریحاً غلط بیانی کی ذیل میں آتا ہے مگر میں اس کی وضاحت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ انہی دو مثالوں سے سلیری صاحب کے فرمودات کا وزن سامنے آ جاتا

ہے۔ میں جوابی الزام کے طور پر سیلہری صاحب کی ذات کے بارے میں بھی کچھ عرض نہیں کروں گا کہ ایک تو وہ ستر سال کے پیٹے میں ہیں اور بہ لحاظ عمر وہ بزرگ ہیں دوسرے میں "حریف بذلہ" ہوں "حریف دشنام" نہیں وہ جو چاہیں فرمائیں میں ان کی سطح پر کبھی نہیں اتروں گا۔

اپنے "بلے بلے" مضمون میں انہوں نے نوابزادہ نصراللہ خان کو بھی نشانہ بنایا ہے کہ انہوں نے کیوں صدر ضیاء الحق کی جگہ پیر پگاڑا کو مسند صدارت پر بٹھانے کی بات کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> "سوال یہ ہے کہ آخر صدر ضیاء الحق کی جگہ پیر پگاڑا کیونکر لے سکتے ہیں؟ اس تجویز کی حکمت کیا ہے؟ اور پیر پگاڑا کو صدر ضیاء الحق کا منصب سنبھالنے کا کیا استحقاق پہنچتا ہے"۔

اس تجویز کے خلاف دلیل ان کے پاس صرف اتنی ہے کہ 73ء کے دستور کے تحت یہ روایت قائم ہوئی تھی کہ اگر وزیر اعظم سندھی یا غیر پنجابی ہو تو صدر کا عہدہ ایک پنجابی کو ملے گا اور چونکہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو سندھی ہیں اس لئے ایک پنجابی جرنیل محمد ضیاء الحق ہی کو ملک کا صدر رہنا چاہئے۔ میں بصد ادب سیلہری صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ آئین کی وہ کونسی دفعہ ہے جس میں یہ ممانعت کی گئی ہے کہ صدر اور وزیر اعظم ایک صوبے کے نہیں ہو سکتے؟ چلئے وہ آئین کی دفعہ نہیں دکھا سکتے تو وہ ماخذ ہی دکھا دیں جس سے انہوں نے یہ روایت نکالی ہے کہ اگر وزیر اعظم کسی اور صوبے کا ہو تو صدر لازماً پنجابی ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر وزیر اعظم سندھی ہے تو صدر کیوں بلوچی یا سرحدی نہیں ہو سکتا؟ پھر سیلہری صاحب تو ماشاءاللہ نظریہ پاکستان کے پرچارک ہیں، جو صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسلام کے کس اصول اور کس حکم کے تحت یہ ممانعت موجود ہے کہ ایک مسلمان مملکت میں صدر اور وزیر اعظم ایک صوبے کے نہیں ہو سکتے؟ ایک طرف تو وہ صوبائی تعصبات اور علاقائی قومیتوں کی نفی کرتے ہیں اور دوسری طرف خود ہی اسی کے علمبردار بن کر سامنے آرہے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی فرمائیں کہ اگر وزیر اعظم جونیجو کے سندھی ہونے کی صورت میں صدر لازماً پنجاب کا ہونا چاہئے تو آخر جنرل ضیاء الحق کس قاعدے کی رو سے اس پنجاب کے باشندے ہیں، جو موجودہ پاکستان میں شامل ہے؟ وہ مشرقی پنجاب کے مہاجر ہیں اور بارہا کہہ چکے ہیں کہ ہجرت کے بعد وہ پشاور آکر آباد ہوئے تھے اس لئے ان کا تعلق سرحد سے ہے پنجاب سے نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ صدارت اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں کا تعلق کسی علاقے سے نہیں استحقاق اور انتخاب سے ہے۔ سیلہری صاحب نے جس ریفرنڈم کا ذکر کیا ہے وہ دنیا بھر میں طنز و استہزا کا موضوع ہے۔ ایسی صورت میں پیر پگاڑا اپنی خدمات کے لحاظ سے بھی جنرل ضیاء کے مقابلے میں اس منصب کے زیادہ مستحق ہیں اور موجودہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی انہیں جنرل صاحب کی نسبت کہیں زیادہ اراکین کا تعاون حاصل ہے اس پس منظر میں اگر نوابزادہ صاحب جیسے محب وطن اور جہاں دیدہ سیاستدان نے یہ تجویز پیش کر دی ہے تو سیلہری صاحب کے پاس انہیں "پنجاب دشمن" ٹھہرانے کیلئے کیا جواز ہے؟

....

مگر نوابزادہ صاحب سے بھی کہیں زیادہ غصہ سلیری صاحب نے
مجھ حقیر پُر تقصیر پر نکالا ہے ان کے اپنے الفاظ ہیں "لیکن مولانا کوثر نیازی تو
تمام شاتمان پنجاب کو مات دینے کا عزم مصمم کر چکے ہیں"۔

اب اگر پنجاب جنرل ضیاء الحق کا نام ہے تو اس حوالے سے تو واقعی میں "شاتمان پنجاب" میں سرفہرست شمار کئے جانے کے قابل ہوں لیکن اگر اس کا سبب سلیری صاحب نے سینیٹ میں میری اس سادہ اور بے ضرر قرارداد کو ٹھہرایا ہے جس میں قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ سینیٹ کو بھی بجٹ کی منظوری میں شریک کرنے کی سفارش کی گئی ہے تو میں سلیری صاحب سے بصد ادب عرض کروں گا کہ حضور! بات بنی نہیں۔ اہل پنجاب کو میرے خلاف ورغلانے میں انہیں کسی اور عنوان سے بات کرنی چاہئے۔ اس "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" کے طرز استدلال سے تو تمام پنجابیوں کی ہنسی چھوٹی ہوئی ہے۔

سلیری صاحب اتنا تو جانتے ہوں گے کہ پاکستان کی فیڈریشن میں دو ایوانوں کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی ہے تاکہ چھوٹے صوبوں کو بڑے صوبے کی بالادستی کی شکایت پیدا نہ ہو۔ قومی اسمبلی میں بہ لحاظ آبادی نمائندے منتخب ہوتے ہیں اگر صرف یہی ایوان رہے تو بہ لحاظ اکثریت اس میں ہمیشہ پنجاب کی مرضی مانی جائے گی۔ اس کا تدارک کرنے کیلئے سینٹ بنی جہاں چاروں صوبوں کے نمائندوں کی تعداد یکساں ہے اب کوئی بل اس وقت تک منظور نہیں ہو سکتا جب تک قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ سینٹ بھی اسے منظور نہ کر لے صرف بجٹ اس سے مستثنیٰ ہے۔ مالی معاملات میں سینیٹ مداخلت نہیں کر سکتی۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر سینیٹ کو واقعی مؤثر بنانا مقصود ہے تو بجٹ بھی اس کے دائرہ اختیار میں ہونا چاہئے۔ رہی یہ بات کہ سینیٹ کا انتخاب بالواسطہ ہوتا ہے تو میں نے اپنی قرارداد کی توضیح میں یہ تجویز پیش کی تھی (اور سلیری صاحب سینٹ سیکرٹریٹ کے ریکارڈ سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں) کہ آئندہ اس کے اراکین کا انتخاب بھی براہ راست ہونا چاہئے۔ اس تجویز کا مقصد یہ تھا کہ سینیٹ کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور با اختیار بنایا جائے تاکہ چھوٹے صوبوں میں آئے دن "اٹانومی" کے نام پر جو تحریکیں چلائی جاتی ہیں ان کا سدّباب ہو سکے۔ جہاں تک میں پنجاب کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہوں اس کی بھی یہی خواہش ہے کہ صوبہ پرستی کے جراثیم ختم کئے جائیں۔ میری قرارداد پنجاب کی اسی خواہش کی ترجمان ہے اب اگر سلیری صاحب کو اس میں بھی پنجاب دشمنی (یعنی ضیاء دشمنی) نظر آ رہی ہے تو میں اس کے سوا کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

اور سینیٹ کے یہ اختیارات دنیا میں کوئی نئے اختیارات نہیں خود امریکہ میں جو سلیری صاحب کے ممدوح کا آقائے ولی نعمت ہے بجٹ ایوان نمائندگان میں بھی پیش ہوتا ہے اور سینیٹ میں بھی فرانس میں بھی یہی دستور ہے اور چیکوسلواکیہ، اردن، ترکی اور اٹلی میں بھی سینیٹ کو یہ اختیار حاصل ہے۔ سلیری

صاحب کو موقع ملے تو وہ

"THE SECOND CHAMBER ITS ROLE IN MODERN LEGISLATURE."

مطبوعہ راجیہ سبھا سیکریٹریٹ نئی دہلی ہی کا مطالعہ فرمالیں۔ انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں ایوان بالا کو کیا کیا اختیارات حاصل ہیں اور جہاں یہ اختیارات حاصل نہیں وہاں اہل دانش کس طرح یہ تحریک اٹھا رہے ہیں کہ ملکی استحکام کیلئے سینیٹ کو زیادہ سے زیادہ با اختیار بنایا جائے۔؟

....

اور آخر میں منہ کا ذائقہ بدلنے کیلئے سلیری صاحب کے اسی "بلے بلے" والے کالم کے سلسلے میں مشہور صحافی جناب اظہر سہیل کا ایک مکتوب مفتوح جو انہوں نے سلیری صاحب کو لکھا اور ایک کاپی انہوں نے یہ لکھ کر مجھے بھیج دی کہ

"میں جانتا ہوں سلیری صاحب بہت سی دیگر چیزوں کی طرح ان سطور کو بھی ہضم کر جائیں گے اس لئے ایک نقل آپ کو بھی بھیج رہا ہوں"۔

اور سلیری صاحب نے چونکہ اظہر صاحب کے اس "کھلے خط" کو اپنے کالم میں شائع نہیں کیا اس لئے موضوع کی مناسبت سے میں اسے "مشاہدات و تاثرات" میں پیش کر رہا ہوں۔ رہی لب و لہجہ کی شوخی اور اس میں پیش کئے گئے خیالات تو ضروری نہیں کہ بہ تمام و کمال مجھے بھی ان سے اتفاق ہو اس لئے کہ

ہر گُلِ را رنگ و بُوئے دیگر است

جناب اظہر سہیل لکھتے ہیں

محترم سلیری صاحب!

اپنے کالم میں آپ گذشتہ دو ہفتوں سے جس سادگی اور پرکاری کے ساتھ پنجاب کا مقدمہ لڑ رہے ہیں اس پر ایک پنجابی ہونے کے حوالے سے بے اختیار اپنے مقدر کی رسائی پہ دل جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ یہ نصیب، اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

پنجاب کی شروع دن ہی سے یہ تقدیر ہے کہ اس کے نصیب چاہے جیسے بھی ہوں مگر وکیل اسے ہمیشہ اعلیٰ پائے کے میسر آئے۔ جس طرف بھی نگاہ ڈالیں "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست" اور اب تو یہ

کیفیت یوں ہے کہ پنجاب کی وکالت یا جناب حنیف رامے کرتے ہیں یا پھر لے دے کے آپ کی ذات گرامی ہے کہ اس کار دشوار کو انجام دے رہی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حنیف رامے بھی کیا بس آپ ہی آپ ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب آپ کے پاس صدر مملکت کی مشاورت کا منصب بھی ہو۔ گویا "سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا" اور یہ اسی مشاورت کا کمال ہے کہ آپ مارشل لاء اٹھانے کا کریڈٹ صدر مملکت کو دینے کے بعد تعریض کے انداز میں قوسین کے اندر یہ فقرہ لکھتے ہیں کہ ("معاف کیجئے منتخب وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے مارشل لاء اٹھا لیا ہے") ہو سکتا ہے بعض دشمنان پنجاب کو آپ کا یہ انداز برا لگے۔ اگر آپ صدر مملکت کی بجائے وزیر اعظم کے مشیر ہوتے تو قوسین کے اندر تعریض کے انداز میں آنے والا نام کوئی اور بھی ہو سکتا تھا کہ آپ کیلئے قلم روزی کا وسیلہ ہے اور روزی کی تکریم تو بہر حال کی جانی چاہئے۔

یہ تکریم آپ نے اس وقت بھی روا رکھی جب آپ فوج میں کرنل ہو گئے اور اس وقت بھی جب آپ صدر ایوب خان کے ناقوس خصوصی بنے ہوئے تھے۔ بعد میں یحییٰ خان کی خوشنودی کیلئے آپ نے بھٹو کو ناراض کر لیا۔ مگر جب وہ مقتدر ہوئے تو آپ نے ایسا شاندار کالم لکھا کہ انہیں بھی آپ کو سرکاری خرچ پر عالمی دورہ کرواتے ہی بنی اور صدر ضیاء الحق کے ساتھ تو آپ کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ آپ نے کالم کے ساتھ بغیر عینک کی تصویر شائع کرانا شروع کر دی ہے تاکہ اہل نظر کو اندازہ ہو سکے کہ بقول درد

مشابہ کوئی ان آنکھوں سے کم ہے
یہ نرگس ہے سو مرفوع القلم ہے

مگر آپ پنجاب کے ساتھ جوش محبت میں غلام محمد سے چل کر جہاں تک پہنچے ہیں اس میں دو چار سخت مقام بھی آئے ہیں جن کی نشاندہی اس لئے بھی فرض ہے کہ میں قیام پاکستان کے بعد وسطی پنجاب میں جنم لینے والا خالص پاکستانی پنجابی ہوں اور پنجاب کے ساتھ میرا متعصبانہ پیار بہر حال مہاجر پنجابیوں سے زیادہ ہے۔ طول کلام سے بچنے کیلئے میں کچھ سوالات براہ راست اٹھا رہا ہوں تاکہ آپ ان کے جوابات عنایت فرما کر

مجھ ایسے لاتعداد ہیچ مدان پنجابیوں کے دلوں کی چبھن دور کر دیں جن کی پنجاب سے محبت پنجابی صدر کی مشاورت سے مشروط و ملوث نہیں ہے۔

اولاً تو یہ بتائیے کہ جس پاک فوج کو آپ نے خالصتاً پنجابی "ڈھگوں" پر مشتمل قرار دیا ہے اس میں پنجاب کے میدانی علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا تناسب کیا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ خاص طور سے فوجی افسران کے معاملہ میں اکثریت کا تعلق کسی نہ کسی طرح صرف پوٹھوار ہی سے ہے اور پوٹھوار کے ان فوجی نیتاؤں کے فیصلوں پر شاتمان پنجاب ہمیشہ ہم ایسے پسماندہ ڈھگوں ہی کو نشانۂ سبّ و شتم بناتے ہیں جن کا اس تمام ترکھٹ راگ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ہر دو طرح استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ پنجاب کو بھی بلوچستان کی جسامت کے کم از کم چار چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ہم اپنی اکثریت کے باوجود سینیٹ میں نسبتاً کم تر نمائندگی کا شکوہ نہ کر سکیں اور پنجاب کے کسی خاص طالع آزما کی کارروائیوں پر پورے پنجاب کو ہدف ملامت نہ بنایا جاسکے؟

ثانیاً کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایم آر ڈی کے لیڈروں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کسی نہ کسی طرح مارشل لاء حکومت کے ساتھ وابستہ رہے۔ کوئی لیڈر براہ راست مخبر تھا تو کسی کو اس کے مخبر بیٹے کے ذریعہ استعمال کیا گیا اور یہ انہیں لیڈران کرام کی مہربانی تھی کہ انہوں نے 1983ء میں ایک ایسی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں سندھ کے احساس محرومی کا تاثر اجاگر کیا گیا اور یہ اسی تاثر کا شاخسانہ تھا کہ وزارت عظمیٰ سندھ کو دے کر صدارت پنجاب کے کھاتے میں ڈال دی گئی۔

اندریں حالات کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ خود آپ ہی کے بیان کردہ 1973ء کے آئینی فارمولا کے تحت ملک کی صدارت سندھ کے حوالے کر کے پنجاب کو وزارت عظمیٰ دلائی جائے تاکہ سب سے بڑے صوبہ کے مقدر میں آپ ہی کے بقول ایک ایسا بے اختیار صدر نہ آئے جس سے بجٹ تک منظور کروانے کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی ہو جبکہ صوبہ سرحد کے کبھی کبھی بننے والے قائمقام صدر کو یہ بجٹ دکھا کر ان سے اس پر "اوکے" کرانا ضروری سمجھا جائے۔

آخر میں ایک دردمندانہ گزارش، اور وہ یہ کہ آپ نے اپنے

مضمون میں جس انداز سے بیورو کریسی کو خوشامد کے دسترخوان پر لا بٹھایا ہے خدارا اس سے گریز کیجئے۔ آپ نے فوجی نیتاؤں اور بیورو کریسی میں تازہ تر تعاون کی جو ملفوف تجویز پیش کی ہے کیا ہمارا ملک اب اس قابل رہ گیا ہے کہ وہ اس قسم کی کسی سازش کا متحمل ہو سکے؟

سلیری صاب! خدارا ہم پر رحم کیجئے' ہم تو پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئے ہیں ہم نے اس ملک میں گھٹن اور مارشل لاء کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔ ہمیں بھی چند سکھ کا سانس لے لینے دیجئے آخر اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔

آپ کا مخلص اظہر سہیل......اسلام آباد

28 اگست 1987ء

محبت کی میز پر

بیتے ہوئے واقعات اور بالخصوص وہ واقعات جن کا تعلق ملکوں اور قوموں کی تقدیر سے ہوتا ہے تاریخ کی امانت ہوتے ہیں اور جو لوگ بطور کردار ان میں شریک رہے ہوں ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ انہیں اولین فرصت میں قرطاس و قلم کے حوالے کر دیں۔

جمہوری دور کے سیاستدانوں اور حکمرانوں ہی نے نہیں بادشاہوں نے بھی مختلف ادوار میں اپنی یادداشتوں کو کتابی صورت میں قلم بند کیا ہے' مغل حکمرانوں کی کتابیں...... توزک تیموری' توزک' بابری اور توزک جہانگیری' آج بھی تاریخ کے اہم ماخذ میں شمار ہوتی ہیں اور اس دور میں تو ہر ملک اور قوم کے راہنماؤں نے اپنی یادداشتیں لکھنا اپنے فرائض میں شامل کر رکھا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے سیاستدانوں نے اس جانب بہت کم توجہ دی ہے مگر خوشی کی بات ہے کہ کچھ عرصہ سے اس خلاء کو بھی پُر کیا جا رہا ہے اور "جنگ پبلشرز" کے کارکن اور کارپرداز اس سلسلے میں بطور خاص مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ انتہائی فنی مہارت اور کامل حسن طباعت کے ساتھ ان کتابوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

77ء میں پی این اے اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے مابین ہونے والے مذاکرات ہماری تاریخ کا اہم سنگ میل ہیں۔ انہی کے اختتام پر ملک پر مارشل لاء کی طویل اور سیاہ رات آٹھ سال تک مسلط رہی۔ ان مذاکرات میں جو چھ افراد شریک تھے ان میں سے دو افراد تو اللہ کو پیارے ہو چکے میری مراد جناب ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا مفتی محمود سے ہے چار اصحاب موجود ہیں یعنی نوابزادہ نصراللہ خان' پروفیسر

غفور احمد، مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور راقم السطور۔ اس موضوع پر میری ایک کتاب "اور لائن کٹ گئی" پہلے ہی منظر عام پر آچکی ہے جس کے اس وقت تک سات آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میرے محترم اور عزیز دوست سردار عبدالقیوم خان جو مذاکراتی ٹیم میں تو شامل نہ تھے مگر جنہوں نے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا وہ بھی مذاکرات سے مارشل لاء تک" کے نام سے ایک کتاب لکھ چکے ہیں جس سے دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب پروفیسر غفور احمد بھی اس فرض سے سبکدوش ہوئے ہیں اور انہوں نے بھی بے لاگ انداز میں اپنی معلومات تاریخ کے حوالے کر دی ہیں۔ تفصیلات تو آپ کو کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوں گی مگر ان مذاکرات کے ضمن میں ایک اہم ترین بات جس پر پروفیسر صاحب اور میں دونوں متفق ہیں یہ ہے کہ انجام کار مختلف نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ اور مدو جزر کے مراحل سے گزرتے ہوئے دونوں ٹیمیں ایک جامع معاہدے پر متفق ہو گئی تھیں۔ صرف بعض جزوی نکات اور معاہدے کے نفاذ کی ٹیکنیکی تفصیلات کا طے ہونا باقی رہ گیا تھا کہ یکا یک مارشل لاء آگیا۔

اس موقع پر پروفیسر صاحب کی کتاب سے دو تین متعلقہ اقتباسات کا حوالہ دینا بے جا نہ ہو گا۔ وہ ص۔ 238، 239 پر لکھتے ہیں

> "ہفتہ کی صبح نماز فجر ہم نے پرائم منسٹر ہاؤس میں باجماعت ادا کی اور اجلاس اس کے بعد بھی جاری رہا۔ اجلاس کے اختتام پر جب ہم باہر آئے تو پورے پریس کو منتظر پایا۔ حسب معمول میں نے اور کوثر نیازی صاحب نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور بتایا کہ تمام اختلافی امور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ بظاہر اب کسی تعطل کا امکان نہیں ہے لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی کونسل سے توثیق کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ حتمی طور پر کوئی بات اس توثیق کے حصول کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے کیونکہ ترمیمات خواہ ان کی حیثیت کیسی ہی معمولی کیوں نہ ہو ان کو قبول یا رد کرنے کا آخری اختیار مرکزی کونسل کو حاصل ہے اگر مرکزی کونسل نے توثیق کر دی تو ایک دن میں ایک خصوصی تقریب میں اس معاہدہ پر دستخط ہو جائیں گے۔
>
> قومی اتحاد کے فیصلے کے مطابق مذاکراتی ٹیم نے ترمیمات پر اپنی رضا مندی کو مرکزی کونسل کی توثیق سے مشروط کر دیا تھا۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ تمام اہم اور بنیادی مطالبات کے تسلیم کئے جانے کے بعد ان معمولی ترمیمات کو مان لینے میں مرکزی کونسل متامل نہیں ہو گی۔ یہ کسی فریق کی

ہار جیت کی بات نہیں تھی بلکہ پوری قوم کے اتحاد، یکجہتی اور بے مثال قربانیوں کے نتیجے میں ہوش مندی اور تدبر کی فتح تھی۔ دو متحارب گروپوں کے مابین بات چیت کے ذریعے طے پانے والا یہ ایک مثالی اور ہمہ گیر سمجھوتہ تھا جو ملک و ملت کے بہترین مفاد میں تھا اور توقع تھی کہ یہ بحران پر قابو پانے اور جمہوریت کی شاہراہ پر گامزن ہونے کا سبب بنے گا"۔

مگر یہ معاہدہ روبہ عمل کیوں نہ آسکا، اس میں دونوں فریقوں کی کوتاہیوں کا بھی دخل ہے جن کی آڑ میں فوجی جنتا کو اپنے عزائم کی تکمیل کا موقع مل گیا۔ دونوں فریقوں کی یہ کوتاہیاں کیا تھیں سب سے پہلے پی این اے کے بعض رہنماؤں کا طرز عمل ملاحظہ فرمایئے جسے پروفیسر صاحب نے بلاخوف لومتہ لائم سپرد قلم کیا ہے وہ کتاب کے ص 240، 241 پر لکھتے ہیں۔

"مفتی صاحب ان دنوں پنڈی میں مقیم تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک دن رات گئے سردار شیر باز خان مزاری صاحب ان کے پاس آئے اور کہا کہ انہیں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ یہاں کمرے میں تو ایسے آلات لگے ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے حکومت ہماری تمام باتیں سن لے اس لئے مناسب یہ ہو گا کہ آپ نیچے تشریف لے چلیں ہم موٹر کار میں بیٹھ کر سفر کرتے ہوئے یہ باتیں کر لیں گے۔ مفتی صاحب سردار صاحب کے ہمراہ نیچے اترے اور کار تک پہنچے۔ مفتی صاحب نے دیکھا کہ کار میں بیگم نسیم ولی بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔ گاڑی روانہ ہوئی، راستہ میں بیگم صاحبہ نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ بھٹو صاحب کے ساتھ معاہدہ نہ کریں اور مارشل لاء لگنے دیں۔ مارشل لاء کا نفاذ ہی اس بات کی ضمانت ہو گا کہ 90 دن کے اندر آزادانہ انتخابات ہو سکیں کیونکہ بھٹو صاحب پر اس بارے میں کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

مفتی صاحب نے بیگم صاحبہ سے دریافت کیا کہ آیا وہ اس بارے میں ولی خان کی رائے معلوم کر چکی ہیں، بیگم صاحبہ نے جواب دیا کہ ہاں ان کی بھی یہی رائے ہے۔ مفتی صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ ان کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں کرتے۔ اس سے قبل اصغر خان صاحب بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کر چکے تھے کہ ان کی دانست میں بھی مارشل لاء کا نفاذ ہی

انتخابات کیلئے بہتر تھا"۔

یہ تو پی این اے کے بعض رہنماؤں کے طور اطوار تھے۔ دوسرے کیمپ میں کیا ہو رہا تھا اگرچہ پروفیسر صاحب کی معلومات اس سلسلے میں شنیدہ اور سماعی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی مکمل تفصیل "اور لائن کٹ گئی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ غلط نہیں کہتے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

"ان رکاوٹوں کو دور کرنا فریقین میں سے کسی کیلئے بھی ناممکن نہیں تھا لیکن اس بات پر، بھٹو صاحب کے ساتھی ہی روشنی ڈال سکتے ہیں کہ 3 جولائی کی شب میں کابینہ کے ارکان اور صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے مسٹر بھٹو کو کیا مشورے دیئے اور اجلاس میں موجودہ اعلیٰ فوجی حکام نے اپنی کیا رائے پیش کی۔

میں نے حال ہی میں جناب مصطفیٰ جتوئی سے دریافت کیا (واضح رہے یہ اس زمانے کی روایت ہے جب جتوئی صاحب پیپلز پارٹی کے سرکردہ لیڈر تھے اور انہوں نے پارٹی نہیں چھوڑی تھی) کہ اس اجلاس میں، بھٹو صاحب کو کیا مشورہ دیا گیا جس کے باعث ان کے رویہ میں سختی آ گئی اور انہوں نے اتحاد کو نئے نکات پیش کرنے کا مورد ٹھہرایا۔ جتوئی صاحب کا کہنا تھا کہ کابینہ کے اکثر حضرات مصالحت کے حق میں تھے اور ان کی رائے بھی کہ مذاکرات کو نتیجہ خیز بنایا جائے لیکن بعض افراد جن میں عبدالحفیظ پیرزادہ نمایاں تھے اس کے سخت مخالف تھے اور ان کا موقف تھا کہ ہمیں سخت رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایسے افراد کا خیال تھا کہ اتحاد کی تحریک دم توڑ دے گی ورنہ بار بار نرم رویہ اختیار کرنے سے وہ مزید مضبوط ہوں گے"۔ (ص 248۔249)

پھر کیا ہوا دونوں فریقوں کے اس طرز عمل کے نتیجے میں وہی ہوا جو شاعر نے کہا ہے

کچھ ہم کھچے کھچے رہے کچھ وہ کھچے کھچے
اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

یا وہی بات کہ فارسی شاعر نے کہا، میں رکا کہ پاؤں سے کانٹا نکال لوں بس ایک لحظہ کی غفلت نے منزل کو سو سال مجھ سے دور کر دیا۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

کسی شاعر نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے کہ

ایک پل ٹھہرنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

مگر بہر حال ان ساری تفصیلات کے باوجود ایک بات طے ہے کہ مذاکرات میں جو کچھ بھی ہوا اصل معاہدہ طے پا گیا تھا۔ اس آخری موڑ پر مارشل لاء کے نفاذ کا ہر گز ہر گز کوئی جواز نہ تھا۔ اس صورتحال پر اگر ایک دن بھی اور گزر جاتا تو وہ معمولی تیکنیکی جزئیات بھی خوش اسلوبی سے طے پا جاتیں جن کی آڑ میں جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی تھی۔ پروفیسر صاحب کی کتاب کی آخری سطریں میرے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"اس رات اگر یہ قدم نہ اٹھایا جاتا تو غالب امکان تھا کہ پانچ جولائی معاہدہ کی تکمیل کی تاریخ ہوتی لیکن اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بعض نادانوں کی نادانی کے باعث 4 اور 5 جولائی کی درمیانی شب ایک ایسی طویل اندھیری رات ہوگی جس کی صبح کیلئے قوم برسوں ترستی رہے گی"۔

(ص 256)

کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر تاریخ کن معنوں میں اپنے آپ کو دہراتی ہے ان معنوں میں نہیں کہ پچھلے واقعات آنے والے دور میں دوبارہ رونما ہوتے ہیں، وہی افراد و کردار پھر جنم لیتے ہیں یہ اصول عمل تناسخ کی تھیوری کو ثابت نہیں کرتا جس کے تحت لوگ ایک جنم سے دوسرے جنم میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کے ایک دور میں جن واقعات کا جو نتیجہ نکلتا ہے اگر کسی دوسرے دور میں پھر ویسے ہی واقعات رونما ہوں تو پھر ویسے ہی نتائج نکلتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر اسی اور نوے کے عشرے میں سیاستدان پھر وہی طرز عمل اختیار کریں گے جو انہوں نے ستر کے عشرے میں اختیار کیا تو اس کے نتائج آج بھی وہی بر آمد ہوں گے جو کل بر آمد ہوئے تھے۔

کہتے ہیں تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ لوگ اس سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ آیئے آج کے حالات پر منطبق کر کے دیکھنے کی کوشش کریں کہ 77ء کے ان مذاکرات سے ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

....

77ء کے مذاکرات کا اولین اور آخری سبق یہی ہے کہ سیاستدانوں کو اپنے اختلافات دور کرنے کیلئے ہمیشہ ڈائیلاگ اور مذاکرات کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اندرونی ملکی اور قومی اختلافات میں فوج نجات دہندہ نہیں بن سکتی اسے جب بھی مداخلت کی دعوت دی جائے گی یا ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے گا جس سے حکمرانی کی ہوس میں مبتلا بعض جرنیلوں کے خفیہ عزائم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو تو ملک پٹڑی سے اتر جاتا ہے اور ایسا اترتا ہے کہ اس کی منزل ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ صدر غلام اسحاق خان جنرل اسلم بیگ اور الیکشن کمیشن کی فرض شناسی سے ملک میں عام انتخابات ہو چکے ہیں اس کا جو بھی نتیجہ نکلا بہر حال جمہور کی امنگوں کا آئینہ دار ہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند' مرکز میں پاکستان پیپلز پارٹی بر سر اقتدار آ چکی ہے اور سب سے بڑے صوبے پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد حکومت بنا چکا ہے اب پانچ سال تک آئین کے مطابق حکومت کرنا ان کا حق ہے اس حق کو ختم کرنے کی کوشش کرنا پھر وہی نتائج دکھائے گا جو 77ء میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

آج کل ملک میں آٹھویں ترمیمی بل پر بحث و تکرار جاری ہے۔ دونوں پارٹیوں کی طرف سے بیانوں کی گولہ باری ہو رہی ہے' فریقین کے درمیان مذاکرات کے چرچے ہیں مگر بدقسمتی سے وہ لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں جو 73ء کی آئین سازی میں بھی شریک تھے اور 85ء کے آئین کے وقت بھی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں 73ء اور 85ء دونوں کے ایوانوں اور آئینوں میں شامل تھا۔ 73ء کا آئین ڈرافٹ ہو رہا تھا تو میں اس کمیٹی کا ممبر تھا اور وہ ساری بحثیں آج بھی میرے حافظے میں تازہ ہیں جو اس وقت مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کے مابین ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ 73ء کا آئین آج بھی نافذ ہے صرف اس میں بعض ترمیمیں ہوئی ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ترمیمیں اتنی بنیادی ہیں کہ ان کے بعد آئین کا بنیادی ڈھانچہ ہی تبدیل ہو گیا ہے اور حق یہ ہے کہ اس طرح کی بنیادی تبدیلی ایک آئین ساز اسمبلی تو کر سکتی ہے جو باقاعدہ یہ مینڈیٹ لے کر قائم ہوتی ہے مگر ایک غیر جماعتی اسمبلی اس کا اختیار نہیں رکھتی۔ ان ترمیموں کے بعد یہ آئین 73ء کا آئین نہیں رہا 85ء کا آئین بن گیا ہے اس کے آثار و ظواہر پارلیمانی ہیں مگر روح کے اعتبار سے یہ صدارتی ہے۔ 73ء کے آئین میں اگر اختیارات کا پلڑا وزیر اعظم کے حق میں جھکا ہوا تھا تو 85ء کے آئین میں یہ صدر کے حق میں جھک گیا ہے۔ 73ء کے آئین میں اگر صدر محض ایک ربڑ اسٹیمپ تھا کہ جب تک اس کے کسی ڈائریکٹو پر وزیر اعظم کے کاؤنٹر سائن نہیں ہو جاتے تھے اس وقت تک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی تو اب 85ء کے آئین میں صدر اتنا طاقتور ہے کہ وہ بیک جنبش قلم پوری منتخب اسمبلی کی چھٹی کرانے کا مجاز ہے۔

جن دنوں پارلیمنٹ میں آٹھواں ترمیمی بل زیر بحث تھا میں سینیٹ کا رکن تھا اس موضوع پر میں نے کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر کی تھی جو اسی کالم میں بالاقساط شائع ہو چکی ہے۔ سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو خود بامر مجبوری اسے تسلیم کر رہے تھے ان کا کہنا تھا اگر ہم نے اسے تسلیم نہ کیا تو مارشل لاء نہیں اٹھے گا گویا دوسرے لفظوں میں یہ ایک قسم کا "بلیک میل" تھا۔ جونیجو نے سینیٹ کے آزاد اراکین سے وعدہ کیا تھا کہ وہ 73ء کے اصل آئین کو بحال کرنے کیلئے بتدریج اقدامات کریں گے۔ اس مقصد کیلئے سینیٹ کی ایک کمیٹی بھی قائم ہوئی جسے چھ ماہ کے عرصے میں اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی مگر تین سال کے عرصے میں جب تک میں سینیٹ کا رکن رہا یہ کمیٹی اپنی کارروائی مکمل نہیں کر سکی تھی۔ ہم تحاریک استحقاق کے ذریعے یاد دہانی پہ یاد دہانی کراتے رہے لیکن لگتا تھا کہ جونیجو صاحب "عالم بالا" سے خائف ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ

آٹھواں ترمیمی بل تو منظور ہو گیا مگر مارشل لاء اٹھنے کے باوجود بعد کے تین چار سالوں میں 73ء کا آئین بحال کرنے کیلئے کوئی اقدام نہ ہو سکا۔

یہ آٹھواں ترمیمی بل کیا ہے مختصراً اس کے بعض پہلو حسب ذیل ہیں۔

1)۔ انڈمنٹی یعنی قانونی ذمہ داری سے بریت ہر مارشل لاء لیتا ہے دوسرے ملکوں میں بھی لیتا رہا ہے لیکن یہ کسی نے نہیں کہا کہ اس بات پر انگوٹھا لگاؤ کہ جو کچھ ان آٹھ سالوں میں ہوا ہے وہ سب کا سب نیک نیتی پر مبنی تھا۔ گویا اس بل کے ذریعے یہ منوایا گیا کہ آٹھ سالوں میں جتنے بھی واقعات ہوئے، جتنی بھی جائیدادیں ضبط ہوئیں، جتنی بھی رشوتیں لی گئیں، جتنے بھی کوڑے لگائے گئے جتنی بھی پھانسیاں ہوئیں وہ سب کی سب نیک نیتی پر مبنی تھیں۔

2)۔ اس میں جنرل ضیاء الحق کا نام لے کر انھیں یہ اجازت دی گئی کہ وہ صدر بھی رہ سکتے ہیں اور چیف آف آرمی سٹاف بھی۔

3)۔ آر سی او اور اس ترمیمی بل کے ذریعے عدلیہ پر ناروا پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ ججوں کے تقرر، تبادلے اور ان کی شرائط ملازمت کے تعین کے سلسلے میں عدلیہ کے ساتھ توہین آمیز سلوک روا رکھا گیا ہے جس کی تفصیل موجودہ چیئرمین سینیٹ جناب وسیم سجاد نے جو ان دنوں ہمارے ساتھ سینیٹ کے آزاد اراکین میں شامل تھے، سینیٹ میں اپنی تقریر کے دوران بڑی خوبصورتی سے پیش کی تھی۔

5)۔ 73ء کے آئین میں تھا کہ اگر ایک مرتبہ قومی اسمبلی اور سینیٹ کسی بل کو پاس کر دیں تو صدر کیلئے اس کی منظوری دینا لازم ہے مگر اس ترمیم کے ذریعے اب صدر کی مرضی ہے وہ چاہے تو اس بل کی منظوری دے چاہے تو نہ دے۔

یہ آٹھویں ترمیمی بل کے چند نمایاں پہلو ہیں۔ جن حضرات کو تفصیل مقصود ہو وہ جنگ میں شائع ہونے والی میری چار قسطوں پر مشتمل معروضات کی طرف مراجعت فرمائیں یا پھر سینیٹ کی آفیشل رپورٹ بابت 30 اکتوبر 85ء، جلد 4 مشتمل بہ نمبر 1 تا 17 سینٹ کے سیکرٹریٹ سے طلب فرمائیں جس میں میری تقریر کا مکمل متن 459 سے 481 تک کے صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ آج جو ادھوری باتیں کہی جا رہی ہیں، میں بھرپور وضاحت کے ساتھ اکتوبر 85ء ہی میں ان کی نشاندہی کر چکا ہوں۔

خوشی کی بات ہے کہ آٹھویں ترمیمی بل پر اب حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات منعقد ہونے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مذاکرات نامکمل رہیں گے جب تک 73ء کے آئین میں ہونے والی تمام ترمیموں پر غور وخوص کے مراحل طے نہیں ہوتے' ان میں سے کچھ ترمیموں پر تو پی این اے اور پیپلز پارٹی کے 77ء کے مذاکرات ہی کے دوران سمجھوتہ طے پا گیا تھا کہ ان پر خط تنسیخ پھیر دیا جائے گا۔ باقی ترمیموں پر بھی بات چیت سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صدر اور وزیر اعظم کے درمیان توازن اختیارات کا مسئلہ بھی اتنا معقول ہے کہ دونوں فریق آسانی سے اس کیلئے درمیانی راستہ نکال سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی تو 73ء کے آئین کی طرف لوٹنا چاہے گی ہی' اسلامی جمہوری اتحاد کے رہنماؤں کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ اپنے انتخابی منشور کے باب دوم میں کھل کر یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ بھی 73ء کے آئین کو اصل شکل میں بحال کریں گے۔ جب دونوں طرف سے 73ء کے آئین کی بحالی پر اتفاق ہے تو پھر مذاکرات میں یہ تاخیر وتعویق کس لئے ہو رہی ہے؟ خدا کرے کہ مذاکرات کی یہ تجویز اب اخباری بیانوں سے آگے بڑھ کر میز تک بھی جا پہنچے مگر کس میز پر؟ گول میز پر نہیں! محبت کی میز پر! کہ اسی میز پر سیاستدان بیٹھیں گے تو 77ء کے مذاکرات جیسا نتیجہ بر آمد نہیں ہو گا
بقول کوثر'

زمانے بھر کی نگاہوں میں معتبر ہوں گے
وہ فیصلے جو محبت کی میز پر ہوں گے

بہاری پاکستانیوں کا مسئلہ

تاریخ میں رام چندر جی کا بن باس بہت طویل گنا جاتا ہے۔ یہ چودہ برس کا تھا مگر ہمارے بہار کے پاکستانی بھائیوں کا بن باس تو اس سے بھی طویل تر ہو گیا ہے۔ اسے اب سترہواں سال ہونے کو ہے اور وہ غریب بنگلہ دیش کے کیمپوں میں سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں یہ بھارت کے شہری ہوتے تو بھارت ان کیلئے "کلیم" کرتا مگر وہ تو بھارت کو خود چھوڑ کے آئے۔ بنگلہ دیش انہیں پاکستانی قرار دے چکا ہے اور خود پاکستان جس کیلئے انہوں نے سب کچھ چھوڑا وہ انہیں "بہاری" کہہ کر پکارتا ہے۔ 16 دسمبر 71ء تک وہ پاکستانی تھے مگر ملک ٹوٹا تو پاکستان نے بنگال میں پھنسے ہوئے پنجابیوں، پختونوں، بلوچوں اور سندھیوں کو تو پاکستانی قرار دیکر ان کی بحفاظت واپسی کی ذمہ داری قبول کر لی مگر بھارت کے بہار سے پاکستان کے مشرقی بنگال میں ہجرت کر کے آنے والوں کو ایک نسلی اور علاقائی اقلیت قرار دے دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا بہار سے ہجرت کرنے والے ان مسلمانوں نے بنگال کے لئے ہجرت کی تھی؟ کیا بہار کسی لحاظ سے بھی بنگال سے کم تر تھا؟ ثقافت کے اعتبار سے علم و فن کے لحاظ سے، خوبصورتی کے نقطہ نظر سے، روحانی اور مادی پہلوؤں سے اس میں کونسی کمی تھی کہ اس کے رہنے والے اپنے آباؤ اجداد کی قبریں اور دیش میں پھیلی ہوئی ان کی نشانیوں کو چھوڑ کر بنگال کی راہ لیتے؟ انہوں نے بنگال کیلئے نہیں پاکستان کے لئے اپنا وطن چھوڑا تھا اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے 71ء میں جب پاکستان کو توڑنے

کی کوششیں ہو رہی تھیں محمد پور ڈھاکہ کو پاکستان کا ناقابل تسخیر مورچہ بنا دیا تھا۔ پاکستان ٹوٹا تو اس جرم کی سزا انہیں یہ دی گئی کہ انہیں اٹھا کر کیمپوں میں ڈال دیا گیا۔ ان کی دکانوں اور مکانوں پر غیر مسلم اور مقامی باشندے قابض ہو گئے اور یہ دوبارہ پاکستان کیلئے لٹنے والے اور پٹنے والے بھائی پھر بھی ہمارے نزدیک بہاری کے بہاری ہی رہے اب تک پاکستانی نہیں کہلا سکے۔

وہی چمن میں غریب الدیار کہلائے
جنہوں نے خون بہایا کلی کلی کیلئے

ہم آج اسرائیل کو گالی دیتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے عالم عرب بلکہ عالم اسلام کی کوششوں کے باوجود اسے اب تک برقرار رکھا ہے۔ امریکہ کی پشت پناہی کا فیکٹر اپنی جگہ مگر اس میں جو قومی حمیت اور ملی انا ہے اس سے تو ہمیں کچھ سبق سیکھنا چاہئے۔ آخر کچھ خصوصیات تو ایسی ہوں گی جن سے دوسرے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ذرا نقشہ اٹھا کر دیکھئے اس میں عالم عرب ایک بڑی چٹان کی مانند نظر آتا ہے اور اسرائیل ایک چھوٹے سے مینڈک کی طرح' مگر کیا وجہ ہے کہ اس چھوٹے سے مینڈک نے اپنے پنجوں میں اتنی بڑی چٹان کو جکڑ رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی قومیت کو مضبوط اور مستحکم بنالیا ہے۔ ایتھوپیا میں قحط پڑا اور لوگ فاقوں سے مرنے لگے تو اسرائیل نے طیاروں کی ذریعے سے یہودی آبادی کو وہاں سے نکال کر اپنی سرزمین میں لا بسایا' دنیا چیختی چلاتی رہ گئی مگر اس نے تمام تنقیدوں اور نکتہ چینیوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا مگر ہمارا طرز عمل کیا ہے۔ حکومت پاکستان کی ایک "ممتاز ترین شخصیت" نے کراچی کا دورہ کیا اور وہاں آباد بہار کے مہاجر کنبوں نے بہاری پاکستانیوں کی واپسی پر زور دینے کیلئے مظاہرہ کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا "ہم ان لوگوں کو یہاں بلا کر بھیک منگوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے" حالانکہ ان کا یہ ارشاد جہاں شریفانہ اسلوب بیان سے عاری تھا وہاں حقائق کے بھی منافی تھا۔ سب جانتے ہیں کہ بہار کے رہنے والے مسلمان بھیک نہیں مانگتے وہ ہنرمند اور دستکار لوگ ہیں۔ مختلف پیشے جانتے ہیں' حلال کی روزی کماتے ہیں کبھی معاشرے پر بوجھ نہیں بنتے۔ وہ آج بھی سالوں سے کیمپوں میں پڑے ہیں محنت مزدوری اور ہنروری کی وجہ سے وہاں کی حکومت اور عوام کے دست نگر نہیں بنے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ہمارے صدر صاحب بنگلہ دیش کے دورے پر گئے تو وہاں انہوں نے بہاری پاکستانیوں کے ایک وفد کو بھی شرف باریابی بخشا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم یہ توقع کرتے تھے کہ وہ محمد پور کیمپ کا دورہ کر کے خود ان بے بس پاکستانیوں کی ڈھارس بندھائیں گے۔

بہاری پاکستانیوں کے وفد سے بات چیت کرتے ہوئے صدر صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بھی کچھ زیادہ حقیقت افروز نہ تھا۔ انہوں نے کہا "ہم مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جونہی اس میں کامیابی حاصل ہوئی جلد سے جلد آپ لوگوں کو پاکسان بلا لیا جائیگا"۔

سوال یہ ہے کہ صرف بہاری پاکستانیوں ہی کیلئے مالی امداد کا مسئلہ کیوں پیدا ہوتا ہے کسی اور سلسلے میں کیوں نہیں؟

افغان مہاجرین سے تقابل مقصود نہیں وہ بھی ہمارے دینی بھائی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ وطن کے رشتے سے ان کے مقابلے میں بہاریوں کا حق ہم پر کہیں زیادہ ہے۔ ان پر ہم روزانہ اپنے بجٹ سے پچاس لاکھ روپے خرچ کر رہے ہیں۔ (ہاں ہاں روزانہ پچاس لاکھ روپے) یہ سال میں پونے دو ارب روپے بن جاتے ہیں گو معاہدہ جنیوا کے تحت ان کے واپس جانے کی سبیل نکل آئی ہے مگر موجودہ حکمرانوں کا بس چلے تو وہ انہیں مستقلاً یہیں آباد کر لیں۔ اس سے پہلے صدر صاحب کے ایک بیان میں کہا جا چکا ہے کہ یہ مہاجر اگر واپس نہ گئے تو ان تیس لاکھ افغانوں کو پاکستان کا شہری بنا لیا جائیگا۔ خارجہ پالیسی اور اسٹریجی کے اعتبار سے یہ بیان کتنا بے وقت تھا اس بات کو جانے دیجئے سوال یہ ہے کہ جب افغان مہاجرین کے معاملے میں ہم اتنے دریا دل ہیں تو بہاری مسلمانوں کے ساتھ سرد مہری کا یہ سلوک کیوں کر رہے ہیں؟ اگر کوئی مشرقی پنجاب سے ایک بار ہجرت کر کے پاکستان کا شہری بن سکتا ہے تو بہاری مسلمان پاکستان کے لئے دوبار ہجرت کر کے بھی یہاں کے شہری کیوں نہیں بن سکتے؟

دیوار کی ہر اینٹ پر لکھا ہے مرا نام
تعمیر مگر آپ سے منسوب ہوئی ہے

....

اس بات پر تو ہم آگے چل کر بحث کریں گے کہ ان غریبوں کی پاکستان آمد پر کتنے اخراجات کی ضرورت ہے اس مرحلے پر یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ اس سلسلے میں فی الحقیقت فنڈز فراہمی سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ 86ء میں میں نے جب بہاریوں کی واپسی کیلئے سینیٹ میں ایک تحریک پیش کی تھی تو اس پر حکومت نے یہی عذر لنگ پیش کیا تھا کہ ضروری فنڈز دستیاب نہیں ہیں۔ دریں اثنا مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ بیان سراسر حقائق کے منافی ہے۔ اس سے اگلے سیشن میں 18 ستمبر 1986ء کے اجلاس میں میں نے ایک تحریک استحقاق پیش کی جو خلاف معمول ہاؤس میں دو گھنٹے تک زیر بحث رہی اور حکومت کی طرف سے کئی وزیروں نے اس میں حصہ لیا۔ بدقسمتی سے اس کا بہت ہی نامکمل حصہ عوام کے سامنے آیا، جو لوگ اس کی مکمل تفصیلات جاننے کے خواہشمند ہیں وہ تو سینٹ کی طرف سے اب اس کی مطبوعہ سرکاری رپورٹ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں (جلد 3 نمبر 1 جمعرات 18 ستمبر 86ء) لیکن عام قارئین کیلئے میں اس کے بعض حصے ذیل میں پیش کرتا ہوں تاکہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ فنڈز کی عدم دستیابی کا بہانہ کتنا بے جان اور بعید از حقیقت ہے۔

میں نے اپنی تحریک استحقاق میں کہا تھا۔

"جناب چیئر مین! میری تحریک استحقاق کا مضمون یہ ہے کہ سینیٹ کے پچھلے سیشن میں میری ایک تحریک کے جواب میں وزیر مملکت مسٹر سرتاج عزیز نے بہاری پاکستانیوں کو بنگلہ دیش سے پاکستان لانے کے سلسلے میں ایک بیان دیا تھا جس میں اصل رکاوٹ انہوں نے فنڈز کی عدم دستیابی بتائی تھی۔ اس پر مجھے ہاؤس آف لارڈز لندن کے ممبر لارڈ ڈیوڈ انیل نے ایک مراسلے کے ذریعے سے اصل صورتحال سے آگاہ کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس مقصد کیلئے بین الاقوامی طور پر تین سو ملین ڈالر کی رقم جمع ہو چکی ہے جو نہ صرف ڈھائی لاکھ افراد کی واپسی کیلئے کافی ہے بلکہ ان سے مہاجرین کی رہائشی بستی بھی بسائی جا سکتی ہے۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا ہے کہ جونہی حکومت پاکستان کی طرف سے اس سلسلے میں کسی مفصل منصوبے کا اعلان ہو گا مزید انٹرنیشنل فنڈ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ لارڈ انیل نے اپنے مراسلے میں کہا ہے کہ اس سلسلے میں اصل رکاوٹ فنڈز نہیں ہیں بلکہ حکومت پاکستان کی ڈھلمل پالیسی ہے جس کے تحت وہ اپنا فرض ادا نہیں کرنا چاہتی۔ سینیٹ کے معتبر فلور پر حکومت کی طرف سے فنڈز کے سلسلے میں یہ غلط بیانی واضح طور پر سینیٹ کے وقار اور استحقاق کو مجروح کرتی ہے لہٰذا میں تحریک کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر ایوان میں غور کیا جائے"۔

اس کا جو جواب وزیر متعلقہ نے دیا وہ یہ تھا

حکومت کی پالیسی ہے کہ وہ اس سلسلے میں صرف رابطہ عالم اسلامی کے ذریعے یہ پروجیکٹ چلا رہی ہے اور کسی کے ذریعے نہیں، تو جہاں تک کسی اور کا تعلق ہے کہ فنڈز موجود ہیں یا نہیں وہ اس دائرے میں نہیں آتے۔ حکومت کو جب لارڈ انیل کی طرف سے اس قسم کی آفر موصول ہوتی تھی تو ان کو ایک دفعہ سے زیادہ مطلع کر دیا گیا تھا کہ وہ اس معاملے میں رابطہ عالم اسلامی سے رجوع کریں حکومت پاکستان سے نہیں"۔

اس موقع پر سینیٹر طارق چودھری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ

"بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے بہاری پاکستانی ہیں وہ پاکستان اور پاکستانی حکومت کی ذمہ داری ہیں رابطہ عالم اسلامی کی ذمہ داری نہیں ہیں اس لئے رابطہ عالم اسلامی کو درمیان میں لا کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے"۔

وزیر صاحب نے اپنی بات ختم کی تو میں نے دوبارہ اپنی معروضات پیش کیں، عرض کیا کہ

"جناب والا! جب ہم اپنا نان نفقہ چلانے کیلئے غیر مسلموں کی طرف دیکھ سکتے ہیں، کھانا پینا، گندم وغیرہ سب ان سے لیتے ہیں تو ہم بہاریوں کا مسئلہ حل کرنے کیلئے غیر مسلم حکومتوں سے مدد کیوں نہیں لے سکتے؟ یہ ایک خالص انسانی مسئلہ ہے، ٹھیٹھ مذہبی مسئلہ نہیں کہ اس کا ٹھیکہ صرف رابطہ عالم اسلامی کو دے دیا جائے ویسے بھی رابطہ محض ایک آرگنائزیشن ہے کوئی حکومت نہیں یا تو سعودی عرب کی بات ہوتی وہ بھی اس میں شامل نہیں پھر معلوم نہیں رابطہ کو اس کا اجارہ دار کیوں بنادیا گیا ہے؟۔ اگر انسانی بنیادوں پر دوسرے ملک بھی اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو ہماری حکومت کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟۔ اگر لارڈ انیل کہتے ہیں کہ اتنا فنڈ دستیاب ہے تو اسے کیوں استعمال نہیں کیا جاتا۔ انہیں رابطے ہی کی وساطت سے بات کرنے کو کیوں کہا جاتا ہے (جس کا دفتری نظام اتنا ناقص ہے کہ مہینوں کسی خط کی رسید نہیں ملتی)"۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب نے بھی میری تحریک کے حق میں دلائل دیئے۔ انہوں نے کہا

"وزیر صاحب نے کہا تھا کہ پیسہ نہیں ہے اب ہمارے سامنے یہ حقائق آرہے ہیں کہ ایوان کے سامنے پوری بات نہیں کہی گئی۔ لارڈ انیل جنہوں نے اس مسئلہ میں پچھلے دس سال سے بڑی دلچسپی لی ہے اور وہ پاکستان آکر صدر صاحب سے بھی مل چکے ہیں اور اس مسئلہ پر دو تین بین الاقوامی کانفرنسیں بھی منعقد کر چکے ہیں کہتے ہیں کہ تین سو ملین ڈالر دستیاب ہیں ادھر رابطہ کے سیکرٹری جنرل کا بیان آیا ہے کہ پیسے اصل مسئلہ نہیں ہیں اصل سبب یہ ہے کہ حکومت پاکستان یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ پیسہ ہم کو دے دو جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ اسکیم دیں ٹرسٹ موجود ہے وہ اسے عملی جامہ پہنائے گا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایوان کو غلط اور نامکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں جن سے ہاؤس کا استحقاق مجروح ہوا ہے"۔

اس پر وزیر صاحب پھر اٹھے اور انگریزی میں انہوں نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جو بقول غالب مُدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا، مکمل نمونہ تھی۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس مسئلے پر حکومت کی پالیسی کا اعلان عنقریب ایک مفصل بیان میں سینیٹ کے اجلاس میں کریں گے۔ اس پر چیئرمین نے مجھ سے پوچھا

کہ کیااس یقین دہانی کے بعد بھی میں اپنی تحریک استحقاق پر زور دینا پسند کرونگا میں نے کہا

"اگر وزیر صاحب یہ وعدہ فرمائیں کہ وہ یہ بیان اسی سیشن کے دوران دینے کیلئے تیار ہیں تو میں اس تحریک پر زور نہیں دونگا اور ان کے تفصیلی بیان کا انتظار کروں گا"۔

وزیر صاحب نے فرمایا

"جناب! میں اس سیشن کا وعدہ نہیں کر سکتا مگر یہ کہتا ہوں کہ جتنی جلدی بھی ہو سکا کیونکہ انفارمیشن دینے کی بات نہیں ہے پالیسی کا اعلان کرنے کی بات ہے اور یہ حکومت غور و خوض کے بعد ہی کر سکتی ہے"۔

اس پر ایک معزز رکن نے جن کا نام رپورٹ میں درج نہیں ہوا۔ دلچسپ فقرہ کسا انہوں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلے پر ابھی تک کوئی پالیسی طے نہیں ہے"۔

چیئرمین صاحب پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور میرا موقف جاننا چاہا۔

میں نے عرض کیا

"جناب والا! اگر پالیسی بن چکی ہے تو پھر اس کو بیان کرنے میں کیا وقت ہے۔ ابھی کئی دن پڑے ہیں، خان اقبال احمد خان نے کہا ہے کہ یہ سیشن پانچ اکتوبر تک جاری رہے گا، اگر حکومت اس مسئلہ پر اپنی پالیسی وضع کر چکی ہے تو پندرہ دن میں ان جیسے فاضل وزیر کیلئے ایک بیان لکھ لینا کونسا مشکل کام ہے"۔

چیئرمین صاحب کہنے لگے یہ محض بیان لکھنے کی بات نہیں فنڈز کی فراہمی کی بات ہے۔ میں نے پھر عرض کیا "جناب والا! ان پندرہ دنوں میں فنڈز کی فراہمی کی بات نہیں ہو رہی" (صرف ایک بیان دینے کی بات ہو رہی ہے)

اس موقع پر حکومت کے ایک اور وزیر (مرحوم خاقان عباسی) اپنے ساتھی وزیر کی کمک کو میدان میں کودے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی کنسٹرکشن کمپنی کی ان کوششوں کا ذکر کیا جو وہ اس سلسلے میں کر رہی ہے جس پر پروفیسر خورشید نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا "جناب والا! میرا خیال تھا وزیر صاحب حکومت پاکستان کی طرف سے وضاحت فرما رہے ہیں لیکن اگر وہ کسی کنسٹرکشن کمپنی کی طرف سے بول رہے ہیں تو کیا جناب چیئرمین! آپ اجازت دیں گے کہ اس کنٹریکٹ میں جو دوسرے لوگ مقابلے میں تھے وہ بھی آ کر اس ایوان کے سامنے بیان دیں اور ہمیں اپنے حقائق سے آگاہ کریں"۔

اس پر ایوان میں شور اٹھا، اتفاق سے اس دن صدارت ڈپٹی چیئرمین ملک محمد علی خان فرما رہے تھے چیئرمین سینیٹ غلام اسحاق خان تشریف فرما ہوتے تو یہ بحث اتنا طول بھی نہ کھینچتی۔ وہ رولز کے معاملے میں

بہت سخت واقع ہوئے ہیں ان کی عدم موجودگی کا ہم لوگ دل کھول کر فائدہ اٹھا رہے تھے۔ خاقان عباسی مرحوم پسپا ہوئے تو اس وقت کے وزیر منصوبہ بندی ڈاکٹر محبوب الحق اپنے ساتھیوں کی دستگیری کیلئے کھڑے ہو گئے ان کی تقریر ختم ہوئی تو ہمارے دوست سردار خضر حیات نے سرکاری بینچوں پر بیٹھے بیٹھے ایک اور شگوفہ چھوڑ دیا۔

"جناب! کہیں اس مسئلے میں کمیشن کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہے کہ اس میں کچھ لوگ کمیشن لینا چاہتے ہوں' کیا ایسی بات تو نہیں"۔

پروفیسر خورشید احمد نے کہا "خطرہ تو ہے" سردار صاحب نے دوبارہ فرمایا "مجھے تو اصل بات یہی نظر آتی ہے کہ سارا مسئلہ کمیشن پر رکا ہوا ہے"۔ اس دلچسپ کمنٹری کے بعد میں ایک بار پھر تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "آپ کی سہولت کیلئے میں اس تحریک کو نمٹانے کیلئے تین متبادل صورتیں عرض کرتا ہوں۔

ایک صورت یہ ہے کہ لارڈ نیل کے اس بیان کو ہمارے محترم وزراء صاحبان نے چیلنج کیا ہے اور ہمارے جیسے معزز ایوان کے بلکہ ہم سے کہیں بالا ایوان کے معزز ممبر پر خاصے سنگین الزامات عائد کئے ہیں۔ یہ ایک سائیڈ ہے' ہم یہ ساری پروسیڈنگز آپ کی وساطت سے لارڈ نیل کو بھیج دیں اور ان کا نقطہ نگاہ معلوم کریں میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سرکاری بینچوں سے ایک ممبر صاحب کو اپنے نمبر بنانے کا موقع مل گیا۔ وہ پوائنٹ آف آرڈر پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ "ان کا ایوان ہم سے بالا کس حساب سے ہے اس کی وضاحت فرمائیں"۔

میں نے کہا کہ "سرکار انہی کی روایات پر آپ نے یہ ایوان قائم کیا ہے ورنہ آپ کہاں اور ایوانوں کا تصور کہاں" بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا

"دوسری صورت یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر محبوب الحق نے فرمایا ہے کہ ان کی حکومت بہاریوں کو یہاں لانے میں بہت دلچسپی رکھتی ہے مگر اس کیلئے فنڈز مہیا نہیں ہیں اگر اس ضمن میں ان کو کوئی تجویز دی جائے تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ میں عرض کرونگا کہ میں پہلے بھی یہ تجویز پیش کر چکا ہوں آج پھر اسے دہراتا ہوں کہ فنڈز حاصل کرنے کیلئے وہ سب سے پہلے باہر دیکھنے کی بجائے اپنی قوم کی طرف دیکھیں اس کیلئے "پرائم منسٹر فنڈ" قائم کریں اگر حکومت آج یہ اعلان کرے تو میں اپنی تحریک واپس لے لوں گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ سرتاج عزیز صاحب نے جس تفصیلی بیان دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اسے اسی سیشن میں پیش کر دیں تب بھی اپنی تحریک واپس لے لوں گا۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہمارے دوستوں کو قبول ہو سر آنکھوں پر"۔

اب چیئرمین صاحب نے پھر سرتاج عزیز صاحب کا نام پکارا کہ وہ ان متبادل صورتوں پر اظہار خیال کریں۔ انہوں نے کہا

"جہاں تک پہلی تجویز کا تعلق ہے یہ اس وقار کے منافی ہو گا کہ اس ایوان کی روداد ایک اور ایوان کے ممبر کو بھیجی جائے اور وہ پھر اس پر اپنی رائے دیں۔

دوسری تجویز جو وہ پہلے بھی پیش کر چکے ہیں اس کیلئے وہ انتظار فرمائیں جب اس موضوع پر تفصیلی بحث ہو اگر فنڈز اس حد تک آ گئے ہیں کہ اس سے کافی حد تک کام چل جائے اور مزید فنڈز کی ضرورت ہو تو اس تجویز پر غور کیا جا سکتا ہے لیکن مناسب وقت پر۔ رہی تیسری تجویز تو مسئلے پر جو پالیسی ہے اس کا بیان تو ہو چکا ہے۔ جہاں تک حکومت کی قانونی ذمہ داری کا تعلق ہے وہ حکومت نے پوری کر دی ہے لیکن انسانی وجوہات پر وہ مزید بہاری پناہ گزینوں کو جو وہاں پر ہیں لانے کیلئے تیار ہے بشرطیکہ مالی وسائل کا انتظام ہو جائے۔ اب اس سلسلے میں صوبائی حکومت سے یہ مشورہ کرنا کہ کونسا صوبہ وہاں سے آنے والوں کو کتنی جگہ دے سکتا ہے یہ ایک انتظامی مسئلہ ہے جو بہت قدرتی ہے کہاں جگہ موجود ہے کہاں ان کو "سیٹل" کیا جائے یہ بجائے خود ایک آسان مسئلہ نہیں ہے۔ یہ سارے کام دس پندرہ دنوں میں نہیں ہو سکتے اس لئے میں فاضل رکن سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنی تحریک پر زور نہ دیں"۔

ظاہر ہے ان کی تقریر خاصی طویل ہو گی میں صرف ہر تقریر کے اہم نکات لکھ رہا ہوں (مگر ہر مقرر کے اپنے لفظوں میں) میں پھر اٹھا اور میں نے کہا

"جناب! بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان کے مالی امور کے مسیحا ڈاکٹر محبوب الحق اس ایوان میں موجود ہیں اور انہوں نے ہی تجاویز طلب فرمائی تھیں کہ ہمیں فنڈز مہیا کرنے کیلئے کوئی راستہ بتایا جائے۔ میں نے ایک بے ضرر سا راستہ بتایا اب اس ضمن میں سرتاج عزیز صاحب بیچارے کیا کہیں کہ وہ مالی امور کے نگران نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شہرت تو ماشاء اللہ مالی مسائل میں مسلّم ہے۔ اگر وہ یہ فرما دیں کہ وہ کونسی رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے اس سلسلے میں "پرائم منسٹر فنڈ" قائم نہیں کیا جا سکتا"

ڈاکٹر محبوب الحق بات کو ٹالنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اپنی شاندار انگریزی میں "اگر مگر لیکن" کا سہارا

لیکراور تجویز پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کر کے شتابی سے فارغ ہو گئے۔ میں نے اتمام حجت کیلئے ایک اور تجویز پیش کر دی۔ میں نے کہا

"جناب والا! آخری بات! چلئے وزیر سرتاج صاحب یہ کہہ دیں کہ اس سیشن میں نہیں اب سال ختم ہونے کو ہے اکتوبر نومبر دسمبر اور اس سہ ماہی کے اندر تمام پالیسی طے کر کے اور کوئی گوشہ وضاحت طلب رکھے بغیر سینیٹ کے سامنے تفصیلی بیان جاری کر دیں گے تو میں تب بھی اپنی تحریک واپس لے لونگا"۔

اب وزیر قانون و پارلیمانی امور خان اقبال احمد خان اٹھے وہ غالباً بڑی دیر سے اس طول کھینچی ہوئی بحث پر پیچ و تاب کھا رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ تحریک غیر ضروری طوالت اختیار کر رہی ہے اس لئے میں مجبوراً آپ کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ یہ تحریک قواعد کے اعتبار سے ناقابل بحث ہے کیونکہ ایوان کے اندر دیئے گئے کسی بیان پر کوئی استحقاق لاگو نہیں ہوتا لہٰذا میری گزارش ہے کہ اسے مسترد فرمایا جائے۔

مجھے پھر موقع مل گیا میں نے عرض کیا:

"جناب والا! میں یہ گذارش کرونگا کہ پارلیمنٹ کی روایت کے مطابق جب کوئی وزیر تحریک پر اظہار خیال کرتا ہے تو محرک کا حق بنتا ہے کہ وہ بھی اس کے اٹھائے گئے نکتوں پر اظہار خیال کرے۔ میرے اظہار خیال کے بعد اگر کوئی اور وزیر صاحب بولیں گے تو پھر میرا حق بنے گا کہ میں اس کا جواب دوں خان صاحب ایک طرف تو طوالت کا گلہ فرما رہے ہیں اور دوسری طرف خود طوالت کا باعث بن گئے۔ مسئلہ ختم ہو رہا تھا میں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وزیر صاحب یہی کہہ دیں وہ دسمبر تک حتمی پالیسی کا اعلان کر دیں گے مگر معلوم ہوتا ہے یہاں پر وزیر صاحب کی نئی اور الگ پالیسی ہے"۔

جناب جاوید جبار نے بھی میرا ساتھ دیا انہوں نے کہا:

"سرتاج عزیز صاحب اس بات کی تائید کر چکے ہیں کہ لارڈ ڈانیل نے فنڈز مہیا کرنے کی جو آفر کی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ تین سو ملین ڈالر کی یہ رقم تین سال کے عرصے میں قسطوں میں مہیا کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وزیر صاحب نے اس اطلاع کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ فنڈز دستیاب ہیں"۔

کابینہ کے اراکین اور سرکاری بنچوں پر براجمان اصحاب سخت مشکل میں مبتلا تھے انہیں فرار کا کوئی

راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ پارلیمانی امور کے وزیر مملکت میر نواز خان مروت کیوں پیچھے رہتے اب وہ اٹھے (اس پر میں نے کہا جناب دو چار وزیر باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی سن لیں) مروت صاحب اپنے وزیر پارلیمانی امور اقبال احمد خان کی تائید میں حوالہ ڈھونڈ کر لائے تھے۔ یہ ایم این کول کی کتاب کا اقتباس تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہاؤس میں دیئے جانے والے وزیر کے کسی غلط بیان سے ہاؤس کا استحقاق مجروح نہیں ہوتا (جب تک وہ دیدہ دانستہ جھوٹ نہ ہو)

لندن کے ایوان بالا کے ذکر پر ایک سرکاری رکن کو تکلیف ہوئی تھی۔ اقبال احمد خان نے بھی اسے ایوان کی توہین قرار دیا تھا۔ اب مجھے موقع مل گیا میں نے کہا "جناب! ایک ہندو کی کتاب کا حوالہ دیکر کیا اس ایوان کی توہین نہیں کی جا رہی"۔ دریں اثناء قائم مقام چیئرمین کی مدد کیلئے سینیٹ سیکرٹریٹ کا عملہ حرکت میں آچکا تھا انہیں 1975 کی قومی اسمبلی کے اسپیکر کی ایک رولنگ نکال کر دی گئی۔ میں نے پوچھا "جناب یہ کس زمانے کی رولنگ ہے" چیئرمین صاحب نے جواب دیا "یہ 1975ء میں نیشنل اسمبلی میں دی گئی تھی" میں نے تفنن طبع کیلئے کہا

کیا ہمارا زمانہ اس قابل ہے، جناب کہ اس کی کوئی روایت آپ قبول کریں؟۔ یہ رولنگ پیش کرنے کے بعد چیئرمین صاحب نے پہلے سے لکھا ہوا ایک فیصلہ میری تحریک پر بھی صادر فرمادیا۔ جس کے تحت اسے مسترد کر دیا گیا۔

سینٹ کے حوالہ جات طویل ہو گئے مگر میرا خیال ہے یہ خالی از دلچسپی نہ تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں پارلیمنٹ کی کارروائی جس طرح رپورٹ ہوتی ہے اس سے ایوان کی پوری فضا کی عکاسی نہیں ہوتی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ قارئین اس کے زیر بحث آتے وقت ایوان میں اپنے آپ کو موجود تصور کریں اور مجھے یقین ہے کہ اس میں مجھے ناکامی نہیں ہوئی ہو گی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فنڈز کی عدم دستیابی کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ حکومت سے کوئی نہیں کہتا کہ ان سب بھائیوں کو ہوائی جہاز کے ذریعے واپس لایا جائے۔ نوے ہزار پاکستانی فوجی بھی تو رہا ہونے کے بعد بنگلہ دیش سے پاکستان آئے تھے وہ بھارتی ریلوے کے ذریعے یہاں پہنچے تھے۔ ہم اگر راجیو گاندھی کو خوش کرنے کیلئے اس کے مہمانوں کو طیارے آفر کر سکتے ہیں تو راجیو بھی ٹکٹ کے پیسے کھرے، کر کے ان مہاجرین کو ریل کے ذریعے پاکستان لانے کی اجازت دے سکتا ہے اور اگر اس کیلئے پیسوں کی ضرورت ہے (گو سطور بالا میں حقیقت حال عرض کی جا چکی ہے) تو اگر ہم بنگلہ دیش کے سیلاب زدگان کا امدادی فنڈ کھول سکتے ہیں۔

تو بہار کے پاکستانی بھائیوں کیلئے بھی کوئی فنڈ کھولا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصہ کیلئے انکم ٹیکس، ریل اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر اضافی چارجز وصول کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے پاکستانی عوام یہ چھوٹی سی قربانی خوشی سے قبول کریں گے مگر یہاں تو سرے سے نیت ہی نہیں کہ ان غریبوں کو پاکستان بلایا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ چند روز پیشتر رابطہ عالم اسلامی کے عہدیداروں کی صدر صاحب سے ملاقات کو بڑی پبلسٹی دی گئی

ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدر صاحب نے رابطے کیساتھ کسی معاہدے پر بھی دستخط کئے ہیں مگر اسلامک سیکرٹریٹ اور مسلمان حکومتوں کے ہوتے ہوئے محض ایک حکومت کی ذیلی تنظیم کے ساتھ کسی معاہدہ کی خبر نہ کوئی حیثیت رکھتی ہے اور نہ ہی قابل اعتبار قدروقیمت۔ سنا ہے اس سلسلے میں کوئی فنڈ بھی کھولا گیا ہے مگر اس کی کوئی اطلاع اب تک اہل وطن تک نہیں پہنچی۔ اگر کوئی فنڈ کھولا جاتا تو پاکستانیوں کو بھی اس میں حصہ لینے کی ترغیب دی جاتی لیکن لگتا ہے یہ سب پبلسٹی سٹنٹ ہے۔

مباحثات

(1) کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟

قریب قریب پچھلا پورا پندرھواڑہ کراچی میں گزرا، تقریب سفر ایک شادی میں شمولیت سے پیدا ہوئی۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا یہاں تو گھر گھر شادی ہے۔ جوں جوں احباب کو کراچی میں میری موجودگی کی اطلاع ملتی چلی گئی شادیوں کے دعوت ناموں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کئی جگہ معذرت بھی کی پھر بھی پانچ شادیوں دو ولیموں اور دو مہندیوں میں تو شریک ہونا ہی پڑا۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

نقشوں سے تم نہ جانچو لوگوں میں پھر کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

اب لوگوں میں پھر کے اپنے معاشرے کی وہ جھلکیاں براہ راست دیکھنے کا اتفاق ہوا جن کا تعلق شادی بیاہ کی رسموں سے ہے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ماشاءاللہ ہمارا ایک طبقہ کتنا خوشحال، صاحب ثروت شاہ خرچ اور لکھ لٹ واقع ہوا ہے۔ ایک ایک شادی پر لکھو کھا روپے کے یہ اخراجات دیکھے تو میری نظر میں ان بھی فلینوں کے شب و روز پھرنے لگے جن کی بیٹیاں سر ڈھانپنے کیلئے آج بھی دوپٹے سے محروم ہیں۔

اس طرف بھی آدمی ہیں اس طرف بھی آدمی
ان کے جوتوں پر چمک ہے ان کے چہروں پر نہیں

....

ایک عزیز دوست کے بیٹے کی شادی دیکھی ان کا اصرار تھا کہ شادی کی ساری ہی تقریبات میں شرکت

کروں چنانچہ دولہاوالوں کی طرف سے دلہن کو مہندی لگانے کیلئے جو قافلہ روانہ ہوا اس میں بھی شامل تھا۔ قافلہ کیا تھا پوری برات تھی فرق صرف اتنا تھا کہ دولہا میاں ہمارے ساتھ نہ تھے۔ معلوم ہوا اس تقریب میں وہ بعد میں پدھاریں گے۔ پہنچے تو ماشاءاللہ دلہن کا گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ کوئی چار پانچ سو خواتین و حضرات ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ ماحضر میں چار پانچ کھانے تھے' بعد میں ناچ گانے کا بھی اہتمام تھا۔ مگر میں اہل خانہ کو اطلاع دیئے بغیر چپکے سے کھسک آیا۔

اگلے دن لڑکی والوں کو مہندی لیکر آنا تھا۔ وہ اس شان سے آئے کہ ان کے آگے آگے بینڈ نغمہ سرائی کر رہا تھا' دولہا کی برات کیساتھ تو بینڈ باجے کئی دفعہ دیکھے تھے مگر لڑکی والوں کی طرف سے مہندی لیجاتے وقت بینڈ کا یہ اہتمام پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا۔ اس روز بھی دونوں طرف سے مل ملا کر کوئی چار پانچ سو افراد کھانے میں شریک تھے اور کھانا بھی ماشاءاللہ چار پانچ اقسام پر مشتمل تھا۔ کھانے کے بعد قوالی ہوئی اور اس طرح رات گئے تک یہ محفل آراستہ رہی۔

ایک دو دن کے بعد نکاح ہوا۔ اس میں البتہ کم لوگ شریک تھے' دلہن والوں کی طرف سے پر تکلف کھانا دیا گیا۔ میں نے سمجھا تقریبات کا سلسلہ ختم ہوا اب صرف ولیمہ ہوگا اور بس مگر معلوم ہوا اگلے روز لڑکی والوں کی طرف سے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں استقبالیہ بھی ترتیب دیا گیا ہے۔ استقبالیہ میں کوئی ایک ہزار مہمان ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ فی کس ایک سو روپے سے کم خرچ نہیں اٹھا ہوگا۔

دو اور ولیمے بھی بھگتائے۔ ایک شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں تھا دوسرا ایک فور اسٹار ہوٹل میں' دونوں ولیموں میں دو دو ہزار کا اجتماع تھا۔ بڑے ہوٹل والے ولیمے میں مجھے بھی معلوم ہے کہ ہوٹل نے دو سو روپے فی کس چارج کیا تھا اس طرح چار لاکھ روپے صرف ولیمے کی دعوت پر ہی صرف ہوگئے۔ دوسرے ولیمے میں خرچ کا اندازہ ایک سو روپے فی کس ہے اس کا بل دو لاکھ روپے بنا ہوگا۔

....

شادیوں میں اسراف و تبذیر اور نمود و نمائش کے علاوہ ایک اور قابل ذکر اور لائق غور پہلو رسموں کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شادی بیاہ کے موقع پر اظہار مسرت ایک فطری امر ہے اس لئے زرق برق لباسوں' بینڈ باجوں اور آتش بازی کے مظاہروں پر کچھ زیادہ تنقید نہیں کی جاسکتی مگر جو بات تشویش ناک ہے وہ یہ ہے کہ اس موقع پر بعض ایسی لایعنی رسمیں بھی ادا کی جاتی ہیں جن کی جڑیں مسلم ثقافت کی بجائے غیر مسلم اور ہندووانہ ثقافت میں پیوست ہیں۔ مثال کے طور پر مہندی کے ایک موقع پر پندرہ بیس لڑکیوں کے ایک غول نے مہندی کے تھال میں جلتے ہوئے دیئے رکھ کر رقص کیا۔ بعد میں لڑکے بھی اس میں شامل ہوگئے ان کے ہاتھوں میں بھی جلتے ہوئے دیئے تھے۔ اس ناچ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ دیوالی پر ہونے والے ہندووانہ رقص کا چربہ ہے۔ اسی طرح ایک شادی میں شادی سے قبل دولہا اور دلہن دونوں کے گھر والوں نے ایک دوسرے کے قریبی رشتہ داروں کو طرح طرح کے رنگ ڈال کر نیل کنٹھ بنا دیا۔ یہ ہولی

کے تہوار میں رنگوں کی پچکاریاں بھر بھر کر ڈالنے کی نقالی تھی۔ ایک اور شادی میں بچیوں نے جو گانے گائے ان پر کم سے کم "فحاشی" کا عنوان ہی راست آتا ہے۔ یہ بجا اور درست ہے کہ اس موقع پر دولہا اور دلہن کی عزیز اور رشتہ دار خواتین کا تھوڑا بہت گانا بجانا ہمارے کلچر کا بھی حصہ ہے لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ گایا کیا جا رہا ہے۔ ایک موقع پر دلہن والوں کے سامنے دولہا کی رشتہ دار خواتین نے جو گانے گائے وہ افسوسناک ہی نہیں شرمناک بھی تھے۔ مثال کے طور پر ایک گانے کے بول یہ تھے

"دلہن کی بہنیں آنے کی دو"

میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ فحاشی شادی بیاہ کے موقع پر مسلم خاندانوں میں کہاں سے گھس آئی ہے۔

رسموں میں بدترین رسم جہیز کی رسم ہے۔ ان شادیوں میں بھی اس کا خوب مظاہرہ ہوا اور وہ سارے قوانین دھرے کے دھرے رہ گئے جو پچھلی حکومت نے بنائے تھے اور اس حکومت نے بھی جزوی ترمیموں کیساتھ ان کی توثیق کی ہے۔ جہیز کے بارے میں بدقسمتی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ سنت رسولؐ ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دو صاحبزادیاں اور بھی تھیں اگر جہیز سنت رسولؐ ہوتا تو آپؐ نے انہیں بھی ضرور جہیز دیا ہوتا مگر تاریخ اور سیرت کی کسی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدۃ النساءؓ کی شادی میں کوئی خاص انفرادیت تھی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسا کیا اور وہ انفرادیت یہ تھی کہ جناب علی مرتضیٰؓ کو ان کے والد ماجد جناب ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سپرد کیا تھا اور آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں جناب علیؓ پروان چڑھے تھے۔ اس لحاظ سے وہ آپ کے چچازاد بھائی ہی نہیں آپؐ کے بیٹے بھی تھے اور ان کے جملہ اخراجات کی کفالت بھی سرکار رسالت مآبؐ کے ذمے تھی جب حضرت علیؓ کی شادی ہوئی تو ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا اپنی زرہ بیچ کر انہوں نے کچھ رقم اکٹھی کی 'انہیں نیا گھر بسانا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس فرض کفالت کیوجہ سے جو آپؐ نے ذمے لیا تھا' نوبیاہتا جوڑے کو گھر گرہستی کی ضروری اشیاء فراہم کر دیں۔ یہ تھی وہ بات جسے یار لوگ لے اڑے اور اسے سنت بنا کر چھوڑا اور یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ سامان جسے وہ جہیز کا نام دے رہے ہیں اس کی مالیت ہی کتنی تھی؟ اگر بالفرض جہیز سنت رسولؐ ہے بھی تو پھر اس پر عمل کرنے کے خواہشمند حضرات اپنی بیٹیوں کو "جہیز فاطمی" دیں نہ کہ اس کی آڑ میں اپنی ثروت و امارت کے وہ وہ ڈنکے بجائیں کہ سوسائٹی میں طبقاتی منافرت کی داغ بیل پڑ جائے۔ دیکھا جائے تو اصل میں "جہیز" بھی ایک ہندووانہ رسم ہے چونکہ ہندو اپنی بیٹی کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیتے اس لئے وہ اسے جہیز کے نام پر ہی اپنی دولت کا کچھ حصہ دان کر دیتے ہیں اس کے برعکس اسلام نے بیٹی کو باقاعدہ وراثت کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی

اس کا یہ حق تو اسے دیا نہیں جاتا محض جہیز دیکر اسے ٹرخا دیا جاتا ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والے انہی کثیر مصارف اور جہیز وغیرہ کی غلط رسموں کے انسداد کیلئے میں نے مئی 1976ء میں قومی اسمبلی میں جہیز ایکٹ کے نام سے ایک بل پیش کیا تھا جس میں دعوت ولیمہ وغیرہ کے مصارف' مہمانوں کی تعداد اور جہیز وغیرہ کی اشیاء کی تفصیل کا تعین کیا گیا تھا۔ اس ایکٹ کی خلاف ورزی پر باقاعدہ سزا بھی مقرر کی گئی تھی۔ قومی اسمبلی میں اس وقت حزب اختلاف کے بنچوں پر مولانا مفتی محمود مرحوم' مولانا شاہ احمد نورانی' مولانا عبدا مصطفیٰ الازہری' مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم' مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا نعمت اللہ جیسے جید علمائے دین تشریف فرما تھے۔ سب کے اتفاق رائے سے یہ بل منظور ہوا۔ بعد میں مارشل لاء نافذ ہوا تو اس ایکٹ میں کچھ ترمیمیں کی گئیں مگر اپنی روح اور بیشتر خصوصیات کے ساتھ وہ جوں کا توں نافذ رہا۔ حیرت ہے کہ اس قانون کے ہوتے ہوئے شادی بیاہ کے موقع پر اس طرح کے مظاہرے کیسے ہو رہے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ایسی تقریبات میں وہ ذمہ دار حکام اور وزراء بھی بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں جن کا کام ہی قوانین ملکی کا نفاذ اور ان کا احترام کرانا ہے۔ جب ان کے ناک کے نیچے قانون کی اس طرح دھجیاں بکھیری جائیں گی تو عوام میں قانون کا احترام کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا یہ میرے فوری اور سرسری تاثرات ہیں۔ اصل بات جس پر میں اس وقت سے لیکر اب تک مسلسل سوچ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا معاشرہ اس قابل ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو سکے اور کیا یہ معاشرہ فی الحقیقت دل سے اسلامی نظام کا طلب گار ہے بھی کہ نہیں؟ میں نے جہاں تک اس پر غور کیا ہے بدقسمتی سے اس کا جواب نفی میں پایا جاتا ہے۔ تمام نعرہ بازیوں' اسلام کے نام پر سیاست کاریوں اور مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والے کاروباری اداروں کے باوجود اصلیت یہی ہے کہ ہم میں سے کچھ مومنین مخلصین کو چھوڑ کر ہر شخص صرف "اسلام زندہ باد" کا نعرہ لگانا چاہتا ہے اس پر عمل نہیں کرنا چاہتا۔

میرے خیال میں اس ضمن میں ہمیں اپنے نفس سے مندرجہ ذیل سوالات کرنے چاہئیں:

(1) کیا ہم دل سے سودی کاروبار کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک مین بینک' انشورنس کمپنیاں اور زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے اور راتوں رات امیر بن جانے کے امکانات رکھنے والے سودی ذرائع یک قلم ختم کر دیئے جائیں اور ہم رزق حلال پر قانع ہو جائیں؟

(2) کیا ہم واقعی چاہتے ہیں کہ رشوت اور رزق حرام کے دوسرے تمام دروازے

بند ہو جائیں؟ کیا واقعی رشوت لینے والے اور انہیں غلط کام کرانے کیلئے رشوت پیش کرنے والے اس ذہنی تبدیلی کیلئے تیار ہو چکے ہیں؟

(3) بڑے بڑے سرمایہ داروں ‘ کارخانہ داروں اور لکھ پتیوں ہی کو نہیں ایسے لوگوں کو بھی اپنے دلوں کو ٹٹول کر یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ لینا چاہئے جو اس گروہ میں تو شامل نہیں ہیں لیکن رات دن اس گروہ میں شامل ہونے کے جلی اور خفی راستوں کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کیا وہ واقعی اسلامی اصولوں کے مطابق سادہ زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں اور شادی بیاہ اور اس طرح کی دوسری معاشرتی تقریبات میں شاہ خرچیاں کر کے دوسروں پر اپنی امارت کا رعب نہیں گانٹھنا چاہتے؟

(4) زمین کی ملکیت کے متعلق اسلام کا بنیادی اصول ”الارض للّٰہ“ کے مختصر مگر جامع ترین الفاظ میں موجود ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں ہوئیں لیکن اس کی حقیقی شرح وہی ہوگی جو اس کے سادہ معنوں ”زمین اللہ کی ہے“ میں مضمر ہے اس پر آپ علمیت کے جتنے خول چاہے چڑھالیں لیکن یہ علمی خول آپ کے تبحر علم کی دلیل بن جانے کے باوجود اسلام کی حقیقی روح کے آئینہ دار نہیں ہونگے۔ سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی زمیندار ‘ کوئی جاگیردار ‘ مربعوں کا کوئی مالک اس بنیادی اصول کو علمی خول سے نکال کر اس کے سادہ معنوں میں اپنانے کو تیار ہے؟

یہ اسلام کے نظام اقتصاد کی دو سادہ بنیادیں ہیں۔ سود سے پاک معیشت اور جاگیردارانہ نظام سے پاک معاشرہ۔ اگر آپ ان پر غور فرمانے کی زحمت کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان سادہ بنیادوں کو اپنا لینے سے ہم سرمایہ دارانہ نظام حیات کی ان تمام لعنتوں سے محفوظ ہو سکتے ہیں جو اندر ہی اندر ہماری اسلامیت کو کھوکھلا کئے دے رہی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ آج کا دور ہو یا تاریخ کا کوئی دوسرا دور ‘ کوئی نظریہ اور عقیدہ اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتا جب تک وہ نظام اقتصادی کو متاثر نہ کرے۔

کتابوں میں بند ‘ الماریوں میں سجے ہوئے اسلام کو خود اسلام ‘ اسلام نہیں سمجھتا اور قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اہل کتاب کو آسمانی تعلیمات کو کتابوں میں بند کر دینے کی غلطی میں مبتلا ہونے پر بڑی سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان وعیدوں کے مصداق ہم کیوں نہیں بنیں گے اور اس طریق عمل کے وہ نتائج جو پہلی امتیں بھگت چکی ہیں ہمیں اپنی گرفت سے کیوں آزاد کریں گے؟

قوانین اپنی جگہ ضروری ہیں ‘ ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ‘ میں خود سطور بالا میں جہیز ایکٹ کے نفاذ پر زور دے چکا ہوں لیکن معاشرے میں ہونے والی ہر خرابی کیلئے ایڈمنسٹریشن کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ایڈمنسٹریشن بھی تو آخر اسی معاشرے کا ایک حصہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس

فلسفے کو ان دو لفظوں میں سمیٹ کر بیان فرمادیا ہے کہ "اعمالکم عمالکم" تمہارے اعمال تمہارے حاکم ہیں۔ ایڈمنسٹریشن اگر چاہے بھی تو معاشرے میں رائج یہ غلط اقدار نہیں بدل سکتی' ان غلط اقدار نے معاشرے میں مفادات کے بعض ایسے حلقے اور طبقے (پریشر گروپ) قائم کر دیئے ہیں جن کو توڑنے کیلئے محض حکومت اور انتظامیہ کی تبدیلی کافی نہیں اس کیلئے ایک ذہنی اور قلبی انقلاب کی ضرورت ہے۔ جو عوام ہی کی سطح پر جنم لیتا اور یہیں سے اوپر کا سفر اختیار کرتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی انقلاب موجود نہیں جو ایڈمنسٹریشن کے حلقوں میں پیدا ہوا اور اس نے معاشرے میں رائج اس نظام کو بدل دیا ہو جس کے اثرات کی شکایت معاشرے میں ہر ہر قدم پر ہو رہی تھی۔ خود اسلام ایک عوامی ذہنی انقلاب ہے۔ جس نے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کی۔ دلوں کو بدلا اور اس کے بعد ایک قدیم نظام کی جگہ ایک دوسرا نظام قائم کیا جس کی عظیم الشان اور فقید المثال ایڈمنسٹریشن کی نمائندگی حضرت عمر فاروقؓ نے کی۔ ہم اس عجیب و غریب منطق میں مبتلا ہیں کہ نظام تو وہی برقرار رہے' معاشرہ تو ویسے کا ویسا ہی رہے لیکن اس نظام اور معاشرے میں ایڈمنسٹریشن وہ ہو جس کی نمائندگی حضرت عمر فاروقؓ نے فرمائی۔

سوال یہ ہے کہ اس نظام اور معاشرے کی تبدیلی کیلئے ہمارے علمائے کرام' ہماری دینی اور سیاسی جماعتیں' ہمارے ارباب قلم' ہماری صحافت اور دوسرے ذرائع ابلاغ کیا کر رہے ہیں؟ جب تک ہم میں سے ہر شخص تبدیلی کیلئے دل و جان سے تیار نہیں ہو جائے گا اس وقت تک محض خدمت اسلام کی زبانی جمع خرچ اور ایک لولے لنگڑے قانونی ڈھانچے سے کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہو گا۔

ترسم کہ بہ کعبہ نرسی اے اعرابی
کاں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

سوٹ اور ٹائی کا مسئلہ

قارئین جنگ آئے دن اس کالم میں میرے بیرون ملک ہونے کا ذکر پڑھ پڑھ کر اکتا چکے ہوں گے، مگر کیا کیا جائے کسی نہ کسی حوالے سے اس کی بات نکل ہی آتی ہے۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ اس بہانے احباب سے خوشی و غمی میں شریک نہ ہوسکنے کی معذرت بھی ہوجاتی ہے اور ان لاتعداد اصحاب کو اپنے خطوط کا بروقت جواب نہ ملنے کا سبب بھی معلوم ہوجاتا ہے جو ازراہ کرم اس کالم میں چھڑنے والے موضوعات پر مجھے اپنی آراء سے مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ مہینے میں ایک مرتبہ بعض منتخب اور اہم خطوط کے چھپنے کی باری آتی ہے مگر اس مرتبہ یہ معمول دو تین ہفتوں مؤخر ہورہا ہے اور سبب اسکا اب کے بھی یہی ہے کہ ایک مہینے سے زمین کا گز بنا ہوا ہوں "سیروا فی الارض" ...... دنیا میں گھوم پھر کر دیکھو۔ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے اور ویسے بھی بزرگوں کا قول ہے کہ سفر وسیلہ ظفر ہے۔ سفر وسیلہ ظفر بنے یا نہ بنے رزق کی تلاش کیلئے ایک دوسرا حکم قرآنی یہ بھی موجود ہے کہ "فانتشروا فی الارض" زمین میں پھیل جاؤ۔ اپنے وطن میں رہنے کی خواہش کس دل میں نہیں مگر "ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا ......"

سو اب کے بھی دیس دیس کی خاک چھان رہا ہوں۔ پر ان دوستوں کے خیال سے غافل نہیں ہوں جو اپنے خطوط کی رسید نہ پاکر مجھ سے خفا ہونگے، یہ ہفتہ وار رابطہ تو خیر بفضل خدا میں جہاں کہیں بھی ہوں قائم رکھتا ہوں۔ دو تین ہفتوں میں واپسی ہوگی تو ڈاک کا سارا پچھلا حساب بھی فی الفور بے باق ہوگا۔ اب کے تو ڈاک کے اس کالم میں اس عمومی سوال پر میرا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے جو "مشاہدات و تاثرات" کے ساتھ چھپنے

والی میری تصویر میں نظر آنے والے سوٹ اور ٹائی کے متعلق ہے۔ بلا مبالغہ ہر بار پانچ دس خطوط اس مضمون کے موصول ہوتے ہی رہتے ہیں کہ تصویر تبدیل کر دی جائے۔ لباس غیر اسلامی ہے۔ اور ٹائی تو سراسر اس لئے حرام ہے کہ صلیب کی نشانی ہے۔

....

سب سے پہلے تو یہ وضاحت سن لیجئے کہ میں ذاتی طور پر سوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ حکومت کے زمانے میں بھی چند ہی بار میں نے یہ لباس پہنا ہوگا اور وہ بھی کسی سرکاری یا سفارتی تقریب میں، ٹائی تو ویسے بھی مجھے بوجھ لگتی ہے۔ بیرون ملک بھی حتی الوسع ایسا لباس پہنتا ہوں کہ ٹائی نہ باندھنی پڑے، قمیض شلوار اور سردیوں میں اس پر واسکٹ میرا پسندیدہ لباس ہے مگر ان باتوں کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا مخصوص ''کٹ'' موجود نہیں جسے اسلامی کہا جاسکے اور اس کے علاوہ تمام دوسرے لباس غیر اسلامی قرار پائیں۔ عرب دنیا میں اس وقت جو لباس رائج ہے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہی لباس حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے صحابہ کرامؓ پہنا کرتے تھے۔ ویسے بھی آنحضورؐ دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے کہ صدیوں پہلے کے لباس کا کوئی مخصوص ڈیزائن قیامت تک کیلئے لازم قرار دے دیں آپ خود اس سلسلے میں اتنے لبرل تھے کہ احادیث کے مطابق جب انہوں نے رومیوں میں پہنے جانے والی شلوار دیکھی تو اسے خود زیب تن کیا اور پسند فرمایا شلوار کو اس زمانے میں ''سراویل'' کہتے تھے اور ہمارے ہاں شلوار اصل میں اسی کا بگڑا ہوا دوسرا نام ہے۔ حضورؐ کے اس عمل سے ثابت ہوا کہ لباس کا کوئی بھی غیر ملکی انداز بلا تکلف اختیار کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ اس سلسلے میں شریعت کے کسی اصول سے متصادم نہ ہو۔

....

اور اس سلسلے میں شریعت نے جو اصول عطا کئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ

1۔ لباس ستر پوش ہو عریاں اور فحش نہ ہو

2۔ مرد عورتوں کا لباس نہ پہنیں اور عورتیں مردوں کی وضع قطع اختیار نہ کریں

3۔ مرد (خالص) ریشم کا لباس نہ پہنیں (کہ اس سے ان میں تن آسانی اور آرام طلبی پیدا ہوگی)

4۔ لباس میں اسراف نہ کیا جائے یعنی لباس صاحب لباس کے بجٹ کی حدود میں ہو۔ قرض لیکر یا اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس پر خرچ نہ کیا جائے

5۔ ایسا لباس نہ پہنا جائے جو کسی قوم کا مذہبی شعار ہو۔

علمائے کرام اور فقہائے عظامؒ نے مسئلہ لباس پر جو کچھ لکھا ہے اس کا نچوڑ یہی پانچ اصول ہیں۔ البتہ پانچویں اصول کو ہم نے ان لفظوں کے بجائے اپنی عام فہم تشریح میں پیش کیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں کہ

"لباس میں تشبّہ بالکفار نہ ہو"

تشبّہ' مشابہت یا ملتے جلتے انداز کو کہتے ہیں ہم نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ لباس کا کوئی جز غیر مسلم اقوام کے کسی مذہبی شعار سے نہ ملتا ہو اگر مشابہت کو عام معنوں میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ غیر مسلم کرتے کے بجائے قمیض پہنتے ہیں تو قمیض کا پہننا ناجائز ہو گا۔ اگر وہ قمیض میں جیب پہلو کے بجائے سینے پر لگاتے ہیں تو یہ بھی ان سے مشابہت ہو گی' اگر وہ عام گلے کے بجائے کالر لگاتے ہیں تو کالر لگانا غیر اسلامی ہو گا۔ اگر ان کے ہاں قمیض کے نیچے بنیان پہننے کا رواج ہے تو اس سے بھی احتراز لازم ہو گا۔ گھڑی باندھنا بھی لباس کا حصہ ہے اگر وہ رسٹ واچ باندھتے ہیں تو ہمیں اس سے بھی پرہیز کرنا ہو گا۔ بوٹ خالصتاً ان کی ایجاد ہے انہیں پہننا بھی خلاف اسلام ٹھہرے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ " تشبّہ بالکفار " کی یہ تشریح نہ صرف دور از کار ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے پوری دنیائے اسلام اس کے خلاف عمل پیرا ہے اور اگر وہ چاہے بھی تو لباس کے معاملے میں دوسری اقوام کی کسی نہ کسی جزوی مشابہت کو اختیار کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتی ویسے بھی اگر اس طرح کی مشابہت سے منع کرنا شریعت کا منشا ہوتا تو خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روم سے آئے ہوئے لباس کے ایک انداز کو پسند نہ فرماتے۔

سوٹ پر بھی ہمارے ہاں کے بعض علمائے کرام کی طرف سے جو اعتراض کیا جاتا ہے (میں نے ہمارے ہاں کے علمائے کرام اس لئے کہا ہے کہ دنیا کے تمام دوسرے مسلمان ممالک کے امام اور خطیب صاحبان سوٹ اب ذوق و شوق سے پہنتے ہیں) اس کی بھی اصل روح یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس میں استعمال ہونے والی ٹائی عیسائیوں کا مذہبی شعار ہے یعنی صلیب کی نشانی ہے۔

اصل میں مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے علمائے کرام انگریزی زبان نہیں جانتے اس لئے مغربی اقوام کی تہذیب اور کلچر کے بارے میں ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں تک محدود ہیں۔ یہی مشکل اس وقت پیش آئی تھی جب برصغیر پاک و ہند میں پہلی مرتبہ لاؤڈ سپیکر کا آغاز ہوا تھا اور تو اور خود حضرت مولانا اشرف علی تھانوی جیسے جیّد عالم دین نے فتویٰ دیا کہ اسے نماز میں استعمال کرنا ناجائز ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ لاؤڈ سپیکر کی آواز پر رکوع و سجود کرنے والے درحقیقت امام کی پیروی نہیں کرتے کیوں کہ وہ امام کی آواز نہیں ہوتی۔ مولانا تھانوی کے اس فتوے سے ان کے لائق مرید اور خلیفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے اختلاف کیا انہوں نے سائنس جاننے والے بعض ماہرین سے' اور ان میں غیر مسلم ماہرین بھی شامل تھے' اس مسئلے پر معلومات حاصل کیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاؤڈ اسپیکر کے بارے میں حضرت تھانوی ؒ کی یہ رائے تحقیقی نہیں انہوں نے اپنے مرشد سے اس مسئلہ پر خط و کتابت کی اور یہ حضرت تھانوی کی عظمت تھی کہ انہوں نے حقیقت حال کے بعد اپنے فتوے سے رجوع کر لیا۔

لاؤڈ اسپیکر ہی پر کیا موقوف ہے ریل چلنے لگی اور اس پر بھی بعض علمائے کرام کو بہت سے اشتبھات لاحق ہوئے، "شاہ فیصل شہید" کے تذکرے میں یہ واقعہ میں پہلے ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ کس طرح علماء ٹیلیفون لگوانے کی مخالفت کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ اس کے ذریعے سے شیطان کلام کرتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے پہلا ٹیلیفون لگوا کر اپنے ہاں کے شیخ الاسلام کو طلب کیا آپریٹر سے وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ فون پر چھوٹتے ہی تلاوت شروع کر دی جائے۔ گھنٹی بجی تو شاہ نے ٹیلی فون کا ریسیور شیخ الاسلام کے کانوں سے لگا دیا وہ تلاوت کی آواز سن کر بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ٹیلی فون سے شیطان نہیں رحمٰن بولتا ہے۔ ٹائی کے معاملے میں بھی ہمارے ہاں کا مذہبی طبقہ بلاوجہ غلط فہمی کا شکار ہے۔ اور اس کے صلیب کی نشانی ہونے کا وسوسہ اس کی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے اس زور و شور سے پھیلا ہے کہ سیدھے سادے عوام اسے بلاچوں وچرا حقیقت ثابتہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے؟ کیا ہے کوئی رجل رشید جو اس دعوے کی تائید میں باقاعدہ تحقیقی حوالہ پیش کر سکے؟ ٹائی انیسویں صدی کی پیداوار ہے اس کا رواج ہوئے دو سو سال بھی نہیں گزرے۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق واقعہ صلیب کو تو دو ہزار سال ہونے کو آئے اگر ٹائی کا تعلق ان کے اس عقیدے سے ہوتا تو اسے شروع ہی سے اختیار کرایا جاتا۔ سترہ اٹھارہ سو سال کے بعد اسے کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان ریسرچ اور تحقیق کی زبان ہے اس میں یورپ کے کلچر کے ہر جز کی تاریخ موجود ہے ایسی کتابیں ہیں جن میں لباس کے نشوو ارتقاء کی بھی پوری ہسٹری ہے تفصیل دیکھنی ہو تو جیمز لیور کی کتاب "دی بک آف ٹائیز" دیکھ لو اسے سیلے سروس اینڈ کو لمیٹڈ لندن نے شائع کیا ہے۔ "وکٹورین کاسٹیوم" کا مطالعہ کر لو۔ اس میں "بک" نے ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے لباس کا جائزہ لیا ہے۔ "اکوپیشنل کاسٹیوم ان انگلینڈ" ایک اور کتاب ہے جس میں گیارھویں صدی سے لیکر 1914ء تک کے لباسوں کا تذکرہ ہے۔ "دی میل امیج"...... تیرھویں صدی سے 1970ء تک مردانہ فیشن پر روشنی ڈالتی ہے یہ "پنی لیوپ بائرڈ" کی تصنیف ہے۔ "یوروپین کاسٹیومز" (بائی ڈورین یارورڈ) میں "گردن کے پہناووں" کا حال پڑھ لو "کریوٹ" سے "نکٹائی" تک پہنچنے میں کیا کیا مرحلے آئے۔ سرکاری ضیافتوں میں اس کی کیا اہمیت تھی۔ پروٹوکول اور ادب و آداب پر جان دینے والی فرانسیسی اور انگریزی اقوام نے کس طرح اسے مختلف طبقات میں امتیاز کا ذریعہ بنایا۔ سوال یہ ہے کہ جب کسی مؤرخ یا پادری نے اسے مذہب کا نشان نہیں بنایا تو آپ نے اسے بلاوجہ کیوں صلیب کا نشان بنا لیا؟ آپ اسے پسند نہیں کرتے نہ کریں مگر اپنے ذوق کو مذہب کا درجہ کیوں دیتے ہیں؟ سوٹ اور ٹائی تو ایک بین الاقوامی لباس ہے۔ ہر ملک میں رائج ہے اب یہ کسی مخصوص ملک کی میراث اور ملکیت نہیں آپ اسے پہننے یا نہ پہننے کو اسلام کا مسئلہ بنا دیں گے تو اقوام مغرب بلکہ اقوام عالم تک پر اسلام کا دروازہ بند کر دیں گے۔ ذرا اپنے ملک سے باہر نکل کر اس نقطہ نظر کی تبلیغ کیجئے پھر دیکھئے دنیا آپ کا کس طرح مذاق اڑاتی ہے؟

....

حضورؐ نے فرمایا:۔ "الدین یسر" ...... دین آسان ہے، بدقسمتی سے ہماری بعض تشریحات و تعبیرات نے اسے مشکل بنا دیا ہے۔ خاص طور پر ان امور و مسائل کے بارے میں تو ہمارا مذہبی مزاج حقائق سے زیادہ اندھی تقلید اور جذباتیت کو پسند کرتا ہے جن کا تعلق عصر حاضر اور جدید معاشرت سے ہے اور دیکھا جائے تو اسی وجہ سے ہم دو عملی اور نفاق میں مبتلا ہیں۔ مذہبی حلقے تصویر کو حرام اور ناجائز قرار دیتے ہیں مگر کوئی عالم دین ایسا نہیں جس کا فوٹو موجود نہیں۔ اب تو آئے دن علماء صاحبان کے گروپ فوٹو بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں علماء کا فوٹو چھپتا تھا تو اسی پر اعتراض ہوتا تھا اب آہستہ آہستہ نظریں یہ فوٹو اور تصویریں دیکھ کر ان سے اتنی مانوس ہوگئی ہیں کہ اعتراض اب نفسِ تصویر پر نہیں اس چیز پر ہونے لگا ہے کہ کوئی تصویر اب ملکی لباس میں اور عقیدے کا تعلق ہے میں تو فوٹو کو آئینے کے عکس کی مانند سمجھتا ہوں۔ آپ آئینے کے سامنے اپنے عکس کو دیکھتے ہیں اسے جائز سمجھتے ہیں یہی عکس اگر زیادہ دیر کو محفوظ کر لیا جائے تو تصویر ہے اگر ایک چیز جائز ہے تو دوسری ناجائز کیسے ہوگی؟

یہی طرز عمل ہمارا ٹی وی اور فلم کے بارے میں ہے مذہبی حلقوں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہیں۔ مگر کوئی مسلمان ملک ایسا نہیں جہاں ٹی وی اور فلم کا دور دورہ نہ ہو۔ علماء صاحبان ٹی وی کی ایجاد کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اس میں جلوہ افروز بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کے گھر میں ٹی وی سیٹ بھی موجود ہیں وہ فلم سینما میں نہیں دیکھتے تو ٹی وی پر دیکھ لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پوری دنیائے اسلام میں ہمارے عمل اور ہماری تشریح میں تضاد کیوں ہے؟ ہم ایسی تشریحات کو مذہب کیوں قرار دیتے ہیں جن پر عمل نہیں کر سکتے ہیں؟

....

آپ سوٹ کو ناجائز اور غیر شرعی تو قرار دے نہیں سکتے ہاں ایک صورت میں اس کا پہننا ...... کم سے کم اندرون ملک کی حد تک ناپسندیدہ سمجھا جا سکتا ہے جب آپ کوئی اسلامی یا قومی لباس متعین کر دیں، جہاں تک اسلامی لباس کے تصور کا تعلق ہے شروع میں گزر چکا کہ ہر وہ لباس اسلامی ہے جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہو، اسلام کوئی ٹیلرنگ کی دکان نہیں جہاں مخصوص وضع قطع کے لباسوں کی تراش و خراش ہوتی ہو لباس کا تعلق جغرافیائی اور موسمی ضروریات اور علاقائی ثقافت سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود عالم اسلام میں ہر مسلمان ملک کا لباس دوسرے مسلمان ملک سے مختلف ہے۔ رہا قومی لباس تو پوچھ سکتا ہوں کہ ہمارا قومی لباس کیا ہے؟ اچکن جس پر پانچ سو سے لیکر ایک ہزار تک کی سلائی دینی پڑتی ہے، قراقلی ٹوپی جو گرمیوں میں پہنی نہیں جا سکتی اور ویسے بھی اس کے لئے پانچ سو اور ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ قومی لباس تو وہ ہوتا ہے جسے امیر و غریب سب پہن سکیں۔ صرف امیروں کے پہناوے کو تو قومی لباس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نقطہ نظر سے اگر کوئی لباس قومی لباس قرار پانے کا حق رکھتا ہے تو وہ قمیض شلوار ہے یا کرتہ پاجامہ ہے، جو ہر خاص و عام آسانی سے پہن سکتا ہے۔ اسے دفتروں میں رائج کیجئے گھروں میں اور

محفلوں میں پہنئے' اپنے کلچر اور ثقافت کی پہچان اور شناخت بنائیے۔ نئی نسل بھی اس میں آپ کا ساتھ دیگی۔ البتہ ٹائی اور سوٹ کو اسلام اور غیر اسلام کا مسئلہ پھر بھی نہ بنائیے کہ ایک تو یہ خدا کے ازلی اور ابدی دین کے ساتھ زیادتی ہے دوسرے یہ ہر شخص کے ذاتی ذوق اور پسند کی بات ہے اور ذاتی ذوق اور پسند و ناپسند کو شریعت بنا کر دوسروں پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔

(20ر اگست 1981ء)

(3) پھر وہی ٹائی اور سوٹ کی بحث

چندماہ پیشتران کالموں میں "مسئلہ لباس" پر جو معروضات پیش کی گئی تھیں اس پر لاتعداد خطوط موصول ہوئے اور ان کا تذکرہ ایک پچھلے کالم میں بھی ہو چکا۔

خیال تھا کہ بات ختم ہو گئی اور اب دوبارہ اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی مگر معلوم ہوتا ہے پتھر بہت بڑا تھا کہ اس کے پھینکنے سے جامد خیالات کے جوہڑ سے اب تک لہریں اٹھ رہی ہیں۔ دلیل کا جواب بے دلیل سے کیا دیا جاتا کہ وہ تو اس دیس کی ریت ہی نہیں ایک بیرونی سوغات ہے البتہ ایک عدد فتوے کا تمغہ ضرور عطا ہوا جو انشاء اللہ دارین میں سینے پر سجاوٹ کا کام دیگا۔ "جنگ" ہی میں مذہبی مسائل پر فتویٰ نگاری کرنے والے ایک بزرگ نے اس مضمون کے سلسلے میں ایک سوال کا دوسطری جواب دیتے ہوئے ازراہ تقویٰ مجھے "پڑھا لکھا گمراہ" قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں انہوں نے یہ بھی غیر ضروری رعایت برتی کہ "گمراہی" کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ "پڑھے لکھے" کا لاحقہ لگا دیا خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس کا بھی ادعا نہیں۔

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

نیرنگیٔ زمانہ دیکھیے ایک طبقے نے مجھے مُلّا سمجھا زمانہ اقتدار میں لادینی نظریات کیخلاف اپنے ہی سیاسی ہم سفروں سے جنگ لڑی اور نتیجتاً الزاموں اور بہتانوں کی فصل کاٹی اور اب ایک مسئلہ پر حرف برہنہ کہا اور

روش عام کی پیروی نہ کی تو گمراہ ٹھہرا۔ وہی بات ہوئی کہ۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میں نے اپنے مذکورہ مضمون میں جو دلائل پیش کیے تھے انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ قارئین ان سے باخبر ہیں البتہ ایک بات اس وقت کہی تھی اور اب اسے پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ اپنے مخصوص ذوق اور ذاتی پسند اور ناپسند کو دین کا درجہ مت دو کہ یہی بدعت ہے۔ آپ واسکٹ پسند کرتے ہیں اچکن پسند نہیں کرتے' شوق سے واسکٹ پہنئے مگر اچکن کو غیر اسلامی قرار نہ دیجئے۔ آپ پاجامہ زیب تن فرماتے ہیں شلوار آپ کو بھلی نہیں لگتی' کوئی بات نہیں پاجامہ پہنئے' مگر شلوار پر کفر کا ٹھپہ مت لگائیے اس طرح آپ سوٹ اور ٹائی سے مانوس نہیں تو نہ سہی اسے کبھی ہاتھ نہ لگائیے مگر خدا کیلئے جو لوگ سوٹ پہنتے ہیں انہیں کافروں کا ہم جنس مت قرار دیجئے۔ یہ بھی عرض کیا تھا کہ جو لوگ ٹائی کو صلیب کا نشان قرار دیتے ہیں وہ دلیل یا حوالہ پیش کریں اپنی طرف سے ٹائی کی تاریخ پر میں نے انگریزی زبان کی کئی کتابوں سے حوالے بھی پیش کیے تھے یہ بھی بتایا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دنیا سے رخصت ہوئے دو ہزار سال ہونے کو آئے اگر ٹائی کا تعلق عیسائیوں کے مذہبی عقیدے سے ہوتا تو یہ اس وقت سے عیسائیوں کے لباس کا جزو ہوتی مگر اسے شروع ہوئے دو سو سال بھی نہیں ہوئے اس طرح "تشبیہ اور مشابہت" کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ اس کا مفہوم محض مشابہت نہیں کسی مذہبی شعار کی مشابہت ہے۔ آنحضورؐ نے کسی قوم کے مذہبی شعار سے مشابہت اختیار کرنے کو منع فرمایا ہے اگر مشابہت کو عام معنوں میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کوئی بھی ایسی چیز اپنے لباس میں اختیار نہیں کرسکتے جو دوسری قوموں سے ہم تک پہنچی ہے۔ اسطرح تو ہماری قمیضیں' اس میں لگے ہوئے بٹن' ان کا کالر' کلائی پر بندھی ہوئی گھڑیاں' بھیڑ کا پیٹ چاک کر کے چار پانچ ماہ کے بچے کی اتاری ہوئی کھال کی قراقلی ٹوپیاں' ہمارے بوٹ اور جرابیں یہ ساری چیزیں غیروں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ آج بھی اِن پر اُن کا عمل ہے مگر عوام تو کیا علماء حضرات تک بلا تکلف ان اجزاء کو استعمال کرتے اور بوقت عبادت ان سے زینت کاری کا کام لیتے ہیں۔ ایک قابل غور بات اپنے مضمون میں یہ بھی پیش کی تھی کہ شلوار اصل میں رومی لباس ہے اسے "سراویل" کہتے ہیں۔ یہ عربوں کا پہناوا تھا۔ حضورؐ کے زمانے میں روم سے آئی تو حضورؐ نے اسے پسند کیا اور اسے شوق سے پہنا اس سے بھی ثابت ہوا کہ جو لباس ستر پوش ہو اور کسی قوم کا مذہبی شعار نہ ہو تو اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا ان نکات پر روشنی ڈالتے اور سند اور دلیل سے بات کرتے تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ اپنی رائے سے دستبردار ہونے سے مجھے کوئی تامل نہ ہوتا۔ میں ان مؤلفوں اور مصنفوں کی پیروی نہ کرتا جن کے کسی نظریہ پر گرفت ہو اور حق ان پر واضح ہو جائے تو وہ اگلے ایڈیشن سے اس نظریہ کو تو خارج اور حذف کر دیتے ہیں مگر اس کا

اعلان نہیں کرتے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ میں اہل حق کی تقلید میں اپنی رائے سے رجوع بھی کرتا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی اخلاقی ہمت اور جرأت عطا کی ہے کہ اپنے کالم میں باقاعدہ اس کا اعلان بھی کرتا مگر مفتی صاحب قبلہ تو بس دو حرفی فتویٰ لگا کر چلتے بنے!

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟

بات کرتے کہ میں لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا!

قبلہ و کعبہ سے تو "ادارہ قومی تشخص" حیدر آباد سندھ کے نگران جناب الیاس اختر انصاری ہی اچھے رہے کہ انہوں نے مذہبی یا غیر مذہبی گالی نہیں دی اپنے ایک خط میں بڑی شائستگی سے لکھا:

ٹائی صلیب کا نشان ہے یہ بات عام طور سے مشہور ہے اس سلسلے میں کوئی تاریخی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی کیونکہ کسی بھی لباس کے بارے میں تاریخی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا رواج کب اور کیوں پڑا۔ اس سلسلے میں عام طور پر مشہور روایات ہی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے میں آپ کو کچھ فوٹو سٹیٹ کاپیاں بھیج رہا ہوں جن میں ٹائی اور سوٹ کے بارے میں عرض کیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک میں یہ لکھا ہے کہ "نکٹائی کا استعمال 1790ء کے لگ بھگ پاپائے روم کے حکم سے ہوا۔"

میں نے یہ فوٹو سٹیٹ ہینڈ بل پڑھا یہ ادارہ کے صدر ڈاکٹر اختر علی صاحب کی تحریر ہے ان کے جذبے اور خیالات کی مجھے قدر ہے مگر نکٹائی پر انہوں نے بھی صرف اتنا لکھا ہے۔

"نکٹائی کا استعمال 1790ء کے لگ بھگ پاپائے روم کے حکم سے شروع ہوا 1850ء تک اسے تمام مسیحی دنیا نے قبول کر لیا اور پھر اس کا استعمال یوروپی حملہ آوروں کیساتھ برصغیر پاک و ہند سمیت تمام مسلمان ملکوں تک جا پہنچا۔"

اس ہینڈ بل سے مجھے وہ وصیت نامہ "یاد آگیا جواب ادھر کچھ عرصہ سے تو مجھ تک نہیں پہنچا' ورنہ کم و بیش ہر سال بڑے التزام سے کوئی نہ کوئی صاحب اسے ارسال فرمادیا کرتے تھے۔ اب ٹھیک الفاظ یاد نہیں مفہوم کچھ ایسا تھا کہ کسی صاحب کو آنحضورؐ کی خواب میں زیارت ہوئی ہے اور آپؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت سے کہہ دو قیامت آنے والی ہے چودہ صدی کے بعد کوئی صدی نہ ہوگی۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ گناہوں سے توبہ کرے اور اس وصیت نامہ کی سات نقلیں دوسرے لوگوں تک پہنچادے ورنہ اسے سخت خسارہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے جذبہ تو اس وصیت نامے کا بھی قابل قدر ہے لیکن مصنف نے اس کیلئے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ غلط ہے اس کیلئے آنحضورؐ کے نام کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانے میں ایک گروہ نے عذاب اور ثواب کے سلسلے میں آنحضورؐ کی ذات گرامی سے ایسی حدیثیں منسوب کیں جن

کی تغلیط اور تردید میں محدثین کرام کو بہت محنت کرنی پڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ٹائی سے نفرت دلانے کیلئے اسے پاپائے روم سے منسوب کیا لیکن سوال تو پھر وہیں کا وہیں ہے کہ اس کی سند کیا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے اسے کہاں سے اخذ کیا ہے؟ پاپائے روم نے یہ فرمان جاری کیا ہوگا تو یہ کہیں شائع بھی ہوا ہوگا۔ جب یہ مذہبی چیز ہے تو عیسائیوں کو اس کے اخفاء سے زیادہ اس کی اشاعت میں دلچسپی ہونی چاہئے۔ آخر ڈاکٹر صاحب سے یہ راز کی بات کس نے کہی؟

سرّ ازل کہ عارف و سالک بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!

....

الیاس انصاری صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ اس سلسلے میں کوئی تاریخی دلیل اس لئے پیش نہیں کی جاسکتی کیوں کہ کسی لباس کے بارے میں یہ تاریخی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا رواج کب اور کیوں پڑا اس سلسلے میں عام طور پر مشہور روایات ہی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔"

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

آپ نے ایسی بات کہہ دی جو عملی لحاظ سے سخت مضحکہ انگیز ہے لباسوں پر تو آج انسائیکلوپیڈیا تک ترتیب دے دیئے گئے ہیں۔ ٹائی اور سوٹ ان میں تبدیلی اور ترمیم واضافہ اور ان کی تاریخ پر پانچ دس نہیں بیسیوں کتابیں موجود ہیں۔ چند مشہور کتابوں کے نام اور حوالے تو انہیں میرے اسی مضمون میں مل جائیں گے جسے پڑھنے کے بعد انہوں نے یہ خط تحریر فرمایا ہے ان کے اور ان کے ہم خیال دوسرے پرجوش احباب کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ ٹائی اور سوٹ کے خلاف ضرور مہم چلائیں اس کے لئے انہیں بہت سے دوسرے دلائل مل جائیں گے لیکن ایک تو اسلام کو اس کے لئے بیچ میں نہ لائیں دوسرے دعوے ایسے کریں جس کے لئے باقاعدہ دلیل اور مستند حوالہ ان کے پاس ہو۔

....

میرے احباب اور شناسا جانتے ہیں کہ میں سوٹ بہت کم پہنتا ہوں۔ سرکاری فرائض کی انجام دہی میں کبھی کبھی مجھے یہ لباس پہننا پڑا مگر طبیعت اس سے مانوس نہیں ہوئی۔ اب بھی دوسرے ملکوں میں جانا پڑتا ہے تو اکثر بند گلے کا کوٹ پہنتا ہوں۔ جنگ میں یہ کالم چھپنا شروع ہوا تو ادارہ کو وہ فوٹو اچھا لگا جس میں ٹائی اور سوٹ ہے اس وقت سے ہی تصویر چھپ رہی ہے۔ بہت سے دوستوں نے نصیحت بھی کی کہ اسے بدلوا دو مذہبی حلقے جزبز ہونگے۔ یہاں مزاج ایسا پایا ہے کہ اور ہر عیب ہو سکتا ہے بفضل خدا منافقت سے عداوت ہے سوچا جب میں اسے غلط نہیں سمجھتا اور کبھی کبھی یہ لباس پہنتا بھی ہوں تو خلق کا خوف کیسا؟ مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ میں یہ بھول گیا ہمارا مجموعی چلن کیسا ہے؟ ہمارا حال تو وہی ہے کہ ہم بائبل کے الفاظ میں "مچھروں کو چھانتے اور اونٹوں کو سموچا نگل جاتے ہیں" آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ "غیبت زنا سے بڑا گناہ ہے۔" مگر ہم صبح آنکھ کھلتے ہی جو اس نیک کام میں مشغول ہوتے ہیں تو پھر نیند ہی آکر اس کام

میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شیخ سعدیؒ کی حکایت یاد آگئی، کہتے ہیں میں چھوٹا تھا اپنے والد ماجد کیساتھ ایک قافلے میں سرگرم سفر تھا۔ اپنے والد بزرگوار اٹھے وضو کیا مجھے بھی جگایا اور نوافل پڑھنے کی ہدایت کی۔ لوگ سوئے پڑے تھے میں نے تعمیل کی اور کہا اباجان! یہ لوگ کتنے غافل ہیں کہ نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کیلئے نہیں اٹھ رہے۔

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں اس پر میرے والد نے مجھے ڈانٹ پلائی اور فرمایا "کاش! تو سویا رہتا اور نوافل کیلئے نہ اٹھتا یہ اس سے بہتر تھا کہ تو شب بیدار ہے مگر بندگان خدا کی غیبت کر رہا ہے۔"

غیبت پس پشت کسی کو ایسے عیب سے منسوب کرنے کو کہتے ہیں جو واقعی اس میں پایا جائے یہاں تو غیبت ہی نہیں بہتان بھی روزمرہ کا معمول ہے اور اس میں بھی دنیاداروں سے زیادہ دین داروں کو لطف آتا ہے۔ اب اس فضا میں ایک بزرگوار نے میرے اس طرح کے خیالات پر مجھے گمراہ قرار دیا تو اس پر اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

زندگی کے جملہ معاملات میں تین طریقے ہیں پہلا اہل عشق و طریقت کا ہے حضرت اویس قرنیؒ کی مانند کہ غزوۂ احد میں آنحضورؐ کے دندان مبارک کی شہادت کا سنا تو اپنے تمام دانت نکلوا دیئے۔ دوسرا اہل عزیمت کا کہ مکروہ و مشکوک باتوں سے بھی بچتے اور اس میں احتیاط اور تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، تیسرا اہل رخصت کا جس میں ہم ایسے عوام کالانعام افضل طریقے کے بجائے غیر افضل لیکن جائز باتوں پر عمل کرتے ہیں پہلے دو طبقوں کی پیروی کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے جن لوگوں کو سلوک و طریقت کی منزلیں طے کرنی ہوتی ہیں وہ جائز دنیوی لذتوں سے بھی منہ موڑ لیتے ہیں، نفس کشی کرتے ہیں ان کے لباس میں سینکڑوں پیوند لگے ہوتے ہیں ان کے مسلک میں تو سوٹ 'اچکن'، گھڑی، جوتا سب دنیاداروں کی باتیں ہیں۔ ان چیزوں کو ناجائز بھی قرار دے دیں تو اس کی گنجائش موجود ہے کہ ان کا رستہ خواص کا رستہ ہے وہ مدینہ منورہ میں جوتا پاؤں سے اتارتے ہیں کہ بے ادبی کا خطرہ ہے مگر ظاہر ہے ہما شما اس کی تقلید نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اہل عزیمت ہیں کہ تصویر کو مشکوک سمجھتے ہیں نہیں کھنچواتے کسی ہوٹل میں کھانا پینا تو ایک طرف رہا بازار سے گزرنا بھی ان کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اخبار میں ان کے درس یا وعظ کی بابت کچھ چھپ جائے تو اسے بھی ریاکاری سمجھتے ہیں۔ میں اپنے ایک گزشتہ کالم میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی شخصیت پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں وہ اسی طبقے کے بزرگ تھے مگر ظاہر ہے اس کی پیروی کرنا بھی ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ عوام کیلئے تو اتنا ہی بہت ہے کہ کبیرہ اور کھلے گناہوں سے بچیں ایسے لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوٹ اور رخصت کے جو دروازے کھلے ہیں

انہیں بند کرنا اور دین کو مشکل سے مشکل تر بناتے چلے جانا دین دوستی نہیں' جدید معاشرت نے آج جو معاملات اور مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان میں کسی طبقے کا اپنی تشریحات کو قرآن و سنت کا درجہ دینا اور دوسرے نقطہ ہائے نظر کو کفر اور گمراہی قرار دے دینا بہت بڑی زیادتی بھی' حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے "الدین یسر" ...... دین آسان ہے۔ آپ اپنی خود ساختہ تشریحات سے اسے مشکل بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو یاد رکھئے آپ شارع اور شریعت ساز بننے کی کوشش کر رہے ہیں اور صاحب شریعت تو ہم صرف سرکار خاتم النبیین کو مانتے ہیں' ان کے سوا شریعت سازی کا ہر مدعی' مدعی کاذب ہے۔

....

کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے ٹائی سوٹ پہننا اہل عزیمت کا کام نہیں' یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ ملکی لباسوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور رات دن سوٹ ہی میں کسے تنے رہتے ہیں وہ غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ہیں۔ یہ بھی دلیل دی جا سکتی ہے کہ اس سے نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ پیش آتی ہے سوٹڈ' بوٹڈ آدمی کو اپنی پتلون کی کریز کا خیال رہتا ہے اور بسا اوقات وہ اس لئے سربسجود ہونے سے پہلو بچاتا رہتا ہے۔ ان ساری باتوں کی میں تائید کروں گا ہاں جو کوئی از روئے اسلام بات کریگا مذہب کو بیچ میں لائے گا' ٹائی کو صلیب کی نشانی قرار دے گا' سوٹ پہننے والے کو گناہگار اور لائق نفرت جانے گا اس کی ضرور تردید کروں گا۔ اسے خوف خدا بھی دلاؤں گا کہ اس طرح کی فتوے بازی سے وہ دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف معاشروں کے ان کروڑوں مسلمانوں کی کیوں توہین و تذلیل کرتا ہے جو جغرافیائی' موسمی اور علاقائی ضرورتوں یا بین الاقوامی رواج کے مطابق سوٹ پہنتے لیکن دل سے سچے اور پکے مسلمان ہیں۔

....

یہ نعرہ اپنی جگہ دل کش ہے کہ قومی لباس ہونا چاہئے لیکن ہمارے ہاں کے بزرجمہر تو یہی طے نہیں کر سکے کہ قوم سے مراد کیا ہے اگر قوم سے مراد "مسلمان قوم" ہے تو ہر ملک کے مسلمانوں کا لباس جدا ہے۔ عرب عبا و قبا پہنتے ہیں۔ انڈونیشین اور ملائی مسلمان دھوتی باندھتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں رہنے والے مسلمان سوٹ میں ملبوس ہیں۔ پاک و ہند کے مسلمان اچکن' پاجامہ اور شلوار سے مانوس ہیں۔ آپ ہر ملک کے مسلمانوں کو اپنے ہاں کا لباس چھوڑ کر کونسا ایک "قومی لباس" اختیار کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں؟ اور اگر قوم سے مراد پاکستانی قوم ہے تو کیا آپ کی بعض معتبر اور اب تو اقتدار میں بھی کسی حد تک دخیل بعض مذہبی جماعتوں نے پوری مسلمان قوم سے علیحدہ کسی "پاکستانی قوم" کا وجود بھی تسلیم کیا ہے؟ ایک ہے آئیڈیلزم...... صورت مثالی کی تلاش۔ یہ آئیڈیلزم تو یہی ہے کہ تمام مسلمان ایک قوم ہیں مگر اس آئیڈیلزم کے علاوہ ایک ہے حقیقت پسندی' اس حقیقت پسندی سے کام لو تو موجودہ صورتحال مختلف ہے۔ اگر تمام مسلمان ایک قوم ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ خلافت ہے اس میں الگ الگ

منطقے اور صوبے تو ہوں گے لیکن ملک نہ ہوں گے اس کی حدود میں آنے جانے کیلئے کسی مسلمان کو پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہ ہوگی' اس کی کرنسی بھی ایک ہوگی حکمران بھی ایک مگر آج صورت حال کیا ہے۔ ایران اور سعودی عرب میں مذہبی حکومتیں قائم ہیں مگر پاکستانی اس میں ویزے کیساتھ بھی مشکل سے داخل ہو سکتا ہے۔ عرب ملک مسلمان ہیں مگر ان میں سے کئی بر سر جنگ ہیں۔ عراق اور ایران دونوں کی قومیت اسلام ہے مگر اب تک دونوں لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ اس حقیقت پسندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم یہ بھی مانیں کہ آج عقیدہ کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حدود بھی قومیت کا لازمہ اور ایک اہم عنصر ہیں۔ پاکستانی قوم بھی محض مذہب سے نہیں مذہب اور اپنی سرحدوں کے آمیزے سے تشکیل میں آتی ہے۔ پہلے اس فلسفہ کو اپنے ہاں منوالیجئے پھر شوق سے قوم کی بات کیجئے اور قومی لباس کو متعارف کرانے کا بیڑہ اٹھایئے مگر ہاں اس میں یہ بھی خیال رہے کہ جاگیرداروں اور امیروں کے لباس کو قومی لباس کا درجہ نہ دیجئے گا۔ اچکن اور شیروانی بڑی اچھی پوشاک ہے مگر بڑی مہنگی ہے۔ اچکن آج کل ایک ہزار سے کم میں کیا پڑتی ہوگی۔ اسے قومی لباس بنانا ہے تو ایسا معاشی نظام بھی رائج کیجئے جس میں ہر پاکستانی یہ لباس خریدنے کی طاقت رکھتا ہو' ایسا نہیں ہو سکتا تو قمیص شلوار یا پاجامہ پر قناعت کیجئے اسے قومی لباس کی حیثیت سے رائج کرنے کا پروگرام بنایئے مجھ ناچیز کی دعائیں اور زبان و قلم کی جملہ توانائیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

(3 دسمبر 1981ء)

....

(4) منظور ہے گزارش احوالِ واقعی!

حسب معمول اس مرتبہ پھر دو ماہ ملک سے باہر گزرے کالم میں باقاعدگی رہی اس لئے احباب نے یہی تاثر لیا کہ میں ملک ہی میں ہوں وہ نوازش نامے لکھتے رہے اور اکثر نے جوابی لفافہ بھی ارسال کیا مگر ظاہر ہے یہاں سے جواب نہیں جاسکتا تھا۔ ابھی پہلی ہی ڈاک صاف نہیں ہوئی تھی کہ ایک انبار اور جمع ہو گیا۔ اب انہیں پڑھنے اور چھانٹنے اور ان کا جواب بھجوانے میں چند دن لگ جائیں گے جہاں اتنی دیر ہوئی وہاں کچھ تاخیر اور سہی۔ یہ سطور اس لئے لکھ دی ہیں تاکہ قارئین اپنے خطوط کا جواب نہ پاکر اسے کسی بداخلاقی پر محمول نہ کریں...... ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا...... آئندہ کوشش کروں گا کہ باہر جاؤں تو کالم میں اس کا تذکرہ بھی کردوں اس طرح "مشاہدات و تاثرات" کے نتیجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے والے کرمفرما میرے احوال و کوائف سے باخبر رہیں گے اور خطوں کا جواب نہ پاکر انہیں کوئی بدگمانی اور بدمزگی نہیں ہوگی۔

....

اب تو اس سلسلے کو ڈیڑھ دو سال ہو گئے۔ قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ میں بحث برائے بحث کا قائل نہیں اپنا نقطہ نظر واضح کر دیتا ہوں۔ "تلخ و شیریں" ہر قسم کے مراسلے میں نے شائع کئے ہیں۔ مخالفین کا ذکر بھی ادب و احترام سے کیا ہے۔ مرحومین کیلئے خاص طور پر احتیاط برتی کہ ان کے اچھے ہی پہلو سامنے آئیں۔ ذاتی خامیاں اور عیب کس میں نہیں مگر ان کا تذکرہ وہ کرے جو خود ان سے پاک ہو' ایک زمانہ تھا

جب آتش جواں تھا تو صحافیانہ معرکے بھی لڑے قلم کو نیزہ بھی بنایا' نثر و نظم میں ہجو گوئی بھی کی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا مگر آہستہ آہستہ مختلف تجربات اور ادوار سے گزرنے' بزرگوں کا فیض محبت پانے اور دنیا دیکھنے کے بعد رنگ طبیعت ہی کچھ اور ہے اور اب تو گالی دینے والے کیلئے دعا نکلتی ہے اور کانٹے بکھیرنے والے کیلئے بھی پھول نچھاور کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب "مولوی" اور "مولانا" "حضرت" اور الحاج" کے لاحقے اور سابقے اچھے لگتے تھے مگر جب سے "خاک مدینہ و نجف" آنکھوں کا سرمہ بنی ہے ان ریاکاریوں اور ظاہر داریوں سے دل بے زار ہے' جب ذہنی کیفیات یہ ہوں تو ایسے میں ذاتیات کے دنگل میں لنگر لنگوٹ کس کر کودنے کا کیسے شوق ہو سکتا ہے کئی مہربان دعوت مبارزت دیتے ہیں مگر میں خود ہی کنی کاٹ جاتا ہوں' ایک ایسا ہی "للکارا" اب کے "جنگ" ہی کے صفحات میں نظر سے گزرا۔ لکھنے والے سید قمر الحسن تھانوی ہیں ظاہر ہے حضرت مولانا ہوں گے' "اس مسٹر اور اس شخص" یعنی کوثر نیازی کو انھوں نے خوب خوب کوسا ہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے یہ پڑھ کر مجھے بہت دکھ ہوا کہ میرے کالم پڑھ پڑھ کر وہ خون کے گھونٹ پیتے رہے شاید اسی خون کی قے اب کے انھوں نے اپنے اس مضمون میں کر دی۔ تبھی تو یہ خوبصورت اور رنگین لفظوں کے گل بوٹے عجب بہار دے رہے ہیں۔

....

میں اس مضمون کا کوئی نوٹس نہ لیتا اگر یہ جنگ میں اس اہتمام کے ساتھ چھپ کر لاکھوں قارئین میں بعض غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب نہ بنتا۔ میں مضمون نگار کی ذات پر تو اپنے مسلک کے مطابق کچھ نہ کہوں گا۔ وہ میرے لئے اجنبی ہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے برادر نسبتی ہیں اس تعلق سے وہ میرے لئے قابل احترام ہیں ہاں ان کے اٹھائے گئے نکات پر...... اگر انہیں نکات کہا جا سکتا ہے...... اپنے دفاع میں ضرور کچھ عرض کروں گا اور وہ بھی آخری بار............ اس کے بعد گریبان پر کسی بزرگ نے ہاتھ ڈالا بھی تو اس کی دھجیاں انہی کی نذر کر کے اپنی راہ لوں گا۔ آخری بار اس دفاع کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتا اگر ناواقفان حال کے بارے میں یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ سوئے ظن کا شکار ہو جائیں گے اگرچہ مضمون کی زبان اور اس کا لب و لہجہ خود چیخ چیخ کر اپنے غیر علمی اور غیر اخلاقی ہونے کا اعلان کر رہا ہے اور شاید ہی کوئی سنجیدہ اور غیر جانب دار آدمی اس کا اچھا تاثر لے لیکن پھر بھی اتمام حجتؒ کیلئے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں

انداز بیان گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

....

اب اس سے کیا تعرض کروں کہ حضرت مولانا مجھ سے اس بات پر ناراض ہیں کہ "میں نے برے

وقت میں بھٹو مرحوم کا ساتھ چھوڑ دیا" خدا جانے! ان پر یہ القا کیسے ہوا کہ میں نے ان کا ساتھ چھوڑا! اگر بعض حضراتِ علماء کو سیاسی معاملات و مسائل سے کماحقہ واقفیت نہیں تو وہ اس میں دخل کیوں دیتے ہیں؟ یہ سوال وہ لوگ مجھ سے کریں جو حکومت سے پہلے بھی میری طرح جناب بھٹو مرحوم کے ساتھی تھے تو کوئی بات بھی ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ سوال ایک ایسے بزرگ کی طرف سے ہے جن کا پورا خانوادہ بھٹو صاحب کے بر سر اقتدار آنے سے پہلے ان پر کفر کے فتوے لگا رہا تھا لیکن جب وہ تخت نشین ہوئے تو وہی ان کے گن گانے لگا۔ میں اس میں بھی ان کی نیت پر حملہ نہیں کرتا یقیناً یہ علماء بر سر اقتدار پارٹی میں ہونے والے اسلام اور سوشلزم کی کشمکش میں اپنا وزن اسلامی طاقتوں کے پلڑے میں ڈالنا چاہتے ہوں گے مگر سوال تو برے اور اچھے وقت کا ہے اس سے برا وقت، بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی پر کیا آیا ہو گا کہ ان پر کفر کے فتوے لگ رہے تھے اور بعض علماء اس کے کارکنوں کی نماز جنازہ پڑھانے سے بھی انکاری تھے ایسے میں یہ عاجز ہی تھا جس نے اس برے وقت میں، بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی کا ساتھ دیا اور اس بنا پر دیا کہ معاشی انصاف کے نعرے کی وجہ سے محض لفظی کھینچ تان میں لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج نہ ٹھہراؤ اسی جدوجہد میں مجھے پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی حکومت بنی تو خدا کے فضل و کرم سے میں نے کوئی ظلم نہیں کیا کسی کا حق نہیں مارا، کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ بساط بھر اسلامی قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ میں حکومت کے سارے شعبوں کا انچارج نہ تھا، میرے پاس جو محکمے تھے ان کی کارکردگی کیلئے جواب دہ تھا، ریڈیو پاکستان کے غریب ملازمین کے مطالبے پر میں نے ریڈیو کارپوریشن بنوائی ان لوگوں سے پوچھئے انہیں اس کا کتنا فائدہ ہوا۔ ریڈیو، ٹی وی اور پاکستان نیشنل سنٹرز سے عربی کے فروغ کا کام لیا فلموں میں فحاشی کے انسداد کی کوشش کی۔ وزارت مذہبی امور کے نام سے نئی وزارت قائم کرائی۔ اس کے تحت انٹرنیشنل سیرت کانگریس، امام کعبہ اور امام مسجد نبوی کے دورے قرآن حکیم کی غلطیوں سے پاک طباعت رویت ہلال کا انتظام، اوقاف کی تنظیم اور خطیبوں کی معاشرے میں عزت، قرعہ کے بغیر لاکھوں حاجیوں کی ترسیل وغیرہ کے جو کام ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی توفیق و طاقت مجھے عطا فرمائی۔ آئین میں خلاف اسلام کوئی بات نہیں آنے دی ان سارے کاموں کے عوض پارٹی کے غیر اسلامی عناصر نے میرے خلاف جو سازشیں کیں میری کردار کشی کی جو ملک گیر منظم مہم چلائی گئی، اسے میں جانتا ہوں یا میرا خدا، بہر حال یہ تو ایک طویل جملہ معترضہ تھا عرض یہ کر رہا تھا کہ برے وقت میں، بھٹو صاحب کا میں نے ساتھ دیا تھا آپ نے نہیں، مارشل لاء لگا تو پارٹی میں طریق کار پر جو اختلافات پیدا ہوئے وہ سب کے سامنے ہیں، کیا مولانا چاہتے ہیں کہ میں تشدد اور غیر قانونی کارروائیوں میں بھی ایک فیملی کی غلامی کرتا؟ میں بھی غیر ملکی طاقتوں کا آلۂ کار بن جاتا؟ میں بھی ہوائی جہازوں کے اغوا اور الذوالفقار کے قتل و غارت کے منصوبوں کی تائید کرتا؟ کیا سیاسی رفاقت اور دوستی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اندھی غلامی اختیار کر کے اور ملک و ملت اور نظریہ و عقیدہ کو بھی پارٹی پر قربان کر دے؟ حضرت مولانا کو مغالطہ ہے کہ میں نے پارٹی کو چھوڑا ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ جب بھٹو مرحوم کی فیملی نے پارٹی کی سابقہ متوازن پالیسی بدل کرائے

انتہا پسند بائیں بازو کی دہشت پسند تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا تو خود بھٹو صاحب کی بیگم نے مجھے پارٹی سے نکالنے کا اعلان کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ پارٹی سے میرے اخراج کا اعلان نہ تھا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ہمارا آئندہ طریقہ اسلامی عناصر کو ساتھ لیکر چلنا نہیں ہو گا۔ اب ہماری منزل تخریب 'انتقام' آگ و خون اور سائنٹفک سوشلزم کی منزل ہے۔ میں نے اس یکطرفہ اعلان کے باوجود کسی دوسری پارٹی میں شمولیت نہ کی۔ پارٹی میں موجود اپنے احباب ور فقاء کے تعاون سے اسی نام سے ایک گروپ تشکیل دیا میں نے اپنے طریقہ پر بھٹو صاحب کو بچانے کی کوشش کی۔ اگر میرا راستہ اختیار کیا جاتا تو نہ پارٹی تباہ ہوتی نہ بھٹو صاحب کی جان جاتی اور نہ ملک میں یہ تخریب کاری ہوتی۔ اس سارے عمل کو اگر حضرت مولانا برے وقت میں ساتھ چھوڑنا کہتے ہیں تو میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

....

حضرت مولانا کا دوسرا فرمودہ یہ ہے کہ میں نے بعض مرحوم علماء پر جو کالم لکھے ہیں ان میں خواہ مخواہ ان سے تعلقات بگھارے ہیں اس سلسلے میں بطور مثال انہوں نے اپنے قریبی عزیز حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مولانا احتشام الحق تھانوی" کے متعلق اس شخص نے اپنے اخبار الشہاب میں جو خرافات لکھی تھیں وہ بھی ابھی قارئین کو یاد ہوں گی۔ ان سے بھی اپنے خصوصی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے۔"

میں نے بعض مرحوم اکابر پر اپنی ذاتی معلومات کی روشنی میں جو مضامین لکھے ہیں وہ قارئین کے مطالعہ سے گزر چکے ہیں میں نے ان میں انہی کی عظمت اور بڑائی کے پہلو اجاگر کیے ہیں اپنی تعریف نہیں کی۔ میں چاہتا تو ہر مضمون کو ان لاتعداد مکاتیب سے بھی سجا سکتا تھا جو یہ اکابر مجھ حقیر کو وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں مگر ان میں بعض ایسی تخن گسترانہ باتیں تھیں کہ چھپتیں تو ان کی اشاعت شاید مناسب نہ ہوتی مگر اب جب کہ حضرت مولانا نے ان تعلقات کو بلا دلیل اور بلا علم چیلنج کیا ہے اور حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کا نام بطور مثال پیش کیا ہے تو مجبوراً اس سنگین الزام کی صفائی میں مجھے ان کے دو گرامی ناموں کا عکس اس کالم میں دینا پڑ رہا ہے۔ قارئین انہیں پڑھ کر اندازہ لگالیں کہ حضرت مولانا مرحوم اور میرے تعلقات کا عالم کیا تھا۔ دونوں خطوں کا متن یہ ہے۔ (اخباری کالم میں باقاعدہ عکس شائع ہوئے تھے)

1۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

محب گرامی قدر م نیازی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدتیں ہو گئیں بیٹھ کے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دل کے مسودے دل

ہی میں جمع ہور ہے ہیں۔ کبھی کبھی اسے یہ کہہ کر سمجھ لیتا ہوں۔ ؎

یہ تو نہیں کہ عرض غم درخور اعتنا نہیں
عالم حسن کو مگر فرصت ماسوا نہیں!

ہسپتال میں آپ نے میری عیادت فرما کر اہل علم کی قدر شناسی کا اعلیٰ کردار ادا کیا ہے حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے ہلال کمیٹی کو بقول جعفری محمود احمد رضوی نے حرام کمیٹی بنادیا۔ ہمارے سیکرٹری ہاشمی کے پاس بھی اس جن کو قابو میں لانے کا کوئی نسخہ ہے؟ وہ ضرور ہنگامہ کرائے گا کوئی منتر سوچ کے رکھئے۔

ملکی اور قومی پریس اسلام کا پاس تو کیا کرتا خود ملکی اور قومی مقاصد کی پبلسٹی میں یا وزیراعظم کے اقدامات کو بڑھانے میں بھی ناکام ہے یہ مسئلہ لاینحل ہے وزیراعظم صاحب سے اس لئے نہیں کہا کہ آپ سے مشورہ نہیں ہوا۔ معلوم نہیں مصلحت ہے کہ نہیں، تبلیغی دورے کے ضروری واقعات آپ کے علم میں لانے بھی ضروری تھے جو ابھی تک نہیں پہنچائے جاسکے ہر حال میں ہمہ ساعت منتظر ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ کراچی میں فرصت نہ مل سکے تو میں اسلام آباد میں تخلیہ میں بات کر سکوں۔ اچھا خدا حافظ

والسلام

احتشام الحق تھانوی

14-9-75

2۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم گرامی قدر مولانا کوثر نیازی صاحب السلام علیکم

میں کیمبل پور سے واپسی پر صرف آپ کی ملاقات کیلئے 3، 4 نومبر کو پنڈی ٹھہرا تھا مگر آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی اور اگلے روز جمعہ کی وجہ سے میں قیام نہیں کر سکتا تھا۔ محروم واپس ہونا پڑا۔ یہ شعر پڑھتا ہوا واپس آیا۔ ؎

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

مولانائے محترم! آپ کی غیر معمولی مہربانیوں نے احقر کو جری اور بے باک بنادیا ہے اس لئے معروضی ہوں کہ میرے منجھلے فرزند اور ان کے ایک رفیق خدمت میں اس لئے حاضر ہیں کہ ان کے پاس ہوائی جہاز سے جانے والے حجاج کی ایک بڑی تعداد جن کو ویزوں کی ضرورت ہے اگر میری خاطر آپ یہ مہربانی فرمائیں گے تو میں آپ کا

ممنون ہوں گا

والسلام،

احتشام الحق تھانوی

5-11-76

خطوط اور بھی ہیں اور جن بزرگوں پر میں نے ذاتی تعلق کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے ان سب بزرگوں کے ہیں میرے لئے یہ گرامی نامے تبرکات کے درجے میں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں عام کروں صرف دیگ سے یہ دو دانے بطور نمونہ حضرت مولانا کے اطمینان اور ضیافت طبع کے لئے ان کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔

امید ہے ان کے مطالعہ کے بعد وہ خون کے گھونٹ پینے بند کر دیں گے اور مجھ حقیر پُر تقصیر کو اپنے مرحوم برادر نسبتی کا دوست سمجھ کر اپنا سمجھیں گے اور کار لائقہ سے سرفراز فرمائیں گے۔

حضرت مولانا کا تیسرا فرمودہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا محمد شفیع مرحوم کے ان فتووں سے متعلق ہے جو انہوں نے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے جواز اور عدم جواز پر دیئے تھے یہ ایک علمی بحث ہے اس لئے قدرے تفصیل طلب، زیر نظر کالم میں اس کی سمائی ممکن نہ ہو گی اس لئے صحبت آئندہ پر اٹھا رکھتا ہوں، تب تک کے لئے حضرت مولانا اور قارئین سے اجازت طلب ہوں، خدا حافظ

(17، دسمبر 1981ء)

علمائے کرام کی خدمت میں

پچھلے دنوں اس کالم میں لباس کے مسئلے پر جو معروضات پیش کی گئی تھیں ان میں نئے دور کے بعض نئے مسائل کے ضمن میں حضرت علمائے کرام کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی گئی تھی کہ وہ ان پر اپنے فتووں کو نص قرآنی کا درجہ نہ دیں۔ اپنی تشریحات سے اختلاف کرنے والوں کو ضال ومضل اور کافرو فاسق نہ ٹھہرائیں، جو چیزیں پہلے زمانے میں نہ تھیں انہیں حرام اور ناجائز قرار دینے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کرلیں۔ ٹائی کے بارے میں عرض کیا تھا کہ آپ کی یہ معلومات غلط ہیں کہ یہ صلیب کی نشانی ہے آپ بے شک ملکی اور قومی لباس پہنیں، اس کی حوصلہ افزائی کریں (اور حکومت نے اس سلسلے میں ابھی حال ہی میں سرکاری ملازمین کو جو ہدایات دی ہیں میں دل سے ان کی تائید کرتا ہوں) لیکن دنیا کے مختلف علاقوں میں رہنے والے ان لاکھوں مسلمانوں کو محض سنی سنائی بات کی وجہ سے "صلیب پوش" نہ قرار دیں جو ٹائی اور سوٹ کو بین الاقوامی پوشاک کی حیثیت میں پسند کرتے اور استعمال کرتے ہیں اس طرح ایک تو آپ "ایجاد بندہ" سے پیروئ دین کو خواہ مخواہ مشکل اور دشوار بنا دیتے ہیں دوسرے باخبر اور تعلیم یافتہ نئی نسل ان ادھوری معلومات کا مضحکہ اڑاتی ہے جن کا اظہار آپ کی جانب سے ان مسائل پر رائے زنی کرتے وقت کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بتایا تھا کہ شروع شروع میں جدید معاشرت کی ہر نئی بات بعض اکابر علماء کو مشکوک نظر آئی مگر یہ ان کا تقویٰ اور شان احتیاط تھی کہ انہوں نے پوری پوری تحقیق کی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی وہ معلومات صحیح نہیں جن پر انہوں نے فتویٰ صادر کیا تھا تو انہوں نے اس فتوے سے

رجوع کر لیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ ان کی پہلی رائے صحیح نہ تھی اس سلسلے میں میں نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتوے کا حوالہ دیا تھا اور عرض کیا تھا کہ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ لاؤڈ اسپیکر میں آواز تبدیل ہو جاتی ہے یہ بولنے والے کی اصل آواز نہیں ہوتی اس کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ نماز میں اس کے استعمال کو ناجائز قرار دیا تھا۔ ان کے شاگرد رشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم نے تحقیق مزید کے بعد اس سے اختلاف کیا اور حضرت تھانویؒ نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا۔

کراچی کے مولوی قمرالحسن صاحب نے جن کے ذاتی حملوں پر کچھ گزارشات پچھلے کالم میں پیش کی جا چکیں۔ لاؤڈ اسپیکر کے جواز اور عدم جواز کے فتوؤں کی داستان کو "ایک بے سروپا اور خود ساختہ افسانہ قرار دیا ہے۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے حضرت تھانویؒ کی "توہین کی ہے" اور مفتی محمد شفیع پر "افترا باندھا ہے"۔ میں نے سنی سنائی بات بیان کی ہے اس لئے "کاذب اور جھوٹا" ہوں۔ قطع نظر اس کے کہ مولوی صاحب نے اس عاجز کے بارے میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ سب سنی سنائی ہیں اس کے باوجود میں انہیں دروغ گو کہنے کے لئے تیار نہیں۔ اس انداز کلام کے لئے بھی میں انہیں معذور سمجھتا ہوں۔ مذہبی حلقوں میں بدقسمتی سے ایک عرصہ دراز سے مناظروں کی جو فضا قائم ہے اس میں یہ طرز گفتار اب روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ میں قبلہ و کعبہ کی خدمت میں نہایت ادب سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اخبار بین طبقے کی سہولت کے لئے ایک لمبی چوڑی فقہی بحث کو جن دو چار سادہ جملوں میں سمیٹ کر پیش کرنے کی جسارت کی تھی وہ سنی سنائی بات نہ تھی اس کا پورا ریکارڈ مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم کی کتاب "آلۂ مکبّر الصوت کے شرعی احکام" میں موجود ہے۔ جس کا پہلا ایڈیشن آج سے 43 سال پہلے منظر عام پر آیا اور تیسرا ایڈیشن پاکستان میں "ادارۃ المعارف کراچی" نے 1381ھ میں آج سے تقریباً بیس سال قبل شائع کیا تھا اس کے مقدمہ طبع ثالث میں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ

"جب یہ رسالہ پہلے پہل شائع ہوا تھا تو اس وقت لاؤڈ اسپیکر کی پوری حقیقت سامنے نہیں آئی تھی اس لئے:۔

> "اس میں اس آلہ کے نماز میں استعمال کی ممانعت کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ جو نماز اس کی مدد سے ادا کی جائے وہ نماز فاسد ہے" (صفحہ 3)

لیکن جب رسالہ کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو حضرت مفتی صاحب اس وقت تک مزید تحقیقات کے نتیجے میں اپنا فتویٰ بدل چکے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا۔

"اس میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس آلہ کی اصلی آواز ہے یا اس کا عکس یا شبیہ اور چونکہ اس مسئلہ کا تعلق سائنس جدید سے تھا پہلی مرتبہ بھی مسئلہ کا حکم لکھنے کے وقت

اس معاملہ کی تحقیق اس وقت کے محدود وسائل کی حد تک کرلی گئی تھی۔ اس مرتبہ پاکستان میں اس تحقیق کے زیادہ مواقع فراہم تھے ان سے بھی کام لیا گیا۔ جدید تحقیقات کے نتیجے میں یہ ظاہر ہوا کہ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) سے سنی ہوئی آواز متکلم کی اصلی آواز ہوتی ہے جس کی وجہ سے فسادِ نماز کے حکم کی اصل بنیاد ہی منہدم ہوگئی"۔ (ص 3)

"لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے نماز فاسد ہو جاتی ہے"۔ یہی فتویٰ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بھی تھا (صفحہ 26) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس سے پہلے ہی نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی ممانعت کا فتویٰ دے چکے تھے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ

"مولانا مدنی کے اس فتوے کی بنیاد یہ مفروضہ تھا کہ لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہونے والی آواز اصل آواز نہیں ہوتی۔ حضرت تھانوی نے اس امر کی تحقیق کے لئے جن تین سائنس ٹیچروں کو خط لکھے ان میں ایک ہائی اسکول کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب بھی تھے۔ ان جوابات میں چونکہ اختلاف پایا جاتا تھا اس لئے آپ نے اپنا فتویٰ قائم رکھا۔ البتہ اس کی انہوں نے صراحت فرمادی کہ آئندہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو جائے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدائے بازگشت نہیں ہوتی، اصل آواز ہوتی ہے تو اس صورت میں ان کا فتویٰ بدل جائے گا یعنی اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی (تلخیص از صفحہ 27، 28)

حضرت مفتی صاحب نے اپنی اس تالیف میں نماز میں لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کے مسئلے پر اپنی اور اکابر علماء کی آراء کی جو تفصیل بیان کی ہے مجھے معلوم نہیں اس کا خلاصہ بیان کرنے میں مجھ سے کون سا توہین آمیز اقدام ہوا تھا کہ مولوی صاحب قبلہ نے مجھ غریب کو اتنی جلی کٹی سنادی ہیں "مشاہدات و تاثرات ایک صحافیانہ کالم ہے اس میں کسی علمی مقالے کا ٹھوس اور بھاری بھر کم انداز نہیں اپنایا جاسکتا۔ میں نے اخبار بین طبقے کے لئے ساری بحث کو دو چار جملوں میں سمو کر پیش کر دیا تھا، فرمایا جائے کہ اس میں مفتی محمد شفیع مرحوم پر کون سا افتراء ہے؟ کیا انہوں نے رسالہ مذکور کے مقدمہ میں یہ نہیں لکھا کہ

"اس کے علاوہ دوسری فقہی وجوہ ایسی بھی سامنے آئیں کہ اگر یہ اصلی آواز نہ ہو بلکہ مصنوعی تب بھی فساد نماز کا حکم نہیں ہونا چاہیے"۔

اس میں حضرت تھانوی کی توہین کا کون سا پہلو ہے؟ کیا انہوں نے اپنے فتوے میں خود ہی اس امر کی گنجائش نہیں رکھ لی تھی کہ تحقیقات کے نتیجے میں اگر صورتحال مختلف ہوگئی تو ان کا فتویٰ بدل جائے گا؟

جب مفتی محمد شفیع مرحوم کی تحقیقات کے نتیجے میں صورت حال کا مختلف ہونا پوری طرح ثابت ہو گیا تو اس سے حضرت تھانوی کی جلالت شان میں کون سا فرق واقع ہو گیا؟ کیا آئمہ کرام اور علمائے حق نے کبھی اپنی رائے میں تبدیلی اور ترمیم نہیں کی؟ کبھی اپنا فتویٰ نہیں بدلا؟ کبھی کسی مسئلہ سے رجوع نہیں کیا؟

حضرت تھانوی کی تفسیر قرآن "بیان القرآن" ہی کو لے لیجئے کیا انہوں نے اس کے دوسرے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت "مقامات اشتباہ" میں "جابجا مناسب ترمیم" نہیں کی؟ کیا ان مقامات کا ایک بڑا حصہ "ترجیح الراجح" کے نام سے شائع نہیں ہو چکا؟ یہ باتیں تو حق والوں کی شان اور ان کی بے نفسی کی پہچان ہیں انہیں ان کی توہین قرار دینا در حقیقت خود علم اور اہل علم کی توہین ہے۔

میں علمائے حق کا خادم ہوں اور ان کی خدمات کا دل وجان سے معترف، خود برصغیر میں ان نفوس قدسیہ نے انگریزی سامراج کے خلاف جو تاریخ آفرین جدوجہد کی ہے وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے سرمایہ افتخار ہے ان بوریا نشینوں نے مشکلات کی آندھیوں میں اپنے خون جگر سے جو چراغ روشن کئے ان کی ضیاء سے آج بھی موجودہ نسلوں کی محراب زندگی منور ہے، معاصرانہ اختلافات ان میں بھی تھے لیکن باہمی احترام کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا تھا ان کے دل فراخ تھے ان میں رواداری کا جذبہ پایا جاتا تھا مگر افسوس زندگی کے دوسرے تمام گوشوں کی طرح آہستہ آہستہ ملت دینی اور روحی اعتبار سے بھی زوال کا شکار ہے پہلے مسلمان بھائی کی دلداری اصل دین تھی اب اس کے جذبات کی جراحت اور پھر اس پہ نمک پاشی فریضہ ایمانی ہے، اہل حق اب بھی موجود ہیں مگر اس فضا سے دل برداشتہ اور گوشہ گیر، محراب و منبر سے الاماشاءاللہ جو آوازیں اٹھ رہی ہیں ان سے دل توڑے تو جاتے ہیں جوڑے نہیں جاتے۔ کفر کے فتووں کی سوغات عام تقسیم ہوتی ہے لیکن نوجوان نسل کے دل پر جو گھاؤ ہیں انہیں کوئی نہیں دیکھتا۔ ایک غریب خاندان کا نوجوان اول تو تعلیم کے اخراجات ہی برداشت نہیں کر سکتا۔ اخراجات کا جوں توں کر کے انتظام بھی کر لے اسے داخلہ نہیں ملتا۔ درس گاہوں میں غریب اور امیر کا اب بھی امتیاز موجود ہے۔ لاہور میں ایک "چیفس کالج" ہے انگریز نے اسے روسا اور جاگیرداروں کے صاحب زادوں کے لئے قائم کیا تھا۔ مقصد نام ہی سے ظاہر ہے یہ بڑوں اور سرداروں کا کالج ہے۔ اخراجات اتنے ہیں کہ غریب کا بچہ دور سے اس کے پھیلے ہوئے سرسبز میدانوں اور اس کی عالی شان بلڈنگ کو دیکھتا ہے اور دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔

اس طبقاتی تعلیم کی مار کھا کر کوئی غریب جوہر قابل ڈگری بھی لے تو ملازمت کے لئے کوٹہ سسٹم، کسی بڑے آدمی کی سفارش اور طرح طرح کے دوسرے مرحلے ہیں۔ یہ کالجوں کی صورت حال ہے۔ دینی درس گاہوں کا حال اس سے ابتر ہے یہاں سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کے لئے تو کوئی باعزت ذریعہ معاش سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس غیر منصفانہ سماجی اور معاشی نظام کی زد میں ٹھوکریں کھانے والی نسل کو مذہبی راہنما ہیئر اسٹائل، ٹائی سوٹ اور شیعہ سنی، بریلوی، دیوبندی موضوعات پر وعظ پلاتے ہیں تو وہ

مذہب سے اور دور ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے علمائے کرام! وقت کی رفتار کا جائزہ لو، تبدیلی کی لہریں تمہاری فصیلوں سے ٹکرا رہی ہیں مسلم معاشروں میں عدل و انصاف کے قیام کی جدوجہد کرو اس کے لئے آواز اٹھاؤ۔ انبیائے کرام کی تشریف آوری کا ایک اہم مقصد خود آیات قرآنی کے مطابق عدل و قسط کا قیام تھا۔ پرانی نسل اپنا وقت گزار چکی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے جو نسل جوان ہوئی ہے اس کے حصے میں محرومیوں اور ناانصافیوں کے سوا کچھ نہیں آیا وہ ہم آپ سب سے بڑھ کر خدا اور مصطفےٰ کی نام لیوا ہے ان کے ظاہر پر نہ جاؤ ان کے باطن کو دیکھنے کی کوشش کرو، اسلام کے لئے ہر مرحلے پر قربانی اسی نوجوان نسل نے دی ہے مگر یہ نسل پڑھی لکھی ہے جدید علوم نے اس کی نظر میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ ٹیلی ویژن اور سینما نے جہاں اسے مفاسد دیئے ہیں وہاں دنیا بھر میں ہونے والے نت نئے تجربات اور واقعات کی آگہی بھی عطا کی ہے وہ ترجیحات کا صحیح تعین چاہتی ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر منطقی استدلال کی خواہاں ہے اسے ہر دعوے کی دلیل درکار ہے۔ وہ رواداری اور فراخدلی کی طلب گار ہے اس کی نظر میں مسائل کے پہاڑ ہیں وہ خزف ریزوں اور کنکروں کی سوداگری سے بے زار ہے۔

عالمی حالات کے پس منظر میں آج ملت اسلامیہ پر ادبار کی جو گھٹا چھائی ہے کبھی نعرے بازی اور مدعیانہ خوش فہمیوں کے خول سے نکل کر اسے بھی دیکھنے کی کوشش کرو۔ پندرہویں صدی ہجری کے جشن منانے والو! اتحاد عالم اسلامی کا منظر مراکش کی سربراہ کانفرنس میں دیکھ لیا؟ خود ہمارا ملک جس طرح آہستہ آہستہ اغیار کے عزائم بد کا ہدف بنتا جا رہا ہے اس کا بھی جائزہ لیا؟ ایسے میں اتحاد ملی اور عدل اجتماعی کی جو ضرورت ہمیں آج ہے کیا اس پر بھی کسی دلیل کی حاجت ہے؟ مگر ہم کہاں کھڑے ہیں؟۔ شیعہ سنی مسلمانوں کے دو مکتب فکر ہیں۔ فرقہ بندی کی اغیار لاکھ داستانیں گھڑ لیں لیکن اسلام کے دو بنیادی مکتب فکر شروع ہی سے چلے آ رہے ہیں نہ شیعہ سنیوں کو ختم کر سکتے ہیں نہ سنی شیعوں کو، کفر و الحاد کے نزدیک دونوں اسلام کے نام لیوا ہیں۔ اپنے ملک میں انہیں ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی ضرورت ہے یا ایک دوسرے سے دور تر کرنے کی؟ مگر ہو کیا رہا ہے ابھی پچھلے دنوں ایک دین دار مفسر نے اخباروں میں اشتہار دیا ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے مگر کب؟ 7 محرم کو؟ ہو سکتا ہے ان کے نزدیک محرم میں شادی جائز ہو مگر فرض اور واجب تو نہ تھی؟ اس کے مقابلے میں اس سے لاکھوں مسلمانوں کے جذبات اگر مجروح ہوتے ہیں تو ان کا احترام اور لحاظ تو شریعت اسلامی کی رو سے فرض اور واجب تھا؟ میں تو دسمبر کے پہلے عشرے کے طلوع ہوتے ہی قدر تا سوگوار اور مجہور ہو جاتا ہوں کہ اس میں میرا بیٹا مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ اگر اہل دل عشرہ محرم کی آمد پر۔ جس میں فرزند رسولؐ اور خانوادۂ رسولؐ پر قیامت گزر گئی، شادی بیاہ کی تقریبات کو جراحت جاں کا سامان سمجھتے ہیں تو ان پر اعتراض کیسا؟ اور بفرض محال کسی کے نزدیک یہ جذبہ دور از کار بھی ہو تب بھی عشرۂ محرم کی شادی کسی سنت رسولؐ کا احیاء تو نہیں کہ اس کے لئے اسلامی اتحاد جیسے بنیادی فریضے کی بھی قربانی

دے دی جائے؟

اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ آج قوم کو ان علماء کی ضرورت ہے جن کے دل اسلامی تصوف کی روح سے سرشار ہیں۔ ہمیں رحل کی چوب ہائے خشک درکار نہیں ہیں۔ ہم دل زندہ رکھنے والے صاحبان معرفت کے حاجت مند ہیں، حضرت سلطان العارفین حضرت باہوؒ کا ایک غریب لوہار مرید قینچی بنا کر لے گیا۔ آپ کی خدمت میں اس کا ہدیہ پیش کیا آپ نے اسے لوٹا دیا فرمایا سوئی لے کر آؤ۔ سوئی آئی اسے قبول فرمایا۔ مرید نے عرض کیا قینچی لوٹا کر سوئی رکھنے کی حکمت؟ فرمایا میں کاٹنے کے لئے نہیں پاٹنے کے لئے آیا ہوں، توڑنے کے لئے نہیں جوڑنے کے لئے آیا ہوں اور پھاڑنے کے لئے نہیں سینے کے لئے آیا ہوں۔

علمائے عظام! تلخ نوائیاں بہت ہو چکیں اب فضا میں شیرینیاں بکھیرنے کی ضرورت ہے، لوگوں کو کافر نہ بناؤ مسلمان بناؤ۔ اختلاف کرنے والوں کو گالیاں نہ دو ان پر ذاتی حملے نہ کرو، ان کے گریبانوں سے نہ کھیلو انہیں دردمندی اور دل سوزی سے سمجھاؤ، چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو مدار کفر و ایمان نہ ٹھہراؤ، بنیادوں کی فکر کرو، نفس اسلام پر ہونے والی یلغار کا مقابلہ کرو، فرقہ وارانہ مسائل پر جھگڑے نہ اٹھاؤ۔ بقول حضرت زکی کیفی مرحوم ؎

اٹھو کہ گھوم رہے ہیں خزاں کے ہرکارے
چمن بچاؤ غم آشیاں کا وقت نہیں!

کیا آنکھوں کا عطیہ دینا جائز ہے؟

آنکھیں اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہیں اس کا اندازہ آنکھوں والے ہی کر سکتے ہیں وہ آنکھوں والے جن کے دل کی آنکھیں کھلی ہیں یا پھر ان کی قدر اندھوں سے پوچھو جو حسن کائنات کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے اس کائنات حسین میں ان کا نہ کوئی حق ہے نہ حصہ۔ معجزات کا زمانہ نہیں کہ کوئی مسیح اللہ کا نام لے کر نابیناؤں کو بینا کر دے۔ عقل سن بلوغ کو پہنچ چکی، سائنس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا طب اور سرجری کی دنیا میں بھی آج وہ وہ کارنامے ہو رہے ہیں کہ پہلے نہ دیکھے اور نہ سنے 'اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیت سے انسان اس قابل ہو چکا ہے کہ وہ پیدائشی اندھوں کو نہ سہی کم سے کم ان نابیناؤں کو دیکھنے کے قابل بنا دے جن کی آنکھ کا قرنیہ کسی بیماری سے خراب یا ناکارہ ہو جاتا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے مریضوں کی تعداد ڈاکٹروں کے نزدیک کروڑوں تک جا پہنچی ہے جن کی آنکھ کا یہ آئینہ دھندلا پڑ جانے کی وجہ سے روشنی کو اندرونی حصے تک پہنچانے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ اس مرض کے علاج کے لئے بہت ریسرچ ہوئی۔ بہت کوششیں ہوئیں مگر کوئی ایسی دوا نہ مل سکی جو تیر بہدف ہوتی آخر کار یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی انسان کی آنکھیں مل جائیں تو انہیں لگا دینے سے بینائی عود کر آئے گی۔ اس تحقیق کے نتیجے میں پوپ نے عیسائی دنیا سے اپیل کی کہ مرنے کے بعد آنکھوں کے عطیات دیئے جائیں۔ مغربی دنیا میں بہت سی ایسی انجمنیں قائم ہو گئیں جو ایسے عطیات جمع کرتی ہیں انہیں آئی بنک سوسائٹی کہا جاتا ہے۔
پہل تو اس سلسلے میں برطانیہ اور امریکہ نے کی لیکن ایک چھوٹا سا ملک سری لنکا اس میں ان سے بازی لے

گیا۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر بدھ مت کے پیروکار ہیں اور وہ اپنے مخصوص مذہبی مزاج کی وجہ سے اسے بہت بڑی نیکی تصور کرتے ہیں۔ یہ عطیات صرف سری لنکا ہی کی ضرورت پوری نہیں کرتے یہاں کا آئی بنک دنیا کے دوسرے ملکوں کی بھی اس سلسلے میں بڑی مدد کرتا ہے۔ پاکستان کو آنکھوں کا عطیہ اکثر اسی ملک سے ملتا ہے اب تک تقریباً تین ہزار آنکھیں سری لنکا سے آکر پاکستانی نابیناؤں کا نور نظر بن چکی ہیں۔

دنیا کی بہت سی دوسری ایجادات اور جدید انکشافات کی طرح آنکھوں کے عطیات کے سلسلے میں بھی عالم اسلام نے اول اول بہت محتاط رویہ اختیار کیا۔ یہ رویہ ایک اعتبار سے مستحسن بھی ہے۔ کسی بھی چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر بے صبری اور جلدبازی میں اس کی طرف لپکنے کا انداز روایات رکھنے والی کسی قوم کو زیب نہیں دیتا۔ اس سلسلے میں اچھی طرح چھان پھٹک کر تحقیق کر لینی چاہئے اس تحقیق و تفتیش میں پہل مصر نے کی' آج سے تقریباً تیس سال پہلے مصر کے مفتی اعظم نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ **حکومت مصر تو یہاں** تک چاہتی تھی کہ قانوناً ہر مرنے والے کی آنکھیں نکال کر محفوظ کر لی جائیں مگر مفتی اعظم کی رائے میں اس سے فتنہ و فساد پھیلنے کا احتمال تھا لاش کے وارث ہو سکتا ہے بگڑ بیٹھیں اور لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو اس لئے انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ اس قانون کو عام قانون بنانے کے بجائے صرف لاوارث مرنے والوں اور پھانسی پانے والے لوگوں تک محدود کر دیا جائے۔ بہرحال آنکھیں بطور عطیہ دینے کی وصیت کرنے کے جائز ہونے میں انہیں کوئی تردد نہیں تھا۔ یہی نقطہ نظر اردن کی مجلس افتاء نے اختیار کیا اس نے بھی اس کے حق میں فتویٰ دیا اور تو اور سعودی عرب کے بعض علماء نے بھی یہی رائے دی ہے اور بعض دوسرے مسلمان ملکوں کے اہل علم نے بھی اسے شریعت کے کسی اصول سے متصادم قرار نہیں دیا ہے۔

پاکستان میں البتہ صورت حال مختلف ہے یہاں کے علمائے کرام سے جب کبھی پوچھا گیا ہے انہوں نے اس کی حرمت ہی کا فتویٰ دیا ہے ابھی حال ہی میں اخبارات نے بعض علماء کے ایسے فتوے ایک مرتبہ پھر شائع کئے ہیں جن سے یہ بحث پھر تازہ ہو گئی ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ دوسرے مسلمان ملکوں کے علماء کی رائے بھی صحیح ہو جنھوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور پاکستانی علماء کا موقف بھی درست ہو جو اسے حرام کہتے ہیں۔ ضرور ہے کہ ان میں سے ایک مسلک غلط ہو گا' ضرورت ہے کہ ٹھنڈے دل سے غور کر کے موافق و مخالف دلائل کا جائزہ لیا جائے تاکہ ذہنی خلفشار ختم ہو' میں پاکستان کے ان علمائے کرام کا دل سے احترام کرتا ہوں جو عطیہ چشم کی حرمت کے قائل ہیں لیکن چونکہ یہ مسئلہ عہد رسالتؐ' صحابہؓ کرام تابعین اور تبع تابعین کے دور میں پیدا نہیں ہوا اس پر کوئی نص صریح موجود نہیں یہ اس دور کا مسئلہ ہے اس لئے اگر اس سلسلے میں میرا نظریہ جداگانہ ہو اور میں ان حضرات کی رائے سے اختلاف کروں تو امید ہے اسے ان کے احترام کے منافی قرار نہیں دیا جائے گا۔

عطیہ چشم کی وصیت کے خلاف جو دلائل دیئے گئے ہیں ان میں مرکزی دلیل یہ ہے کہ اسلام لاش کی بے حرمتی کے خلاف ہے وہ میت کی ہڈی توڑنے کو بھی گناہ قرار دیتا ہے اس نے لاش کا مُثلہ کرنے یعنی اسے مسخ کرنے سے منع کیا ہے اس لئے مرنے کے بعد کسی لاش کی آنکھیں نہیں نکالی جاسکتیں میں اس دلیل کی کمزوری پر تو بعد میں کچھ عرض کروں گا چلئے پہلے یہی فرض کیے لیتے ہیں کہ آنکھیں دینے کی وصیت لاش کی توہین ہے اور اسلام اسے برائی قرار دیتا ہے۔ اس صورت میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ازالہ مرض کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ نے علاج کا بھی حکم دیا ہے اور اندھاپن ایک ایسا مرض ہے جس کے علاج سے کسی اندھے کو محروم رکھنا بھی برائی ہے پہلی برائی کا تعلق ایک مردہ انسان سے ہے دوسری کا زندہ سے، پہلی صورت میں مردے کی ایذا ہے دوسرے میں زندہ کی، ظاہر ہے وہ برائی شدید تر ہوگی جس کا تعلق زندہ انسان سے ہے اور شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ دو برائیوں میں سے ایک برائی کا انتخاب ناگزیر ہو تو بڑی برائی کو چھوڑ کر چھوٹی برائی کو اختیار کرلینا چاہئے۔ اسی کو فقہ کی اصطلاح میں " اھون البلیتین " یہ ہے کہ لاش کی توہین گوارا کرلی جائے مگر اندھے انسان کو علاج سے محروم نہ کیا جائے۔

بات واضح نہ ہوئی ہو تو لاش کی توہین کے مفروضے پر شریعت کے ایک اور قاعدے کُلیّے سے غور کر لیجئے۔ شریعت کے نزدیک جس چیز میں نفع اور نقصان کے دونوں پہلو پائے جاتے ہوں اس کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سا پہلو غالب ہے اگر نقصان زیادہ ہے اور نفع کم تو یہ چیز ناجائز ہوگی اور اگر نقصان کم ہو اور نفع زیادہ تو جائز' اب آنکھوں کے عطیےُ کا مسئلہ لے لیجئے اس میں ایک طرف یہ نقصان ہے کہ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ فائدہ کہ اس سے ایک اندھے انسان کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ لوبس نقصان کا تعلق مردہ سے ہے اور اس میں نفع زیادہ ہے اور نقصان کا تعلق مردہ سے ہے اور اس نفع کا تعلق زندہ سے' صاف ظاہر ہے کہ اس میں نفع زیادہ ہے اور نقصان کم۔ اس لئے اسے ناجائز قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔

....

اوپر کی گفتگو اس مفروضے کو صحیح مان کر کی گئی ہے کہ آنکھوں کا عطیہ لاش کی بے حرمتی ہے' اب ہم یہ عرض کریں گے کہ سرے سے یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ عطیہ چشم انسانی لاش کی توہین ہے' یہ احکام کہ لاش کو مسخ نہ کرو اس کی ہڈی نہ توڑو اس لئے دیئے گئے کہ ایام جاہلیت میں بالخصوص میدان جنگ میں دشمن کے مرنے کے بعد بھی انتقامی کارروائی ختم نہیں ہوتی تھی لاش کے ناک کان کاٹ دیئے جاتے تھے (جیسے ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش سے کلیجہ نکال کر چبایا تھا' اسلام نے اس کی سختی سے ممانعت کردی' جہاں تک عطیہ چشم کی وصیت کا تعلق ہے نہ اس میں انتقامی کارروائی کا سوال ہے نہ کسی دوسرے شخص کی طرف سے لاش کی بے حرمتی کا' یہ تو مرنے والے کی اپنی وصیت ہے جسے نافذ کیا جارہا ہے اور اس کے پیچھے جذبہ بنی نوع انسان کی خدمت اور ہمدردی کا ہے' اسلام میں تمام اعمال کا

اصل الاصول یہ ہے کہ ان میں نیت کیا کار فرما ہے۔ مثال کے طور پر پوسٹ مارٹم کو لے لیجئے اس میں بھی لاش کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے بظاہر یہ کام بھی لاش کی بے حرمتی کا ہے مگر چونکہ نیت تفتیش جرم کی ہے اور اس سے انسانی معاشرہ کی منفعت مطلوب ہے اس لئے اسے ناجائز اور حرام قرار نہیں دیا جائے گا۔

....

ہمارے فقہائے کرام کے دور میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لئے براہ راست تو ان کے ہاں اس پر کوئی صراحت موجود نہیں مگر لاش کی بے حرمتی اور چیر پھاڑ کے تصورات پر ان کے ہاں بعض مفروضہ صورتوں کے احکام و مسائل سے ہم بنیادی رہنمائی ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ فقہ کا مشہور مسئلہ ہے کہ اگر کسی عورت کے پیٹ میں مردہ بچہ ہو اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کئے بغیر پیٹ سے نہ نکالا جا سکتا ہو تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اجازت ہے اسی طرح اگر مردہ ماں کے پیٹ میں زندہ بچہ ہو تو ماں کا پیٹ چاک کر کے بچہ کو نکال لینا جائز ہو گا، بعض اوقات بچے کی ولادت عام طریقے پر ہونے سے ماں کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے اس صورت میں بھی پیٹ کا آپریشن کر کے بچے کی ولادت ہوتی ہے۔ کسی عالم دین نے آج تک فتویٰ نہیں دیا کہ یہ تینوں صورتیں از روئے شرع غلط ہیں گو بظاہر ان میں بھی انسانی بدن کا احترام ملحوظ نہیں رکھا جاتا لیکن چونکہ نیت اور ارادہ انسانی فلاح و بہبود کا ہے اس لئے شریعت نے اس کی اجازت عطا کی ہے، حادثات کی صورت میں زندگی بچانے کے لئے بعض لوگوں کی ٹانگ کاٹ دی جاتی ہے۔ بعض بیماریوں میں گردہ نکال دیا جاتا ہے۔ مقصود اس سے زندہ انسانوں کی بھلائی ہے اس لئے انسانی جسم کا یہ تصرف جائز اور مباح ہے اور عطیہ چشم میں بھی یہی روح کار فرما ہے کہ اپنی جان پر ایثار کر کے دوسرے بھائی کو فائدہ پہنچایا جائے لہٰذا اسے بھی مستحسن قرار دیا جائے گا۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کہ "وہ اپنی جانوں پر ایثار کرتے ہیں" ...... آنکھوں کی وصیت اسی ایثار پیشگی کا ایک خوبصورت اور قابلِ قدر مظاہرہ ہے۔

....

مخالفت میں دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ مردہ انسان کا کوئی حصہ زندہ انسان کے وجود میں شامل کر دیا گیا تو یہ ایسے ہو گا جیسے نجاست اور طہارت کی پیوند کاری کر دی جائے۔ بعض علمائے کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی مردے کا دانت یا اپنا گرا ہوا دانت لگانے کی بھی اسی لئے ممانعت ہے کہ شریعت اسے نجس سمجھتی ہے۔

دیکھا جائے تو یہ دلیل بھی کئی غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے۔ سب سے پہلے تو یہی بات غلط ہے کہ قرنیہ کے علاج کے لئے جو آنکھیں مردہ ہو جائیں تو انہیں علاج کے لئے استعمال کرنا ہی بے کار ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی شخص کی فوتیدگی کے بعد کئی گھنٹے آنکھوں میں زندگی برقرار رہتی ہے اور اگر انہیں مطلوبہ خنکی اور برودت میں محفوظ کر لیا جائے تو وہ دو دن تک مردہ نہیں ہونے پاتیں۔ مردے سے آنکھیں نکالنے

کے وقت سے لے کر ان کے محفوظ کر لینے کی مدت کے دوران ہی انہیں بطور علاج استعمال کیا جاتا ہے۔ رہا دانت لگانے کا مسئلہ تو وہ اس لئے مختلف ہے کہ دانت گرتے ہی بے حس اور مردہ ہو جاتا ہے اس لئے اس کا جوڑ لگانے پر بعض فقہائے کرام نے اعتراض کیا ہے۔ بعض فقہائے کرام نے اس لئے کہا ہے کہ اس پر سب کا اتفاق نہیں مثلاً جلیل القدر فقیہ قاضی ابو یوسف اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

یہاں ایک سوال اور بھی قابل غور ہے اگر ایک جسم سے دوسرے جسم میں کوئی چیز منتقل نہیں ہو سکتی تو علمائے کرام انتقال خون کے مسئلہ پر کیوں خاموش ہیں؟ ممکن ہے بعض حضرات نے اسے بھی ناجائز قرار دیا ہو لیکن کم سے کم میری نظر سے ایسا کوئی فتویٰ نہیں گزرا حالانکہ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ خون جسم کا حصہ ہی نہیں جسمانی زندگی کا سارا دارومدار ہی اسی پر ہے جب اسے ایک جسم سے نکال کر دوسرے جسم میں ڈالا جا سکتا ہے صرف اس لئے کہ اس طرح دوسرے انسان کا بھلا ہو گا۔ تو انسانی منفعت کے لئے مرنے والے کی وہ آنکھیں ایک نابینا کو بطور عطیہ کیوں نہیں دی جا سکتیں جن کا مصرف خاک میں مل کر خاک ہو جانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں!

کہا جاتا ہے انسانی جسم اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اسی لئے خودکشی حرام ہے کوئی انسان اپنے جسم کا مالک نہیں یہ تو اس کے پاس اللہ کی امانت ہے اس لئے وہ اس کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کر سکتا۔

انسانی معاملات و مسائل کا فیصلہ کرتے وقت یہ انداز نظر سامنے رکھا جائے تو پھر انسان کے پاس اس کا اپنا رہتا کیا ہے؟ پھر تو اسے مال کے بارے میں بھی وصیت نہیں کرنی چاہئے کہ یہ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ بیوی بچے بھی اس کے نہیں ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ کائنات اور کائنات کی ہر چیز اللہ کی نہیں تو اور کس کی ہے؟ مگر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے تصرف میں دیا ہے وہ یہاں اس کی ملکیت ہی کہلائے گا اسی لئے تو قرآن پاک (اموالکم) تمہارے مال ...... اموالھُم ...... ان کے مال ...... کہتا ہے اور اس ضمن میں جہاں اور بہت سی چیزوں کا ذکر کرتا ہے وہاں ...... ابصارھُم ...... ان کی آنکھیں ...... بھی کہتا ہے، جسم کو کوئی نقصان پہنچائے تو بطور تاوان اس کا معاوضہ اسے جسم کے مالک کو دینا پڑتا ہے۔ یہ اسلامی قانون ہے 'انگلی کاٹنے تک کی دیت مقرر ہے جسم ہمارا نہ ہو تو ہمیں اس کا معاوضہ کیوں ملے؟ جو لوگ خودکشی کو حرام کرنے میں یہ حکمت دیکھتے ہیں کہ اس سے جسم پر انسانی ملکیت ثابت نہیں ہوتی وہ ایک خود ساختہ بات کہتے ہیں۔ خودکشی اس لئے حرام ہے کہ اس سے انسان کتنے ہی حقوق کا خون کرتا ہے خود اپنے نفس اور جسم کا حق کہ اس کی صحت اور حفاظت کا خیال رکھنا اس کا فرض منصبی تھا۔ اپنے والدین بیوی بچوں بہن بھائیوں اور اعزا و اقربا کا حق کہ ان کو راحت و آرام پہنچانا اس کے ذمے تھا۔ خودکشی سے وہ حقوق العباد کا قاتل بن گیا کتنے ہی پس ماندگان کو مبتلائے عذاب کر گیا۔ فطری طریقے سے موت کی بات اور ہے اس میں مرنے والے کا قصور نہیں اس پر صبر بھی آ جاتا ہے لیکن خودکشی جیسی غیر فطری موت تو خود اپنے اوپر وارد کی جاتی ہے۔ متعلقین و لواحقین کے سینے پر یہ کاری زخم تو مرنے والا خود

لگتا ہے۔ اتنا بڑا جرم کیسے معاف کیا جاسکتا ہے۔

اس واضح اور صاف سیدھے فلسفے کی بجائے خود کشی کی حرمت سے جسم پر انسان کی عدم ملکیت ثابت کرنا اور پھر اس سے آنکھوں کی وصیت پر استدلال دور از کار ہی نہیں غیر عقلی اور غیر منطقی بھی ہے۔

جسم کے کسی حصے کے بارے میں کوئی ایسی وصیت جس سے بنی نوع انسان کو ضرر پہنچتا ہو یقیناً ناجائز ہے مگر آنکھوں کی وصیت سے وصیت کرنے والا نہ کسی حرص وہوس کا مظاہرہ کرتا ہے نہ کسی کو نقصان پہنچا رہا ہے اس کے سامنے ایک اعلیٰ وارفع مقصد اور ایک بہت اونچا آدرش ہے آپ اس کی لاش کو محض قبر میں دفنانے کے متمنی ہیں حالانکہ خود تدفین سے بھی اصل مقصود زندہ انسانوں کو تکلیف وضرر سے بچانا ہے۔ یہی شخص جسے آپ دفنا رہے ہیں اگر سمندری سفر کے دوران مرجاتا تو شریعت کے حکم پر آپ اس کی لاش کو مچھلیوں اور سمندری جانوروں کی خوراک بننے کے لئے سمندر میں ڈال دیتے قبر کا انتظار اس لئے نہ کرتے کہ اس کی لاش گل سڑ کر سمندری جہاز میں موجود زندہ انسانوں کی تکلیف کا باعث بنتی تو اصل اعتبار کس بات کا ہوا مردوں کے جسم کو صحیح سالم دفن کرنے کا یا زندہ انسانوں کے دفع مضرر اور نفع و آرام کا؟

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر لاش کی آنکھیں نکال کر زندہ انسانوں کو لگانے کا عمل شروع ہو گیا تو پھر آہستہ آہستہ موٹر کے اسپیئر پارٹس کی طرح انسانی اعضاء کا کاروبار شروع ہو جائے گا انسانی چربی کا صابن بنایا جائے گا اور لاش دفن ہونے سے پہلے ہی مستحقین میں تقسیم ہو جائے گی۔

یہ بہت دلچسپ انداز بیان ہے اور بہت خطیبانہ طرز استدلال مگر آنکھوں کے اس طریق علاج پر قریب قریب نصف صدی تو بیت چکی کسی ملک میں لاش کے حصے بخرے کرنے کا یہ منظر کسی کی نظر سے بھی گزرا؟ آنکھوں کے علاج کے لئے تو آنکھیں اس لئے نکالی جاتی ہیں کہ اس کے علاوہ اندھے پن کا اور کوئی علاج ہی موجود نہیں 'انسانی جسم کی چربی کا صابن کیوں بنایا جائے گا جبکہ ایک سے ایک بڑھیا صابن مارکیٹ میں موجود ہے الٹا امکان تو اس بات کا ہے کہ آگے چل کر سائنسی ترقی سے آنکھوں کے علاج کے کچھ اور طریقے بھی نکل آئیں گے اور کچھ ایسے کیمیاوی اجزاء دستیاب ہو جائیں گے جن سے مصنوعی قرنیہ بنایا جا سکے۔ اُس وقت بلاشبہ ایثار پیشہ لوگوں کو آنکھیں بطور عطیہ دینے کی وصیت نہیں کرنی پڑے گی اور اس وقت اس فتوے کا موقع بھی ہو گا کہ جب اندھوں کا علاج دوسرے رستوں سے ممکن ہے تو اس کے لئے لاش کی بے حرمتی کیوں کی جا رہی ہے؟

جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک پاکستان کے علمائے کرام! عطیہ چشم کی وصیت کرنے کی اس عالمی اور بین الانسانی تحریک کو اپنے فتووں سے روکنے کی کوشش نہ کرو جس کے سامنے خدمت خلق کا ایک عظیم نصب العین ہے۔ یہ نصب العین اسلامی تعلیمات کی روح کے عین مطابق ہے جب دوسرے مسلمان ملکوں کے علمائے دین اسے جائز سمجھتے ہیں تو کم سے کم اسے حرام کہنے سے تو گریز کرو یا پھر سرسری دلائل سے یک لخت فیصلہ صادر نہ کرو علمی بحث وتمحیص کرو تبادلہ خیال سے ہر موضوع کے نئے

نئے گوشے سامنے آتے ہیں اور ذہن کی گرہیں کھلتی ہیں۔ میں نے اپنی معروضات پیش کر دیں یہ ایک طالب علم کی گزارشات ہیں آپ اس پر عالمانہ محاکمہ کرنا چاہیں تو آپ کے فرمودات کے لئے "مشاہدات و تاثرات" کا کالم حاضر ہے۔

(21 ر جنوری 1982ء)

پردے کا روایتی تصور اور اسلام

چند دن پہلے عالم اسلام کی دو مقتدر علمی شخصیتوں کے ایک ہی موضوع پر دو مختلف اور متضاد فتوے نظر سے گزرے۔ پہلا فتویٰ سعودی عرب کے عالم جلیل شیخ بن باز کا ہے جو ویسے تو پیدائشی نابینا ہیں لیکن اپنے نور بصیرت کی وجہ سے پوری دنیائے اسلام میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں مجھے ذاتی طور پر ان سے شرف نیاز حاصل ہے، بعض مسائل حج پر انہوں نے جو علم افروز راہنمائی کی تھی اس سے ذہن کی بہت سی گرہیں کھلیں اور سوچ بچار کے کئی نئے افق روشن ہوئے۔ میں اب تک ان مذاکرات کی حلاوت فکری کا لطف آشنا ہوں۔ شیخ کو ان کی علمی اور دینی خدمات پر ابھی حال ہی میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا ہے۔

شیخ بن باز کا فتویٰ یہ ہے کہ خواتین کے لئے ڈرائیونگ حرام ہے کیونکہ اس سے فسق و فجور کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور معاشرہ میں اخلاقی فساد پیدا ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے اسی سوال کنندہ نے یہ سوال مرد انقلاب اور فقہ جعفریہ کے عالم بے بدل حضرت آیت اللہ روح اللہ خمینی کی خدمت میں بھی ارسال کیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں ان کا فتویٰ یہ تھا کہ خواتین کار وغیرہ چلا سکتی ہیں بشرطیکہ اس کے لئے وہ حجاب کے احکام کو ملحوظ رکھیں۔ حضرت آیت اللہ اور شیخ بن باز کے فتووں کا اختلاف و تضاد تو ظاہر ہے ہی۔ حضرت آیت اللہ کے فتوے سے ایک دوسرا سوال بھی آپ سے آپ سامنے آجاتا ہے اور وہ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا حجاب اور پردے میں عورت کا چہرہ شامل ہے یا نہیں، اگر عورت کو کار ڈرائیو کرنے کی اجازت ہے تو وہ بے چاری چہرے کو چھپا کر صرف آنکھوں کی جالیوں سے تو ٹریفک کے احکام و قواعد کا حق ادا نہیں کر سکتی۔

کچھ اسی قسم کی بحث پچھلے دنوں ہمارے ہاں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی ' ہمارے ایک پرانے رفیق اور دوست ڈاکٹر اسرار احمد پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک دینی پروگرام میں حصّہ لیتے ہیں ' ان کا کہنا ہے کہ ٹی وی والے ان کے پروگرام کے حاضرین میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی بٹھانا چاہتے ہیں ' میرا اصرار یہ تھا کہ انہیں پردے میں بٹھایا جائے۔ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ میرا پروگرام بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے اس انکشاف کے بعد ان کا نام فیڈرل کونسل میں آیا (جسے یار لوگ "مجلس شوریٰ" کہنے پر مصر ہیں) تو لاہور کے ایک عالم دین نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھا گیا ہے کہ اگر وہ ٹیلی ویژن پروگرام میں بے پردہ خواتین کے ساتھ بیٹھنے کو تیار نہ تھے اور انہیں پردے میں بٹھانے کو شرط لازم قرار دے رہے تھے تو اب وہ "مجلس شوریٰ" کی "بے پردہ خواتین" کے ساتھ ایک ہی محفل میں کیسے رونق افروز ہیں؟۔

اسی طرح ایک دلچسپ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب 1975ء میں میں عالم اسلام کی مایۂ ناز یونیورسٹی "جامعہ الازہر" کی ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ میں اپنا مقالہ پیش کر رہا تھا شیخ عبدالحلیم محمود اس زمانے میں شیخ الازہر تھے وہ بیک وقت صوفی صافی بھی تھے اور ایک عالم اجل اور فقیہ وقت بھی، علم و عمل کے ایسے پیکر دنیا کی نگاہوں نے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ میری دعوت پر پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ پھر لندن اور قاہرہ میں بھی ان سے یادگار صحبتیں رہیں۔ ان کے قلم سے بعض معرکے کی کتابیں بھی نکلی ہیں گو ان کا اتنا چرچا نہیں ہو سکا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ (شاید اس لئے کہ وہ سیاسی اور مذہبی گروہ بندی میں شامل نہ تھے) ورنہ موجودہ دور میں عالم عرب نے جو دینی لٹریچر پیش کیا ہے اس میں اس پائے کی کتابیں شاید ہی موجود ہوں ' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ انٹرنیشنل علمی محفل انہی کی کوششوں اور سرپرستی کا نتیجہ تھی۔ بدقسمتی سے اپنے ایک ناگزیر غیر ملکی سفر کی وجہ سے وہ بعد میں خود تو اس میں شریک نہ ہو سکے لیکن ان کی دعوت پر عالم اسلام کے گوشے گوشے سے نامور اور ممتاز اہل فکر اس میں شریک ہوئے۔ مجلس مذاکرہ کا موضوع "اسلام میں عورتوں کا مقام اور حقوق" تھا اور اس ضمن میں مقالہ نگاروں سے خواتین کی مجلسی حیثیت کے پس منظر میں "مسلم خاندانوں کو درپیش جدید آزمائشیں اور ان کے فرائض" خاص طور پر زیر بحث لانے کی درخواست کی گئی تھی ' میں نے اس موضوع پر جو مقالہ پیش کیا اس کا عنوان تھا۔ "مسلم خاندان اور جدید عصری تقاضے" اس کا ترجمہ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں کر لیا گیا تھا کیونکہ یہی دونوں زبانیں مجلس مذاکرہ کا ذریعہ اظہار تھیں۔ (میرے پبلشر شیخ غلام علی اینڈ سنز چوک انار کلی لاہور نے اردو مقالے کو کتابی صورت میں شائع بھی کر دیا ہے) میرے مقالے میں پردے کی روایتی صورت سے لے کر تعداد ازدواج اور ضبط ولادت تک کتنے ہی اہم اور نازک مسائل پر گفتگو کی گئی تھی اس پر گرما گرم بحث ہوئی۔ میرے نقطہ نظر کے حق میں اور خلاف بہت سے مشاہیر اہل علم نے تقریریں کیں۔ الازہر کے ایک عالم جو شیخ الازہر کی عدم موجودگی میں عملاً مذاکرے کے مہتمم اور اس کے کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے خاص طور پر اس

عقیدے کے مبلغ اور ترجمان بن کر سامنے آئے کہ عورت کا اصل مقام گھر کی چار دیواری ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس کا فریضہ بچوں کی تربیت ہے اور بس۔ آخر میں میری باری تھی مجھے اس ساری بحث وتمحیص کو سمیٹنا اور مخالفانہ نکات کا جواب دینا تھا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا وہ اس سے مختلف نہیں جو "مشاہدات و تاثرات" میں اکثر دہراتا رہتا ہوں، میں نے کہا۔

"عالم اسلام کا اصل روگ نفاق اور تضاد ہے ہم اسلام کو جن تشریحات کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں ان پر عمل نہیں کرتے اور معاشرت جس تیزی سے تغیر پذیر ہو رہی ہے اس میں شاید عمل کر بھی نہیں سکتے اور دوسری طرف ہم بدلے ہوئے حالات میں مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ان تشریحات پر نظر ثانی کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، ہم نے قرآن وسنت کی جگہ ایک مخصوص دور کی معاشرانہ سوچوں کو نصِ صریح کا درجہ دے رکھا ہے۔"

اس سلسلے میں میں نے ایک مثال بھی پیش کی۔ بات سخت تھی مگر چونکہ سامنے کی تھی اس لئے اس سے زیادہ برمحل بات شاید ہی کوئی دوسری، اس تضاد کی نشاندہی کر سکتی تھی جسے اجاگر کرنا میرے پیش نظر تھا، مذاکرے کا افتتاح مصر کی خاتون اول بیگم جیہان سادات نے کیا تھا، میں نے اس تناظر میں بات آگے بڑھائی اور عرض کیا کہ۔

"خود اس مذاکرے کو دیکھ لیجئے۔ مذاکرے کے مہتمم مصری بزرگ عقیدہ یہ پیش کر رہے ہیں کہ عورت کا مقام اس کا گھر ہے لیکن عمل یہ ہے کہ انہوں نے افتتاح اس کا ایک خاتون سے کرایا اور ان کی تشریف آوری سے لے کر ان کی تقریر اور روانگی تک بھی حضرات ان کے آگے پیچھے پھرتے رہے اب یا تو وہ عقیدہ غلط تھا یا یہ عمل، عقیدہ وعمل کے اس تضاد کے ساتھ ہم شاہراہ حیات پر آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

اب اس بات کو جانے دیجئے کہ آگے کیا ہوا، ہال میں موجود سینکڑوں حاضرین وحاضرات کا ردعمل کیا تھا؟ مصری پریس نے میرے مقالے اور اس پر ہونے والی بحثوں کو کس انداز نظر سے دیکھا۔ عرض جو کچھ کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ فتووں کے ان اختلافات اور عقیدہ وعمل کے ان تضادات سے اب عالم اسلام کو چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، زندگی ٹھہرے ہوئے پانی کا جوہڑ نہیں ایک جوئے رواں ہے یہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ نئے نئے مسائل نئے نئے واقعات نئی نئی ایجادات کل یوم ھو فی شان۔ کے مظاہرے ان پر احکام پہلے فقہاء کی کتابوں میں نہیں ملتے اس کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور جب میں اجتہاد کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہر کس وناکس کو اس کا اختیار حاصل ہونا چاہئے ظاہر ہے اس کی بھی شرائط ہیں اور ایسا نہیں کہ وہ شرائط پوری کرنے والے اہل علم مسلم معاشرے میں موجود نہیں، وہ موجود ہیں انفرادی طور پر فریضہ اجتہاد سے بھی غافل نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی انفرادی رائے کو وہ تقدس اور وہ قانونی درجہ حاصل نہیں جس سے ذہنی الجھاؤ کو سلجھانے کی کوئی حتمی

صورت سامنے آسکے۔

ماضئ قریب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا نام اور کام علمائے اسلام کی خدمات کا ایک روشن اور تابناک باب ہے۔ وہ حنفی فقہ پر سختی سے عامل اور سلف صالحین کے مسلک پر شدت سے کاربند رہے ہیں، ان کی کتاب "بہشتی زیور" اسی طرز فکر کی آئینہ دار ہے مگر بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات کی رعایت انہوں نے بھی کی، ان کی کتاب "الحیلۃ الناجزہ" اس کی روشن مثال ہے اس میں انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کبھی فقہ حنفی کی وجہ سے مسلمان خواتین کے لئے دقتیں پیدا ہو جائیں تو وہ امام مالک کے فقہی مسلک کو اختیار کر سکتی ہیں جس میں نسبتاً وسعت کا رجحان پایا جاتا ہے۔

خود فقہ حنفی میں بھی مسئلے کی اصل صورت وہ نہیں ہے، جو روایتی پردے کے سلسلے میں ہمارے مذہبی حلقوں میں رائج ہے ندوۃ المصنفین دہلی کے روح رواں ایک مشہور عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے چھ قسطوں میں "پردۂ نسواں، قرآن وسنت کی روشنی میں" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس میں حنفی فقہ کے مطابق قرآن وسنت اور اقوال فقہاء سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عورت کا چہرہ، کلائی تک دونوں ہاتھ اور ٹخنوں تک دونوں پاؤں ستر میں داخل نہیں ہیں (یعنی انہیں چھپانے کا حکم نہیں) (بحوالہ برہان دہلی جولائی 80ء ص 4، 5) مولانا لکھتے ہیں کہ اس پر علماء کے ایک طبقے میں ہل چل مچ گئی، ان کے الفاظ میں اس کا اصل سبب یہ تھا کہ

> "ایک انسان کسی خاص سماج یا ماحول میں عرصہ دراز تک رہنے سہنے کے باعث چند عادات وخصائل اور رسوم کا نسلاً بعد نسل اس درجہ خوگر اور گرویدہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے مذہبی احکام کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے ساتھ وابستگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی حقیقی تعلیمات اس شخص کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اس کی ایک دلچسپ مثال لیجئے۔ حج کے سلسلے میں شریعت کا صاف حکم ہے کہ عورت کا احرام ہی چہرہ کھلا رکھنا ہے لیکن اس کے باوجود ہم نے حجاز میں دیکھا ہے کہ بعض خواتین برقعے کی ٹوپی میں ایک چھجا لگا لیتی ہیں اور اس سے نقاب لٹکا لیتی ہیں تاکہ چہرہ کھلا بھی رہے اور کوئی اسے دیکھ بھی نہ پائے یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کی رسم پرستی دین داری ہرگز نہیں ہے بلکہ سرتا اتباع ہوا ہے جس پر شدید وعید خداوندی ہے۔"

مولانا نے نہیں لکھا لیکن اسی پر اضافہ کرتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں جائز چیزیں ناجائز اور حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، لباس پہننا، غسل کرنا، خوشبو لگانا، بیوی سے جنسی تعلق قائم رکھنا یہ سارے امور شریعت نے حلال قرار دیئے ہیں لیکن ایام حج میں ان کی اجازت نہیں۔ سوچنے کی بات ہے جس عبادت میں جائز چیزیں بھی ناجائز ٹھہرا دی گئی ہیں ان میں کسی ناجائز ارتکاب کی اجازت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عورت کا چہرہ ظاہر کرنا ناجائز ہوتا تو حج میں تو اس کی اور

بھی سخت تاکید ہوتی کہ عبادت کے دوران کسی ناجائز فعل کا ارتکاب اسے اور شدید بنا دیتا ہے لیکن یہاں حکم یہ ہے کہ اگر ایام حج میں عورت نے چہرہ چھپایا تو اس کا احرام باقی نہیں رہے گا۔

مقصد یہاں پردے پر تفصیلی بحث کرنا نہیں۔ یہ گفتگو تو برسبیل تذکرہ چھڑ گئی' میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے معاشرتی مسائل کی وہ تشریحات جو ایک مخصوص سماج میں قرون وسطیٰ کے علماء اور فاضلین نے کی تھیں آج انہیں تشریح کے بجائے اصل دین سمجھنے کی غلطی نے ہمیں نفاق اور تضاد میں مبتلا کر دیا ہے' پورے عالم اسلام میں روایتی اور رواجی پردے کا خاتمہ ہو چکا ہے' ترقی پذیر ملکوں کی ضروریات کے تحت عورتیں ڈاکٹر' انجینئر' استاد' نرس اور سپاہی کے روپ میں زندگی کے ہر میدان میں پیش قدمی کر رہی ہیں لطف یہ ہے کہ اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعی ملکوں میں بھی یہی صورت حال ہے مگر مذہبی حلقے عقیدہ یہی دینے اور رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں کہ اسلام میں عورت کو گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہئے ان کے نزدیک روایتی پردہ اب بھی عین تقاضائے مذہب ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی حلقوں کے بالمقابل مسلمان ملکوں کا لادینی طبقہ ایک دوسری انتہا کا قائل ہے۔ وہ عورت سے شرم وحیاء کی نعمت چھین کر اسے ایک شمع محفل' سبھا کی ایک پری' خربوزے کی ایک پھانک' سیب کی ایک قاش اور انگور کا ایک خوشہ بنانا چاہتا ہے وہ اسے عریانیوں کے طوفان و طغیان میں دھکیل کر معاشرے میں جنسی اور اخلاقی آوارگی عام کرنے کے درپے ہے اس کے سامنے نہ اسلامی قدریں ہیں نہ مشرقی اطوار و آداب وہ تو مغرب کی نقالی کو معراج حیات سمجھتا ہے۔ وہی مخلوط کلب' وہی شبینہ رقص و سرود کی محفلیں وہی عورتوں کی ساقی گری اور ناؤنوش کے ہنگامے' اس طبقے کی تہذیب و ثقافت کا مرکز و محور یہی عریانی اور فحاشی ہے اور بس۔

اس دو طرفہ انتہاپسندی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ ہر جگہ دو متوازی طبقوں میں بٹ گیا ہے اور یہ دریا کے دو کناروں کی مانند ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ قریب آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کبھی کبھی تو یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں آگے چل کر ان میں تصادم ہی نہ ہو جائے اور گھر کا یہ بٹوارہ دیکھ کر کوئی ڈاکو ہی اس پر قبضہ نہ کر لے مگر انتہاپسندوں کا تو جو معاملہ ہے سو ہے ستر اسی فیصد ان بے چارے اہل ایمان کا کیا قصور ہے جو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلام کے مسلک اعتدال پر چلنا چاہتے ہیں لیکن انہیں راہ صواب کا سراغ نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں بہت سے چلتے ہوئے فقروں میں سے ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ "اسلام میں پاپائیت کا وجود نہیں" یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ عبد اور معبود کے درمیان کسی ایجنٹ کی ضرورت نہیں' اسلام کا خدا بندوں کی شہ رگ سے بھی قریب ہے اس کا ارشاد ہے' "مجھے پکارو میں سنوں گا" لیکن اسی لحاظ سے غلط بھی ہے کہ اس میں اسلامی امور و مسائل کے باب میں کسی مرکزی اتھارٹی کی بھی نفی کر دی جاتی ہے۔ پاپائیت کے آپ ہزار مخالف ہوں مگر کیتھولک عیسائیوں کے لئے ویٹی کن کے مقام سے پاپائے روم کا اعلان مذہب کے معاملے میں حرف آخر تصور ہوتا ہے' یہی صورت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی ہے ان میں بھی مذہبی ہیئت حاکمہ موجود ہے اور مسائل کے باب میں اس کا فیصلہ حتمی اور آخری ہے یہی

صورت حال دوسرے مذاہب کی ہے مگر جب سے خلافت ختم ہوئی ہے ہم مسلمان ایک عجیب مخمصے کا شکار ہیں، خلافت تھی تو دینی اور دنیوی جملہ امور میں ملت کی راہنمائی اس کے ذمے تھی وہ نہیں ہے تو عملاً دین اور سیاست الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سیاسی اور مذہبی معاملات میں ہم اس سے رجوع نہیں کر سکتے اور الگ سے عالم اسلام کی کوئی دینی اتھارٹی اس لئے تشکیل پذیر نہیں ہو سکی کہ یہ خود مسلمان حکومتوں کے لئے بھی ایک چیلنج بن جاتی اور ان چھوٹے چھوٹے مذہبی اداروں اور انفرادی دکانداریوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا جو کسی نظم کی عدم موجودگی میں سبزۂ بیگانہ کی طرح ہر طرف لہلہاتی نظر آتی ہے۔

آج جبکہ ہر چہار طرف اتحاد عالم اسلامی کا غلغلہ ہے، اسلامک سیکرٹریٹ قائم ہو چکا ہے، عالم اسلام کے فکری اور علمی رہنماؤں کی کوئی ایسی عالمی مجلس کیوں قائم نہیں ہو سکتی جس میں ہر مسلمان ملک سے ممتاز اہل علم جدید و قدیم سے پیدا ہونے والے مسائل پر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ کامل غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد۔ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کریں۔ مصر اور سعودی عرب میں بعض ایسی تنظیمیں کام کر رہی ہیں مگر ایک تو وہ اپنے ملک کی حکومتوں کی قائم کردہ ہیں دوسرے ان کا دائرہ کار علمی سے زیادہ سیاسی ہے اور اسی لئے اختلافی ہے۔ یہ تنظیم تو اسلامک سیکرٹریٹ کو قائم کرنی چاہئے اس میں ہر مسلمان حکومت اپنے بہترین دماغ بطور نمائندہ بھیجے اور پھر جو فیصلے ہوں انہیں شرح صدر کے ساتھ رائج و نافذ کرے اس طرح عقیدہ و عمل کا وہ تضاد بھی ختم ہو گا جس نے مسلم دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور نئی اور تعلیم یافتہ نسل کا وہ اضطراب بھی جو ایک ہی مسئلے پر علمائے کرام کے مختلف فتووں کی آئے دن اشاعت سے اسلام ہی کو سرے سے ناقابل عمل سمجھنے لگی ہے۔

(28 رجنوری 82ء)

کیا کوڑوں کی سزا اسلامی ہے؟

وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد کے چیف جسٹس محترم شیخ آفتاب حسین صاحب کا ایک انٹرویو روزنامہ نوائے وقت نے اپنے پچھلے جمعہ ایڈیشن میں شائع کیا ہے۔ جس میں شیخ صاحب نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

> "کوڑوں کی سزا تو بر سر عام ملنی چاہئے۔ میں نے چاروں صوبوں کے ہوم سیکرٹریوں کو مراسلہ بھیجا ہے جس کے ذریعے ان سے دریافت کیا ہے کہ کوڑوں کی بر سر عام سزا دینے کے تقاضے پورے کرنے کے لئے انہوں نے کون سی جگہ کا انتخاب کیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سزا کو دیکھ سکیں اور عبرت پکڑیں' دراصل اسلام کے تعزیری نظام کا مقصد یہ ہے کہ مجرم کو ایسی سزا دی جائے کہ جرم کے تمام امکانات ختم ہو جائیں۔

شیخ صاحب ہماری عدلیہ کے سینئر اراکین میں سے ہیں۔ شرعی کورٹ کی سربراہی سے پہلے وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس اعتبار سے وہ ہم سب کے لئے عزت و احترام کے لائق ہیں وہ عدالت میں کوئی فیصلہ صادر فرماتے تو ظاہر ہے مروجہ قوانین کے تحت اس پر تبصرہ کی کوئی گنجائش نہ تھی (اگرچہ ازروئے شریعت کسی جج کے فیصلہ پر بیرون عدالت دینی اعتبار سے نقد و جرح نہ صرف جائز ہے بلکہ اہل علم کے لئے بعض صورتوں میں لازم اور فرض بھی ہے) لیکن اب جبکہ اخباری انٹرویو کے ذریعے ایک مسئلہ پر انہوں نے

اپنی رائے ظاہر کی ہے ان کی خدمت میں اس سے متعلقہ چند مباحث پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے وہ اسے کسی طور بھی اپنے مقام و منصب کے وقار کے منافی قرار نہیں دیں گے اور کھلے دل سے ان پر غور و خوض فرما کر اہل وطن کو اپنے خیالات عالیہ سے آگاہ فرمائیں گے۔

بدقسمتی سے اسلام کے نظام تعزیرات کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ سزائیں وحشیانہ ہیں' ان میں انسانیت کا احترام مفقود ہے ان میں تعذیب یعنی عذاب دینے کا پہلو تو پایا جاتا ہے تہذیب یعنی مجرم کو سدھارنے کی خواہش ناپید ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر کوڑوں کی سزا کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ کوڑوں کی موجودہ سزا کم سے کم پاکستان میں ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے۔ ہم نے اسے یہاں اسلامی قانون کے طور پر کبھی رائج و نافذ نہیں کیا اس میں شبہ نہیں کہ قرآن حکیم اور سنت رسولؐ میں کوڑوں کی سزا کا حکم ہے لیکن وہ صرف تین جرائم کے لئے ہے' ان میں سے دو کی صراحت قرآن حکیم کی سورۃ النور کی آیات میں ہے اور ایک کی کتب احادیث میں' پہلا جرم زنا کا ہے جس پر سو کوڑوں کی سزا مقرر ہے دوسرا قذف (یعنی کسی مرد یا عورت پر زنا کا بہتان باندھنا) اس کے لئے شریعت نے اسی کوڑوں کی سزا رکھی ہے اور تیسرا جرم شراب نوشی کا ہے جس کے لئے اسی کوڑے مقرر ہیں' اس تیسری سزا کی صراحت بخاری مسلم ترمذی اور ابو داؤد کی "کتاب الحدود" میں ہے۔ نیز موطا امام مالک کی "کتاب الاشربہ" میں بھی اسے بیان کیا گیا ہے ان تین جرائم کے علاوہ اسلام نے کسی جرم میں کوڑوں کی سزا دینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی کتب احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ صاف صاف ارشاد منقول ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"حدود اللہ کے علاوہ کسی شخص کو بھی دس کوڑوں سے زیادہ کی سزا نہ دی جائے"

ایک اخباری کالم میں علمی حوالوں کی ثقاہت پڑھنے والوں کو گراں نہ گزرتی تو ہمیں ان تمام احادیث کے الفاظ یہاں درج کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی لیکن پھر بھی جن حضرات کو اس ارشاد رسولؐ کو براہ راست کتب احادیث میں دیکھنے کا اشتیاق ہو وہ مسلم' ترمذی' ابن ماجہ اور سنن الدارمی کی کتب الحدود اور بخاری کی کتاب المحاربین دیکھ لیں۔

اس ارشاد رسولؐ سے صاف ثابت ہے کہ اسلام جا و بیجا اور بات بے بات پر کوڑوں کی سزا دینے کا مخالف ہے اور حدود کے علاوہ اگر قاضی کسی شخص کو کوڑوں کی سزا دینے میں کوئی ضروری مصلحت دیکھتا ہو تب بھی وہ دوسرے جرائم پر دس کوڑوں سے زیادہ کی سزا نہیں دے سکتا۔ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ کوڑوں کی موجودہ سزا ہمارے ہاں انگریزوں کی یادگار ہے۔ اس زمانے میں "تعزیرات ہند" کے نام سے انگریزوں نے جو مجموعہ قوانین ترتیب دیا تھا اصل میں کوڑے لگانے کی سزا انہی میں مذکور ہے' گوروں نے کالوں کی توہین کے جو طور طریقے اختیار کر رکھے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کچھ پالتو جلاد جو عام طور پر بھنگیوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے کوڑوں کو تیل پلا پلا کر اس کام پر مامور کیے جاتے تھے جس کو کوڑوں کی

سزادینا مقصود ہوتی تھی اس کے تمام کپڑے اتار کر اس کے بدن پر صرف ایک لنگوٹ رہنے دیا جاتا تھا اور پھر اسے ٹکٹکی سے باندھ کر جلاد فاصلے سے بھاگتا ہوا آتا اور ضرب ہائے کاری سے اس کے جسم کے پرخچے اڑا دیتا' کوڑوں سے سزا دینے کا یہی طریقہ ہم نے بدقسمتی سے انگریز سے ورثہ میں پالیا اور چونکہ ہم اپنے ملک میں اسلامی قوانین رائج کرنے کے مدعی تھے اس لئے ہمارا یہ عمل بیرونی دنیا میں اسلامی سزا کے طور مشتہر ہوا اور اس طرح خود اس سزا کے مصنفوں اور موجدوں نے ہم مقلدوں کو یہ وحشیانہ سزا دینے پر دنیا میں بدنام کرنا شروع کر دیا جیسے کہ یہ سزا دینے کے بانی وہ نہ تھے ہم تھے۔

قرآن حکیم کی سورۃ النور میں جہاں کوڑے مارنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے لئے " فاجلدوا " کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو جلد سے نکلا ہے چونکہ کوڑا عام طور پر چمڑے سے بنایا جاتا ہے اس لئے " فاجلدوا " فرمایا' ہمارے دور کے مشہور مفتی اور فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم اپنی تفسیر معارف القرآن (جلد ششم ص' 33) میں لکھتے ہیں۔

> " بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ لفظ جلد سے تعبیر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ کوڑوں یا دروں کی ضرب اس حد تک رہنی چاہئے کہ اس کا اثر انسان کی کھال تک رہے گوشت تک نہ پہنچے' خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوڑے لگانے کی سزا میں اسی توسط و اعتدال کی تلقین فرمائی کہ کوڑا نہ بہت سخت ہو جس سے گوشت تک ادھڑ جائے اور نہ بہت نرم کہ اس سے کوئی خاص تکلیف ہی نہ پہنچے "

فقہائے کرام نے سنت رسولؐ اور عمل صحابہؓ سے اس سلسلے میں جو مسائل اخذ کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

فتح القدیر جلد 4 صفحہ 121' 122 پر ہے کہ

(1) کوڑے جسم کے متفرق مقامات پر پھیلا کر مارے جائیں' ہاں سر' چہرہ اور شرم گاہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(2) زیادہ زور سے نہ مارے جائیں

(3) کوڑا مارتے وقت اسے سر تک بلند کرنا کافی ہے

(4) مرد کو کھڑا کر کے اور عورت کو بٹھا کر کوڑے مارے جائیں۔

المغنی لابن قدامہ جلد 9 صفحہ 313 پر اس سلسلے میں مزید اضافہ کیا گیا ہے اس میں آیا ہے کہ مجرم کو باندھ کر کوڑے مارنے کی ممانعت ہے نیز کوڑا ایسا استعمال کیا جائے جو نہ پرانا ہو نہ نیا' درمیانی درجے کا ہو اور اسے بھی لمبا کر کے نہ مارا جائے پھر آگے اس کی اور صراحت کی ہے کہ کوڑا نہ بالکل چھوٹا ہو جس کی ضرب نہ پہنچ سکے اور نہ لمبا ڈنڈا ہو جس سے سخت ایذا پہنچے بلکہ صرف کوڑا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں انگریزوں کے وقت سے کوڑے لگانے کی جو سزا چلی آ رہی ہے جس میں کھال تو کھال گوشت تک کے چیتھڑے اڑا دیئے جاتے ہیں' ازروئے شریعت ہرگز جائز نہیں'

شریعت جو کچھ چاہتی ہے وہ مجرم کی رسوائی ہے اس لئے سورۃ النور کی آیت نمبر 2 میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ
"اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے"

اس لحاظ سے محترم جسٹس شیخ آفتاب حسین صاحب کی ہوم سیکرٹریوں کو یہ ہدایت تو اپنی جگہ درست ہے کہ کوڑے مارتے وقت عام جگہ کا انتخاب کیا جائے البتہ یہ بات محل نظر ہے کہ ان عام جگہوں پر مجرموں کو جو کوڑے لگائے جائیں گے وہ کس حد تک اسلامی احکام کے مطابق ہیں؟

یہ ذکر بھی گزر چکا کہ ہمارے ہاں کوڑے مارنے کے لئے جو جلاد مقرر ہیں وہ عام طور پر غیر مسلم بلکہ طبقہ خاک روباں سے لئے جاتے ہیں' ان کے انتخاب میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ دیکھنے میں انتہائی مکروہ نظر آئیں اور رحم کا جذبہ تو کبھی زندگی بھر ان کے حاشیہ خیال ہی میں نہ آیا ہو اسلامی نقطۂ نظر سے جلادوں کا یہ انتخاب اور تقرر بھی درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد چہارم کے صفحہ 341 پر اس سلسلے میں جو بحث کی ہے اس میں وہ کہتے ہیں۔

"مار کا کام اجڈ جلادوں سے نہیں لینا چاہئے بلکہ صاحب علم و بصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہئے جو جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لئے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حضرت علیؓ ' حضرت زبیرؓ ' مقداد بن عمروؓ ' محمد بنؓ مسلمہؓ ' عامر بن ثابت اور ضحاک بن سفیان جیسے صلحاء معززین سے جلاد کی خدمت لی جاتی تھی"

امام بن قیمؒ کے حوالے سے مولانا مودودی مرحوم نے جو تصریحات پیش کی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوڑے مارنے کی سزا پیشہ ور سنگ دل جلادوں سے لینے کے بجائے ملک کے علماء کو انجام دینی چاہئے جو یہ جانتے ہوں کہ سزا کے نفاذ کے وقت نہ انہیں سخت ہونا ہے اور نہ نرم بلکہ حد اعتدال کے اندر رہنا ہے۔ علمائے کرام یہ کام نہ کر سکیں تو پھر خدا ترس اور متقی افسر خود یہ کام کریں انہیں اس کام میں اس لئے بھی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے کیونکہ نفاذ شریعت ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے اور فریضہ منصبی کی ادائیگی از روئے اسلام عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

کوڑوں کی سزا کے سلسلے میں اسلامی قانون میں جو حدود و قواعد ملحوظ رکھے گئے ہیں' ہم نے مندرجہ بالا تصریحات میں مختصراً ان پر روشنی ڈالی ہے قارئین خود فیصلہ کر لیں گے کہ اس میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی قرآن و حدیث اور فقہائے کرام کے حوالوں سے ہر بات کا ثبوت پیش کیا ہے' ان گذارشات کے سامنے آنے کے بعد شرعی عدالت کے فاضل چیف جسٹس کا فرض ہے کہ جہاں انہوں نے کوڑے مارنے کے لئے ہوم سیکرٹریوں کو ہدایت کی ہے کہ اس کے لئے عام جگہوں کا انتخاب کیا جائے وہاں وہ یہ ہدایات بھی جاری کریں کہ

(1) حدود اللہ کے سوا کوڑے مارنے کی سزا نہ دی جائے اور اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو تو سزا کسی صورت دس کوڑوں سے متجاوز نہ ہو۔

(2) تیل پلائے ہوئے موجودہ کوڑے موقوف کر کے معتدل قسم کے کوڑے استعمال کئے جائیں جو نہ بڑے ہوں نہ چھوٹے نہ نرم ہوں اور نہ سخت۔

(3) انہیں مارتے وقت مجرموں کو باندھا نہ جائے۔

(4) ایک ہی جگہ پر اتنے کوڑے نہ مارے جائیں کہ کھال تو کھال گوشت بھی ادھڑ کر رہ جائے۔

(5) نیز ہر مقام پر کوڑے مارنے کے لئے اصحاب علم اور نیک افسران کو نامزد کیا جائے اور پیشہ ور جلادوں سے یہ کام نہ لیا جائے۔

ان کی ان ہدایات کے بعد امید کی جا سکتی ہے کہ تعزیرات ہند سے ورثہ میں ملنے والی کوڑوں کی سزا میں اسلامی نقطہ نظر سے ترمیم و تصحیح ہو سکے گی اور اس طرح اغیار کو مفت میں ہم پر طعنہ زنی کرنے کا موقع نہیں ملے گا کہ ہمارا قانون وحشت و بربریت پر مبنی ہے۔

(25ر فروری 82ء)

دین اور سیاست کی یک جائی کا مبالغہ آمیز تصور

کراچی سے لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سعید احمد صاحب سابق سپرنٹنڈنٹ و سرجن جناح ہسپتال اپنے ایک طویل مراسلے میں لکھتے ہیں۔

"پاکستان میں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ مذہب اور سیاست کو علیحدہ کرنا مناسب نہیں ورنہ بقول اقبال" چنگیزی رہ جائے گی مگر مریضوں کا علاج معالجہ نرسنگ، ہسپتالوں میں علاج اور دیگر اس قسم کی مصروفیات کا بھی میری رائے میں مذہب سے گہرا تعلق ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے مذہبی راہنماؤں نے اس شعبے سے کوئی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اس کے برعکس عیسائی مذہب کے پادریوں نے اس شعبے میں بہت دلچسپی لی ہے چنانچہ میڈیکل مشن عیسائی مذہب کے عملی کام کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی عیسائیوں نے کئی ہسپتال نرسنگ سکول اور جذام کے ہسپتال وغیرہ بنا رکھے ہیں اس کے علاوہ پادری صاحبان بائیسکل پر سوار ہر عیسائی مریض کو ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور ملنے کے لئے جاتے ہیں اور اسے تسلی و تشفی دیتے ہیں مرنے سے پہلے اس کے پاس جا کر دعا پڑھتے ہیں ہر مرنے والے پر ایک ایسا وقت آتا ہے جب دوا بے سود ہو جاتی ہے اور مریض اپنے خالق حقیقی کے پاس جانے کے لئے تیار ہوتا ہے اس وقت مریض کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی اس کو

روحانی تسلی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے ڈاکٹر کے بجائے علمائے کرام زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ میں نے کسی ہسپتال میں ایسے وقت میں کسی مولوی صاحب کو آتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ اکثر یہ دیکھا ہے کہ مریض کے رشتہ دار ڈاکٹروں اور نرسوں کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے یہی ملک الموت ہیں۔ حالانکہ مسلمان کا یقین تو ایسے وقت میں خدا پر ہونا چاہئے اخباروں میں بھی بعد از مرگ اگر کوئی شکریئے کے الفاظ ڈاکٹروں اور نرسوں کے لئے دیکھے گئے ہیں تو وہ بھی عیسائیوں کی طرف سے ہوتے ہیں مسلمانوں کی طرف سے تو یہ رسم ہی نہیں اس قسم کے اخلاق میں اصلاح کی ضرورت ہے اور عیسائیوں کے رواج اور طریقے سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے مذہب کو عملی طور پر صرف مسجدوں یا عبادات و ریاضات تک محدود نہیں رہنا چاہئے اس کا جذبہ بیمار اور معذور لوگوں کی خدمت کی صورت میں بھی عیاں ہونا چاہئے"

....

یہ ایک دردمند اور تجربہ کار مسلمان معالج کے الفاظ ہیں جن میں انہوں نے معاشرے کی ایک اہم فروگذاشت کی نشاندہی کی ہے جس کا تعلق بیماروں اور ہسپتالوں سے ہے لیکن سوال صرف اس ایک فروگذاشت کا نہیں زندگی کے کتنے ہی میدان ہیں جو ہماری توجہ کے طلب گار ہیں جنہیں ہم خدمت خلق کے ساتھ ساتھ نیکی کمانے اور اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں مگر ہم ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس کا سبب شاید وہ نقطہ نظر ہے جس کی رو سے اسلام کو صرف سیاسیات تک محدود کر دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں زندگی کے دوسرے اخلاقی اور روحانی تقاضے نظر انداز ہو چکے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے ان پہلوؤں میں ایک سیاست بھی ہے اس لئے اس شعبہ میں بھی اس کی تعلیمات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا لیکن خرابی جہاں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے سیاست کو زندگی کا ایک جز سمجھنے کی بجائے کل سمجھ لیا ہے اور ہم پورے دین کو اس جزو کے ارد گرد گھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دین سیاست سے مغلوب ہو گیا ہے اور ہم دینی سیاست کی جگہ ایک سیاسی دین کے پیروکار بن گئے ہیں۔

....

بیسویں صدی میں احیائے دین کی جو تحریکیں چلیں اور انہوں نے جو اسلامی لٹریچر پیدا کیا اس سے جہاں بہت سے فائدے ہوئے وہاں ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ دین اور سیاست کی یک جائی کا ایک یک رخا اور مبالغہ آمیز تصور ایک ناقابل تردید نظریہ اور اسلامی اصول کی حیثیت میں ہر چہار طرف پھیل گیا۔ یہ نظریہ اس حد تک درست تھا کہ اسلام سیاست میں بھی بعض تعلیمات اور ہدایات عطا فرماتا ہے۔ مثلاً یہی کہ سیاست کو بددیانتی اور دھوکے پر استوار نہیں ہونا چاہئے اس میں سچائی کی روح برقرار رہنی چاہئے یا پھر اس

کا یہ پہلو کہ دینی پیشوائی اور سیاسی قیادت کا دو الگ الگ خانوں میں بٹوارہ نہیں ہونا چاہئے وہی لوگ سیاسی قیادت کے اہل قرار دیئے جائیں جو دینی اعتبار سے بھی پیشوائی کے لائق ہوں اس طرح اس کا یہ پہلو بھی اپنی جگہ صحیح تھا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں بلکہ دنیا کو اگر دینی اصولوں کے مطابق برتنے کی کوشش کی جائے تو وہ عین دین بن جاتی ہے اس لحاظ سے نیکو کاروں کو کاروبار دنیا سے الگ تھلگ رہ کر سیاست اور نظام حکومت کا میدان غلط کاروں کے سپرد نہیں کر دینا چاہئے مگر اس نظریئے کا توازن وہاں بگڑا جہاں پورے دین کی توجیہہ و تشریح سیاسی عینک لگا کر کی گئی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ سیاست میں حصہ لینا ہی اسلام کے نزدیک اعلیٰ وارفع عمل ہے اور اس کی باقی تمام عبادات و ہدایات اسی کام کی تربیت لینے کا ایک ذریعہ ہیں اور بس۔ اس نظریہ کے تحت دنیا میں انبیائے کرام کی تشریف آوری کا مقصد ہی یہ ٹھہرایا گیا کہ وہ اسلامی حکومت قائم کریں حالانکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبران کرام میں سے صرف تین انبیاء ہی ایسے تھے جو حکومت پر فائز ہوئے داؤد، سلیمان اور محمد علیہم السلام۔ اگر حکومت اور سیاست ہی انبیائے کرام کی بعثت کا منتہائے مقصود تھی تو اس نظریہ کی رو سے باقی تمام انبیاء و رسل کا مشن ناکام قرار دیا جائے گا لیکن چونکہ بیسویں صدی میں اٹھنے والی مذہبی تحریکیں دوسری عصری تحریکوں سے متاثر تھیں اس لئے انہیں اپنے استدلال کے اس جھول کا احساس نہیں ہوا اور انہوں نے اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد اور اس میں حصہ لینے کی سیاسی کارروائی کو اصل دین بنا دیا اور یہیں سے دین پر سیاست کے غلبے کی راہ ہموار ہوئی۔

....

اس نظریہ کی اشاعت اور فروغ سے عبادات و روحانیات کا تصور یکسر بدل گیا اب الیکشن میں حصہ لینا "جہاد" ٹھہرا اور اس میں ووٹ کا استعمال "لیلتہ القدر میں عبادت کرنے سے افضل" قرار پایا غریبوں اور حاجت مندوں پر خرچ کرنے کی نسبت اس مقصد کے لئے ہونے والے سیاسی جلسوں کی کامیابی کے لئے چندہ دینا زیادہ کار ثواب سمجھا گیا۔ عبادت میں وقت صرف کرنے کے بجائے کانفرنس اور کنونشن کا انتظام اور اس کے لئے پوسٹر لگانا اعلیٰ ترین نیکی بن گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین جو رحمت و رافت اور اخوت و محبت کا علمبردار تھا سیاسی مخالفوں کے لئے تشدد اور اذیت کا ذریعہ و وسیلہ قرار پایا جو مسلمان اس سیاست سے مختلف نظریئے کا حامل نظر آیا وہ اسلام دشمن ٹھہرا اور اس طرح دین اور سیاست کی یک جائی کے مبالغہ آمیز تصور نے مسلمانوں ہی کے معاشرے میں "اسلام پسند" اور "اسلام دشمن" طبقات پیدا کرائے اب مخالفوں سے نبٹنے کے لئے مسلح ہونا جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہونے کے مترادف بن گیا۔ غازی اور شہید کی اصطلاحوں کے مفہوم بدل گئے۔ یہ اسی زاویہ نظر کا کرشمہ ہے کہ مصر میں صدر انور سادات کو قتل کیا جاتا ہے اور قاتل فخر سے اپنے اس کارنامے کی داد چاہتے ہیں اور اسلامی سیاست کے علمبردار حلقے جگہ جگہ اس قتل کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے یہ بھی تاریخ اسلام کا کوئی یادگار واقعہ ہو یہ کوئی

نہیں سوچتا کہ قتل مومن پر قرآن حکیم میں کیا وعید آئی ہے۔ یہ بھی اس طرز فکر کا شاہکار ہے کہ شام میں حکومت کا تختہ الٹنے کی مسلح جدوجہد ہوتی ہے۔ بم پھٹتے ہیں دھماکے ہوتے ہیں۔ مسلمان مسلمان کا خون بہاتا ہے اور یہ حلقے اس خونی جدوجہد کو اس مرصع انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے بدر واحد کی داستاں دہرائی جا رہی ہو یہی حال ایران کا ہے جہاں سینکڑوں کلمہ گو مسلمان آئے دن تختہ دار پر کھینچے جاتے ہیں اور ان کا قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ مذہب اور سیاست کو ایک ماننے سے منکر ہیں۔

....

دین اور سیاست کی یک جائی کے اس مبالغہ آمیز تصور کی تائید میں عام طور پر علامہ اقبالؒ مرحوم کا یہ مصرعہ پیش کیا جاتا ہے کہ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حالانکہ اس مصرعہ میں انہوں نے سیاست کو مشرف بہ دین کرنے کی تلقین کی ہے نہ کہ دین کو سیاست بنا دینے کی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ جب بھی سیاست اور نظام حکومت کا تعلق دینی تعلیمات سے کاٹ دیا جاتا ہے اور انہیں دھوکا فریب اور مادہ پرستی کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو خلق خدا عدل وانصاف سے محروم ہو کر استبداد اور ظلم وستم کا نشانہ بن جاتی ہے۔ حاکم وقت جب اسلامی اور الہامی اصولوں پر کاربند نہیں ہوتا تو وہ چنگیز بن کر آمریت کی نت نئی رسمیں ایجاد کرتا ہے دیکھا جائے تو اقبالؒ کے اس مصرعہ میں انسانی تاریخ کی مکمل روئیداد سمٹ کر آ گئی ہے۔ اب اس مفہوم کی جگہ اقبالؒ کے منہ میں یہ الفاظ ڈالنے کی کوشش کرنا کہ وہ دین کو سیاست کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں اور اس سے تمام تر روحانیت سلب کر لینے کے حق میں ہیں محض سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ الٹا اقبالؒ نے اس طرز سیاست کو خیرباد کہہ کر اسلام کی اعلیٰ روحانی قدروں کا پرچم بلند کرنے کی تلقین کی ہے خدا جانے اپنے نظریہ کی تائید میں اقبالؒ کا یہ مصرعہ پیش کرنے والے اصحاب اس کا یہ مصرعہ کیوں بھول جاتے ہیں یہ بھی تو اسی کا کلام ہے کہ ع

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو

....

دین اور سیاست کے ایک ہونے کا خیال ہمارے معاشرے میں اس شدت سے پھیلا ہے کہ اب سیاست کے بغیر دینی خدمت کا تصور ایک امر محال بن کر رہ گیا ہے جس کسی کو دینی تقاضے پورے کرنے ہیں وہ لازماً کسی مذہبی سیاسی جماعت سے وابستگی اختیار کرے اس کے لئے کنویسنگ کرنے کو عبادت جانے اس سے اختلاف رکھنے والوں سے بغض رکھنے اور انہیں بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس مبالغہ آمیز تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف معاشرے میں نفرتوں کی فصل لہلہا رہی ہے اور دوسری طرف وہ کام جن سے نیکی پھلتی پھولتی اور روحانیت کے چراغ روشن ہوتے ہیں معمولی اور ناقابل

التفات قرار دے کر نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں حالانکہ جس چیز کا نام اسلامی حکومت ہے۔ اسلامی معاشرے کے درخت ہی پر وہ پھل لٹکتا ہے جسے اسلامی حکومت کہتے ہیں اور یہ درخت اس وقت تک برگ وبار نہیں لاتا اور زمین میں اپنی جڑیں نہیں چھوڑتا جب تک کچھ دیوانگان شوق اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔

ہمارا معاشرہ اس وقت بدقسمتی سے اسلامی سیاست کے بجائے جس "سیاسی اسلام" کی زد میں ہے اس میں نعرے بازی زوروں پر ہے اور روحانی کام پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ہمارے مراسلہ نگار ڈاکٹر سعید احمد نے بجاطور پر ایک روحانی کام کی نشاندہی کی ہے اور وہ ہسپتالوں کے شعبے سے متعلق ہے اگر ہمارے ملک میں محلّہ وار ایسی تنظیمیں بن جائیں جن کا کام مریضوں کی فلاح و بہبود ہو۔ وہ غریب مریضوں کے لئے دوادارو کا انتظام کریں اور نہیں تو ہفتے میں ایک دن ان کی عیادت کے لئے وقت نکالیں۔ انہیں پھولوں کے گلدستے پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحبان علاج کے وقت روحانیت کا جزو بھی اس میں شامل کر لیں۔ مثال کے طور پر آپریشن سے پہلے اور بعد دعا کی عادت ڈالیں مذہبی راہنما اور علماء صاحبان ہسپتالوں میں مریضوں کے وقتِ آخر میں انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں تو تنہا اسی کام سے معاشرے کی کایاپلٹ سکتی ہے۔ یہ تو روحانیت کے فروغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے صرف ایک شعبہ ہے ذرا سی منصوبہ بندی کی جائے تو ایسے کتنے ہی میدان اور نکل آئیں گے جن میں تگ وتازِ وقت کی آواز ہے۔ یاد رکھئے سیاست زدہ دینی تصورات نے گناہ گار سے نفرت کرنے اور بھائی کو بھائی سے لڑانے کے جو فتنے کھڑے کئے ہیں ان کا مقابلہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک روحانیت کی حس بیدار ہونے کے بعد اس معاشرے کا ہر فرد نفرتوں کے ان سوداگروں کے بالمقابل یہ نہ کہہ اٹھے کہ۔

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ جس سے ہو
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
میں کسی کو بُرا کہوں، توبہ!
ساری دنیا سے خود بُرا ہوں میں

(18 مارچ 82ء)

روایتی پردہ اور اسلامی تعلیمات

قارئین کرام کی گذشتہ محفل میں کراچی سے ایک خاتون کا خط کیا چھپا' قیامت آ گئی۔ مراسلوں پر مراسلے اس مضمون کے آنے لگے کہ ان خاتون نے تو بے پردگی کی حمایت کر دی اس کی تردید ہونی چاہئے۔ ان محترمہ نے جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ اتنا ہے کہ طواف کعبہ کے وقت عورت اس لئے پردہ نہیں کرتی چونکہ اس سے اس کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے آگے چل کر انہوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جہاں کہیں بھی ایسی صورت حال پیدا ہو دفع حرج کے لئے عورت کو اسلام میں ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ مثال اس کی انہوں نے یہ دی کہ آج کراچی کی بندر روڈ کراس کرتے وقت یا کسی دفتر میں ملازمت کرتے وقت بھی اس کو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے ان صورتوں میں بھی عورت سے برقع کرنے کا اصرار مناسب نہ ہو گا۔

اس پر مزنگ لاہور سے جناب ابو الکمال لکھتے ہیں'

"مشاہدات و تاثرات میں بے پردگی کی حمایت میں آپ نے ایک خط شائع کر دیا ہے' لگتا ہے کہ آپ بھی برقع اور پردے کے خلاف ہیں۔ اگر ہمت ہے تو اس پر کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔

ابو لکمال صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس موضوع پر اظہار خیال نہ کرنے میں ہمت کے فقدان کا سوال نہیں وہ تو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کر رکھی ہے۔ اصل دقت یہ ہے کہ میں اس مسئلے پر

آج سے چند ماہ پیشتر اسی کالم میں "روایتی پردے کا تصور اور اسلام" کے عنوان سے اپنی گزارشات پیش کر چکا ہوں۔ تکرار اور اعادہ مجھے پسند نہیں۔ ہاں عورت کے مقام کے تعین کے سلسلے میں جدید معاشرت نے جو الجھنیں پیدا کر دی ہیں ان پر قلم اٹھانے کا ارادہ ہے۔ انشاء اللہ اس سے میرے خیالات تفصیل کے ساتھ قارئین کے سامنے آجائیں گے۔

جہاں تک روایتی پردے کا تعلق ہے اس سلسلے میں صرف اتنی گزارش کروں گا کہ بد قسمتی سے ہمارا معاشرہ بعض دوسرے امور کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط کا شکار ہے۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو عورت کو کپڑے کے تھانوں میں لپیٹ کر اجتماعی زندگی سے بالکل بے تعلق اور بے دخل بنا دینا چاہتا ہے دوسری طرف وہ گروہ ہے جو عورتوں کے حقوق کی آڑ میں اس کے جسم پر کپڑے کی ایک آدھ دھجی لٹکا کر اسے بے حیائی کا چلتا پھرتا اشتہار بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ دونوں انتہا پسندانہ نقطہ ہائے نظر اسلام کے مسلکِ اعتدال کے منافی ہیں۔ بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہ روایتی پردہ ہی اسلامی ہے اور نہ عورت کو فیشن کی گڑیا بنا کر کوچہ و بازار میں رسوا کرنا ہی شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔ راہ صواب ان دونوں کے درمیان ہے اور جب تک اسے اختیار نہیں کیا جائے گا۔ سوسائٹی قدیم اور جدید کی اس آویزش سے نجات نہیں پا سکتی۔ اس چیز کا ادراک کہ عورتوں کی گھر سے باہر آمدورفت پر پابندی اور انہیں برقع پہنانے کی رسم کہاں تک اسلامی ہے اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر ہم قرآن پاک کی طرف رجوع کریں اور ان معاملات پر اس کے احکام و تعلیمات معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ سورۃ النور میں قرآن پاک فرماتا ہے،

> "مومنوں سے کہو کہ وہ نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور مومنات سے کہیں کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینتوں کو ظاہر نہ کریں سوائے ان کے جو ان میں سے (عام طور پر) ظاہر ہو جاتی ہیں۔" (النور 31-30)

ان ارشادات ربانی میں دو نکتے ہماری گہری توجہ کے مستحق ہیں۔ پہلا یہ کہ مردوں کو حکم ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور دوسرا یہ کہ عورتوں کو حکم ہے کہ وہ اپنے حسن کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو مجبوراً ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں ثابت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں عورتوں کو گھروں میں بند نہ کیا جاتا تھا اور وہ مختلف امور کو سرانجام دینے کے لئے گھروں سے باہر آتی جاتی تھیں اگر ایسا نہ ہوتا تو مردوں کو دیا جانے والا نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم زائد از ضرورت تھا۔ اسی طرح اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسول پاکؐ کے زمانے میں عورتوں کے چہرے کھلے رہتے تھے ورنہ ان کے لئے نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم بے معنی ہوتا۔ پھر یہ بات کہ عورتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے حسن کی نمائش نہ کریں سوائے اس کے کہ کچھ حصے ضرور تاً ظاہر ہو جاتے ہیں۔ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ان کے چہرے ڈھکے ہوئے نہ ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا آیت اور عورتوں کے لئے اپنی زینت کی سوائے اس کے جو ضرور تاً ظاہر ہو

جائے نمائش نہ کرنے کے حکم کے حوالے سے فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ہدایہ" کا مصنف لکھتا ہے،

"یہ اس وجہ سے ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کا کھلا رکھنا ضرور تاً ہے یہ چیز مردوں کے ساتھ لین دین اور دوسرے معاملات کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عورتوں کے پاؤں کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں لیکن ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق یہ جائز ہے کیونکہ بعض اوقات اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اور ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق عورت کے بازوؤں کی طرف دیکھنا بھی جائز ہے کیونکہ عام حالات میں بازو کھلے رہتے ہیں۔" (الھدایہ جلد 4 ص 458)

فی الحقیقت عورتوں کے ان حقوق کا جو انہیں قرآن نے عطا کئے ہیں یہ ضیاع رواجی قوانین کے قوی اثرات کے باعث تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اسلام کئی ممالک میں پھیل گیا تو قرآنی اصلاحات اور نو مسلموں کے مستحکم معاشرتی رواجات کے مابین باہمی عمل اور تصادم نے نئی ثقافتی ترغیبات پیدا کیں جنہوں نے بالآخر عورت کی حیثیت کم تر کر دی مثلاً جب مسلمان شام عراق ایران اور مصر کے شہروں میں وارد ہوئے تو ان کی عورتوں نے امتیاز اور شناخت کے طور پر چہروں پر نقاب ڈالنے شروع کر دیئے تاکہ انہیں ان پست اخلاق عوتوں میں نہ سمجھ لیا جائے جو بے پردہ رہتی تھیں، اسی طرح عورتوں کی علیحدہ نشینی (حرم یا پردہ) کا طریقہ جو بازنطین اور ایران میں مروج تھا بغداد کے دربار میں بھی داخل ہو گیا اور بعدازاں مسلم ممالک میں اسے عمومی قبولیت حاصل ہو گئی۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ رائے دی ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ شادی سے پہلے اسے دیکھ لیا کریں۔ امام رازی رحمتہ اللہ علیہ رقم طراز ہیں

"ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ایک شخص انصار کی ایک عورت کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا پس رسولؐ خدا نے اس سے فرمایا "اسے ایک نظر دیکھ لو اور حضورؐ نے فرمایا اگر تم کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا چاہو تو اس کو دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (مفاتیح الغیب جلد ششم ص 253)

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روایتی پردہ یا عورتوں کی خانہ نشینی جو آج کل بعض مسلم ممالک میں مروج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے زمانہ میں ناپید تھی ورنہ نکاح کی غرض سے عورتوں کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

ازمنہ متوسطہ میں عورتیں کیوں خانہ نشیں کر دی گئیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جاگیردارانہ نظام اقتصاد کے تحت زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس نظام میں زندگی غیر متحرک تھی لوگ اسی شہر

قصبے ہی میں پڑے رہتے جہاں ان کا قیام ہوتا تھا اور وہ ایک شہر یا قصبے سے دوسرے شہر یا قصبے میں آتے جاتے نہ تھے، سفر اور نقل و حرکت کے مواقع محدود تھے بڑے پیمانے کی ایسی صنعتیں نہ تھیں جن میں عورتوں کو ملازمت دی جا سکتی اس لئے عورتوں کو اپنے گھروں سے باہر جانے کے لئے مواقع نہ ملتے تھے اور وہ زیادہ تر گھریلو کاموں مثلاً گھر کے مردوں کے لئے کھانا پکانے میں مصروف رہتی تھیں لیکن اس کے برعکس معاشرے کے جاگیردارانہ نظام کے باوجود بھی گاؤں اور دیہاتی علاقوں میں عورتیں روایتی پردے کی پابندی نہ کرتی تھیں اور گھروں میں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ نہ جاتی تھیں۔ اس ضمن میں دیہاتی زندگی شہری زندگی سے بالکل مختلف تھی کیونکہ دیہات میں عورتیں اپنے مردوں کے ہمراہ کھیتوں میں کام کیا کرتی تھیں۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ عورتوں کا الگ تھلگ رہنا معاشرے کے جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے تھا اور اس کا کوئی تعلق لازمی اسلامی احکام سے نہ تھا۔ آج کل صنعت کی ترقی اور نشوونما کی بدولت صورت حال یکسر بدل گئی ہے، خاندان اکثر اپنی سکونتیں بدلتے رہتے ہیں اور انہیں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانا پڑتا ہے۔ عورتیں کارخانوں اور عوامی دفاتر میں کام کرتی ہیں اس لئے قدرتاً گھریلو فرائض کی طرف توجہ کیلئے ان کے پاس کم وقت بچتا ہے اس صورت میں وہ تصورات درہم برہم ہو رہے ہیں جن کے مطابق عورت اور مرد کے درمیان تقسیم کار کا یہ عقیدہ بنا ہوا تھا کہ گھر سے باہر کے کام کاج مرد کے ذمے ہیں اور گھر کے اندر کے کام عورت کے ذمے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تقسیم کار خود ہمارے ذہنوں کی پیداوار ہے یا ہماری مخصوص معاشرت اور معاشی ضرورتوں کا تقاضا ورنہ جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے ان میں اس طرح کا کوئی حکم موجود نہیں جس کے تحت عورت کو گھر کے کام کاج کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ اس مسئلے پر ہمارے فقہائے کرام نے بھی بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

> "اور مالک، ابو حنیفہ اور شافعی رحمتہ اللہ علیہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ عورت مرد کے لئے گھریلو خدمات سرانجام دینے پر مجبور نہیں ہے کیونکہ معاہدہ نکاح کا مقصد یہ ہے کہ مرد اس سے جنسی تمتع حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ وہ خاوند کی خدمت بھی کرے" (یعنی گھریلو کام سرانجام دے) " (فقہ السنہ جلد 7 ص 166)

اسی موضوع پر لکھتے ہوئے امام ابن حزم رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں،

> "کسی عورت پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ خاوند کی خدمت گاری کرے نہ کھانا تیار کرنے کے لئے، نہ بستر لگانے کے لئے نہ گھر میں صفائی کرنے کے لئے اور نہ ہی سوت کاتنے یا کپڑا بننے کے لئے" (المحلہ جلد 10 ص 74)

ان مختصر گزارشات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عورت کے مقام اور سوسائٹی میں اس کی حیثیت کے متعلق قرآنی نظریات ان تصورات سے کتنے مختلف ہیں جو مخصوص جغرافیائی، علاقائی اور مقامی اثرات

کے نتیجے میں ہم نے وضع کئے اور آہستہ آہستہ ان پر تقدس کا رنگ چڑھا کر انھیں منزل من اللہ بنادیا۔ حقیقت میں ہمارے یہ تصورات کتاب و سنت پر مبنی ہونے کے بجائے ایک خاص دور کی معاشرت کی پیداوار ہیں مگر جہاں تک معاشرت کا تعلق ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے 'ایک زندہ قوم فقط اپنے اصولوں پر اصرار کرتی ہے ان سے سمجھوتہ نہیں کرتی لیکن جہاں تک تفصیلات اور جزئیات کا تعلق ہے وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ مسئلہ زیر بحث میں بھی صورتِ معاملہ یہی ہے۔ جہاں تک عورت کی عزت و عصمت اور اس کی حیا کی حفاظت کا تعلق ہے اس میں کبھی کوئی نرمی یا کمزوری نہیں دکھائی جانی چاہئے۔ عورت اور مرد کے غیر ضروری اختلاط کی بھی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے لیکن جہاں تک برقع اور روایتی پردے کا تعلق ہے اس صنعتی دور میں جہاں ترقی پذیر ممالک کو زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کارکنوں کی بھی ضرورت ہے 'اس پر زور دینا اور ایک مخصوص معاشرتی علامت کو دین و ایمان کا تقاضا بنا کر پیش کرنا اسلام سے نادان دوستی کے مترادف ہو گا۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید خاندان کے بارے میں جس نازک مسئلے کا حل ضروری ہے وہ ہمارے معاشرے میں عورت کی حیثیت کا مسئلہ ہے اگر یہ مسئلہ طے ہو جائے تو خاندان سے تعلق رکھنے والے بیشتر مسائل آسان ہو جاتے ہیں کیونکہ خاندان میں عورت سب سے زیادہ اثر و رسوخ رکھتی ہے آج مسلم خاندان کو جدید معاشرے کی طرف سے آزمائشوں کا سامنا اسی وجہ سے ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عورت کی روایتی حیثیت میں ترمیم نہیں کی گئی۔ ہم عورت کے مجلسی مرتبے کے متعلق قرون وسطیٰ کے تصورات پر قائم ہیں اور عصری تقاضوں کے تحت اس میں جو تغیرات لازمی ہیں ان کے خلاف زور آزمائی میں مصروف ہیں۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ وہ علمائے کرام جنھوں نے عورتوں کے سلسلے میں ہمارے لئے اسلامی تعلیمات کی تشریحات چھوڑی ہیں وہ ایک خاص وقت اور عہد سے تعلق رکھتے تھے وہ یہ تشریحات کرتے وقت اپنے معاشرتی حالات سے اپنے آپ کو الگ تھلک نہیں کر سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان تشریحات پر اس دور کی مخصوص معاشرت کی چھاپ بہت واضح اور نمایاں نظر آتی ہے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسلام کی تشریح جدید اس کی ابتدائی روح کے مطابق کی جائے تاکہ اسے قرون وسطیٰ کے مخصوص معاشرتی تصورات اور اثرات سے پاک کیا جاسکے جو اس کے اندر سما گئے ہیں۔ اسی بات کو علامہ اقبال مرحوم نے "ری کنسٹرکشن آف تھاٹ ان اسلام" یعنی افکار اسلامی کی تشکیل جدید کا نام دیا ہے' یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو مسلمان علماء' مفکرین اور دانش ور جتنی جلد انجام دے سکیں اتنا ہی بہتر ہو گا۔ آج عورتیں مردوں کے ساتھ برابری کا حق طلب کر رہی ہیں۔ وہ دفتروں اور کارخانوں میں کام کر کے اقتصادی خود مختاری کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ بعض ممالک میں وہ سربراہ مملکت کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں وہ نکاح اور طلاق کے معاملات میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف سراپا احتجاج

ہیں۔ اب وہ اپنے ساتھ محض کنبے کے لئے کھانا تیار کرنے والی باورچنوں کا سا سلوک قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتیں۔ ہمیں نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے ان تمام سوالات کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لینا ہو گا۔ (7، اگست 1982ء)

علمائے کرام کے باہمی اختلافات

آپ ہر جمعہ کے خطبہ میں سرکار دو عالم فخر موجودات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث سنتے ہیں کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاء اپنا ورثہ درہم و دینار کی صورت میں نہیں چھوڑتے بلکہ ان کی وراثت علم کی صورت میں ہوتی ہے اور اس کے حقدار علمائے کرام ہوتے ہیں۔ اس حدیث سے ہمارے دین میں علماء کا منصب واضح ہوتا ہے اس حیثیت سے ان پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اول یہ کہ وہ پیش آمدہ مسائل میں امت کی رہنمائی کریں اور دوم یہ کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا اور جبریلؑ کسی کے نام نامۂ حق لے کر نہیں آئیں گے اس لئے اب علماء پر ہی دنیا بھر میں اشاعت اسلام کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک علمائے کرام نے اپنا فریضہ انجام دیا اس وقت تک ہماری امت دنیا کی غالب امت رہی ہماری تہذیب دنیا کی رہنمائی کرتی رہی اور ہم کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے لیکن جب ہمارے اہل علم میں بگاڑ پیدا ہو گیا تو دنیا نے ہمیں اوج ثریا سے زمین پر دے مارا آج آپ کو اپنی جو حالت نظر آ رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر علمائے کرام نے اپنا فرض فراموش کر دیا ہے یا اگر وہ مصروف جدوجہد ہیں بھی تو تنہا تنہا۔ ان میں اجتماعیت اور مرکزیت کا فقدان ہے اور وہ متحد ہو کر وقت کے تقاضوں کو لبیک نہیں کہتے۔ میں علمائے کرام کا خادم ہوں، ملت پر ان کے جو احسانات ہیں ان کا دل سے معترف ہوں، یہ علمائے حق ہی تھے جو بے سروسامانی کے باوجود فرنگی استبداد سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے روکھی سوکھی روٹی کھائی۔ بوریئے اور چٹائی پر بیٹھے اور مخالفت کی تیز اور

تند آندھیوں میں بھی دین کی مشعل کو بجھنے نہیں دیا لیکن اس عقیدت مندی کے باوجود اگر میں یہ نہ کہوں تو کتمانِ حق ہو گا کہ آج نوجوان طبقے کو دین سے دور کرنے میں جہاں اور بہت سی وجوہ ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علمائے کرام میں اتحاد نہیں۔ ان کی اکثریت آپس میں دست بہ گریبان ہے اور نئی تعلیم یافتہ نسل بتدریج ان سے بدظن ہوتی جارہی ہے۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے علمائے کرام میں اتحاد و اتفاق نہ ہونے کی وجہ نہایت معمولی ہے۔ گو ماضی کے علماء بھی اس سے محفوظ نہ تھے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس کے باوجود باہم شیر و شکر تھے' یوں یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے اور ایک وقت میں ہونے کی بناء پر اکثر علماء ایک دوسرے کے علم و فضل اور بزرگی کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں عربی کا ایک مقولہ ہے۔ "اَلْمُعَاصِرَةُ سَبَبُ الْمُنَافِرَةِ" (ایک وقت میں ہونا' ہم عصر ہونا منافرت کا باعث ہے) چنانچہ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ اگر دو فاضل ہم عصر ہیں تو وہ ایک دوسرے کے علم کا اعتراف نہیں کرتے۔ اکثر صورتوں میں تو وہ ایک دوسرے کے احترام سے بھی عاری ہوتے ہیں اور یہیں سے ذاتی اختلافات پیدا ہوتے ہیں' جو بڑھتے بڑھتے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے دین کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے سلف بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے کمالِ علمی اور مرتبۂ دینی کے معترف بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم تو عالم ہیں اگر کسی غیر عالم سے بھی انہیں کوئی اچھی بات مل جاتی تھی تو وہ بڑے جذبۂ امتنان کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ احناف' اہل حدیث اور شیعہ تو مسلمانوں کے مشہور مکاتب فکر ہیں میں ان کے علماء کی بات نہیں کرتا وہ فرقے جن کا تذکرہ آج صرف کتابوں میں پایا جاتا ہے ہمارے علماء ان تک کے اہل علم کا احترام بجالاتے تھے۔

تذکروں میں آتا ہے کہ ایک بار امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تکئے کا سہارا لئے نیم دراز تھے کہ فرقہ مرجیہ کے ایک عالم ابراہیم بن طہمان کا ذکر آ گیا آپ فوراً تکئے کا سہارا چھوڑ کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ جب نیک لوگوں کا تذکرہ ہو تو اسے مؤدب ہو کر سننا چاہئے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ ان بزرگوں میں جزوی نوعیت کے اختلافات نہیں بلکہ عقائد کے اختلافات ہیں لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کا عالم یہ ہے کہ ذکر آجائے تو مؤدب ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام ابن سیرینؒ اور خواجہ حسنؒ بصری دونوں ہم عصر اور جلیل القدر بزرگ تھے مگر دونوں کے درمیان نقطہ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا ایک مرتبہ باہم دگر شکر رنجی ہو گئی اور وہ ایک دوسرے سے ناراض ہو گئے لیکن اس حالت میں بھی ایک دوسرے کے احترام کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک بار کسی شخص نے امام ابن سیرینؒ کو اپنا خواب سنایا اور اس کی تعبیر دریافت کی خواب یہ تھا کہ ایک جانور مسجد میں آیا اور مسجد کا سب سے زیادہ خوبصورت سنگ ریزہ لے کر چلتا بنا۔

حضرت ابن سیرینؒ نے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ اس میں حسن بصریؒ کے انتقال کی طرف اشارہ ہے اور انہیں مسجد کے سب سے خوبصورت سنگ ریزے سے تشبیہ دی گئی ہے گویا معاصرت تو ایک طرف رہی ان سے ناراضگی بھی انہیں ان کے اجلال و احترام سے باز نہیں رکھ سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف بذات خود کوئی بری چیز نہیں دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن میں اختلافات ہیں اگر اختلاف بری چیز ہوتی تو اللہ کی مخلوق میں اختلاف نہ ہوتے' انسان ایک ہی طرز پر پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک جتنے انسان پیدا ہوئے ہیں انہیں کوئی گن بھی نہیں سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے ظاہر میں ہی اتنا اختلاف رکھا ہے کہ انہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا جاتا ہے ان کے ظواہر میں کوئی نہ کوئی اختلاف ہوتا ہے۔ ڈیل ڈول میں اختلاف' ناک نقشے میں خدوخال میں رنگ میں اختلاف اور اگر شکل و صورت میں یکسانیت بھی پائی جاتی ہو پھر بھی کہیں نہ کہیں ایسا اختلاف ضرور ہوتا ہے جس کی بناء پر ہم یہ شناخت کر لیتے ہیں کہ زید کون ہے اور بکر کون۔

حضرت امام شافعیؒ نے تو اختلافات کو وجود باری تعالیٰ کی دلیل قرار دیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ کتنے ہی انسان پیدا ہوئے اور وہ سب شکل و صورت آواز اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں کیا اتنے متنوع انسان خود بخود پیدا ہو گئے ہیں انہیں پیدا کرنے والا کوئی نہیں؟ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانی جسم کے اجزاء ایک دوسرے سے مختلف ہیں جرم و سزا کی سائنس کے تحت بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان کی مدد سے مجرموں کو پکڑا جاتا ہے کیونکہ ایک انسان کا بائیں ہاتھ کا انگوٹھا دوسرے انسان کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے اور یہ صرف انسان تک ہی محدود نہیں دوسری مخلوقات بھی اسی ضمن میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ہی نوعیت کے پھول ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ان کی پنکھڑیاں بظاہر ایک ہی طرح کی معلوم ہوتی ہیں لیکن سائنس کہتی ہے کہ ان میں بھی اختلاف ہے اگر سائنسی آلات کی مدد سے ان پنکھڑیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پنکھڑی دوسری پنکھڑی سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہے۔

اللہ اگر اختلاف کو پسند نہ کرتا تو اختلاف بھی نہ ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف بذات خود بری چیز نہیں بری چیز اختلاف کو مخالفت کا رنگ دینا ہے ورنہ انسانی عقل ایک دوسرے سے مختلف ہے کسی کی عقل پست ہے کسی کی بلند' انسانوں کی فہم و فکر میں یکسانیت موجود نہیں پھر دنیا کے ہر شعبہ زندگی میں اختلاف ہے' خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں اختلاف کو مخالفت کا رنگ دے دیا جاتا ہے اور انتشار و افتراق وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دوسرے کی سوچ کو غلط اور کفر اور اپنی فکر کو عین اسلام اور حق قرار دیا جائے دراصل خرابی کی یہی بنیاد ہے ورنہ اختلاف کوئی بری چیز نہیں۔

علماء میں پہلے بھی اختلافات تھے وہ ایک دوسرے کی رائے اور فکر سے اختلاف رکھتے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں یہ اختلاف بالکل اسی قسم کا تھا جس قسم کا اختلاف ضلع کچہری اور سیشن یا ہائی کورٹ اور سپریم

کورٹ میں ہوتا ہے ضلع کچہری میں ایک مقدمہ میں کسی ملزم کو سزا دی جاتی ہے اور سیشن یا ہائی کورٹ اسے بری قرار دے دیتا ہے ایک ہی قانون کے تحت ایک مقدمے میں سیشن اور ہائی کورٹ کے فیصلے بسا اوقات ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہوتے ہیں اس طرح انجینئروں میں اختلاف موجود ہے وہ ایک عمارت کا نقشہ اور ڈیزائن بناتے وقت ایک دوسرے سے بالکل مختلف رائے دیتے ہیں جج اور انجینئر تو بڑے لوگ ہیں معمولی دستکاروں تک کا یہی حال ہے۔ مثلاً درزیوں کو لے لیجئے کپڑے کی تراش خراش کے سلسلے میں ان کے درمیان اختلاف ہوتے ہیں اس سے یہ ثابت ہوا کہ اختلاف صرف علماء میں نہیں بلکہ صنعت کاروں، ہنرمندوں اور ججوں وغیرہ میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے علماء میں جو اختلافات ہوتے تھے وہ مخالفت کے رنگ میں نہیں تھے اور اس کی وجہ سے افتراق نہیں پھیلا تھا۔ علماء اختلاف کی بناء پر امت کو لڑاتے نہیں تھے گروہ نہیں بناتے تھے اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے سے لڑتے نہیں تھے وہ ایک دوسرے کے علم کا اعتراف کرتے اور باہم دگر ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

تو پہلی ضرورت یہ ہے کہ علمائے کرام ایک دوسرے کے فقہی اور عقیدے کے اختلاف میں باہمی رواداری پیدا کریں ایک دوسرے پر فتوے لگانے کی بجائے ایک دوسرے کے لئے احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ یہ ہوگا تو ان کے وعظوں اور خطبوں میں وہ تلخی پیدا نہیں ہوگی جس کی وجہ سے وہ حسن تاثیر سے محروم ہو چکے ہیں۔

دوسری طرف علمائے کرام کو چاہئے کہ وہ اسلامی مشن قائم کر کے اہل مغرب کو اسلام سے روشناس کرائیں۔ مغربی دنیا اس وقت بے پناہ روحانی امراض میں مبتلا ہو چکی ہے اور اسے ایک نسخہ شفا کی ضرورت ہے۔ علمائے کرام عیسائی مشنریوں سے مرعوب نہ ہوں انہیں یورپ نے دیس نکالا دے دیا ہے مغرب ان کے فرسودہ عقائد اور مذہب سے بے زار ہے یہی وجہ ہے کہ ان مشنریوں نے اس فضا کو ناساز گار پا کر اپنے لئے دوسری سرزمین تلاش کی ہے۔ اہل مغرب کو جس نسخہ شفا کی ضرورت ہے وہ صرف اسلام کے پاس ہے یہ اور بات ہے کہ ہم نسخہ بردار ہی خود مریض کو طبیب مان بیٹھیں،

یہ صحیح ہے کہ یورپ اور امریکہ میں آج کل تبلیغ اسلام کی تھوڑی بہت کوششیں ہو رہی ہیں مگر ان کے مخاطب غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمان ہیں اور وہ بھی بعنوان فرقہ پرستی، یورپ میں اسلامی کانفرنسیں ہوتی ہیں مگر کسی کا سرنامہ سنی کانفرنس ہے تو کسی کا اہل حدیث کانفرنس، عالی شان مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں مگر ان میں اکثر و بیشتر جن موضوعات پر داد خطابت دی جاتی ہے وہ فاتحہ خلف امام، رفع یدین، آمین بالجہر، گیارہویں شریف اور علم غیب جیسے مسائل ہوتے ہیں۔ مغرب میں رہنے والے مسلمان ان تیز و تند تقریروں کی وجہ سے آپس میں بٹتے جا رہے ہیں ان میں دنگا فساد ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ امن بحال کرنے کے لئے پولیس کو مداخلت کرنی پڑی ہے۔ مسجدوں کی تالا بندی ہوئی ہے اور اندیشہ نقص امن کی وجہ سے فریقین کو ضمانتیں کرانی پڑی ہیں۔ مغرب میں تبلیغ اسلام کرنی ہوگی تو پھر یہ طور طریقے بدلنے ہوں گے وہاں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو اجاگر کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کو عملی طور پر اتحاد اسلامی کا

نمونہ پیش کرنا ہو گا اور ان بیماریوں اور خرابیوں کا حل تجویز کرنا ہو گا جو آج مغربی معاشرے کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے چلی جارہی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہاں جو نت نئے اقتصادی اور معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کے قائد اور عقائد انہیں حل نہیں کر سکتے۔ مثلاً آج اگر کوئی شخص عیسائی رسم و رواج کے مطابق اپنی بیوی سے علیحدہ ہونا چاہے تو وہ اختلافات کے باوجود اس وقت تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ برسر عام عدالت میں اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام نہ لگائے اور پھر اسے مکمل طور پر ثابت نہ کر دے اس غیر فطری رکاوٹ کی وجہ سے خانگی اور عائلی زندگی سخت خلفشار کا شکار ہے اور لوگ شادی بیاہ کے لئے مناسب قوانین کے طلب گار ہیں چنانچہ امریکہ میں کئی ایسے کلب بن چکے ہیں جن کا پروگرام معینہ مدت کے لئے شادی ہے۔ مثال کے طور پر شادی کے وقت چھ ماہ کی مدت مقرر کر لی اور اگر نباہ ہو گیا تو فبہا ورنہ چھ ماہ بعد میاں بیوی الگ ہو گئے میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر مغرب میں صرف اسلام کے قوانین نکاح ہی کی عمدہ انداز میں وضاحت کر دی جائے تو وہاں کے لوگوں کے لئے قبولیت اسلام کے دروازے کھل جائیں گے۔

یہ اسلام ہی ہے جس نے ایک طرف تو یہ کہا ہے کہ اگر خدا کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ نا پسند کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے اور دوسری طرف یہ بھی اجازت دی ہے کہ اگر میاں بیوی نباہ نہیں کر سکتے تو وہ خوش اسلوبی سے علیحدہ ہو سکتے ہیں اور اس کے لئے گھر کے گندے کپڑے گھاٹ پر دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے علمائے کرام ذرائع کی کم یابی کا رونا روئیں اور اپنے مقابلے میں مشنریوں کے وسائل کی برتری کا ذکر کریں میں عرض کروں گا کہ عیسائی مشنریوں کی دولت اور بے پناہ وسائل سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ دولت اور وسائل انہیں یورپ نے نہیں دیئے بلکہ انہوں نے یہیں سے حاصل کئے ہیں۔ سب سے پہلا مشنری 1793ء میں ہندوستان آیا تھا جس کا نام ولیم کیری تھا یہ شخص جن حالات میں ہندوستان آیا وہ ایک سبق آموز داستان ہے ولیم کیری ایک غریب موچی کا لڑکا تھا۔ مدت العمر جوتیاں گانٹھتا رہا اور جب اس نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے امداد طلب کی تو سب نے انکار کر دیا پھر اس نے مایوس ہو کر لوگوں سے چندے کی اپیل کی۔ اس کی اپیل کے جواب میں عیسائیوں نے اسے کل تیرہ پونڈ اور اڑھائی شلنگ کی رقم عطا کی جب کہ اس دور میں بال بچوں سمیت ہندوستان آنے کے لئے کم سے کم ایک سو تیس پونڈ درکار تھے لیکن اس شخص نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ حضرات علمائے کرام کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس راہ میں قدم رکھیں گے تو منزلیں خود بخود ان کے قدم چومیں گی زمانہ انہیں آواز دے رہا ہے کہ بیدار ہوں اور اگر وہ بیدار نہ ہوئے تو قیامت کے دن سب سے زیادہ باز پرس بھی انہی سے ہوگی۔ قرآن مجید میں ہے کہ

"(اے پیغمبر کہہ دو) میری طرف یہ قرآن اسی لئے وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے میں تمہیں ڈراؤں اور اُن کو جن تک یہ پہنچے۔"

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن تک قرآن کی دعوت ہی نہیں پہنچی انہیں کس طرح ڈرایا جائے گا؟ اور یہ قرآن کی دعوت ساری دنیا تک پہنچانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ علمائے کرام پر۔ اگر حضرات علماء نے اس ذمہ داری کو پورا نہ کیا تو ان سے قیامت کے دن صرف اپنی ذات ہی کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی بلکہ اقوام عالم کے بارے میں بھی انہی سے پوچھا جائے گا اب یہ علمائے کرام ہی بہتر جان سکتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے حضور اس کے لئے کیا عذر پیش کریں گے؟

(12، اگست 82ء)

بھارتی فلم "گاندھی" اور پاکستانی فلم "بلڈ آف حسینؓ"

سفر تو کئی ملکوں کا تھا لیکن بیچ میں چند دن اب کے بھی لندن ٹھہرنے کا موقع نکل آیا' ان دنوں وہاں فلم "گاندھی" کی بڑی دھوم تھی۔ یہ فلم ایک برطانوی فلم ساز ادارے نے حکومت ہند کے اشتراک سے بنائی ہے۔ بیس کروڑ روپے سے زیادہ کے اخراجات میں چھ کروڑ روپیہ اندرا گاندھی کی حکومت نے دیا ہے۔ فلم کی ریسرچ' مطالعہ اور تیاری میں دس سال کا عرصہ لگا' گاندھی کا پارٹ ادا کرنے والے اداکار "بن کنگسلے" نے (جو ایک بھارتی نژاد انگریز ہے) اس اثناء میں گاندھی جی کے ساتھ مشابہت تامہ پیدا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ جزئیات تک میں گاندھی کی "نقل مطابق اصل" نظر آتا ہے۔

لندن کے سینما گھروں میں اس فلم کو لگے کافی دن ہو چکے تھے لیکن دوستوں نے بتایا کہ اس کا ٹکٹ لینا اب بھی کارے دارد ہے۔ ایک دو دوست لمبے کیو میں پہلے ہی لگ کر کھڑے ہو گئے پھر بھی انہیں ٹکٹ حاصل کرنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ دنیا بھر کے اخبارات و جرائد نے اس فلم پر جو شاندار ریویو کئے ہیں وہ تو کئے ہی ہیں خود برطانوی اخبارات انگلستان میں دکھائی جانے والی جن دس چوٹی کی کامیاب فلموں کی فہرست شائع کرتے ہیں ان میں بھی یہ فلم پہلے نمبر پر درج ہو رہی تھی۔ فلم دیکھی تو اندازہ ہوا کہ اس کی شہرت بے سبب نہ تھی ٹیکنیکی اعتبار سے واقعی فلم لاجواب ہے۔ تقریباً دس لاکھ افراد نے تو اس کی شوٹنگ ہی میں حصہ لیا ہے۔ فلم کا آغاز گاندھی جی کی پرارتھنا اور ان پر فائر ہونے کے سین سے ہوتا ہے پھر

ان کی ارتھی اٹھتے دکھائی جاتی ہے۔ جس میں فوجی دستوں سمیت لاکھوں آدمیوں کا جلوس نئی دہلی کی شاہراہ سے گزر رہا ہے پھر معاً بعد جنوبی افریقہ کی ایک ٹرین میں نوجوان گاندھی کو فرسٹ کلاس میں بیٹھے دکھایا جاتا ہے جس سے ریلوے گارڈ ایک انگریز کی شکایت پر انہیں سامان سمیت نیچے پھینک دیتا ہے۔ یہاں سے ان کی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے، جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے قیام اور نسلی امتیاز کے خلاف ان کے احتجاجی مشن کے یہ سین بلاشبہ بڑے متاثر کن ہیں اس کے بعد ہندوستان میں ان کا ورود اور کانگریس میں ان کی شرکت سے لے کر تقسیم تک کے واقعات کی تفصیل ہے آخر میں وہی پہلا سین پھر دہرایا جاتا ہے جس میں ایک متعصب ہندو کے ہاتھوں گاندھی جی کا قتل دکھایا گیا ہے۔ فلم کا اختتام گنگا میں گاندھی کی راکھ بکھیرے جانے پر ہوتا ہے۔ جس میں گلاب کے پھولوں کی پتیاں پانی کی لہروں میں تیرتی نظر آتی ہیں اور اس طرح تین گھنٹے کی یہ فلم پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ فلم ایک پروپیگنڈہ فلم ہے۔ بھارتی حکومت نے اسے زر کثیر صرف کر کے بنوایا ہے اس لئے فلم سازوں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے گاندھی جی کی شخصیت اور جدوجہد کا محاکمہ کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ان کی اچھائیاں ہی اچھائیاں پروجیکٹ کی گئی ہیں اور ان کی کسی خامی کو سامنے نہیں لایا گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک سیاسی اور روحانی اوتار ہیں نہ ان سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے نہ ہی ان میں کوئی عیب تھا البتہ اس کی داد فلم سازوں کو ضرور ملنی چاہیے کہ انہوں نے پروپیگنڈے کو اتنے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ ناظرین کو فلم کے بہاؤ میں اس کا احساس نہیں ہونے پاتا۔

فلم دیکھنے سے پہلے ہی مجھے یقین تھا کہ اس میں قائداعظم محمد علی جناح" کے ساتھ انصاف نہیں ہو گا۔ ہوتا بھی کیسے جب فلم بھارتی سرمائے سے بنائی جا رہی تھی چنانچہ وہی ہوا قائداعظم" کا رول جس اداکار کو سونپا گیا ہے اس نے انہیں ایک صاحب دل انسان کی جگہ ایک پارۂ سنگ بنا کر پیش کیا ہے۔ تقسیم کے وقت فسادات کی ذمہ داری بھی قریب قریب ان پر ڈال دی گئی ہے اور ان کی زبان سے گاندھی جی کو بہ خلاف حقیقت دھمکی دلائی گئی ہے کہ اگر پاکستان نہ بنا تو انہیں سول وار کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ قائداعظم" کے علاوہ حسین شہید سہروردی وہ واحد مسلم لیگی لیڈر ہیں جنہیں فلم میں جگہ دی گئی ہے مگر وہ بھی کردار کشی کے پیرائے میں، کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات کی تمام تر ذمہ داری انہی پر ڈال دی گئی ہے اور جب اس کشت و خون کو رکوانے کے لئے گاندھی جی مرن برت رکھتے ہیں تو سہروردی مسلم غنڈوں کے سردار کے روپ میں ان کے سرہانے لا کھڑے کئے جاتے ہیں اور وہ گاندھی کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے کہنے پر مسلمانوں نے آگ اور خون کا جو خوفناک کھیل شروع کیا تھا وہ ان کے مرن برت کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے اہل پاکستان کی دلچسپی کے نقطہ نظر سے فلم کا تیسرا قابل ذکر پہلو مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے متعلق ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد کو فلم میں شایان شان مقام نہیں دیا گیا۔ انہیں

گاندھی جی کے ایک مرید خاص کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور بس، نہ ان کی اپنی کوئی رائے ہے نہ کوئی جداگانہ شخصیت، انہیں تقریر کرتے بھی دکھایا گیا ہے تو انگریزی زبان میں اور وہ بھی غلط لب ولہجہ اور تلفظ کے ساتھ، مولانا ابوالکلام کے سیاسی مقام و مسلک سے ہم پاکستانیوں کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر ان کے علمی اور دینی مرتبے کا ہمیں پورا پورا پاس اور احساس ہے، فلم سازوں کو ہمارا نہیں تو کم سے کم بھارت کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات ہی کا خیال کر لینا چاہئے تھا۔

گاندھی جی پر یہ فلم کیا بنی ہے۔ دنیا بھر میں بھارت کی لیڈر شپ اور اس کے کلچر کے ڈنکے بجنے لگے ہیں، گاندھی جی کی شخصیت اور زندگی پر متعدد کتابیں لندن کے ہر بک اسٹال اور کتب فروش کے ہاں نہایت اہتمام سے فروخت ہو رہی ہیں، گاندھی جی کے سوانح حیات پر لکھی جانے والی وہ کتابیں جو آؤٹ آف پرنٹ تھیں نئے سرے سے طبع ہوئی ہیں، غرضیکہ بھارتی سفارت خانے اربوں روپے خرچ کر کے بھی اپنے ملک اور اپنی قیادت کی جو پبلسٹی نہ کر سکتے تھے وہ اس ایک فلم نے کر دی ہے۔ جس سینما گھر میں ہم نے فلم دیکھی اس میں بھی بھارتیوں سے کہیں زیادہ انگریز اور دوسرے غیر ملکی بھرے پڑے تھے، کئی تو فلم کے بعض مناظر کے زیر اثر باقاعدہ رو رہے تھے۔

....

ایک طرف فلم "گاندھی" کے نتیجے میں بھارت کی یہ پروجیکشن ہو رہی تھی اور دوسری طرف ایک پاکستانی فلم کے ذریعے پاکستان کے نام اور امیج کی بربادی کا سامان ہو رہا تھا۔ لندن کا چینل فور (چار) وقفے وقفے سے غیر ملکی فلمیں بھی دکھاتا ہے ان میں اکثریت تو بھارتی فلموں کی ہوتی ہے لیکن اب کے پہلی بار ایک پاکستانی فلم دکھانے کا بھی اعلان ہوا۔ یہ فلم یوں تو کچھ عرصہ پہلے لندن کے ایک سینما گھر میں بھی لگ چکی تھی لیکن وہ کچھ زیادہ کاروبار نہیں کر سکی تھی اب اس ناکام فلم کو ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا پاکستانیوں کے جوش و خروش کا عالم یہ تھا کہ اس شام شاید ہی کوئی پاکستانی ہو جو ٹیلی ویژن سیٹ کے سامنے بیٹھا فلم کا منتظر نہ ہو جو لوگ اس وقت کام کرتے تھے انہوں نے باقاعدہ چھٹی لی جو چھٹی نہ لے سکے انہوں نے گھر والوں کو ہدایت کی کہ کسی طرح ان کے لئے یہ فلم ٹیپ کر لی جائے تاکہ وہ بعد میں اسے دیکھ سکیں، لیکن جب فلم دکھائی گئی تو پاکستانیوں کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ بجائے اس کے کہ فلم سے ملک کا نام روشن ہوتا اس نے تو ملک کے چہرے پر کالک ہی پھیر دی۔ فلم کیا تھی پاکستانیوں کے لئے سامان صد ہزار جراحت تھی۔ فلم کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر پاکستان کے ایک سابق سفیر کے بیٹے اور ایک موجودہ ممتاز پاکستانی سفارت کار کے بھائی تھے اور فلم کا نام تھا "بلڈ آف حسینؓ" یہ فلم اصلاً ہمارے زمانے میں بنی تھی تمام تر تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں، ہاں اتنا یاد ہے کہ کابینہ میں ایک مرتبہ جنرل (ریٹائرڈ) ٹکا خاں نے اس کا ذکر کیا تھا اور اس فلم کی تیاری پر فوج کی ناراضگی کی اطلاع دی تھی، فلم نیف ڈیک اور پاکستان کی اسٹیٹ فلم اتھارٹی کے سرمائے سے بنی تھی، حکام یہ کہتے ہیں کہ فلم ساز کو لاکھوں روپے کی جو امداد دی گئی تھی وہ فلم کا مسودہ دیکھے بغیر دی گئی تھی بعد میں غالباً مقدمہ بھی چلا لیکن فلم پہلے ہی اسمگل ہو کر لندن پہنچ چکی تھی اور اس کا بنانے

والا ...... بھی ملک سے فرار ہو چکا تھا۔ فلم کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ امام حسینؓ کے گھوڑے ذوالجناح سے شروع ہوتی ہے۔ زمین پھٹتی ہے اور یہ گھوڑا باہر نکلتا ہے یہ گویا استبداد کے خلاف جدوجہد کی علامت ہے۔ فلم کا ہیرو امام حسینؓ سے مماثلت رکھتا ہے ...... فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے تو اس کا بھائی حکومت کا ایڈوائزر بن جاتا ہے مگر وہ فوج کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے۔ ہیرو (جس کا نام بھی حسین ہے) ایسے ہی دو فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور پھر گرفتاری سے بچنے کے لئے اہل وعیال اور اعزاؤ اقرباء کے ہمراہ کہیں اور جانے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے اس کا قافلہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہے کچھ لوگ پیدل بھی چل رہے ہیں، دو چار خواتین بھی اونٹوں پر سوار ہیں۔ اس کی حاملہ بیوی بھی ہمراہ ہے، کافی دور جا کر وہ ایک ندی کے کنارے پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ باقاعدہ خیمے لگے ہوئے ہیں کہ وہ فوج کے نرغے میں آ جاتے ہیں۔ یہاں حسین کی بیوی بچہ جنتی ہے، ندی کا پانی اس قافلے پر بند کر دیا جاتا ہے اہل قافلہ ایک ایک کر کے فوج کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ آخر میں ہیرو اپنے نوزائیدہ بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے فوج کے سامنے جاتا ہے اور اس کے لئے پانی کی التجا کرتا ہے اس کا جواب اسے سالارِ لشکر ایک گولی سے دیتا ہے جو بچے کا حلقوم چھید دیتی ہے بچے کے گلے سے خون کا فوارہ چھوٹ جاتا ہے وہ اس کا خون اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر ملتا ہے اور اپنے بچے کی لاش اٹھائے واپس چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخری معرکے میں وہ درانتی اٹھائے اسی گھوڑے پر سوار فوجی لشکر پر حملہ آور ہوتا ہے اور گولیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس کی موت کے بعد محرم کا ایک ماتمی جلوس سینہ کوبی اور زنجیر زنی کرتے گزرتا دکھائی دیتا ہے فوج کا برسراقتدار جرنیل بالکنی سے اس کا نظارہ کر رہا ہے اور اس جلوس سے اس کے اوسان خطا نظر آتے ہیں اور یہاں پر آ کر فلم ختم ہو جاتی ہے۔

میں نے یہ فلم دیکھی تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ کسی پاکستانی کا کارنامہ ہو سکتا ہے فوجی حکومت یقیناً کسی بھی ملک کے لئے قابلِ فخر نہیں ہو سکتی اگر اس کے لئے رائے عامہ کی تربیت کرنا مقصود تھا تو کسی سیاسی فلسفے یا نظریئے کی بنیاد پر "سٹل" طریقے سے کوئی فلم بنائی جا سکتی تھی اس کے لئے ایک خلاف واقعہ اور خلاف مذہب مضحکہ خیز پلاٹ تیار کرنا بڑی عجیب وغریب بات ہے ہیرو کو امام حسینؓ کے مماثل ٹھہرانا اس کے قافلے کو قافلہ اہل بیتؓ سے تشبیہ دینا اس کے بچے کو علی اصغر بنانا اس کے گھوڑے کو ذوالجناح بنا کر پیش کرنا یہ ساری ہی باتیں مذہبی لحاظ سے سخت افسوس ناک ہیں اور بلاشبہ اس سے مسلم ناظرین کے اسلامی جذبات سخت مجروح ہوئے ہیں فلم کا دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس میں فوجی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے جو واقعات فلمائے گئے ہیں وہ بالکل خلاف واقعہ ہیں۔

پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ جب بھی ہوا ہے سیاسی اور جمہوری اعتبار سے یہ یقیناً افسوس ناک تھا مگر جس طرح کے مظالم پاکستانی فوج کے ساتھ منسوب کئے گئے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی کوئی بات کبھی بھی وقوع پذیر نہیں ہوئی عصمت دری کے واقعات، معصوم بچوں کا قتل یہ ساری باتیں ان صاحب کے اپنے ذہن کا فتور ہیں جو اس فلم کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی ہیں اور خیر سے خود مصنف بھی۔

تیسرا المناک پہلو فلم کی بے حد و بے حساب فحاشی ہے، بھارتی فلموں میں بھی فحش سین فلمائے جاتے ہیں لیکن جو عریانی اس فلم میں پائی جاتی ہے اس کے سامنے تو بھارتی فلمیں بھی ہیچ ہیں۔ ایک طرف حسینؓ کے نام پر فلم بنائی گئی ہے اور دوسری طرف اس میں ایسے شرم ناک مناظر فلمائے گئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی بلیو فلم دکھائی جا رہی ہو اس طرح کی پاکستانی اقدار بعض "سوڈو انٹیلیکچوئل" حضرات کے ذہنوں میں ہوں تو ہوں کم سے کم عام پاکستانی تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

....

اگلے دن اخبار میں پڑھا کہ اس فلم کی نمائش پر پاکستانی سفارت خانے نے آئی ٹی وی سے احتجاج کیا ہے ظاہر ہے یہ بعد از مرگ واویلا کے مترادف تھا اس سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کوشش کرنی ہی تھی تو اس کی نمائش رکوانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ بھی ہوتا کم سے کم یہ ایک بر وقت اور مناسب اقدام تو ہوتا لیکن ہمارے سفارت کاروں کو اتنا درد اور اتنی فرصت کہاں کہ وہ کسی حادثہ یا المیہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی اس کے سدباب کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں۔ عام پاکستانیوں کو فلم کی نمائش سے جو دکھ ہوا اس کا اندازہ بعد کے دو تین دنوں میں ایک "کراس سیکشن" سے مل کر ہوا وہ مذہب اور وطن کی اس بے حرمتی پر خون کے آنسو روتے نظر آئے ہاں بعض سرمایہ دار گھرانے جو حکومت پاکستان یا اس کے اداروں سے طرح طرح کے فائدے اٹھا رہے ہیں جو ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہیں جن کا پاکستانی اقدار اور معاشرت سے بس برائے نام ہی تعلق ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال، تعلیم یافتہ اور ماڈرن سمجھتے ہیں ان میں اسس فلم پر داد کے ڈونگرے برستے بھی دیکھے۔ انہی حلقوں نے یہ فلم ٹیپ کر کے پاکستان بھی بھجوائی ہے اور بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ کراچی کے الٹرا ماڈرن حلقوں میں ان دنوں یہ فلم بڑے زور شور سے دکھائی بھی جا رہی ہے۔

اس فلم کا چرچا نہ ہوا تھا تو اس کے بنائے جانے اور سرکاری امداد سے بنائے جانے کی بات ایک سربستہ راز تھی مگر اب جبکہ ڈنکے کی چوٹ یہ فلم دکھائی جا رہی ہے اس کے بارے میں حکومت کو جملہ تفصیلات پبلک کے سامنے پیش کر دینی چاہئیں۔ سوال یہ ہے کہ جن افسران نے قومی خزانے سے لاکھوں روپے اس فلم کی امداد پر صرف کئے ہیں ان کے خلاف کیا کارروائی ہوئی؟ مصنف اور فلم ساز کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے کیا اقدام ہوا؟ جن افسران نے معمولی معمولی باتوں پر سابق حکومت کے خلاف "قرطاس ابیض" کے نام پر دفتروں کے دفتر سیاہ کر دیئے وہ اس فلم کا ذکر کیوں گول کر گئے کیا اس لئے کہ اس میں افسر شاہی ہی کے بعض بڑے نام ملوث تھے؟

اسی کے ساتھ ساتھ حکومت کو سوچنا چاہئے کہ اگر گاندھی پر فلم بنوا کر بھارت یہ کچھ نتائج حاصل کر سکتا ہے تو ہم تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ پر کوئی فلم کیوں پیش نہیں کرا سکتے، کیا ہم اپنی نئی نسل کو "بلڈ آف حسینؓ" جیسی پکچرز ہی دکھاتے رہیں گے۔ ہمارے کچھ جعلی دانشور اگر فوجی حکومت اور ملک کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچ سکتے وہ فوجی حکومت کی مخالفت کے شوق میں مذہب اور ملک کی بھی دھجیاں

اڑا دینا چاہتے ہیں تو کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے ملک میں کوئی ایسا قابل عمل نظام رائج کریں جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فوجی حکومت قائم ہونے کا خطرہ ہی جاتا رہے۔

بہرحال "گاندھی" اور "بلڈ آف حسین" کا تقابل ہماری قوم اور حکمرانوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ کاش ہم اس "تفاوت راہ" پر غور کر سکیں!

(31 مارچ 83ء)

کیا جمعۃ المبارک کی تعطیل ختم کر دی جائے؟
(1)

اڑتی سی خبر ہے کہ حکومت بعض علقوں کے مطالبے پر جمعۃ المبارک کی تعطیل ختم کرنے پر غور کر رہی ہے۔ دو چھٹیوں کی افواہ بھی گرم ہے کہا جا رہا ہے کہ ہفتہ اور اتوار دو دن چھٹی کی جائے گی مگر ہمیں اس سے بحث نہیں، 'رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند' اگر دو دن کی چھٹی سرکاری ملازمین میں فرض شناسی اور پابندی وقت کی عادت پیدا کر سکتی ہے تو چشم ما روشن دل ماشاد، ہمیں تو اس سے بحث ہے کہ چھٹی کا دن جمعہ کی جگہ پھر سے اتوار کر دیا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ جمعہ کو تعطیل کرنے کا مسئلہ پچھلی حکومت میں 73ء کے دوران زیر غور آیا تھا۔ میں نے تحریری طور پر کابینہ میں یہ تجویز پیش کی تھی جس کی بعض وزراء بالخصوص مسٹر جے اے رحیم نے زبردست مخالفت کی تھی اور یہی دلیل پیش کی تھی جو آج پھر سامنے لائی جا رہی ہے کہ اس طرح ہم مغربی دنیا سے کٹ جائیں گے اور جمعہ اور اتوار دو دن ہمیں دوسرے ممالک سے اپنا لین دین اور کاروبار بند رکھنا پڑے گا جس سے معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ میں نے دوسرے مسلمان ملکوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بات پر زور دیا تو کابینہ نے فیصلہ کیا کہ ان ملکوں میں متعین پاکستانی سفیروں سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی جائیں اور اس کے بعد وزیر اعظم جو مناسب سمجھیں فیصلہ کر لیں۔ کافی عرصہ گزر گیا اور کوئی فیصلہ نہ ہوا تو اسمبلی کے ایک رکن سے میں نے یہ قرارداد قومی اسمبلی میں پیش کرا دی اور پھر میری ہی تجویز پر ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے کنوینر میرے عزیز دوست خان محمد حنیف خان مقرر ہوئے جو اس وقت

ڈپٹی اسپیکر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کمیٹی نے بھی رپورٹ جمعہ کی تعطیل کے حق میں دی مگر مسئلہ اس کے بعد کھٹائی میں پڑا رہا مگر مجھے اندازہ تھا کہ بھٹو صاحب جمعہ کی تعطیل کے لئے ذہن بنا چکے ہیں انہوں نے اس کے لئے مختلف ذرائع سے ہر طرح اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ اس سے ملکی معیشت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ پاکستانی عوام کا ایک دیرینہ مطالبہ ہے اور اس سے سیاسی طور پر بھی انہیں مقبولیت حاصل ہو گی صرف اس کے لئے انہیں مناسب وقت کا انتظار ہے اور پھر اس کا اعلان بھی وہ خود کرنا چاہتے ہیں اسمبلی کو اس کا کریڈٹ نہیں دینا چاہتے چنانچہ یہی ہوا بھٹو صاحب کے نزدیک وہ موزوں لمحہ آ گیا تو انہوں نے بنفس نفیس اس کا اعلان کر دیا اور اس طرح پاکستانی عوام کا ایک دیرینہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا اور پاکستان چھٹی کے معاملے میں بھی عالم اسلام کا حصہ بن گیا۔ اب سات آٹھ سال کے بعد اگر دوبارہ اس مسئلے کو اٹھایا جا رہا ہے اور وہ بھی صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں جن کا طرۂ امتیاز ہی حکومت کا اسلامی تشخص ہے تو اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ۔

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل

یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد؟

جو لوگ بھی عوامی جذبات اور امنگوں سے آگاہ ہیں انہیں اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی کہ سو سوا سو سال سے اتوار کی چھٹی کے رواج کے باوجود ہماری قوم جذباتی طور پر ہمیشہ جمعہ کی چھٹی کے حق میں رہی ہے۔ اتوار کی چھٹی پاکستان بننے کے بعد بھی جاری رہی تو اس کی یہ وجہ ہر گز نہ تھی کہ ہماری قوم اس چیز کو پسند کرتی ہے، سبب صرف یہ تھا کہ اس سے پہلے اس مسئلہ پر کبھی پوری سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا گیا تھا، دفتری امور میں تمام کام ان روایات پر چلتا رہا جو قیام پاکستان سے بہت پہلے قائم ہوئی تھیں اور اب تک چلی آ رہی تھیں انہیں توڑنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا مگر روایتی سوچ آڑے آئی تھی، اس روایتی سوچ کے حق میں جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ آج کل بین الاقوامی سطح پر چونکہ اتوار کو چھٹی کے طور پر زیادہ اہمیت حاصل ہے لہٰذا جمعہ کی چھٹی ہو جانے پر دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت، بینکنگ، مالی معاملات اور حکومتی خط و کتابت میں دقتیں پیش آئیں گی اور عملاً ہمارے ہاں ہفتے میں ایک دن کے بجائے دو دن کام معطل رہے گا۔ جمعہ کے دن ہماری تعطیل کے باعث اور اتوار کو باقی ممالک کی تعطیل کی وجہ سے "مگر یہ ایک ایسا مفروضہ تھا جو غلط اندازوں پر مبنی تھا" یہ درست ہے کہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی ہے لیکن چالیس مسلمان ملکوں میں یوم تعطیل جمعہ ہے، دوسرے علاقوں سے قطع نظر خود برصغیر کی مسلمان ریاستوں میں جمعہ کی تعطیل کا رواج رہا ہے چنانچہ ہندوستان میں حیدر آباد دکن، بھوپال اور رام پور میں ان کے بھارت میں ادغام تک اور پاکستان میں بہاول پور، خیرپور اور قلات کی ریاستوں میں 1956ء تک جمعہ کے دن چھٹی ہوتی رہی ہے جبکہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے زیر انتظام علاقوں میں اتوار ہی کی تعطیل رہی لیکن تعطیل کے اس اختلاف سے کام میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہیں ہوا اب جبکہ ہمارے سیاسی اور تجارتی روابط اسلامی ممالک کے ساتھ بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں

ہمارا سیاسی اور تجارتی مفاد بھی اسی میں ہے کہ ہم جمعہ کو تعطیل منائیں، جمعہ کی تعطیل سے اسلامی ممالک کے ساتھ ہماری اپنائیت اور یگانگت میں اور اضافہ ہو گا۔ ہمیں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلامی ملکوں کی تیل کی بے پناہ دولت نے دنیا کے تجارتی مرکز ثقل کو یورپ اور امریکہ سے اسلامی ممالک کی طرف منتقل کر دیا ہے اور اب صورت وہ نہیں رہی کہ تجارت کے دھارے مغربی دنیا کی مرضی کے مطابق چلیں بلکہ اب ان دھاروں کا رخ اسلامی ملکوں کی مرضی کے مطابق متعین ہو گا، ہفت روزہ تعطیل کے ضمن میں ہمیں اسرائیل کے طرز عمل کا جائزہ بھی لینا چاہئے، ہر چند کہ اسرائیل کی تخلیق، تنظیم اور تدبیر کلیتاً عیسائی ممالک کی مرہون منت ہے اس نے ہفتہ وار تعطیل کے معاملے میں اپنے عقیدے اور روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہفتہ کے دن کو یوم تعطیل قرار دیا ہے اور اس طرح اس وقت اسرائیل دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ہفتہ کے روز تعطیل ہوتی ہے، اگر اسرائیل ہفتے کی تعطیل سے، ہفتہ اور اتوار کو پوری دنیا سے کٹ جانے کے باعث کسی مالی اور حکومتی خسارے میں مبتلا نہیں ہوتا تو ہم جمعہ کے دن تعطیل کر کے کسی خسارے میں کیوں مبتلا ہوں گے؟

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے کھلے لفظوں میں کسی خاص دن کو تعطیل کا دن قرار نہیں دیا (بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس کے ہاں تعطیل کا تصور بھی ناپید ہے تو اسکی بھی گنجائش ہے)۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ اتوار جو عیسائیوں نے اپنا یوم عبادت ہونے کی وجہ سے تعطیل کا دن ٹھہرایا ہے ہمارے لئے وجہ تقلید کیوں ہو؟ کیا اس طرح ہم غیر شعوری طور پر غیروں کی نقالی اور ذہنی مرعوبیت کا تو شکار نہیں ہو جاتے؟ یا تو ہمیں سرے سے تعطیل کرنی ہی نہیں چاہئے اور اگر ہم تعطیل کرتے ہیں تو اس دن کیوں نہ کریں، جو ہمارا یوم عبادت ہے اور جسے اسلامی روایات میں انتہائی مقدس دن قرار دیا گیا ہے۔

جمعۃ المبارک کی یہی فضیلت کیا کم ہے کہ قرآن حکیم میں ایک پوری سورۃ اسی نام سے موسوم ہے اور اس میں اس دن کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس روز جب تمہیں نماز کیلئے بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کے لئے بھاگتے ہوئے جاؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو کہ یہی عمل تمہارے لئے بہتر ہے نماز جمعہ کیلئے ایسا تاکیدی حکم کہ جیسے ہی نماز کیلئے اذان ہو تمام مسلمان اپنا کام و کاج چھوڑ کر تیزی کے ساتھ مسجد کی طرف لپکیں اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اس دن کی عظمت واضح کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام کے نزدیک بالاتفاق نماز جمعہ کا تارک دوسری نمازیں ترک کرنیوالے سے کہیں زیادہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ سورۃ الجمعہ کے علاوہ قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر بھی جمعہ کی فضیلت کا ذکر ہے "سورۃ البروج" میں جہاں "یوم موعود" اور "یوم شاہد و مشہود" کا ذکر آتا ہے احادیث نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یوم شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے حدیث کی مشہور کتاب سنن بیہقی جلد 3 ص 170 پر ہے۔

"حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا یوم موعود یوم قیامت ہے اور شاہد یوم جمعہ ہے اور مشہور یوم عرفہ" (حج کا دن)

ہم یہاں عربی زبان میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے والے تمام اکابر کے تفسیری اقتباسات نقل کریں تو

توبات طویل ہو جائے گی اور اردو داں حضرات بھی اکتاہٹ محسوس کرنے لگیں گے صرف ماضیٔ قریب کے چند مفسّرین کے تفسیری اقوال اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں جو اسی برصغیر سے تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ لکھتے ہیں۔

"والیوم موعود قیامت کا دن، شاہد جمعہ کا دن، مشہود عرفہ کا دن" (ترجمہ قرآن ص943)

حضرت مولانا فتح محمد جالندھری فرماتے ہیں۔

"راجح یہ ہے کہ شاہد جمعہ کا دن ہے اور مشہود عرفے کا" (ص۔ 476)

حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ فرماتے ہیں۔

"شاہد، مراد اس سے یوم جمعہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے مشہود، مراد اس سے روز عرفہ ہے۔" خزائن العرفان ص702)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشاد ہے۔

"حدیث ترمذی میں مرفوعاً ہے کہ یوم موعود قیامت کا دن ہے اور شاہد جمعہ کا" (ترجمہ و تفسیر ص119)

مولوی سید نعیم الدین مراد آبادیؒ لکھتے ہیں۔

"مراد اس سے روز جمعہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے" (ترجمہ، ص 860)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"سب شہروں میں حاضر ہوتا ہے جمعہ کا دن اور سب ایک جگہ حاضر ہوتے ہیں عرفہ کے دن اسی لئے روایات میں آیا ہے کہ شاہد جمعہ کا دن ہے اور مشہود عرفہ کا دن" (تفسیر ص796)

....

آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں جس یوم سبت کا ذکر ہے۔ وہ بھی حقیقتاً جمعہ ہی کا دن تھا۔ اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت خاص طور پر قابل غور ہے جو مشکوۃ المصابیح (مطبع المجتبائی دہلی ص120) میں پیش کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں۔

"میں پہاڑ کی طرف گیا تو (یہودیوں کے مشہور عالم) کعب احبار سے ملاقات ہو گئی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا اور اس نے مجھے تورات سے کچھ سنایا اور میں نے اسے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی کچھ باتیں سنائیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جمعہ

کے دن ایک ایسی ساعت ہوتی ہے جس میں کوئی بھی دعا مانگی جائے اللہ تعالیٰ اس دعا کو منظور کرتا ہے۔ اس مرحلے پر کعب نے کہا کہ کیا سال میں ایک دن ایسا ہوتا ہے تو میں نے کہا نہیں بلکہ ہر جمعہ کو ایسا ہوتا ہے اس پر کعب نے تورات پڑھی اور کہا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ کہا ہے۔"

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا ذکر توریت میں موجود تھا مگر آج جب ہم توریت (کتاب قدیم) کو دیکھتے ہیں تو اس میں جمعہ کی جگہ سبت کا ذکر ملتا ہے ایسا لگتا ہے کہ یہودیوں کے ہاں آغاز میں جمعہ ہی سبت کا دن تھا مگر بعد میں دوسرے احکام کی طرح انہوں نے اسے بھی بدل دیا ہمارے اس نقطہ نظر کی تصدیق برصغیر کے مشہور عالم حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کی اس تفسیر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سورۃ النحل کی آیت نمبر 134 کے ضمن میں ارشاد فرمائی ہے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ۔

"ہفتے کا دن تو انہیں پر رکھا گیا تھا جو اس میں اختلاف رکھتے تھے اور بے شک تمہارا رب قیامت کے دن ان میں فیصلہ کرے گا"

مولانا فرماتے ہیں۔

"یعنی شنبہ (ہفتے) کی تعظیم اور اس روز شکار ترک کرنا اور وقت کو عبادت کے لئے فارغ کرنا یہود پر فرض کیا گیا تھا اور اس کا واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں روز جمعہ کی تعظیم کا حکم فرمایا تھا اور ارشاد کیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے خاص کرو۔ اس دن میں کچھ کام نہ کرو۔ اس میں انہوں نے اختلاف کیا اور کہا کہ وہ دن جمعہ نہیں بلکہ سنیچر ہونا چاہئے۔ بجز ایک چھوٹی سی جماعت کے جو حضرت موسیٰؑ کے حکم کی تعمیل میں جمعہ پر ہی راضی ہو گئی تھی۔"

(ص- 407)

صرف ہمارے علمائے کرام پر ہی منحصر نہیں غیر مسلم اہل علم بھی اس نقطہ نظر کے حامل ہیں کہ حقیقتاً جمعہ ہی کو یوم عبادت مقرر کیا گیا تھا (اس لئے یہی یوم تعطیل کا حقیقی مصداق ہے) جیمز ہیسٹنگز انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھکس میں لکھتا ہے۔

"ALL THESE ASPECTS OF SHABBATH AS A MEMORIAL OF GOD POWER AS CREATOR OF HIS LOVE AS REDEEMER FROM EGYPTIAN BONDAGE AND OF THE CHOICE OF ISPEL ARE SUMMED UP IN LITURGICAL KIDDUSH SANCTIFICATION PRESCRIBED FOR USE IN THE HOME AND ALSO ON THE SYNAGOGUE ON THE FRIDAY EVE."

(یعنی سبت کے تمام پہلو الوہی قوت کا مالک ہونے، محبت کا خالق ہونے، مصریوں کی غلامی کا نجات دہندہ ہونے اور اسرائیل کے انتخاب کی یادگار اس مذہبی تطہیر کے عمل یعنی گھروں یا عبادت کے اجتماعات کی پاکیزگی کے عمل میں اجمالاً موجود ہیں جو جمعہ کی

شام کو انجام پاتا تھا۔)

واضح رہے کہ "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس" یہودی علماء کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اسے یک کتابِ حوالہ کی حیثیت سے پوری دنیا میں شہرت حاصل ہے جب خود یہودی علماء یہ مان رہے ہیں کہ سبت کا دن جمعہ کی شام کو ہوتا تھا اور جب کعب احبار یہ شہادت دیتے ہیں کہ جمعہ کا ذکر توریت میں بھی موجود ہے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے یہودیوں کو جمعۃ المبارک ہی کو یوم عبادت اور یوم تعطیل کا حکم دیا تھا مگر بعد میں اسے تبدیل کر دیا گیا۔ یہودیوں نے اسے ہفتہ بنالیا اور عیسائیوں نے اتوار' عیسائیوں نے ہفتے کی جگہ اتوار کو کیوں منتخب کیا اس پر بحث ہم اگلی قسط میں کریں گے اب تک کی گفتگو کی روشنی میں صرف اتنا عرض ہے کہ قرآن و توریت کی رو سے اگر کوئی دن بطور تعطیل منتخب کیا جاسکتا ہے تو وہ جمعۃ المبارک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم عبادت قرار دیا ہے اس کے علاوہ غیروں کی تقلید میں کسی اور دن کو چھٹی کا دن قرار دینا نہ صرف ذہنی غلامی اور مرعوبیت کی نشانی ہے بلکہ اسلامی تعلیمات سے بھی روگردانی ہے۔

(24 رمئی 84ء)

کیا جمعۃ المبارک کی تعطیل ختم کر دی جائے؟

(2)

پچھلی گفتگو میں ہم نے عرض کیا تھا کہ یہودیوں کو ہفتے کا ایک دن بطور تعطیل مقرر کر کے کاملاً روحانی سرگرمیوں کے لئے وقف کر دینے کا حکم ہوا تھا جو یوم "سبت" کہلاتا تھا یہ جمعہ کا دن تھا مگر بعد میں یہودیوں نے اسے بدل کر سنیچر کا دن مقرر کر لیا' "سبت" لفظ سبات سے نکلا ہے اور سبات کے معنی راحت سکون اور نیند کے ہیں۔ فی الاصل یوم سبت کے معنی یوم راحت کے ہیں اور اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ چھ دن کام کرنے کے بعد ایک دن آرام کیا جائے۔

ہفتہ وار "آرام کے دن" کا طریقہ یہودیوں کے علاوہ دوسری اقوام میں بھی تھا' چنانچہ اہل بابل نے اس مقصد کے لئے کسی مخصوص دن کی جگہ مہینے کی چار تاریخیں مقرر کر رکھی تھیں جن میں تعطیل کی جاتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز جلد 12 ص 103 پر ہے

"اہل بابل کا یوم سبت ہر ماہ کی 7' 14' 21 اور 28 تاریخ کو ہوتا تھا"

ہفت روزہ یوم تعطیل کا تصور عیسائیوں کے ہاں قدیم یہودیوں اور اہل بابل سے لیا گیا ہے۔ عیسائیوں کا ایک ممتاز دینی رہنما سینٹ امبروس لکھتا ہے (اور یہ حوالہ بھی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز ج 12 ص 105 کا ہے) کہ

"خدا نے ابتدا ہی سے ہمیں علامتی انداز میں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ہفتے میں ایک دن علیحدہ کر لیں اور اسے روحانی سرگرمیوں میں صرف کریں۔"

مگر عیسائی چونکہ اپنے آپ کو یہودیوں کا پیرو یا خوشہ چیں نہ بنانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ہفتے کی جگہ اتوار کو اپنا یوم تعطیل بنالیا اور سینٹ پال نے یہودیوں سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے اسے یوم عبادت بھی قرار دے دیا۔ اگرچہ ان کے ہاں پورے کا پورا دن عبادت کے لئے وقف نہ تھا پھر بھی اجتماعی عبادت کے لئے گرجا میں حاضری اس دن دی جاتی اور باقی وقت آرام اور تفریحات میں بسر کیا جاتا۔ عیسائیوں کے نقطہ نظر کی ترجمانی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز ج 12 ص 107 کے اس اقتباس سے ہوتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ

> "عہد نامہ جدید (انجیل) کے ذریعے چوتھا حکم (جو یوم سبت سے متعلق تھا) منسوخ ہو چکا ہے اس لئے نظریاتی طور پر تو مختلف دنوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہئے لیکن طبع انسانی کو محنت کے بعد آرام کے ایک دن کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی روح اجتماعی عبادت کے لئے فرصت کی طلب گار ہے اس لئے سب لوگوں کے لئے (اجتماعی عبادت کا) ایک دن مقرر ہونا چاہئے اس ضمن میں ہم اس روایت کی پیروی کرنے سے بہتر کوئی کام نہیں کر سکتے جس کی رو سے ہفتے کے پہلے دن (یعنی اتوار) کو مخصوص کر دیا گیا ہے۔"

چنانچہ مغربی دنیا کی تاریخ میں شہنشاہ کنسٹنٹائن نے 321ء میں ایک حکم نامے کے ذریعے قانونی طور پر اتوار کو یوم تعطیل قرار دینے کا اعلان کر دیا۔

اس مختصری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ عیسائیوں کے نزدیک اتوار کو یوم سبت کی طرح کوئی تقدس حاصل نہیں اور اس کا انتخاب انہوں نے یہودیوں سے اپنے جداگانہ تشخص کے اظہار کے لئے کیا تھا پھر بھی اسے اجتماعی عبادت کا دن ٹھہرا کر ایک گونہ مذہبی رنگ ضرور دے دیا گیا اور آج بدقسمتی سے پاکستان میں ایک با اثر طبقے کی خواہش یہ ہے کہ ہم بھی اسی مذہبی رنگ کی پیروی کریں۔

....

بعض لوگ کہتے ہیں دنوں میں کیا رکھا ہے کوئی سا بھی نام انہیں دے دیا جائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے جمعہ کو جمعہ کہہ دیں تب کیا اور اسے فرائیڈے کے نام سے موسوم کر لیں تب کیا۔ آخر کو تو یہ ایک دن ہی ہے' اسی طرح کسی دن کو "یوم الاحد" کہہ لیں یا اتوار اور سنڈے کا نام دے دیں اس سے کون سی قیامت آجائے گی مگر ہم عرض کریں گے کہ یہ اتنی سادہ اور معمولی بات نہیں' دنوں کے ان ناموں کے پیچھے باقاعدہ مذہبی اور تہذیبی روایات کار فرما ہیں' میری خواہش تو یہ ہے کہ پاکستان میں ہفتے کے دنوں کے بھی وہی نام رائج کئے جائیں جو اسلامی تقویم نے ہمیں عطا کئے ہیں کیونکہ انگریزی یا ہندی ناموں کی ترویج سے ہم غیر شعوری اور نادانستہ طور پر ان دیومالائی تصورات کو سینے سے لگا بیٹھے ہیں جو ان ناموں کے پس پردہ کام کر رہے ہیں' اب آیئے اور اس اجمال کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

مسلمانوں کے علاوہ باقی تمام اقوام نے ہفتے کے دنوں کے نام ستاروں یا دیوتاؤں کے نام پر رکھے ہیں۔

○ .... سن ڈے سورج کا دن ہے۔

○ .... مون ڈے یعنی منڈے چاند کا دن ہے۔

○ .... ٹیوز ڈے ٹیوٹونک زبان میں ٹیوز اور یونانی زبان میں زیوز کا دن ہے جو رومن زبان میں مارس یعنی مریخ ہے۔

○ .... ویڈنس ڈے یعنی ڈے آف ویڈن' ووڈن کا دن ہے جو رومن زبان میں مرکری یعنی عطارد ہے۔

○ .... تھرس ڈے' جیو پیٹر یا مشتری کا دن ہے۔

○ .... فرائڈے زہرہ کے قدیم نام فرائز پر ہے۔

○ .... سیٹر ڈے اصل میں سٹرن ڈے ہے جس کا مطلب ہے یوم زحل۔

اسی طرح ہندوؤں کی تقویم کے مطابق ایت وار سورج دیوتا کا' سوموار سوم یعنی چاند کا اور منگل وار منگل دیوتا کا دن ہے' اسی طرح کا مفہوم دوسرے ناموں کا ہے جن سے ہندو قوم کے مخصوص مذہبی عقائد کی نشان دہی ہوتی ہے مگر اسلامی تقویم میں دنوں کو گنتی اور عددی ترتیب کے لحاظ سے رکھا گیا ہے صرف جمعہ اور ہفتہ کے دن اس سے مستثنیٰ ہیں' ہفتہ کا دن یہودیوں کے ساتھ مخصوص ہو چکا تھا اس لئے اسے سبت کہا گیا اور جمعہ کو اجتماعی عبادات کی نسبت سے "یوم الجمعہ" کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ دوسری قوموں کے ہاں بھی اس دن کو "یوم خوبی" سمجھا جاتا ہے' بابلی اور یونانی تقویم کے مطابق یہ زہرہ کا دن ہے اور زہرہ کو خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے ہندی میں اسے شکروار یعنی شکرانے کا دن کہتے ہیں' *

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس دن کو چھوڑ کر کسی ایسے دن کو یوم تعطیل کیوں قرار دیں جو دوسری قوموں کے ہاں یا تو اجتماعی عبادت کا دن ہے یا پھر اس سے بعض ایسے عقائد وابستہ ہیں کہ اسے اختیار کرنے پر خواہ مخواہ ان لایعنی تصورات کو تقویت ملتی ہے' ہم واضح کر چکے کہ اتوار "یوم آفتاب" ہے اور آفتاب پرست اقوام کے لئے قابل احترام دن کی حیثیت رکھتا ہے' قدیم بابلی اور ایرانی اقوام آفتاب پرست تھیں' قدیم یونانی دیومالا میں بھی آفتاب کو بہت مرتبہ اور مقام حاصل تھا' آتش پرست لوگ بھی آفتاب کو بہت بڑا دیوتا مانتے تھے (کیونکہ آفتاب ہی آگ کا مبداء اور سرچشمہ ہے) عیسائیوں کے ہاں یہ تصورات نہیں پائے جاتے مگر انہوں نے یہودیوں سے ممیز ہونے کے لئے اتوار کو اجتماعی عبادت کا دن مقرر کیا اور اسے مزید تقدس عطا کرنے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کا یوم پیدائش بھی قرار دیا' سترہویں صدی کے بعد کرۂ ارض میں انگریز عیسائیوں کو جو غیر معمولی سیاسی بالادستی حاصل ہوئی اس کی وجہ سے قدرتی طور پر ان کی زبان' لباس' کلچر' طرز معاشرت' ہر چیز کو فوقیت مل گئی' ریاست ہائے متحدہ امریکہ تک نے یہ چیزیں انہی سے وراثت میں حاصل کیں' برطانیہ کا اثر کم ہو گیا مگر امریکہ کا غلبہ بڑھتا ہی چلا گیا اور اب نتیجہ یہ ہے کہ ان اینگلو امریکی اثرات کے تحت ہم چھٹی کے دن کے لئے بھی اتوار کے سوا کسی اور دن کا تصور نہیں کر سکتے۔

* "شکرانہ" کی ایک ہی رہا — "شکر" ہندی میں زہرہ کو کہتے ہیں۔ ذ ا

عرض کیا جا چکا ہے کہ ہماری دینی روایتوں میں سے ایک اہم روایت یہ ہے کہ جمعہ کا دن مبارک اور قابل احترام ہے' قرآن حکیم میں نماز جمعہ کے لئے خصوصی تاکید موجود ہے یہاں تک ارشاد ہے کہ نماز جمعہ کے لئے اذان ہو تو نہایت تیزی سے نماز ادا کرنے کے لئے جاؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو اسی لئے فقہا کے نزدیک صلوٰۃ جمعہ کے دوران کی ہوئی کمائی مذہبی نقطہ نظر سے ناجائز ہے اسی طرح احادیث نبویؐ میں بھی نماز جمعہ نہ پڑھنے والوں کے متعلق عتاب کا اظہار کیا گیا ہے' چنانچہ السنن الکبریٰ بیہقی میں آتا ہے کہ۔

"جو کوئی تین مرتبہ متواتر جمعہ کی نماز چھوڑ دیتا ہے تو اس کے دل پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے۔" (بیہقی ج 3 کتاب الجمعہ ص 172)

نماز جمعہ کے لئے ایسی زبردست تاکید اور تارکِ صلوٰۃِ جمعہ کے متعلق اس خوفناک وعید سے یہ امر خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ عامتہ المسلمین کو نماز جمعہ کے لئے مناسب سہولتیں مہیا ہونی چاہئیں اور ایک مسلم حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرے۔ آج کل کے دور میں جبکہ شہری آبادیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور آبادی میں اضافے کی وجہ سے لوگوں کے کام کاج کے مراکز ان کے گھروں سے خاصے فاصلے پر ہوتے ہیں' ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا خاصا دشوار ہوتا ہے' پاکستان جیسے ملک میں جہاں وسائل نقل و حمل بھی کافی اور آسان نہیں لوگوں کے لئے اپنے دفاتر میں کام ختم کرنے کے بعد پابندی کے ساتھ نماز جمعہ کے لئے پہنچنا خاصا مشکل ہوتا ہے اس کا مناسب حل یہی تھا کہ ہفتہ وار تعطیل اتوار کے بجائے جمعہ کے دن کی جائے تاکہ لوگ جمعہ کی نماز نہایت فراغت اور اطمینان قلب کے ساتھ ادا کر سکیں' پرانے زمانے میں بھی جب موجودہ دور کے تیز وسائلِ نقل و حمل تو میسر نہ تھے لیکن آبادیاں بھی ایسی پھیلی ہوئی اور منتشر نہ تھیں نماز جمعہ کے لئے کافی وقت صرف ہوتا تھا خود سرکار رسالت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ کے متعلق روایت ہے کہ

"ذوالحلیفہ کے لوگ نماز جمعہ کے لئے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے جبکہ ذوالحلیفہ مدینہ منورہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے"۔

چھ میل کے فاصلے کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم دو گھنٹے سفر کر کے وہ مدینہ منورہ پہنچتے تھے گویا صبح چاشت سے تھوڑی دیر بعد گھر سے چل پڑتے تھے اسی طرح بعد از نماز جمعہ انہیں دو گھنٹے واپسی پر بھی لگتے ہوں گے اور یوں دن کا بیشتر حصہ نماز کے لئے جانے' نماز ادا کرنے اور بعد از نماز جمعہ واپسی پر صرف ہو جاتا ہو گا یہی حال مضافات مدینہ کے دوسرے لوگوں کا تھا وہ بھی اتنا ہی وقت جمعہ کی تیاری اور اس اہم عبادت کی ادائیگی میں صرف کر دیتے تھے گویا اس طرح حقیقتاً جمعہ کا پورا دن چھٹی ہی بن جاتا تھا اور عہد رسالتؐ میں مدینہ کے مضافات کے لوگ سوائے عبادت اور اس کی تیاری کے اس دن اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن حکیم میں ہے۔

"جب نماز ادا ہو چکے تو زمین کے اندر پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔"

اس لئے نماز جمعہ کے بعد اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لئے تجارت میں مشغول ہو جانا چاہیئے، ہم عرض کریں گے کہ ایک تو یہ حکم نہیں اجازت ہے گو "فَانۡتَشِرُوۡا" امر کا صیغہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو ایسا نہ کرے گا وہ گناہگار ہوگا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ وقفہ جمعہ میں بھی کاروبار میں منہمک ہونا چاہتے ہیں وہ ایسا نہ کریں البتہ اگر ادائے نماز کے بعد وقت بچ جائے تو وہ فضل خداوندی یعنی رزق حلال تلاش کر سکتے ہیں۔

اس شرط کی کیا ضرورت ہے؟ آدھا دن بچتا ہے!

اور اگر اس آیت کا وہ مفہوم اختیار کیا جائے جو حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے (اور ان سے زیادہ فہم قرآن کسے ہوگا) تو پھر بات اور صاف ہو جاتی ہے اور جمعہ کے دن بطور یوم عبادت تعطیل کرنے کی ایک اہم دلیل سامنے آجاتی ہے، حضرت امام فرماتے ہیں کہ جمعۃ المبارک کا دن پورے کا پورا یوم الصلوٰۃ ہے اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب یہ پورا دن گزر جائے تو اگلے دن تم اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاؤ" من لا یحضرہ الفقیہہ" رجاب آفتاب تہران 1376 ص 114 پر ہے۔

"جب ابو ایوب الخزاز نے جناب امام سے قرآن حکیم کی اس آیت کے متعلق پوچھا (جس کا مفہوم یہ ہے) کہ جب نماز ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو تو آپ نے کہا کہ جمعہ کا دن یوم الصلوٰۃ ہے اور ہفتہ کا دن یوم انتشار (یعنی زمین میں پھیل جانے کا دن)"

کہا جاتا ہے کہ جب سے جمعہ کا دن تعطیل کا دن قرار پایا ہے لوگ شادی بیاہ کی تقریبات اسی دن کرنے لگے ہیں اور پھر چونکہ تعطیل کے ساتھ تفریح کا تصور بھی وابستہ ہے۔ وہ اس دن تفریحات میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ نماز جمعہ ادا نہیں کر پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات مشاہدہ کے بالکل برعکس ہے جن لوگوں کو نماز جمعہ ادا کرنے کا احساس ہے وہ تعطیل کی وجہ سے یکسو ہو کر عبادت کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جمعہ کی چھٹی کے بعد مسجدوں کی رونق دوبالا ہو گئی ہے رہی تفریح پسندوں اور غفلت شعاروں کی بات تو یہ کام ہماری دینی و تبلیغی جماعتوں، علماء و خطباء اور مسلمان مصنفین اور اہل قلم کا ہے کہ وہ اس چھٹی کو بطور یوم عبادت منانے کے لئے ذہنی فضا تیار کریں اور کوشش کریں کہ جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے اس دن کے اجتماعات میں اور عظمت و کثرت پیدا ہو جائے۔ اس کا یہ علاج جس نے بھی سوچا ہے، غلط سوچا ہے کہ ہم رجعت قہقری اختیار کر کے جمعہ کے بجائے پھر سے اتوار کو اپنا لیں اور اس طرح غیروں کی تہذیب اور شعار کو سینے سے لگا کر اپنی دینی روایات کو بھی پس پشت ڈال دیں اور اس سلسلے میں عالم اسلام سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیں۔

(31 / مئی 84)

مقروض ملک میں خیراتی حج کا مسئلہ

حج ایک ایسی عبادت ہے، جو صرف صاحب استطاعت افراد پر فرض ہے۔ اگر کوئی شخص مقروض ہو توسب سے پہلے اس کے لئے قرضے کی ادائیگی لازم ہے۔ حج کا سوال اس کے بعد اٹھتا ہے۔ وہ لوگ جو زادِ راہ نہیں رکھتے مگر ان کی نیت یہ ہے کہ جونہی وسائل دستیاب ہوئے وہ یہ فریضہ ادا کریں گے۔ اسی حسن نیت پر اللہ تعالیٰ انہیں حج کا ثواب عطا کر دیتا ہے۔

....

بدقسمتی سے اب کے ہمارے قومی بجٹ میں اس سے بالکل متضاد موقف اختیار کیا گیا ہے۔ وزیر خزانہ نے تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی سالانہ رقم ان پانچ سو سرکاری ملازمین کے حج کے اخراجات کے لئے وقف کی ہے، جو از خود حج پر جانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ قومی اسمبلی نے بجٹ پاس کر دیا۔ سینیٹ میں از روئے دستور بجٹ پیش نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ استحقاق نہ رکھنے پر سینیٹ بڑی حد تک اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے۔ سینیٹ کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ فیڈرل یونٹس (وفاقی اکائیوں) کے مفادات کا تحفظ کرے۔ اگر مالی معاملات کو اس کے دائرۂ کار سے خارج کر دیا جائے تو ملک کا یہ اعلیٰ ترین ادارہ بڑی حد تک بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس حکومت نے جہاں سیاسی مقاصد کے لئے 73ء کے آئین میں بے دریغ ترامیم کے ذریعے سے اس کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے وہاں یہ اہم ترمیم کرنے میں تو اسے بطور خاص پیش قدمی کرنی

چاہئے تھی۔ بہر حال یہ احساس سینیٹ کے اراکین میں موجود ہے اور اگر حکومت نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا تو وہ صورتحال کی اصلاح کے لئے خود ہی مناسب قدم اٹھائیں گے میں نے اب کے سینیٹ کے اجلاس میں خیراتی حج کا مسئلہ جن وجوہ سے تحریک التواء کے ذریعے ایوان میں پیش کیا تھا اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سینیٹ کے چیئرمین کی رولنگ سے پورے ایوان کو کامل احساس ہو جائے کہ بجٹ کے معاملات سینیٹ کے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ چیئرمین نے اسی ٹیکنیکی اور فنی بنیاد پر تحریک التواء کو مسترد کر دیا مگر اس کے نتیجے میں سینیٹ کے اراکین اور ملک کے باشعور طبقے کے سامنے یہ ضرورت بہ تمام و کمال واضح ہو گئی کہ بجٹ کی منظوری صرف قومی اسمبلی ہی کا کام نہیں ہونا چاہئے بلکہ سینیٹ کو بھی اس میں برابر کا شریک قرار دیا جائے۔

خیراتی حج پر میری شرعی دلیل تو وہی تھی جس کی جانب میں شروع میں اشارہ کر چکا۔ مزید وضاحت اس کی یہ ہے کہ اس وقت ہمارا قومی خزانہ 3ء9 بلین ڈالر کا مقروض ہے۔ ہم نے اب تک اپنی ملکی معیشت کو سہارا دینے کے لئے بیرونی طاقتوں سے سود در سود پر قرضے لے رکھے ہیں (اور برابر لئے جا رہے ہیں) انہیں اگر پاکستان کی پوری آبادی پر فی کس کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے تو ہر پاکستانی تقریباً ایک ہزار اٹھاون ڈالر یعنی سترہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ حکومت کو اس حد تک قرضوں سے زیر بار قومی خزانے سے ہر سال سینکڑوں افراد کو خیراتی حج پر بھیجنے سے پہلے مفتیانِ کرام سے بھی پوچھ لینا چاہئے تھا کہ اس طرح کے اقدام کی شرعی حیثیت کیا ہو گی؟

کوئی کہہ سکتا ہے کہ صاحب! حج پر بھجوانا اگر حکومت کے لئے فرض نہیں تب بھی یہ کارِ خیر تو ہے اس سے کیوں روکتے ہو۔ میں عرض کروں گا حکومت سب سے پہلے اپنا فرض ادا کرے، نفل کی ادائیگی کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ شریعت کی رو سے ایک اسلامی حکومت کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفیل اور ضامن ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث اور خلافت راشدہ کے تعامل سے اس کے لاتعداد دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں مگر ان کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں کہ اسلامیات کا کوئی معمولی سے معمولی طالب علم بھی اس بات کے اسلامی حکومت کے بنیادی فریضہ ہونے سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ شہریوں سے بھی زیادہ اس پر ذمہ داری سرکاری ملازمین کی عائد ہوتی ہے کہ وہ انہیں اتنے معاوضے ضرور دے جس سے وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکیں، علاج معالجہ کرا سکیں، رہنے کے لئے ان کے پاس کوارٹر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی انہیں رشوت کا سہارا لینا پڑے۔ اب حکومت یہ فرض تو ادا کر نہیں رہی اس کے بجائے انہیں خیراتی حج پر بھیجنے کے منصوبے بنا رہی ہے تاکہ ان کے مذہبی جذبات کا استحصال ہو وہ کھلونے دے کے ہی بہلا لئے جائیں۔ اب اس طرح کے "اسلامی ڈرامے" پر میں لب کشائی نہ کرتا تو یقیناً میں کتمانِ حق کا مجرم ہوتا۔

ڈیڑھ کروڑ روپے سالانہ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے اس سے اگر پانچ مرلہ پلاٹ (فی پلاٹ پانچ ہزار روپے کے حساب سے) خرید کئے جائیں اور قرعہ اندازی کے ذریعہ نچلے درجے کے سرکاری ملازمین میں تقسیم کئے جائیں تو ہر سال پانچ سو ملازمین کے لئے گھر بنانے کی زمین کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ایک

دوسری اسکیم اسی سرمائے سے چھوٹے سرکاری ملازمین کے ذہین بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک روانگی کی شروع کی جاسکتی ہے اور اس میں بھی قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک صدقہ جاریہ بھی ہو گا اور اس کے ذریعے سے ملک ان غریب افراد کے ذہین بچوں کی صلاحیتوں سے بھی فیض یاب ہو سکتا ہے، جو وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے اور اس پر مکمل طور پر خوشحال گھرانوں کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے۔

....

میں نے سینیٹ میں یہ سوال اٹھایا تو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ میری مخالفت مذہبی طبقے کے افراد نے ہی کی۔ فرمایا کہ میں نے کھلاڑیوں اور ثقافتی طائفوں پر ہونے والے اخراجات کے خلاف تو آواز نہیں اٹھائی مگر حج پر اٹھنے والے اخراجات پر احتجاج کر رہا ہوں۔ اس بحث کو جانے دیجئے کہ کسی ملک کے کھلاڑی اور فنکار بھی بعض مخصوص شعبوں میں اس ملک کا تشخص اور اس کی پہچان ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان اخراجات کو اسلامی اور مذہبی تو کوئی نہیں سمجھتا۔ خیراتی حج کا اجراء تو ایک "بدعت" ہے۔ ایک مقروض ملک کے قومی خزانے پر مذہب کے نام پر ایک بوجھ ہے جسے حکومت غلط طور پر ایک نیکی اور خدمت قرار دے رہی ہے۔ میں کتنا ہی کوتاہ عمل کیوں نہ ہوں لیکن ایک غلط عقیدے کے اجراء پر خاموش نہیں رہ سکتا۔

25 / جولائی 85ء

عید کے چاند کا مسئلہ

عید کے سلسلے میں کئی سال کے بعد اب کے پھر بدمزگی ہو گئی۔ رویت ہلال کمیٹی نے 29ر رمضان کو اپنا جو اجلاس منعقد کیا' اس میں چاند ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرتے گیارہ بج گئے۔ دریں اثناء لوگ فیصلے کے اعلان کا انتظار کرتے کرتے تنگ آ گئے یہاں تک کہ تراویح کی نماز بھی ہو گئی اور بہت سے لوگ یہ سوچ کر سو گئے کہ اب عید کا ہونا بہت مشکل ہے۔ کئی لوگوں نے حسب معمول سحری کھائی اور انہیں صبح جا کر معلوم ہوا کہ آج عید ہے۔ ادھر رویت ہلال کمیٹی کے اس قدر تاخیر سے فیصلہ کرنے کے باعث شیعہ اور اہل حدیث نے کمیٹی کے فیصلہ کی تقلید کرنے کے بجائے عید اس سے اگلے روز منائی' ایک ہی شہر میں عید کی دو دو نمازیں ہوئیں اس طرح جو خلفشار پیدا ہوا اس کی زد میں رویت ہلال کمیٹی بھی آ گئی۔ کئی حلقوں سے اس پر عدم اعتماد کا اظہار ہوا ہے اور بعض علماء نے تو اس کے اراکین سے مستعفی ہونے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

چاند ہونے نہ ہونے کا مسئلہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی بننے تک پاکستان میں بڑا ہی معرکتہ الآراء مسئلہ رہا ہے۔ چونکہ چاند کا تعلق روزے کی عبادت سے ہے اس لئے اس کے دیکھنے کی باقاعدہ کوشش مسلمانوں کے لئے فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ صرف فقہ حنبلی میں اسے مستحب (یعنی پسندیدہ) قرار دیا گیا ہے ورنہ دوسرے ہر مسلک کے فقہاء نے اسے فرض کفایہ ہی ٹھہرایا ہے۔ اس کے عبادت سے

متعلق ہونے کی وجہ سے قدرتاً علمائے کرام کا اس سے گہرا تعلق ہے اور عوام مذہبی معاملہ ہونے کی وجہ سے اس سلسلے میں انہی کی صوابدید پر عمل کرنا چاہتے ہیں ادھر بدقسمتی سے جدید تمدن کے بطن سے پیدا ہونے والے لاتعداد مسائل کے بارے میں علمائے کرام کا نقطہ نظر غیر حقیقت پسندانہ رہا ہے اب تو خیر ان حضرات میں آہستہ آہستہ وہ پہلی سی شدت باقی نہیں رہی ہے لیکن آج سے چند سال پہلے ان کے نزدیک ریڈیو پر اعلان مستند نہ تھا اسی طرح ٹیلیفون کے ذریعے شہادت ان کے نزدیک ناقابل قبول تھی اسی طرح کی پیچیدگیاں تھیں جب ایک مرتبہ صدر ایوب خاں مرحوم کے زمانے میں حکومت کی طرف سے عید کا اعلان ہونے پر علمائے کرام اس کی مخالفت میں باقاعدہ حکومت کے مدمقابل بن کر میدان میں آ گئے۔ سحری کے وقت مسجدوں سے اعلان ہوا کہ کل عید نہیں ہوگی۔ ادھر حکومت نے بھی عید کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا اور اس نے اگلے دن اوقاف سے تنخواہیں پانے والے تمام علماء کو مجبور کیا کہ وہ عید کی امامت کرائیں 'اس سلسلے میں بعض لطیفے بھی سرزد ہوئے 'ایسا بھی ہوا کہ بعض امام خود روزے سے تھے لیکن مجبوراً انہوں نے عید کی نماز پڑھائی اور بروایت مشہور کالم نگار جناب عبدالقادر حسن ایک امام نے عید کی جگہ جنازے کی ہی نماز پڑھادی اور ایک امام مقتدیوں کو پہلی رکعت کے سجدے میں ہی چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گئے تلخی اتنی بڑھی کہ حکومت نے پانچ مقتدر علماء کرام کو جن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم بھی شامل تھے گرفتار کر لیا اس موقع پر محکمہ اطلاعات نے جو پریس نوٹ جاری کیا اس میں اہتمام سے ان سب حضرات کے نام کے ساتھ مولانا کی جگہ مسٹر کے الفاظ لکھے گئے گویا اس سے ان حضرات کا استخفاف پیش نظر تھا' ویسے بھی اس زمانہ کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین مرحوم مشہور مفکر جناب غلام احمد پرویز کے حلقہ بگوشوں میں شامل تھے اور پرویز صاحب ان کی وساطت سے صدر ایوب کو بھی اپنے افکار سے متاثر کر رہے تھے ان کا ایک مستقل نظریہ یہ بھی تھا (اور ہے) کہ خدا کے سوا کسی کو "مولانا" کہنا شرک ہے کیونکہ یہ لفظ عربی زبان میں "ربّنا" اے ہمارے پروردگار کے مترادف ہے۔

بات سے بات نکل آئی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ پرویز صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ "مولانا" اور "ربّنا" دونوں ہم معنی ہیں عربی میں اگرچہ رب بھی مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر عام طور پر یہ ذات باری کے لئے خاص ہے اس کے برعکس "مولانا" کا لفظ وسیع المعنی ہے اس کے معنی حمایتی 'دوست' آزاد شدہ غلام 'غلام کو آزاد کرنے والے آقا' رشتہ دار 'ہمسائے اور بھائی کے بھی آتے ہیں اور آقا سردار اور محترم کے بھی 'علمائے دین کو مولانا اسی مؤخر الذکر معنی میں کہا جاتا ہے 'شروع شروع میں یہ لفظ امراء حکام اور علماء سب کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ علمائے دین کے لئے خاص ہو کر رہ گیا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے صحابیٔ رسول حضرت انسؓ بن مالک نے حضرت حسن بصریؒ کے لئے استعمال کیا تھا' طبقات ابن سعد (جلد 7 صفحہ 128) میں ہے کہ

"حضرت انسؓ ابن مالک سے ایک سوال دریافت کیا گیا فقال نیعم مولانا الحسن، آپ نے کہا مولانا حسن کے پاس جاؤ، انہوں نے کہا اے ابو حمزہ ہم تو آپ سے پوچھتے ہیں اور آپ کہتے ہیں مولانا حسن سے دریافت کرو حضرت انسؓ نے فرمایا علم ہم نے بھی سنا اور حسن نے بھی مگر فرق یہی ہے کہ انہوں نے علم کو محفوظ رکھا اور ہم نے بھلا دیا"۔

اہل علم کے علاوہ تیسری چوتھی صدی میں یہ لفظ امراء اور حکام کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا، علامہ ابن خلکان نے اپنی تاریخ کی جلد دوم میں صفحہ 2 پر امیر مصر کے متعلق ابو الفضل کا یہ فقرہ درج کیا ہے کہ

"ادام اللہ ایام مولانا .... اللہ تعالیٰ مولانا (ہمارے سردار) کے اقبال کو قائم رکھے"

یہ تھی لفظ مولانا کی تحقیق اب لگے ہاتھوں مولوی اور ملا کے الفاظ کی طرف آیئے ہماری آج کی نام نہاد مہذب سوسائٹی میں ہر داڑھی والا مولانا ہے اور ہر ہدف نفرت شخص مولوی اور ملا مگر ایک زمانہ تھا جب یہ خطاب عظمت و عزت کی علامت خاص سمجھا جاتا تھا۔ صاحب غیاث اللغات اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مولوی بفتح میم ولام منسوب بمولا بمعنی خداوند ست بعد الحاق یائے نسبت الف کہ رابع بود بواؤ بدل شد زیرا کہ الف مقصورہ آخر کلمہ سہ حرفی بوقت نسبت بواؤ بدل می شود"

اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی کا لفظ مولا اور خداوند کی طرف منسوب ہے مولوی کا مطلب ہوا مولا والا، خدا والا، شروع شروع میں یہ لفظ حکام اور بادشاہوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جب سلطان مصر محمد نے ابو المنذر کو شام کا حاکم بنایا تو اسے ان القاب سے مشرف فرمایا۔

"الملکی" المقام الشریف العالی المولوی السلطانی العمادی المویدی" (کشف الظنون ج 1 ص 209)

مولانا روم جیسا فاضل عصر اپنے آپ کو مولوی کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

مولوی ہرگز نشد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نشد

مولوی کے بعد مُلّا کے لفظ پر غور کیجئے لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں بھرا ہوا، "مُر" قرآن حکیم میں جہاں کہیں اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں ان کا یہی مفہوم ہے سورۃ جن میں آسمان کے بارے میں آتا ہے مُلِئَتْ حرساً شدیدا و شھبا یہ محافظوں اور شہابوں سے بھرا ہوا ہے .... اس لحاظ سے مُلّا کے معنی ہوئے وہ شخص جس کا سینہ علم سے بھرا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں بعض اکابر اہل علم کو "ملا" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون نے علمائے

اہل سنت میں سے حضرت شیخ عبدالرحمٰن جامی ، حضرت محمود جونپوری ، حضرت عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامہ علی قاری کو بطور اعزاز و تکریم مُلّا کا خطاب عطا فرمایا ہے اسی طرح شیعہ علمائے کرام میں سے مُلّا محسن فیض کاشانی اور مُلّا محمد باقر مجلسی کے نام زبان زد خلائق ہیں۔

....

یہ تو خیر ایک جملہ معترضہ تھا جو خاصا طویل ہو گیا ' آمدم بر سر مطلب ' عید کے چاند کے مسئلہ پر علمائے کرام اور صدر ایوب کی حکومت میں ایسی ٹھنی کہ نوبت بعض سرکردہ علماء کی گرفتاری کی آ گئی ' ان اکابر کی گرفتاری کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ صدر ایوب لاہور آئے ' میری اس زمانہ میں ان سے اچھی خاصی صاحب سلامت تھی مرحوم میری بہت عزت کرتے تھے ' میں ایک وفد لے کر جس میں راولپنڈی سے سید علی اصغر شاہ صاحب بھی شامل تھے ان سے ملا اور ان سے علماء کی اس گرفتاری کے نتائج و عواقب پر گفتگو کی نتیجتاً ایوب خان مرحوم نے علماء کی رہائی کے احکام جاری کر دیئے مگر فریقین میں تلخی بدستور قائم رہی اور عید کا چاند ہونے نہ ہونے کے مسئلہ پر حکومت اور علمائے کرام کے درمیان رسہ کشی برابر جاری رہی ' اب یاد پڑتا ہے جس سال چاند کے مسئلہ پر علماء گرفتار ہوئے ہیں اس دن عوام میں ایک افواہ یہ بھی پھیل گئی تھی کہ چونکہ جمعہ کو عید ہو جانے پر دو خطبے جمع ہو جاتے ہیں اس لئے جمعہ کی عید حاکم وقت پر بھاری ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حکومت جمعہ کے دن عید نہیں ہونے دے رہی بدقسمتی سے یہ خیال عوام میں اتنا مقبول ہوا ہے کہ اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں اور تو اور خود ہمارے زمانہ میں جب ایک مرتبہ رویت ہلال کمیٹی نے جمعہ کے دن عید کرنے کا فیصلہ کیا تو بھٹو مرحوم نے مجھے فون کیا اور کہا کہ کمیٹی نے جمعہ کے دن عید کرنے کا اعلان کر دیا ہے حالانکہ جمعہ کی عید بھاری ہوتی ہے میں نے کہا بھٹو صاحب آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی کیسے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گیا ' جمعہ کی عید امیر پر بھاری اس معنی میں تھی کہ اس غریب کو اس دن دو خطبے پڑھنے پڑھتے تھے ایک عید کا دوسرا جمعہ کا ' کیونکہ خیر القرون میں خود حاکم وقت ہی یہ خطبہ دیا کرتا تھا اِس دور میں جبکہ امیر وقت پر عید کی نماز ہی پڑھ لے تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ شمار ہوتا ہے ' جمعہ کی عید حاکم وقت پر کیوں کر بھاری ہو گی ؟ ویسے بھی ... میں نے انہیں سمجھایا۔ جمعۃ المبارک ہفتے کے دنوں میں عید کا دن سمجھا جاتا ہے اور یہ بجائے خود ایک بابرکت تقریب کا موقع فراہم کرتا ہے اس برکت میں عید کی برکت شامل ہو جائے تو یہ دہری برکت ہوئی اس میں نحوست کا پہلو کہاں سے آ گیا۔ بارے میری بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ مطمئن ہو گئے۔

....

گذشتہ عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی اور ملک کی تاریخ میں پہلی بار وزارت مذہبی امور قائم ہوئی تو عید کے مسئلے پر ماضی کے ان تلخ تجربات کے پیش نظر میں نے قومی اسمبلی میں رویت ہمارے ہاں حج کا دن حاجیوں کے دن سے مختلف ہو کم سے کم عید قربان کے فیصلہ کے لئے تو سرزمین حرم کی رویت معتبر ہونی چاہیئے۔

ہلال کے سلسلے میں باقاعدہ بل پیش کیا جس میں ہر مکتب فکر کے علماء پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی جو تمام شرعی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے چاند ہونے نہ ہونے کا حتمی اعلان کرے، مقصد اس بل سے ایک مسئلہ عبادت کو سرکاری حکام کے دائرۂ اختیار سے نکال کر علماء کے حیطۂ عمل میں لے آنا تھا۔ قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر اس بل کو منظور کر لیا تو میں نے اس کے ارکان کی نامزدگی میں مولانا مفتی محمود مرحوم اور مولانا شاہ احمد نورانی کے مشورے حاصل کئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اولین چیئرمین شپ کے لئے حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کو آمادہ کیا جن کا نام چاند کے نزاع کے سلسلے میں ہمیشہ سے پیش پیش چلا آ رہا تھا' خدا کا شکر ہے کہ کمیٹی کے قیام کے بعد سے پاکستان میں دو عیدیں ہونے کا سلسلہ رک گیا ملک میں ایک ایسی مرکزی شرعی اتھارٹی قائم ہو گئی جس پر عوام کو اعتماد تھا اور جس نے اب تک بحسن وخوبی اپنے فرض منصبی کو پورا کر کے قوم کو انتشار و خلفشار سے محفوظ رکھا بدقسمتی سے نو سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ پھر سے نا اتفاقی کا پہلا سا موقع پیدا ہوا اور اس میں بھی افواہ وہی چلی کہ حکومت نے جمعہ کی عید سے بچنے کے لئے جمعرات کے دن کی عید کرا دی۔

پڑھے لکھے لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ عالم اسلام میں عید ایک ہی دن منائی جائے' جواب واضح ہے کہ عید کا انحصار چاند دیکھے جانے پر ہے اور یہ مطلع کے اختلاف کی وجہ سے کہیں پہلے نظر آتا ہے کہیں بعد میں' جہاں تک ماہرین فلکیات کی رائے کا تعلق ہے اگرچہ فقہ شافعیہ میں رویت کے سلسلے میں منجم کے قول پر عمل کیا جا سکتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الفقہ علیٰ مذاہب الاربعہ ج 1) مگر بدقسمتی سے خود سائنس دان ابھی تک چاند کے سلسلے میں کوئی حتمی اور یقینی پیش گوئی کرنے سے قاصر ہیں' ہاں اگر بین الاقوامی طور پر روزے رکھنے اور عید کو ایک دن منانے کا فیصلہ کرنا ہو تو اس کے لئے مسلمان حکومتیں اور علماء مل کر اس پر غور کر سکتے ہیں کہ آیا مکہ مکرمہ میں چاند کی رویت کو اس کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے یا نہیں اس کے دلائل موجود ہیں مگر ظاہر ہے یہ کسی ایک فرد کی رائے کا مسئلہ نہیں اس کے لئے پورے عالم اسلام کو متفقہ فیصلہ کرنا ہو گا اور اس کے کوئی آثار دور دور نظر نہیں آتے' ویسے بھی عید الفطر اب ایک سال دور ہے۔ اس کی اتنی فکر نہیں پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی اپنے حالیہ تجربے کی بنیاد پر مزید محتاط ہو چکی ہو گی اور امید ہے کہ امسال کی سی ناخوشگوار صورت حال دوبارہ پیدا نہیں ہو گی مجھے فکر بقر عید یعنی عید الاضحیٰ کی ہے جو بس آیا ہی چاہتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی نقشہ اس عید پر بھی نظر آئے اس لئے کم سے کم اس عید کے لئے تو میں رویت ہلال کمیٹی اور علمائے کرام کے غور و خوض کے لئے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ یہ عید پاکستان میں بھی اسی دن منائی جائے جس دن منیٰ اور مکہ مکرمہ میں منائی جاتی ہے کیونکہ اس کا کھلا کھلا تعلق حج سے ہے حج کے اگلے دن یہ عید ہوتی ہے' خود قربانی حاجیوں کے عمل سے مشابہت پیدا کرنے کے لئے واجب کی گئی ہے اور یہ مشابہت اسی صورت میں مکمل ہو سکتی ہے جبکہ ہمارے ہاں حج اور عید کے دن بھی وہی ہوں جو حرم پاک میں حاجیوں کے ہوتے ہیں۔

قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان

پاکستان کے بچے بچے کو ہر سال وہ صبح غم یاد آتی ہے جب قائداعظم محمد علی جناحؒ امتحان گاہ تاریخ میں اپنا شاندار کردار ادا کرنے کے بعد پردہ عدم کے پیچھے چلے گئے وہ 11 ستمبر 48ء کی صبح تھی، جب سے اب تک ہر سال قائداعظمؒ کا یوم وفات قومی پیمانے پر منایا جاتا ہے، یہ سطور قارئین کی نظروں سے گزریں گی تو قائداعظمؒ کے یوم وفات میں چند ہی دن باقی ہوں گے اور ان کی برسی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی، اس کالم کے لکھنے کے لئے یہی تحریک بہت کافی تھی مگر اب سے چند روز پہلے ہمارے مخدوم و محترم میاں ممتاز محمد خاں صاحب دولتانہ نے لاہور پریس کلب میں قائداعظمؒ اور پاکستان کے نظریئے اور مقصد کے بارے میں جو بات چیت کی ہے اس کے بعد تو یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ کچھ لمحے یاد قائد میں بسر کئے جائیں اور کچھ پہلو ان کی شخصیت و کردار کے قارئین کے سامنے پیش کئے جائیں۔

....

تمہید کے طور پر سب سے پہلے تو عرض کروں گا کہ یوں تو مادر گیتی ہر روز لاکھوں افراد کو جنم دیتی ہے لیکن ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کے صفحات اور لوگوں کے ذہنوں میں اپنے نقوش ثبت کیا کرتے ہیں، قائداعظمؒ انہی میں سے ایک تھے انہوں نے پاکستان کی صورت میں ایک ایسا حسین و جمیل اور خوش آئند نقش صفحہ گیتی پر ثبت کیا ہے کہ جب تک یہ نقش سلامت اور قائم رہے گا ان کی یاد دلاتا رہے

گا چنانچہ ہر سال ان کے یوم ولادت اور یوم وفات پر ملت اسلامیہ پاکستان ان کی یاد کو اپنے دلوں میں تازہ کرتی ہے ان کے عزم و کردار کو خراج تحسین ادا کرتی ہے اور ان سے اپنی عقیدت و محبت کا گونا گوں صورتوں میں اظہار کرتی ہے لیکن ایسا اظہارِ محبت و عقیدت تو ہر قوم اپنے قومی ہیرو کے بارے میں کیا کرتی ہے اس کی شان میں قصیدہ سرائی کرتی ہے اس کی ابدی خواب گاہ پر گل ولالہ نچھاور کرتی ہے اور اس کی یاد میں عیش و نشاط کی محفلیں برپا کرتی ہے۔ ہم ایک مسلمان قوم ہیں۔ ہماری محبت و عقیدت کا انداز اور ہماری یاد کا رنگ ڈھنگ دنیا کی دوسری قوموں سے اگر مختلف نہ ہو اور ہم بھی نمائشی طور پر اپنے اس عظیم و جلیل رہنما کو خراج تحسین ادا کر کے رہ جائیں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جس سے ہماری انفرادیت کو دنیا کی نظر میں امتیازی رنگ و آب حاصل ہو سکے اس لئے گفتگو کے آغاز ہی میں یہ بات سمجھ لی جانی چاہئے کہ قائدؒ کے اس مختصر مطالعۂ کردار سے ہماری غرض محض ان کو خراج تحسین پیش کرنا نہیں بلکہ ان سنگ ہائے میل کی نشان دہی کرنا ہے۔ جو ہماری قومی شاہراہِ زندگی پر بھی نصب ہونے چاہئیں۔

قائد اعظمؒ نے جس زمانے میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور جدوجہد پاکستان کا پرچم اٹھایا اس وقت میں اپنے بچپن کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا اس لئے ان کے بارے میں میں کوئی آنکھوں دیکھی بات تو عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں یہ میاں دولتانہ سمیت ان قائدین کرام کا حصہ ہے۔ جو قائد اعظمؒ کی ہمراہی میں حصول پاکستان کے لئے سرگرم عمل تھے اور جنہیں قریب سے ان کے شب و روز دیکھنے کے مواقع میسر تھے مگر دنیا کے دوسرے بڑے قائدین کی طرح قائد اعظمؒ کی زندگی بھی ایک کھلی کتاب تھی۔ ان کی سیرت کوئی سربستہ راز نہیں تھی جس کے جاننے کے لئے راز دانوں کی ضرورت محسوس ہو اس لئے ان کی زندگی کی جزئیات اور تفصیلات پر یہ حضرات کتنی ہی بڑی اتھارٹی کیوں نہ ہوں ان کے کردار کی چند بڑی خصوصیات تاریخ آزادی کے ہر طالب علم کے سامنے پوری طرح عیاں ہیں اور ان کی مضبوط سیرت، ان کا عزم بلند، ان کا پختہ کردار ان کی اصول پسندی، ان کی مستقل مزاجی اور ان کی ملی حمیت وہ خصوصیات تھیں جن سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس پر ڈٹ جاتے تھے اور پھر انہیں کوئی قوت کوئی لالچ اور کوئی ترغیب و تحریص متزلزل نہ کر پاتی تھی جن اصولوں کو انہوں نے درست سمجھا ہمیشہ ان کا پاس کیا جو مقصد انہوں نے اپنے پیش نظر رکھا اسے پورا کرنے میں اپنی ساری صلاحیتیں جھونک دیں اور جس نصب العین کو انہوں نے ایک بار اپنا لیا اس تک پہنچنے کی جدوجہد میں اپنا خون جگر صرف کر دیا ان کی ایک بڑی خصوصیت مزاج ملی سے ہم آہنگی اور ان کی جمہوریت پسندی تھی ملت کی قیادت ہاتھ میں لینے سے پہلے ان کے اور ملت کے عام افراد کے درمیان وہی بُعد تھا جو آج بھی اونچے اور متوسط طبقے کے افراد میں پایا جاتا ہے لیکن جب انہوں نے ملت کی قیادت سنبھالی اس کے قریب تر ہونے کی سعی کی اس کی امنگوں کو اپنی امنگیں سمجھا اور اس کے دل کی دھڑکنوں میں اپنے قلب کی دھڑکنوں کو سمو دیا فکر و نظر، لباس اور طور اطوار میں اپنے آپ کو ملت سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی اور یہی وہ بات تھی جس نے انہیں

ملت کی آنکھ کا تارا بنا دیا اور ملت نے پورے اعتماد سے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا اور بالآخر اسی اعتماد کے بل پر وہ کرہ ارض کے نقشے پر ایک اسلامی مملکت ابھارنے میں کامیاب ہو گئے ان کے جمہوری ذہن اور ان کی جمہوریت پسندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان سے پہلے مسلم لیگ انگریز پرستوں' نوابوں' جاگیرداروں' زمینداروں اور اونچے استحقاق یافتہ طبقے کی جماعت تھی اور انہی کے نظریات اور خواہشات کی نمائندگی کرتی تھی۔ مسلمان عوام سے ایک مختصر سے دور کو چھوڑ کر کبھی اس کا تعلق نہ رہا تھا قائد اعظمؒ نے اس کی زمام قیادت سنبھالی تو اسے اس مخصوص طبقے کی سرپرستی سے نکال کر جمہوری اساس پر اس کی تنظیم کی اس طرح اسے مسلمان عوام کی جماعت بنایا اور انہیں اسلام اور اسلامی مملکت کے نام پر دعوت دے کر اس کے پلیٹ فارم پر جمع کیا اور انگریز اور ہندو دونوں سے کامیاب جنگ لڑی۔

ان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے قومی اور سیاسی کاموں سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی روپیہ اور شہرت جیسی چیزیں ان کو اپنی محنت و قابلیت کے بل پر پہلے ہی حاصل تھیں' قوم کی قیادت یا مناصب نمائندگی کے ذریعے انہوں نے اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا' جائیداد نہیں بنائی' قومی دولت میں سے کوئی حصہ ناجائز طریقوں سے نہیں اڑایا' عزیزوں اور دوستوں پر ہُن نہیں برسایا لائسنسوں اور پرمٹوں کا خوان یغما نہیں لٹایا' پھر انہوں نے اپنے اثر و رسوخ' عہدہ و اختیار اور سربراہی ملت کے بل پر کبھی ذاتی خدائی جمانے کی کوشش نہیں کی' عوام پر کبھی دھونس نہیں جمائی اور اپنے آپ کو معیار قانون اور مختار کل نہیں بنایا۔ ان کے کردار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ایک بڑا عظیم الشان سیاسی معرکہ خالص دلیل کی طاقت کے بل پر لڑا اور اس میں کامیابی حاصل کی' ایک لمحہ کے لئے جبریت و دہشت یا سازش و تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا' ساری جدوجہد میں دستور و قانون کی پابندی برقرار رکھی اور ہمیشہ آئینی طریق کار سے بازی جیتنے کی کوشش کی' عوام پر اعتماد کیا اور رائے عامہ کو ساتھ لے کر چلے' یہ اس وجہ سے تھا کیونکہ ان کے ذہن کی بنیادی ساخت جمہوریت پسندانہ تھی' انہوں نے عملاً ساری عمر پارلیمانی طریق کار کے تحت کام کیا اور اس کے اصول و روایات کی کڑی پابندی کرنے کی ایک روشن مثال قائم کی۔

....

قائد اعظمؒ کی زندگی کے یہ نقوش بلاشبہ بڑے حسین و جمیل اور بڑے دل آویز اور دل کش ہیں مگر مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ ان میں سے کوئی نقش ایسا نہ تھا جس نے قائد کو قائد اعظم بنا دیا ہو ان نقوش نے ان کو قائد اعظم بنانے میں مدد ضرور دی لیکن تنہا انہی خصوصیات کی بناء پر وہ قائد اعظم نہیں بنے' یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے ہے کہ 1930ء تک قائد اعظمؒ کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا اس لئے وہ اپنی فکر و عمل کی عظیم صلاحیتوں کے باوجود قائد اعظم نہ بن سکے۔ وہ بڑے کامیاب وکیل تھے اور کامیاب وکیلوں کی ہمارے یہاں اب بھی کمی نہیں' وہ بڑے با اصول تھے اور ہم ایک نہیں اس دور کے کئی لیڈروں

کے نام گنوا سکتے ہیں جو بڑے با اصول تھے اور جن کو کسی قیمت پر اپنے موقف سے نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ وہ بہترین پارلیمنٹیرین تھے وہ سراسر قانونی اور آئینی ذہن رکھتے تھے اور آئین سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ یہ تمام خوبیاں یقیناً قابل ستائش ہیں لیکن حق یہ ہے کہ قائداعظمؒ ان خوبیوں کی وجہ سے قائدِاعظمؒ نہیں بنے تھے یہ تمام خوبیاں زیادہ لوگوں میں نہیں تو سو پچاس میں تو آج بھی مل ہی جائیں گی یہ قوم ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ اس میں با اصول، راست گو، حق پرست اور قانون و آئین پسند لوگ ہی سرے سے ناپید ہو جائیں اس لئے یہ وہ خصوصیات نہیں ہیں جنھوں نے قائدؒ کو قائداعظم بنایا اگر محض انہی خصوصیات پر قیادت عظمیٰ کا تاج کسی سر پر رکھا جانا ہو تو اس کے لئے تو اس دور کے کتنے ہی امیدوار نظر آئیں گے اصل چیز جس نے قائدؒ کو قائداعظمؒ بنایا وہ نصب العین تھا جس کے حصول پر انہوں نے 37ء کے بعد اپنی جدوجہد کو مرکوز کر دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ 1940ء میں قائداعظم بن گئے انہوں نے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کیا تو قوم کے پورے مجموعی ضمیر نے ان کی آواز پر لبیک کہا، بمبئی، مدراس، سی پی، یوپی، میسور، متعدد ایسے علاقے تھے جن کا پاکستان میں شامل ہونا ممکن نہ تھا اس لئے ان علاقوں کے رہنے والے لوگوں کے لئے پاکستان کے تصور میں کوئی فائدہ نظر نہیں آ سکتا تھا انہیں اس میں دلچسپی نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن اس کے باوجود پاکستان کے اس "مطلب" نے شرق و غرب کے ہندی مسلمانوں کے اعصاب پر ایک عجیب اثر کیا اور ہندوستان کے ہر گوشے سے "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "دینا پڑے گا پاکستان" کی آوازیں اٹھنے لگیں ہندو اور انگریز دونوں اس ریلے کے سامنے بہہ گئے اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

میرا خیال تھا کہ برصغیر کا کوئی مسلمان ایسا نہ ہو گا جو قائداعظمؒ کے اس عظیم نصب العین کی نفی کر سکے جس نے انہیں قیادت عظمیٰ کا حق دار ٹھہرایا تھا لیکن قیام پاکستان کے چھبیس سال بعد میاں ممتاز محمد خان صاحب دولتانہ جیسے جہاں دیدہ اور فہمیدہ قومی سیاست دان کی زبان سے یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ ان کے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد اسلام کا احیاء نہ تھا بلکہ یہ محض ایک قومی جدوجہد تھی۔ میاں صاحب کے بارے میں عام شہرت یہی ہے کہ وہ بڑے وسیع المطالعہ بزرگ ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کی نظر سے یہ پیش پا افتادہ حقیقت کیسے اوجھل ہو گئی کہ قیام پاکستان کی بنیاد "دو قومی نظریہ" تھا اور اگر اس نظریہ کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو پاکستان کی تمام تر تعمیر دھڑام سے نیچے آ رہے گی اور یہ دو قومی نظریہ اگر صرف اور صرف اسلام کی بنیادوں پر استوار نہیں تھا تو اس کی اور کون سی اساس ہے جس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے؟ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اور علامہ اقبالؒ مرحوم کے درمیان بپا ہونے والا "معرکہ دین و وطن" بھی تو اسی نظریئے کی پیداوار تھا مصور پاکستان حضرت اقبالؒ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں قائداعظمؒ کے نام جو خط لکھے ہیں ان میں صاف صاف اس منزل کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو جدوجہد پاکستان کا اصل مدعا و منتہا

تھی مثال کے طور پر انہوں نے اپنے 20 ؍ مارچ 37ء کے مکتوب میں قائداعظمؒ کو لکھا۔

"آپ جلد از جلد دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے علاوہ دوسرے مقتدر مسلم رہنماؤں کو بھی مدعو کریں اس کنونشن میں پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں کہ سیاسی مطمح ؍ نظر کی حیثیت سے مسلمانان ہند ملک میں جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں، یہ انتہائی ضروری ہے کہ اندرون اور بیرون ہند کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے اسلامی نقطۂ نگاہ سے ثقافتی مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے اور کسی صورت سے بھی یہ اقتصادی مسئلہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا"

میاں صاحب کے ذہن میں ہو گا کہ یہ خط حضرت علامہؒ نے قائداعظمؒ کو اس وقت لکھا جب پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں 19 ؍ مارچ 37ء کو خطبہ دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ برصغیر کا اصل مسئلہ صرف اقتصادی مسئلہ ہے حضرت علامہؒ نے اپنے اس خط میں ثقافتی مسئلے کو بھی اقتصادی مسئلے کی طرح یکساں اہم قرار دیا ہے اور میاں صاحب محترم کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہو گی کہ اگر مسلم ثقافت میں سے اسلام کی نفی کر دی جائے تو باقی جو کچھ بچتا ہے وہ محض علاقائی اور جغرافیائی خصوصیات ہیں جن کے مرکب کو ہرگز ہرگز مسلم ثقافت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے بھی واضح تر مکتوب حضرت علامہؒ کا وہ ہے جو انہوں نے 28 ؍ مئی 37ء کو قائداعظمؒ کے نام لکھا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں۔

"روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں عام خیال یہ ہے کہ اس غربت کی وجہ ہندو کی ساہوکاری اور سرمایہ داری ہے یہ احساس کہ اس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی شریک ہے ابھی پوری طرح نہیں ابھرا لیکن آخر کو ایسا ہو کر رہے گا، جواہر لال نہرو کی بے دین اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا علاج کیا ہے مسلم لیگ کا سارا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے اگر مسلم لیگ نے اس ضمن میں کوئی وعدہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے، خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس کا حل موجود ہے اور موجودہ نظریات کی روشنی میں مزید ترقی کا امکان ہے، اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظامِ قانون کو اچھی طرح سمجھ

کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لئے کم سے کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے لیکن شریعتِ اسلام کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے سالہاسال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میرا ایمان ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ اور ہندوستان میں امن وامان کا قیام اسی سے حل ہو سکتا ہے"

حضرت علامہؒ کے اس خط سے ان کے تصور پاکستان کی جھلکیاں صاف صاف دیکھی جا سکتی ہیں وہ ایک ایسی مسلم ریاست چاہتے تھے جس میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو اور جس میں اسلامی نظام کے ذریعے روٹی کا مسئلہ حل کیا جائے' قائداعظمؒ نے انہی خطوط کی بنیاد پر جدوجہد پاکستان کو آگے بڑھایا انہوں نے اپنے بیانوں میں قرآن حکیم کو مستقبل کے پاکستان کا آئین قرار دیا اور ایک ایسے معاشرہ کے قیام کو اپنی منزل ٹھہرایا جہاں مسلمان اپنی دینی روایات کے مطابق اپنے جداگانہ کلچر کی حفاظت کر سکیں۔

....

میری دانست میں میاں صاحب محترم کا بیان ان کوششوں کا ردعمل ہے جو آج کل اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر ہمارے ملک میں ہو رہی ہیں' ان کوششوں کے پس پردہ نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو جب تک ان میں حکمت کا عنصر شامل نہ ہو گا یہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد کرنے کے بجائے الٹا نقصان کا باعث ہوں گی قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے تصور پاکستان میں "معاش و معاد" ساتھ ساتھ چلتے تھے حضرت علامہؒ ایک ایسا پاکستان چاہتے تھے جس میں اسلام کے معاشی نظام کی برکت سے ایک عام مسلمان کا روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے زکوٰۃ اسی معاشی نظام کا ایک جزء ہے اور سرمایہ دارانہ طرز حیات جو سود کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اس کی عین ضد ہے' یہ نہیں ہو سکتا کہ پورا معاشی نظام تو سرمایہ داری پر مبنی ہو اور محض زکوٰۃ کی وصولی سے ملک سے غربت کا خاتمہ ہو جائے' اس طرح کے ڈھانچے میں زکوٰۃ کی امداد سے بھک منگوں اور سائلوں کا ایک مستقل طبقہ تو وجود میں آ سکتا ہے لیکن ان کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام کی دوسری خصوصیت اتحاد اور اشتراک کا جذبہ ہے وہ ملت کو ایک بناتا ہے اسے فرقوں اور گروہوں میں نہیں بانٹتا بدقسمتی سے ہمارے ہاں اسلام کا جو تجربہ ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس نتائج پیدا کر رہا ہے فرقہ واریت کا عفریت پہلے سے زیادہ خوفناک ہو گیا ہے اور روح اور اسپرٹ کو چھوڑ کر محض مظاہر پر اتنا زور دیا جا رہا ہے کہ توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے' ظاہر ہے اس طرح کا اسلامی نظام تو کبھی بھی علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے ذہنوں میں نہ تھا وہ تو ایک ایسا معاشرہ چاہتے تھے جس میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی ماحول میں عام مسلمانوں کو معاشی انصاف نصیب ہو' میاں صاحب اگر اس اندھی مذہبیت کو پاکستان کا نصب العین ٹھہرانے سے انکار کرتے جس کی خصوصیات جمود اندھا دھند تقلید اور محض مظاہر پرستی ہیں تو ملک کا باشعور طبقہ یقیناً ان کی ہم نوائی کرتا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ انہوں نے ایک انتہا پسندی کے ردعمل میں دوسری انتہا پسندی کا راستہ اختیار کر لیا۔

....

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد سے ہماری اب تک تاریخ اسی انتہا پسندی کی تاریخ ہے۔ ہمارے قائدین اس اصل نصب العین کو چھوڑ بیٹھے جو قائداعظمؒ اور اقبالؒ کا دیا ہوا نصب العین تھا جس میں اسلامی قوانین اور روٹی کا مسئلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے' بعد میں ہمارے ہاں یا تو صرف روٹی کے مسئلے پر زور دیا گیا یا صرف مذہب پر اس طرح کی قیادتوں کو وقتی طور پر بعض طبقوں کی حمایت تو حاصل ہو گئی لیکن پوری قوم کی تائید نصیب نہ ہو سکی حالانکہ یہ قوم آج بھی اتنی ہی جاندار اور زندہ و پائندہ قوم ہے جتنی یہ 1947ء میں تھی نئی نسل جسے ہم "ٹیڈی" کہتے نہیں تھکتے اور جس کی بعض کوتاہیاں یقیناً ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہیں بہرحال اسی گرجتے برستے اور لہراتے شعلے کی وارث ہیں جس نے چودہ صدیوں سے دنیا کی ہر تاریکی میں اجالا کیا اور جس کی اجالا کرنے کی قوت آج بھی ماند نہیں ہوئی لیکن شرط یہ ہے کہ قائدین فکر اور قائدین قوم کو قوم کے سامنے ایسا نصب العین پیش کرنا چاہئے جسے قوم کی چھٹی حس جائز و درست قرار دے جو اقبال اور قائداعظمؒ کے نصب العین کی طرح معاش و معاد پر مبنی ایک معتدل اور متوازن نصب العین ہو اس کے بعد اس نصب العین کی تکمیل کے لئے قوم کو اس زبان میں پکاریئے جو قوم کے دل کی اس کے ضمیر کی اور اس کی پوری شخصیت کی زبان ہے پھر دیکھئے قوم کس طرح آپ کی آواز پر لبیک کہتی ہے۔

....

آخر میں 11 ستمبر کو آنے والے یوم قائداعظمؒ کی مناسبت سے ایک مرتبہ پھر عرض کروں گا کہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک مرحوم شخص کو اس دنیا میں ہماری کوئی زبانی تعریف و توصیف اور اس کی شان میں کی جانے والی کوئی قصیدہ سرائی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اس کے لئے تو وہی نیک اعمال فائدہ بخش ہو سکتے ہیں جو اس نے اپنی زندگی میں کئے ہوں یا باقیات الصالحات کے طور پر اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہو قائداعظمؒ کا نیک عمل پاکستان کی صورت میں موجود ہے اس مملکت کے لئے یہ کہہ کر انہوں نے جدوجہد کی تھی کہ اس میں اسلامی نظام حیات قائم کیا جائے گا' پاکستان بنانے میں تو وہ کامیاب ہو گئے لیکن اسے اسلامی بنانے کی انہیں مہلت نہ مل سکی اس طرح ان کا یہ سب سے بڑا نیک عمل اب تک ادھورا ہے ہم ان کے اس ادھورے نیک عمل کو مکمل کر کے اور "باقیات الصالحات" کی صورت دے کر ان کے لئے دوسری دنیا میں ثواب اور بلند مراتب کا دوامی سامان کر سکتے ہیں' پاکستان کی اسلامی مملکت سے جب تک اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہے گا اور دنیا کو فلاح و خیر حاصل ہوتی رہے گی اس کا حسنِ ثواب قائداعظمؒ کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاتا رہے گا۔

دھماکے اور الہ دین کا چراغ

کراچی میں بموں کے دھماکوں سے جو قیامت ٹوٹی' اس پر اب تک ماتم ہو رہا ہے' دشمن کے باقاعدہ فضائی حملے سے بھی اتنا بھاری جانی اور مالی نقصان نہ ہوتا جتنا اس تخریب کاری سے ہوا ہے' عجیب بات یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب وزیر اعظم اور تین صوبوں کے وزرائے اعلیٰ ملک سے باہر تھے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ کیوں پیچھے رہ گئے یہ معلوم نہیں ہو سکا' یا تو حکومت کو اطلاع تھی کہ کوئی سانحہ ہونے والا ہے اس لئے سندھ کے وزیر اعلیٰ یہیں رہیں یا پھر کوئی اور مصلحت دامن گیر تھی یہ الگ بات ہے کہ ان کی موجودگی بھی کام نہ آسکی اور جو ہونا تھا ہو کر رہا۔

ادھر کچھ عرصہ سے یہ انوکھی روایت چل نکلی ہے کہ جب بھی صدر یا وزیر اعظم ملک سے باہر جاتے ہیں وہ چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں' صدر صاحب تو عمرہ اور حج کے لئے بھی تشریف لے جاتے ہیں تو وزرائے اعلیٰ کو نہیں بھولتے' بھٹو صاحب کے زمانے میں صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی ان کی معیت میں ملک سے باہر تھے یہ شملہ معاہدہ کا وقت تھا اور ان کو ساتھ لے جانے کی ضرورت اس لئے پڑی تھی کہ اس وقت دو صوبوں میں جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت قائم تھی۔ بھٹو صاحب نے سوچا ایسا نہ ہو میں بھارت سے کوئی سمجھوتہ یا معاہدہ کر لوں اور وہ صرف دو صوبوں یا صرف پی پی پی کا معاہدہ بن کر رہ جائے اس حکمت کے پیش نظر وہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے وزرائے اعلیٰ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ورنہ ان کے پورے عہد حکومت میں ایک

مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی وزیر اعلیٰ کسی بیرونی دورے میں ان کے ساتھ گیا ہو۔ کرم ہو گا اگر موجودہ حکومت بھی یہی پالیسی اپنالے' وزرائے اعلیٰ کا کام اپنے اپنے صوبے کے معاملات کی نگہداشت ہے انہیں ہر دوسرے تیسرے مہینے بیرونی دوروں کی آڑ میں تعطیلات پر جانا زیب نہیں دیتا' بالخصوص ایسی فضا میں جب ان کے صوبوں میں آتش و آہن کی بارش ہو رہی ہو یہ تو وہی بات ہو گی کہ روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ملک میں لاتعداد خفیہ ایجنسیوں کے باوجود یہ دھماکے اتنی کثرت سے کیوں ہو رہے ہیں؟ آرمی کی سیکرٹ سروس الگ ہے' مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی خفیہ پولیس اس کے علاوہ ہے' بعض دوست ملکوں سے خفیہ اطلاعات میں باہمی شراکت کے الگ معاہدے ہیں' سیاسی کارکنوں' صحافیوں اور بعض دوسرے طبقات میں بعض لوگ سفید کپڑوں میں بھی یہ ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپے کے صرفے سے ہر سال ایسے آلات (DEVICES) بھی درآمد کئے جا رہے ہیں جن سے وطن دشمن عناصر پر نظر رکھی جا سکتی ہے مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہے' پے در پے تخریب کاری کی وارداتیں ہوتی ہیں مگر ان کا پیشگی سراغ تو ایک طرف رہا تباہ کاری کے بعد بھی ان کی تحقیقات کا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔ سبب یہ ہے کہ اطلاعات فراہم کرنے کے ضمن میں حکومت کی ترجیحات غلط ہیں' اس باب میں اس کی تمام تر توجہات کا مرکز غریب سیاسی کارکن' ممبران پارلیمینٹ یا مخالف سیاسی جماعتوں کے راہنما ہیں' یہ خفیہ ایجنسیاں رات دن صرف انہی کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں اس سے پہلے بھی سیاست میں یہ روایت قائم تھی یا نہیں مگر ہمارے دور سے جو وزرائے کرام اور ممبران پارلیمینٹ کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کی بدعت شروع ہوئی ہے تو وہ اب تک نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ صدر صاحب تو ماشاء اللہ پابند شرع بزرگ ہیں۔ خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں۔ کی زندہ مثال۔ کیا انہیں ان قرآنی احکام کا علم نہیں ہوا' جو "استراق سمع" یعنی چوری چھپے کسی کی باتیں سننے سے متعلق ہیں؟ سیاسی کارکن' ممبران پارلیمینٹ اور مخالف جماعتوں کے قائدین ٹیلی فون پر اگر دشمن ملکوں سے بات کر رہے ہیں تو ضرور سنئے مگر ان کی نجی زندگی سے آپ کو کیا سروکار؟ آخر ان لایعنی معلومات کی فراہمی پر آپ "بیت المال" کا لاکھوں روپیہ کیوں برباد کر رہے ہیں؟ ایک طرف تو آپ کی دریا دلی کا عالم یہ ہے کہ آپ بے دھڑک جی ایم سید کو بھارت یاترا کے لئے روانہ کر دیتے ہیں مگر دوسری طرف جس کسی نے پارلیمینٹ میں آپ پر تنقید کی اخبار میں آپ کے خلاف کچھ لکھ دیا یا بیان دے دیا اس کی شامت آ گئی' سی آئی ڈی سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ گئی' یہی اہتمام آپ ایرانیوں اور افغانیوں کی جانچ پڑتال کا کرتے' یہی سرمایہ اور آلات آپ تخریبی سرگرمیوں کی روک تھام کے لئے استعمال کرتے تو آج قوم کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا جو سانحہ کراچی کی صورت میں اسے دیکھنا پڑ رہا ہے۔

یہ دھماکے کیوں ہو رہے ہیں؟ ملک کی باخبر ترین شخصیت صدر مملکت کا ارشاد ہے کہ یہ ہماری افغان پالیسی کا نتیجہ ہیں' اس سے پہلے لاہور میں بم پھٹے اور چھ سات افراد لقمہ اجل بن گئے تو صدر صاحب نے کہا تھا کہ سِول حکومتوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے گویا آپ کہنا یہ چاہتے تھے کہ مارشل لاء کے عہد میں تو یہ کچھ نہیں ہوتا تھا تاہم لوگ سول حکومت چاہتے تھے تو پھر اس کے نتائج بھی بھگتو مگر کراچی میں محشر بپا ہوا تو صدر صاحب کو بھی سچ بولتے بنی' اب فرمودہ یہ ہے کہ اس کا سبب ہماری افغان پالیسی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ پالیسی بنائی کس نے؟ اور اب تک چلا کون رہا ہے؟ امریکہ کے اشارے پر فرد واحد نے یہ پالیسی بنائی اور دل فریب مذہبی نعروں کی آڑ میں اسے جہاد کا مقدس نام دے دیا' اب اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر شریک کون ہے امریکی سامراج' جو ایک طرف اسرائیل کا سرپرست اعلیٰ ہے اور عرب اور اسلامی مفادات کا دشمن نمبر ایک ہے. جو لاطینی امریکہ میں نکاراگوا کی منتخب جمہوری حکومت کا تختہ الٹوانے کے لئے بے دریغ ڈالر لٹا رہا ہے اور دوسری طرف السلویڈار میں آمریت کو قائم رکھنے کے لئے جمہوری جدوجہد کرنے والوں کے سینے اپنی گولیوں سے چھلنی کر رہا ہے' ہمیں افغان مجاہدین کے مقصد سے پوری پوری ہمدردی ہے ہم چاہتے ہیں کہ روسی فوجیں افغانستان سے نکل جائیں' افغانستان افغانیوں کا ہے اس پر انہیں ہی حکومت کرنے کا حق پہنچتا ہے مگر جو لوگ اسے کفر و اسلام کا "غزوہ" بنا کر پیش کر رہے ہیں وہ یہ بھی بتائیں کہ اگر یہ اسلام کی جنگ ہے تو امریکہ جیسی دشمن اسلام قوت اس میں کیوں ہمارا ساتھ دے رہی ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ "دو سپر پاورز" کے مفادات کی جنگ ہے اور ہمارے صدر صاحب نے امریکی مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے پاکستان کے مستقبل کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔

سول حکومت بنی اور ایک منتخب پارلیمنٹ وجود میں آئی تو خیال تھا کہ شاید اس پالیسی پر نظر ثانی ہو گی مگر خارجہ پالیسی پر پارلیمنٹ میں دو دفعہ کی "بحث برائے بحث" کے باوجود پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حکومت اپنی پالیسی کے حق میں باقاعدہ ووٹ لیتی مگر ہوا یہ ہے کہ مخالفانہ تقریروں کے بعد لائق وزیر خارجہ صاحب نے دونوں دفعہ ایک لکھی ہوئی تقریر پڑھ دی جس میں ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے اٹھائے جانے والے کچھ نکات کا جواب تھا اور کچھ کے بارے میں کامل خاموشی تھی اور اس طرح یہ فرض کر لیا گیا کہ پارلیمنٹ سے فارن پالیسی کی توثیق کرا لی گئی ہے' میں نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران بھی کہا تھا (اور یہ تقریر لفظ بلفظ اسی کالم میں شائع ہو چکی ہے) اور اب پھر کہتا ہوں کہ مارشل لاء حکومت نے امریکہ کے اشارے پر افغان مسئلے کے سلسلے میں ایک غیر حکیمانہ اور غیر قومی اندھی اور بہری پالیسی اختیار کر کے ہمیں بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا ہے' جہاں سے نکلنے کا کوئی رستہ نظر نہیں آتا' ہم اسے جاری رکھتے ہیں تو اندرون ملک ایک ایسا خوفناک انتشار اور بحران ہمارے انتظار میں ہے. جو پاکستان کو لبنان بنا کر رکھ دے گا اور اگر افغان مجاہدین کو نظر انداز کر کے کابل اور روس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو پھر ہمیں اپنی سرحدوں میں موجود "ان مجاہدین" کے غیض و غضب اور ان کے نعروں اور گولیوں کا نشانہ بننے

کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

صاف صاف بات کہنے کا وقت آ گیا ہے‘ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے مجاہدین کے دستے پاکستان سے روانہ ہوتے ہیں‘ ان کے اسلحہ کے ذخائر اور ہیڈ کوارٹر پاکستان میں واقع ہیں جب پاکستان کے رستے کابل پر آگ برسائی جائے گی تو جواب میں ہمیں پھولوں کی بارش کا انتظار نہیں کرنا چاہئے وہاں سے ہمیں سبق سکھانے کے لئے تخریبی کارروائیاں ہوں گی‘ یہاں پہلے ہی لاکھوں افغان مہاجرین عام پاکستانیوں کے ساتھ مخلوط ہو کر آباد ہیں‘ ہم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ہم ایران کی طرح انہیں ایک ساتھ کیمپوں میں رکھتے‘ اب ان میں سے اکثر کے پاس پاکستانی شناختی کارڈ ہیں‘ انہوں نے پراپرٹی خرید لی ہے وہ باقاعدہ کاروبار کر رہے ہیں جب وہ ترک وطن کر کے پاکستان آئے تھے (اور ان میں وہ مہاجر بھی شامل ہیں جو اب تک برابر چلے آ رہے ہیں) تو ہمارے پاس یہ پڑتال کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ ان میں سے کتنے حقیقی مہاجر ہیں اور کتنے کابل اور روس کے ایجنٹ‘ اب اگر تیس پینتیس لاکھ مہاجروں میں ایک لاکھ بھی درپردہ ایجنٹ پاکستان میں در آئے ہیں تو ان کے لئے کراچی سمیت پاکستان کے بڑے شہروں کو بیروت بنانا کیا مشکل ہے۔ سرمایہ انہیں کابل اور روس دیں گے۔ اشتراک کار کے لئے پاکستان میں موجود ناراض‘ غیر مطمئن اور غیر محب وطن عناصر کی کمی نہیں‘ اس ساری صورت حال کا منطقی نتیجہ وہی نکلنا چاہئے تھا جو اب نکل رہا ہے اسلامی مارشل لاء نے نو دس سال بے عقلی اور بے حکمتی کے جو بیج بوئے ہیں ان کی فصل اب لہلہانے لگی ہے تو ہمیں اس پر تعجب کیوں ہوتا ہے؟۔

اب یہ بات بین الاقوامی سطح پر شک وشبہ سے بالا قرار دے دی گئی ہے کہ گورباچوف کی قیادت میں روسی حکومت پہلی مرتبہ تلخ حقائق کا ادراک کر رہی ہے کسنجر جیسا کٹڑ امریکی قوم پرست روس کے دورے سے واپسی پر یہ تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ روس اندرونی طور پر واقعتاً تغیرات کی زد میں ہے‘ گورباچوف روسی معاشرے میں پہلی دفعہ جمہوری روایات کو متعارف اور رائج کرنے میں سنجیدگی سے کوشش کر رہا ہے‘ چین سے تعلقات بہتر بنائے جا رہے ہیں‘ پہلی دفعہ روسی مفکرین اور سفارتی دائرے میں موجود بعض با اثر شخصیات یہ اعتراف کر رہی ہیں کہ روس نے افغانستان میں فوجی مداخلت کر کے غلطی کا ارتکاب کیا ہے‘ گورباچوف نے بھارت کا دورہ کیا تو ہمیں ماضی کی تلخ یادوں کی وجہ سے کیا کیا خدشات نہیں تھے مگر بھارتی حکومت کی خواہشات کے برعکس گورباچوف نے پاکستان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ یہ علامات اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اگر روس نے مسئلہ افغانستان کو حل کرنے کے لئے بعض مثبت تجاویز پیش کی ہیں تو وہ واقعی ان میں مخلص اور سنجیدہ ہے اور اگر ہم نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم خسارے میں رہیں گے۔

جنیوا مذاکرات اس نکتے پر آ کر رک گئے تھے کہ افغانستان سے روسی فوجوں کے نکلنے کا ٹائم ٹیبل کیا ہو مگر اب جو روس کے اشارے پر نجیب حکومت نے عبوری دور کے لئے "مصالحتی حکومت" کا فارمولا

پیش کیا ہے اس سے فی الحقیقت جنیوا مذاکرات بھی پس منظر میں چلے گئے ہیں اور اصل اہمیت اس تجویز کو حاصل ہو گئی ہے' پاکستان کے منتخب اور شریف النفس وزیر اعظم محمد خاں جونیجو نے جاپان میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس فارمولے کو قبول یا مسترد کرنا افغان عوام کا کام ہے پاکستان کو اس سے کوئی سروکار نہیں' بلاشبہ سفارتی آداب کے لحاظ سے وزیر اعظم کو اس سوال کا یہی جواب دینا چاہئے تھا مگر حقیقت کی دنیا اور پس پردہ حکومتی سرگرمیوں کی سطح پر ایسا نہیں' پاکستان کو بھی اس فارمولے سے اتنی ہی دلچسپی اور اتنا ہی سروکار ہے جتنا خود افغان عوام کو کیونکہ خود پاکستان کا پر امن مستقبل اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

فارمولے کا نازک موڑ یہ ہے کہ مصالحتی حکومت کے اجزائے ترکیبی کیا ہوں اور اس کی سربراہی کس کے سپرد ہو قدرتاً کابل اور روس کی یہی خواہش ہو گی کہ نجیب اللہ ہی اس عبوری حکومت کے سربراہ مقرر ہوں تاکہ روسی مفادات کا تحفظ ہو سکے' مجاہدین یہ سمجھتے ہیں کہ سمجھوتے کا مرحلہ ان کی قربانیوں کے نتیجے میں آیا ہے اس لئے حکومت کی سربراہی بھی کسی مجاہد سالار کے سپرد ہو' ظاہر ہے یہ دونوں صورتیں انتہاپسندی کا نتیجہ ہیں اور ان پر دونوں طرف سے اصرار کیا گیا تو سمجھوتہ خواب و خیال بن کر رہ جائے گا۔ حکومت پاکستان کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ دونوں انتہاؤں سے ہٹ کر بیچ کی صورت پیدا ہو اور کوئی ایسی غیر جانبدار شخصیت سربراہ مقرر ہو جو روس کے لئے بھی قابل قبول ہو اور افغان عوام کے لئے بھی' ظاہر ہے دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جس سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہو ہماری مراد یہ ہے کہ اس عبوری حکومت کا سربراہ وہ ہو جو افغان قوم کی اکثریت کے لئے قابل قبول ہو۔ اس سلسلے میں اب تک ایک ہی نام سامنے آسکا ہے اور وہ ظاہر شاہ کا ہے۔ ہم خدانخواستہ بادشاہت کے حق میں ہیں نہ ہی وہ پچھلا دور افغانستان میں واپس لانا چاہتے ہیں (اور سچ تو یہ ہے کہ اب وہ واپس آ بھی نہیں سکتا) یہ تو صرف ایک عبوری انتظام ہو گا جب روسی فوجیں ملک سے نکل جائیں افغان عوام اپنے مستقبل کی حکومت کا جو نظام رائج کرنا چاہیں رائج کر لیں' ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے افغان مجاہدین میں پروفیسر سیاف اور انجینئر گل بدین حکمت یار کے گروپ ظاہر شاہ کی سربراہی کے شدت سے مخالف ہیں وہ عبوری دور میں بھی افغانستان میں ایک مذہبی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر حکومت پاکستان چاہے تو ایران اور سعودی عرب کی حکومتوں اور پاکستان کی جماعت اسلامی کے عمائدین کے ذریعے ان گروپوں کو اس تجویز پر راضی کر سکتی ہے دوسری طرف روس اور کابل سے براہ راست مذاکرات کے ذریعے یہ کوشش کی جائے کہ وہ نجیب اللہ کو حکومت میں شامل کرنے پر تو اصرار کریں لیکن اسے سربراہ مقرر کرنے کی ضد چھوڑ دیں' موجودہ حالات میں مسئلہ افغانستان کا یہی ایک قابل عمل حل ہے اس کے سوا ہر رستہ ہمیں روز بروز منزل سے دور تر کرتا چلا جائے گا کراچی میں دھماکے ہوئے اور بربادی ہوئی تو صدر نے عجیب و غریب رد عمل ظاہر کیا' ایک پریس کانفرنس کو

خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ”حکومت کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں کہ وہ ان دھماکوں کو روک سکے‘ آج چار دھماکے ہوئے ہیں کل ایک سو چون ہوں گے‘ ابھی تو شروعات ہیں‘ ہمیں ان کے لئے تیار رہنا چاہئے“۔ اس سے قطع نظر کہ کسی ملک کے سربراہ کو اس طرح کا طرز بیان زیب نہیں دیتا‘ یہ بات حد درجہ غیر علمی اور ان سائنٹفک ہے کہ ہمارے پاس الہ دین کا چراغ نہیں‘ ایک ماڈرن سٹیٹ کے وسیع ذرائع و وسائل کا مقابلہ ایک معمولی جن سے وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس روشنی کے زمانے میں بھی قصے کہانیوں کے رومانی اندھیروں میں بس رہے ہوں‘ آپ کو تو اس موقع پر زخموں پر مرہم رکھنا چاہئے تھا آپ تو نمک دان لے کر پہنچ گئے‘ قوم تو آپ سے یہ سننا چاہتی تھی کہ آپ مسئلہ افغانستان کے حل کے لئے بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں اور عنقریب یہ مسئلہ حل ہو جائے گا مگر آپ اس کے برعکس یہ فرما رہے ہیں کہ آج چار دھماکے ہوئے ہیں کل 154 ہوں گے۔

آپ کو پتہ بھی ہے 154 دھماکے ہوئے تو پاکستان میں کیا حشر برپا ہو گا؟ ابھی تو صرف کراچی کے اس حادثے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ قوم کسی سیاسی جماعت کی قیادت کے بغیر ہڑتالیں کر رہی ہے اور آپ اس کے ہیجان سے ڈر کر کراچی کے ایک ہسپتال کا معائنہ نہیں کر سکے اس وقت سے پناہ مانگئے جب ان دھماکوں کے نتیجے میں یہاں ایسی انارکی ہو گی کہ عوام وفور غضب میں امریکی پالیسی بنانے اور چلانے والے بڑے بڑوں کا دھڑن تختہ کر دیں گے۔

آپ کا کام عوام کو تحفظ فراہم کرنا ہے‘ آپ کا کام مسئلہ افغانستان کو حل کرنا ہے‘ آپ نے درد دیا ہے آپ ہی دوا کریں اور اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو اب بھی وقت ہے عزت و آبرو سے مستعفی ہو جائیے کسی اور کو موقع دیجئے جو یہ کہہ کر اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کا عادی نہ ہو کہ میرے پاس الہ دین کا چراغ موجود نہیں ہے لہٰذا میں کچھ نہیں کر سکتا۔

استخارے کی سیاست

پچھلے دنوں صدر صاحب نے فرمایا ہے کہ انہوں نے قومی اسمبلی توڑتے وقت استخارہ کر لیا تھا نیز یہ کہ وہ ایسے تمام معاملات کا فیصلہ کرتے وقت ہمیشہ استخارہ کر لیتے ہیں ...... ان کے اس ارشاد سے استخارے کی شرعی اہمیت ایک دفعہ پھر ابھر کر سامنے آ گئی ہے، کئی قارئین نے اپنے خطوط کے ذریعے استفسار کیا ہے کہ استخارہ کیا ہے؟ دین میں اس کا کیا مقام ہے اور کن کن معاملات و مسائل میں اس کا سہارا لینا چاہئے؟۔ یہ سوالات ذہنوں میں اس لئے ابھرے ہیں کیونکہ آج تک ہمارے ہاں "استخارہ برائے عبادت" استعمال ہوتا تھا اب پہلی مرتبہ "استخارہ برائے سیاست" استعمال ہونے لگا ہے تو ان سوالات کا اٹھنا ایک قدرتی امر ہے، آج کی صحبت میں ہم خالص علمی انداز میں مسئلہ زیرِ بحث پر روشنی ڈالیں گے۔

....

طلوع اسلام سے پہلے مشرکین عرب جن توہمات میں گھرے ہوئے تھے ان میں ایک وہم یہ بھی تھا کہ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے شگون نکالتے تھے، اگر اچھا شگون نکل آیا تو (مثال کے طور پر) سفر پر روانہ ہو گئے بُرا نکلا تو ارادہ منسوخ کر دیا، یہ کالی بلی کا راستہ کاٹنے وغیرہ کے شگون اسی دورِ شرک و وہم پرستی کی یادگار ہیں، ایک دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ تیروں کے ذریعے فال نکالتے یا پانسے پھینکتے جیسے آج بھی تاش کے پتوں کے ذریعے کسی کام کے مبارک یا منحوس ہونے کے فیصلے کئے جاتے ہیں، قرآن حکیم نازل ہوا تو اس نے پانسے اور تیروں کے ذریعے فال نکالنے کے اس عمل کو (جسے عربی میں "استقسام بالازلام"

کہاجاتا ہے) رجس (ناپاک) اور شیطانی عمل قرار دیا اور آنحضورؐ نے اس کے بجائے اہل ایمان کو ہدایت کی کہ جب کبھی انہیں ذاتی زندگی میں کوئی اشکال پیش آئے تو وہ استخارہ کرلیا کریں۔ یہ استخارہ کیا ہے اس کی صورت تو ہم آگے چل کر بتائیں گے یہاں استخارہ کا جو پس منظر سطور بالا میں ہم نے بیان کیا ہے اس کی سند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ملاحظہ فرماتے جایئے' حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔

"مشرکین مکہ اپنی معاشرتی ضروریات' سفر' شادی' تجارت وغیرہ کے لئے " استقسام بالازلام " کو اپنائے ہوئے تھے اسلام نے ان کو اس سے روکا اور بتایا کہ یہ بے اصل بات ہے اور اس کے بدلے میں استخارے کا عمل تجویز کیا' استخارے میں آدمی سراپا طلب بن کر درپیش معاملہ میں رضائے الٰہی کا جویا ہوتا ہے اور دل میں اللہ کی رحمت کے لئے امنگ پیدا ہوتی ہے تو اللہ کی جانب سے فیضان ہوتا ہے"۔

استخارہ لفظ "خیر" سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں خیر چاہنا' بخاری شریف میں آتا ہے اور اسے مشکوٰۃ کتاب ایمان باب التطوع میں درج کیا گیا ہے (نیز اسی طرح کی روایت شیعہ حضرات کی معتبر کتاب " من لا یحضرہ الفقیہ " میں حضرت امام جعفر صادقؒ کے حوالے سے بھی آئی ہے) کہ

"جب تم میں سے کسی کو کوئی امر پیش آئے تو وہ دو رکعتیں پڑھے پھر کہے "اے اللہ ! میں تجھ سے تیرے علم کی بنا پر خیر کا طالب ہوں اور تیری قدرت سے طاقت چاہتا ہوں' تجھ سے فضل عظیم مانگتا ہوں' تجھی کو قدرت ہے مجھے کوئی قدرت نہیں تو ہی جانتا ہے میں نہیں جانتا تو ہی ہر غیب کو خوب جانتا ہے اے اللہ اگر تجھے علم ہے کہ یہ امر میرے لئے باعث خیر ہے میرے دین' میری معاش اور میری عاقبت امر میں تو اسے میرے لئے مقدر کر اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ امر میرے لئے میری معاش اور عاقبت امر کے لئے باعث شر ہے تو اسے مجھ سے دور رکھ اور مجھے اس سے دور رکھ اور میرے لئے خیر مقدر کر جیسے بھی ہو اور مجھے اس سے راضی رکھ"۔

فقہ کی کتابوں (جیسے فقہ حنفی کی مشہور کتاب ردالمختار) میں استخارے کی نماز کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کے مطابق جب ان دو رکعتوں میں استخارے کرنے والا اس جملے پر آئے جس پر ہم نے اوپر خط کشید کیا ہے یعنی یہ امر (ہٰذا الامر) تو اسے پڑھتے وقت اس کام کا دھیان کرنا چاہئے جس کے لئے استخارہ کیا جارہا ہے اس کے بعد پاک وصاف بچھونے پر قبلہ کی طرف منہ کر کے باوضو سو جائے جب سو کر اٹھے تو اس وقت جو بات دل میں مضبوطی سے جمی ہوئی ہو (کہ یہ کام کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے) تو اس کے مطابق عمل کرے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر ایک دن میں کچھ معلوم نہ ہو اور دل کا خلجان اور تردد نہ جائے تو دوسرے دن پھر ایسا ہی کرے یہاں تک کہ سات دن کرتا رہے انشاء اللہ اس دوران اس کے دل میں

کوئی نہ کوئی بات راسخ ہو جائے گی۔

....

احادیث میں استخارے کی دعا اور اس کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا تعلق کسی انسان کی پرائیویٹ زندگی کے ان امور و مسائل سے ہے۔ جن کے بارے میں وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہا ہو اس کا تعلق ہر گز ہر گز امور مملکت یا اجتماعی مسائل سے نہیں ہے، جہاں تک ان کا تعلق ہے اس کے لئے قرآن حکیم میں باہمی مشورے کا حکم ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

"وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ...... اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے"۔

یا جیسے آنحضورؐ کو اجتماعی معاملات میں حکم ہوا کہ

"وشاورهم في الامر ...... اور ان سے مشورہ کیا کرو"۔

آپ قرآن حکیم یا احادیث کے تمام مجموعے اٹھا کر دیکھ لیں کہیں بھی اجتماعی معاملات کے لئے ان میں استخارے کا حکم نہیں آیا، بس اللہ کا نام لے کر ہر کام شروع کرنے ہی میں جو برکت ہے وہ اس میدان میں استخارے کا قائم مقام ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا خلفائے راشدینؓ سے امت کے کسی نزاعی مسئلے میں استخارے کا کوئی عمل یا روایت منقول نہیں، زیادہ سے زیادہ جن حکمرانوں کا نام اس ذیل میں لیا جا سکتا ہے ان میں ایک نام تو حضرت امیر معاویہ کا ہے جن کے بارے میں کتاب الاغانی کی روایت ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے سے پہلے استخارہ کیا تھا اور دوسرا امت کے سب سے بڑے ظالم اور جابر حکمران حجاج بن یوسف کا جس کے متعلق عربی کے شاعر العجاج نے "اراجیز العرب" (صفحہ نمبر 120) میں شائع اپنے ایک قصیدہ میں بطور مدح کہا ہے کہ وہ خدا سے استخارہ کئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا ...... (اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ استخارہ کرنے والے اس بدنام ترین ڈکٹیٹر کے ہاتھ ستر ہزار بے گناہ مسلمانوں کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں) ان دو حکمرانوں کو چھوڑ کر کسی مسلم حکمران یا خلیفہ کے بارے میں یہ منقول نہیں کہ اس نے اجتماعی معاملات میں استخارے کا سہارا لیا ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی بات دوسری ہے، کام شروع کرنے سے پہلے بھی اور بعد بھی اور کوئی شک نہیں کہ اس میں برکت ہی برکت ہے مگر بات مسنون استخارے کی ہو رہی ہے کہ کیا کسی مسلمان حکمران کو کسی قومی نزاعی معاملے میں استخارہ کرنا چاہئے یا اس کے لئے (عوام کے منتخب نمائندوں سے) مشورے اور اپنی خداداد فراست و بصیرت اور تجربے اور معاملہ فہمی سے کام لینا چاہئے، "نہج البلاغہ" امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰؓ کے خطبات و ارشادات کا مشہور عالم مجموعہ ہے اس میں مالک اشتر کو مصر کی حکومت سپرد کرتے وقت آپ کا جو فرمان منقول ہے مسلمان حکمرانوں کے لئے اس سے بہتر اور جامع دستاویز اور دستور حکومت اسلامی تو کیا پورے انسانی لٹریچر میں نہیں ملے گا، آپ اس مفصل فرمان کا مطالعہ کریں اس میں

آپ کو سیدنا علیؓ کی اپنے گورنر کو یہ ہدایت تو مل جائے گی کہ۔

"اور خبردار! رعیت پر احسان کر کے احسان جتانے یا اپنے کئے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے یا رعیت سے کوئی وعدہ کر کے بعد میں وعدہ خلافی کرنے کا خیال بھی نہ کرنا کیونکہ احسان جتانا نیکی کو برباد کر دیتا ہے اور کئے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اپنے آپ کو نور حق سے محروم کرنا ہے اور وعدہ خلافی خالق و مخلوق دونوں کی ناراضی کا موجب بن جاتی ہے"۔

لیکن کئی صفحات کی اس دستاویز میں انہوں نے اپنے گورنر کو کہیں یہ ہدایت نہیں کی کہ وہ اجتماعی اور ملی مسائل میں استخارہ کر لیا کرے، یقیناً سیدنا علی مرتضیٰؓ کے سامنے یہ فرمان جاری کرتے وقت وہ ارشادِ رسولؐ ہو گا جس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"اتقوا فراست المومن ...... مومن کی فراست سے ڈرو، انہ ینظر بنور اللہ ...... کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔

اس فراست اور خدائی نور کے ہوتے اسے ملی مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے لئے ہر آن استخارے کی کیا ضرورت ہے؟۔

....

استخارہ کی حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس میں جتنے بھی صیغے استعمال کئے گئے ہیں وہ واحد کے ہیں یعنی ایک شخص کی ذات کے لئے ہیں، یہ جمع کے صیغے نہیں ہیں ان کا تعلق دوسرے افراد یا ملت اور قوم سے نہیں ہے جیسے دعا میں مذکور ہے کہ

"اے اللہ! اگر یہ بات میرے لئے بہتر ہے، میرے دین کے لئے بہتر ہے، میری معاش کے لئے یا عاقبت امر کے لئے بہتر ہے"

اس دعا سے صاف واضح ہے کہ ایک شخص اپنے ذاتی مسئلہ میں اللہ تعالیٰ سے خیر کا طالب ہے ایک ایسے معاملہ میں اس کی راہنمائی کا طلب گار ہے جو اس کی معاش سے متعلق ہے یا اس کی عاقبت اور آخرت کا مسئلہ ہے اس دعا کا اس طرح کے کسی اجتماعی مسئلے سے کوئی تعلق نہیں کہ میں الیکشن کراؤں یا نہ کراؤں، اسمبلی توڑوں یا نہ توڑوں؟

مارشل لاء لگاؤں یا نہ لگاؤں؟ مسٹر بھٹو کو پھانسی دوں یا نہ دوں؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء و علماء نے استخارے کے موضوع پر جب بھی لکھا ہے یہی لکھا ہے کہ یہ افراد کے نجی مسائل سے متعلق اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کا ایک طریقہ ہے، مثال کے طور پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اپنی مشہور کتاب "بہشتی زیور" (جلد دوم ص۔ 33) میں "استخارہ کی نماز کا بیان" کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔

"کہیں منگنی کرے یا بیاہ کرے یا سفر کرے یا کوئی اور کام کرے تو بے استخارہ کئے نہ کرے انشاء اللہ کبھی اپنے کئے پر پشیمانی نہ ہو گی"۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ ' پنجاب یونیورسٹی لاہور کا عظیم کارنامہ ہے اس میں نامور محققین نے اسلامی موضوعات پر بڑی دقت نظر سے اپنی ریسرچ کا ماحصل پیش کیا ہے اس کی جلد دوم میں۔ 571 پر استخارہ کے زیر عنوان فاضل مرتبین لکھتے ہیں۔

"کسی ایسے امر میں جس کا تعلق اصول و عقائد یا مسائل مسلمہ و مہمہ کی بجائے زندگی کے عام معاملات سے ہو انسان کا باعث تذبذب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا تاکہ اس بارے میں صحیح فیصلہ کر سکے"۔

اس میں شبہ نہیں کہ استخارہ ' مراقبہ اور اچھے خواب باعث برکت اور سبب تسکین ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں بھی اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان کو وہمی نہیں بن جانا چاہئے اور نہ ان کے نتیجے کو حتمی اور قطعی شرعی فیصلہ تصور کرنا چاہئے ' شیطان کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ کوئی بھی صورت بدل لیتا ہے ' خواب میں کسی بزرگ کے روپ میں آکر وہ آپ کو کوئی الٹی پٹی پڑھا جائے تو اس کے بھرّے میں آکر آپ دنیا بھی خراب کریں گے اور عاقبت بھی ' حضرت غوث الاعظمؒ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ ایک دفعہ مراقبے میں محو تھے کہ ایک روشنی نمودار ہوئی اور اس میں سے ایک ہیولے نے ابھر کر آواز دی "عبدالقادر ! جا آج سے تم پر تمام دینی فرائض معاف" حضرت غوث الاعظمؒ کی جگہ کوئی اس دور کا مسلمان حکمران ہوتا تو وہ تو اسے الہام ہی سمجھ بیٹھتا مگر آپ نے فرمایا "او لعین ! جا دور ہو جا' میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں"۔ تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں ضرورت سے زیادہ اعتبار و اعتماد کرنے اور وہمی ہو جانے کی حد تک اعتبار و اعتماد کرنے پر انسان صراط مستقیم سے بھی بھٹک جاتا ہے ' یہ شریعت کی سان پر چڑھ جانے والی بصیرت اور عقل خداداد ہی ہے جو ان کٹھن لمحوں میں راہنمائی کا سامان کرتی ہے۔ صدر گرامی قدر نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہم اس کی روشنی میں ان کے گیارہ سالہ دور کے بے شمار ایسے فیصلوں کو ایک ایک کر کے گنوا سکتے ہیں جو شروع میں کچھ اور تھے بعد میں کچھ اور ہو گئے ' ان کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان کے لئے کیا جانے والا کون سا استخارہ صحیح تھا مثلاً مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً بعد نوے دنوں کے اندر الیکشن کرانے کے فیصلے سے متعلق استخارہ یا انہیں نو سال ملتوی کرنے کا استخارہ ؟ جونیجو صاحب کو وزیر اعظم بناتے وقت کا استخارہ یا انہیں برخاست کرتے وقت کا استخارہ ؟ مارشل لاء لگاتے وقت کا استخارہ یا اسے اٹھاتے وقت کا استخارہ ؟ مشکل یہ ہے کہ استخارہ کرنے والے حکمران کے کسی فعل پر آپ تنقید بھی نہیں کر سکتے کہ اس نے تو ہر فعل اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر کیا ہے تو ذمہ داری اس کی نہ رہی اللہ تعالیٰ پر منتقل ہو گئی اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ تنقید سے بالاتر ہے۔

ہم باادب صدر صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ استخارے کو عبادت ہی رہنے دیں اسے سیاست نہ بنائیں ورنہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔

(جون 89ء)

کتابیات

دنیا کی سب سے بڑی تاریخ ساز شخصیت

ربیع الاول کا مبارک مہینہ آیا چاہتا ہے۔ اس میں قریہ بہ قریہ رسول پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذکر کی محفلیں منعقد ہوں گی' خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ان کا اہتمام کریں گے مگر دیکھا جائے تو یہ ذکر پاک فقط ربیع الاول کی سعید اور مقدس ساعتوں ہی کے لئے خاص نہیں اس کا چرچا اور غلغلہ تو سارا سال ہی سنائی دیتا ہے' خالق کائنات نے خود اس کے بندوبست کا اعلان کیا ہے "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" ...... اور ہم نے تیری خاطر تیرے ذکر کو بلند کر دیا' اور یہ ذکر آسمانوں پر بھی ہوتا ہے جہاں ہر آن فرشتے آپؐ پر درود و سلام بھیج رہے ہیں اور زمینوں پر بھی جہاں سات براعظموں میں گونجنے والے نغماتِ اذان میں' نمازوں میں' جمعہ کے خطبوں میں' بچوں کی پیدائش کے موقع پر' اہل ایمان کے جنازوں میں اور ان کی شادی بیاہ کی تقریبوں میں ہر موقع اور ہر مقام پر آپ کا نام اور اسم گرامی ہدیۂ سلام و صلوٰۃ کے ساتھ کروڑوں زبانوں پر جاری ہے' حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبریل امین نے آپ سے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو ساتھ ہی ساتھ تمہارا ذکر بھی ہو گا' اور اس دعویٰ کی صداقت دیکھنی ہو تو اپنوں کی زبان سے نہیں بیگانوں کی زبان سے' ماننے والوں کے قلم سے نہیں انکار کرنے والوں کے قلم سے سنو جو ہزار تعصبات کے باوجود یہ اعتراف کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ تاریخ انسانی نے تمام سائنس دانوں' رشیوں' منیوں اور نبیوں' پیغمبروں میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم جیسی متاثر کن شخصیت نہیں دیکھی' ایسی شخصیت جس نے بے سروسامانی کے باوجود یکہ و تنہا تاریخ کے دھارے کو بدل دیا اور جس کے اثرات کا غیر مختتم دائرہ بیک وقت ماضی' حال اور مستقبل پر محیط ہے۔

1978ء میں ایک امریکی فاضل مائیکل ایچ ہارٹ کے قلم سے "دی ہنڈرڈ" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں اس نے تاریخ انسانی کے سوسب سے زیادہ با اثر افراد کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ پیش کیا ہے' اس کتاب کی مقبولیت اور تاریخی لٹریچر میں اس کے مقام کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مشہور ترین اخبارات وجرائد نے اس پر شاندار ریویو لکھے اور اسے وقت کی بہترین کتاب ٹھہرایا' مثال کے طور پر "لاس اینجلس ٹائمز" نے لکھا "یہ انتہائی فکر انگیز اور دلچسپ کتاب ہے" نیوزویک کی رائے میں "اس کتاب کی اصل خوبی اس معیار کی دریافت میں ہے جو اس نے شخصیات کے اثر کو جانچنے کے لئے مقرر کیا ہے" وال سٹریٹ جرنل نیویارک نے لکھا "یہ کتاب جاذب توجہ اور قابل مطالعہ تاریخ عالم ہے" اور لندن ڈیلی میل نے اسے ایک غیر متعصبانہ تحقیقی کاوش ٹھہرایا' مسلمانان عالم کی دلچسپی کا سامان اس کتاب میں یہ ہے کہ مصنف نے تاریخ کی سوسب سے زیادہ با اثر شخصیات کے اس تذکرے میں سرفہرست جس ہستی کو جگہ دی ہے وہ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے' اس حوالے سے ملکی پریس میں کتاب کے بارے میں خبریں تو شائع ہو چکی ہیں مگر تاریخی لٹریچر میں کتاب جس مقام بلند کی حامل ہے اس کے پیش نظر ضرورت ہے کہ اس کا قدرے تفصیلی تعارف قارئین سے کرا دیا جائے۔

کتاب میں جن سو شخصیات پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے اس میں یورپ سے 71 امریکہ سے 7 ساؤتھ امریکہ سے ایک افریقہ سے تین اور ایشیا سے 18 شخصیات شامل ہیں' ایشیائی شخصیات میں چین سے 7 ہندوستان سے 3' منگولیا سے ایک اور وسطی ایشیا سے 7 کا انتخاب کیا گیا ہے' جملہ شخصیات کی طبقہ واری تقسیم یوں ہے کہ ان میں 37 سائنس دان اور موجد ہیں' تیس سیاسی اور فوجی رہنما ہیں 14 سیکولر فلاسفر ہیں 11 مذہبی پیشوا ہیں 6 آرٹسٹ اور ادیب ہیں اور دو سیاح ہیں' کتاب کے آخر میں ان سو افراد کی فہرست بھی دی گئی ہے جنہیں مصنف نے تاریخ کی سو اہم شخصیات میں شامل کرنے کے بارے میں سوچا ضرور مگر پھر انہیں شامل نہیں کیا' مصنف کے کڑے معیار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک امریکی ہونے کے باوجود اس نے ابراہام لنکن جیسے نامور امریکی پریذیڈنٹ اور عالمی رہنما کو بھی اس صف میں جگہ نہیں دی' اس کا سبب بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے۔

> "ابراہام لنکن' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سولہواں صدر' ان مشہور اور قابل تعریف سیاسی' رہنماؤں میں شامل ہے جو اس ملک بلکہ کسی ملک نے بھی کبھی پیدا کئے ہیں پھر اسے اس فہرست میں کیوں شامل نہیں کیا گیا' کیا ساڑھے پینتیس لاکھ غلاموں کو آزاد کرانا ایک بڑا کارنامہ نہیں؟ یقیناً یہ بڑا کارنامہ ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دنیا بھر میں غلامی کی ختم کرنے کے لئے بہت سی طاقتیں کام کر رہی تھیں بہت سے ملکوں نے غلامی کو لنکن کے عہدہ صدارت سنبھالنے سے بھی پہلے ختم کر

دیا تھا اور اس کی وفات تک پینسٹھ سال کے عرصے میں بہت سے دوسرے ملکوں نے بھی یہی کیا۔ اس لئے لنکن کے سر اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اس بات کا سہرا باندھا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے ملک میں غلامی کو ختم کرنے کے عمل کو تیز تر کر دیا"

مہاتما گاندھی مغربی دنیا میں یوں تو بڑے مقبول ہیں ان کی شخصیت اور تعلیمات پر مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے لیکن مصنف نے انہیں بھی اپنی فہرست میں شامل نہیں کیا اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے'

"موہن داس گاندھی تحریک آزادی ہند کا ایک ممتاز رہنما تھا اور صرف اسی ایک وجہ سے کئی لوگوں نے مجھے تجویز دی کہ اسے بھی کتاب میں شامل کیا جائے مگر یہ یاد رکھنا چاہئے ہندوستان کو انگریزوں سے بہرحال دیر یا سویر آزاد ہو کے ہی رہنا تھا جو تاریخی طاقتیں کالونیوں کی آزادی کے لئے کام کر رہی تھیں ان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر گاندھی پیدا نہ بھی ہوا ہوتا تب بھی 47ء سے چند سالوں کے اندر ہندوستان آزاد ہو جاتا"

مصنف نے گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد پر بھی بحث کی ہے اور اس میں شک ظاہر کیا ہے کہ اس کی وجہ سے آزادی کی تحریک کو تقویت ملی وہ کہتا ہے ہو سکتا ہے اگر ہندوستان یہ راستہ اختیار نہ کرتا تو اسے اس سے بھی پہلے آزادی مل جاتی' جہاں تک فلسفۂ عدم تشدد کا تعلق ہے مصنف کے نزدیک وہ بھی گاندھی کا طبع زاد (اور جنل) نہ تھا' اس سے پہلے ایجلز' ٹالسٹائی اور بعض دوسرے ہندو مصنف بھی اسے پیش کر چکے تھے پھر جہاں تک اس فلسفہ کے کامیاب اثرات کا تعلق ہے ان کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود گاندھی کا اپنا ملک اس کی وفات کے بعد پاکستان سے تین جنگیں لڑ چکا ہے اور چین سے ایک جنگ اس کے علاوہ' اس لئے اب تک کے واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فلسفی کی حیثیت سے گاندھی کو کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے' مصنف کے تحت الشعور میں یہ خوف پوری طرح سے سمایا ہوا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تاریخ کی ممتاز ترین اور با اثر ترین ہستی کی حیثیت سے پیش کرنے پر عیسائیوں میں اس پر تنقید کی جائے گی وہ خود بھی عیسائی ہے اس لئے اس مسئلہ کی جذباتی نزاکت سے خوب واقف ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے دیباچہ میں اس نے ان معیارات کی نشان دہی کر دی ہے جس پر اس نے تمام شخصیات کو پرکھا اور پھر انہیں نمبروار اپنی کتاب میں جگہ دی' وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے میرا پہلا معیار یہ ہے کہ میں نے افسانوی یا موہوم شخصیات کے بجائے صرف انہی شخصیات کو موضوع گفتگو بنایا ہے جو واقعی تاریخی وجود رکھتی ہیں ان افراد کو بھی قلم زد کر دیا ہے' جو گمنام ہیں' میں نے انسانیت پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اور واقفیت کو مدار انتخاب ٹھہرایا ہے' بعض لوگ ایسے ہیں جو ایک خاص وقت میں انسانی تاریخ پر اثر انداز ہوئے

یا اپنے ملک اور قوم پر، وہ ان لوگوں کے مقابلے میں پیش نہیں کئے جاسکتے جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر اثرانداز ہیں جن کا اثر مقامی نہیں بین الاقوامی ہے جو حال ہی پر نہیں ماضی پر بھی اثرانداز ہوئے، میں نے ان اثرات کو بھی نگاہ میں رکھنے کی کوشش کی ہے جو وہ مستقبل میں آنے والی نسلوں پر ڈالیں گے، میں نے اس انتخاب میں صرف انفرادی اثر کو سامنے رکھا ہے ان تحریکوں اور دوسرے عوامل کو وزن نہیں دیا جو اس اثر کو بڑھانے کا موجب بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پیغمبر اسلام کو اپنی کتاب میں سب سے پہلا درجہ دیا ہے حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی اونچا' (حضرت مسیح علیہ السلام کتاب میں تیسرے نمبر پر آتے ہیں) حضرت مسیحؑ پر جو باب ہے اس میں مصنف نے پھر اس ذہنی خلجان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس نے کیوں حضرت مسیحؑ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم مؤثر شخصیت ٹھہرایا ہے وہ کہتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عیسائیت اسلام کی طرح صرف ایک شخصیت کے ذریعے سے سامنے نہیں آئی اس کے بانی دو ہیں ایک مسیحؑ دوسرے سینٹ پال، مسیحؑ نے روحانی پیام دیا اور پال نے اس میں مسیحؑ کی پرستش کا اضافہ کیا اس طرح انجیل (عہد نامہ جدید) کے ایک معتدبہ حصے کا مصنف بھی سینٹ پال ہے۔ حضرت مسیحؑ ابھی جوان ہی تھے کہ دنیا سے اٹھالئے گئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرح انہوں نے اپنے پیچھے اپنے ماننے والوں کی کوئی بڑی تعداد نہیں چھوڑی' ان کی وفات کے وقت ان کے پیروکار محض ایک چھوٹا سا یہودی فرقہ تھا یہ سینٹ پال تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور یہودیوں کے علاوہ غیر یہودی افراد بھی اس میں شامل ہو گئے' انہی دلائل کی وجہ سے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ عیسائیت اور مسیحؑ کی زندگی کے بارے میں بھی ہمیں جو معلومات اس وقت دستیاب ہیں وہ غیر یقینی ہیں "یہ یقینی نہیں ہے کہ ان کا اصل نام کیا تھا' ان کا سال پیدائش بھی نامعلوم ہے اور اسی طرح سال وفات بھی غیر یقینی ہے' حضرت مسیحؑ نے اپنے بعد کوئی تحریری مواد نہیں چھوڑا ان کی زندگی پر صرف "نئے عہد نامہ" ہی سے روشنی پڑتی ہے جس میں شامل ابواب بدقسمتی سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں' مصنف کہتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے صاحب اقتدار تھے مگر حضرت مسیحؑ کوئی سیاسی اثر نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کی آمد کے بعد کی صدی میں بھی ان کے مذہب کو کوئی سیاسی اثر و رسوخ حاصل نہیں ہو سکا مصنف نے حضرت مسیحؑ کی اخلاقی تعلیمات کا بھی محاکمہ کیا ہے وہ کہتا ہے جہاں تک ان کی ان پندونصائح کا تعلق ہے جو انجیل میں پیش کی گئی ہیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو' جو تم پر لعنت بھیجیں' ان پر رحمت بھیجو' جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان سے بھی حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ اور جو تمہیں تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لئے بھی دعا کرو' جو تمہارے دائیں رخسار پر طمانچہ رسید کرے بایاں بھی اس کے آگے کر دو ...... بلاشبہ اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیمات ہیں مگر جہاں تک اصلیت کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کی پیروی نہیں کی جاتی بلکہ عملاً انہیں قابل قبول ہی نہیں سمجھا جاتا' خود عیسائیوں کی اکثریت دشمنوں سے پیار کرنے کے نظریئے کو ایک ایسا آئیڈیل سمجھتی ہے جو ایک مثالی دنیا میں تو بینے سے

لگایا جاسکتا ہے مگر حقیقی دنیا میں اسے روزمرہ کی زندگی کا رہنما نہیں بنایا جاسکتا، ہم اس پر عمل نہیں کرتے اور نہ دوسروں سے اس کی توقع کرتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کریں، اپنے بچوں کو بھی ہم اس کی تلقین نہیں کرتے اس لئے حضرت مسیحؑ کی یہ تعلیمات دلچسپ اور پرکشش تو ضرور ہیں مگر بنیادی طور پر ایسے مشوروں کا درجہ رکھتی ہیں جنہیں آزمایا نہیں جاسکا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر مصنف نے جو باب باندھا ہے اس میں پھر اس نے اپنی وجوہ ترجیح کی تصریح کی ہے، وہ لکھتا ہے۔

"تاریخ کے سب سے با اثر فرد کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب ممکن ہے بعض قارئین کو عجب لگے اور بعض اسے چیلنج بھی کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں آپؐ ہی وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے دینی اور دنیوی دونوں سطحوں پر بے مثال کامیابی حاصل کی"

"ایک معمولی گھرانے سے اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے ایک بہت بڑے مذہب کی بنیاد رکھی اور پھر اس کی توسیع و اشاعت کی، اسی کے ساتھ سیاست میں بھی ایک مؤثر قیادت فراہم کی چنانچہ آج تیرہ سو سال گزرنے کے باوجود آپؐ کا اثر پوری طاقت و سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے"۔

تاریخ کی دوسری مشہور اور با اثر شخصیات سے آپؐ کا تقابل کراتے ہوئے مصنف رقم طراز ہے،

"اس کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کی اکثریت تہذیب یافتہ اور سیاسی لحاظ سے ترقی یافتہ قوموں اور ثقافت و تمدن کے مراکز میں بنی بڑی ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم 570ء میں مکہ کے شہر (جنوبی عرب) میں پیدا ہوئے جو اس وقت دنیا کا ایک پس ماندہ علاقہ تھا اور تجارت، آرٹ اور علم و فن کے مراکز سے کہیں دور واقع تھا۔ چھ سال کی عمر میں آپؐ یتیم ہو گئے اسلامی روایات کے مطابق آپؐ ان پڑھ تھے، چالیس سال کی عمر میں کوئی خارجی شہادت ایسی نہ تھی کہ آپؐ ایک ایسے صاحب امتیاز شخص بننے والے ہیں"

مصنف کو بار بار خیال آتا ہے کہ وہ عیسائی ہے اور اسے عیسائی دنیا کے سامنے اس امر کی جواب دہی کرنی ہو گی کہ اس نے کیوں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حضرت مسیح پر ترجیح دی ہے در آں حالیکہ عیسائیت کے پیروکاروں کی تعداد مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے، وہ لکھتا ہے،

"اس کے دو اسباب ہیں، پہلا یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسلام کی ترویج و ترقی میں حضرت مسیحؑ سے کہیں زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے، اگرچہ حضرت مسیحؑ نے عیسائیت کے بنیادی اخلاقی تصورات پیش کئے ہیں مگر انہیں مذہب کی شکل دینے کا سہرا سینٹ پال کے سر ہے اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ تصورات پیش بھی کئے اور انہیں عملی جامہ پہنا کر رائج بھی کیا۔

دوسرا سبب قرآن حکیم ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے نازل کردہ ہے، اسے ان کی زندگی ہی میں کم و بیش ضبطِ تحریر میں لے آیا گیا تھا اور ان کی وفات سے کچھ عرصہ بعد اسے مستند طور پر مرتب کرلیا گیا تھا اس کے برعکس حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا کوئی ایسا مجموعہ دستیاب نہیں۔

مزید برآں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ دنیوی رہنما بھی تھے بلکہ حقیقت میں عرب فتوحات کے پس پردہ اصل جذبہ و محرکہ ہونے کی حیثیت میں وہ ہمہ وقت دنیا کے سب سے زیادہ با اثر سیاسی رہنما کا درجہ رکھتے ہیں"۔

مصنف نے اس باب میں اسلامی فتوحات کا بھی جائزہ لیا ہے وہ بدوؤں کی ایک معمولی فوج کے ذریعے روم و فارس کی افواجِ قاہرہ کی شکستوں کو تاریخ انسانی کی سب سے زیادہ **محیّر العقول** فتوحات قرار دیتا ہے اس کے نزدیک ان کا ایک نہایت امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ مستقل فتوحات تھیں، اسپین کے سوا جتنے علاقے بھی مسلمانوں نے فتح کیے وہ آج بھی سب کے سب مسلمان ہیں، وہ کہتا ہے

"بہت سے اہم تاریخی واقعات کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ناگزیر تھے وہ کسی خاص سیاسی لیڈر کی قیادت فراہم ہونے کے بغیر بھی وقوع پذیر ہو کر رہے، مثال کے طور پر جنوبی امریکہ کی نو آبادیاں شاید اسپین سے "سائمن بولیور" کے بغیر بھی آزادی حاصل کرلیتیں لیکن عرب فتوحات کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاسکتا، اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نہیں ہوا اور اس کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں کہ یہ فتوحات آپ کی شخصیت کے ظہور پذیر ہوئے بغیر بھی ممکن تھیں، انسانی تاریخ میں اس طرح کی دوسری مثال صرف مغل فتوحات ہیں جو تیرہویں صدی میں چنگیز خان کے زیر اثر ہوئیں مگر یہ بھی مستقل ثابت نہ ہو سکیں اور آج منگولوں کے پاس صرف وہی علاقہ ہے جس پر وہ چنگیز خان سے پہلے قابض چلے آ رہے تھے اس کے برعکس عرب فتوحات کے نتیجے میں آج بھی عراق سے لے کر مراکش تک عرب قوموں کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہے جسے اسلامی عقیدے اور عربی زبان ثقافت اور تاریخ نے متحد کر رکھا ہے، عربی زبان میں اگرچہ مقامی اثرات اور لہجوں کا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن چونکہ قرآن عربی زبان میں ہے اس لئے اس نے عربی زبان کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھا ہے، یہ صحیح ہے کہ ان ملکوں میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں لیکن ہمیں اس جزوی عدم اتحاد کی وجہ سے اتحاد کے ان اہم عوامل و عناصر سے آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں جو ان ملکوں کے درمیان برابر کارفرما چلے آ

رہے ہیں"

مصنف لکھتا ہے کہ

"دین اور دنیا کا یہی عدیم المثال امتزاج اور اس کے یہی نتائج و اثرات ہیں جن کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ با اثر فرد کی حیثیت سے اپنی کتاب میں جگہ دوں۔"

(9، دسمبر 82ء)

(2) دی مہدی...... مغرب کا ایک منصوبہ

مغربی دنیا یوں تو اپنے مفادات کے اعتبار سے آپس میں بٹی ہوئی ہے لیکن ایک نکتہ ایسا ہے جس کے بارے میں اس کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور وہ ہے اسلام اور اسلامیان عالم کی مخالفت، سپر پاورز سے لے کر ہر چھوٹی بڑی مغربی حکومت کی خواہش اور کوشش ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد نہ ہونے پائے یہ یوں ہی باہم دو گردست بگریباں رہیں ورنہ اگر یہ سب ایک ہو گئے تو اس سیل رواں میں مغرب خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا اس مقصد کے لئے بڑی طاقتوں نے عالم اسلام میں اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر باہمی سمجھوتے سے ایک دوسرے میں بانٹ رکھے ہیں وہ بظاہر ان منطقوں میں رہنے والے مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں مگر درپردہ اس ہمدردی کے پیچھے ان کی اپنی منفعتیں اور مصلحتیں کار فرما ہوتی ہیں ان کی مالی امداد کسی مسلمان ملک کو رہن رکھنے کے مترادف ہوتی ہے دو چار سال قبل "واڈ کا کولا" کے نام سے ایک ماہر اقتصادیات کی کتاب شائع ہوئی تھی جس میں اس نے اعداد و شمار اور کوائف و حقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ امریکہ اور روس نے ملی بھگت سے دنیا کی اقتصادی ناکہ بندی کر رکھی ہے اور مالی امداد کے نام پر مختلف ملکوں پر عطیات کی جو بارش کی جاتی ہے اس میں ان دونوں بڑی طاقتوں کے اپنے خفیہ مفادات پوشیدہ ہیں۔

اسلام اور عالم اسلام کا مغربی دنیا کے لئے خطرہ نمبر ایک ہونا ان کی جدید تحقیق اور ریسرچ ہی کا نتیجہ نہیں ان کے دانشمند اور "مردان غیب" سینکڑوں سال پہلے اس کے لئے باقاعدہ پیش گوئیاں بھی کر چکے

ہیں۔ "ناسٹراڈامس" ایک ایسا ہی پیش بیں ہو گزرا ہے۔ جس نے آج سے پانچ چھ سو سال پہلے ایک ایسے مسلم عرب فاتح کا اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، جو نہ صرف یورپ کو فتح کرے گا بلکہ چار دانگ عالم میں اسلام کی عظمت کے پرچم گاڑ دے گا۔ "ناسٹراڈامس" نے ہٹلر اور نپولین 'جنگ عظیم اور جنگ عالمگیر' لندن میں آتش زدگی وغیرہ کے بارے میں جتنی پیش گوئیاں کی تھیں وہ سب کی سب پوری ہو چکی ہیں اس لئے اہل مغرب اس کی پیش گوئیوں کے مجموعے کو بڑی قدر و قیمت کا حامل قرار دیتے ہیں اس کتاب کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اس کی کئی فلمیں بن چکی ہیں اور ان سب کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اسلام مغربی دنیا کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے اس کی روک تھام کے لئے، جو بھی تدبیر کی جا سکے اس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

مغرب یہ بھی جانتا ہے کہ عالم اسلام جن خطہ ہائے ارض میں پھیلا ہوا ہے وہ قدرتی وسائل کی دولت سے مالامال ہیں، تنہا تیل اتنی بڑی نعمت ہے کہ اسے بجا طور پر "زر سیال" کہا جا سکتا ہے اور اگر کسی دن عالم اسلام نے اسے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس کی ہولناکی مغربی دنیا کے لئے ایٹمی طاقت سے بھی کہیں بڑھ کر ہو گی ایک زمانے میں شاہ فیصل شہید نے امریکہ پر تیل کی بندش کر دی تھی تو سامراج کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ کسنجر، شاہ شہید سے ملنے پہنچا تو انہوں نے یہ کہہ کر کسنجر سے ہاتھ نہیں ملایا کہ وہ یہودی سے ہاتھ نہیں ملانا چاہتے۔ شاہ کو اپنی اسی عزیمت اور تیل کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی پاداش میں شہید کرا دیا گیا۔ مغرب جانتا تھا کہ اگر ان کی دیکھا دیکھی دوسری مسلمان حکومتوں نے بھی یہی راستہ اختیار کر لیا تو وہ بے موت مارا جائے گا۔

"ارمغان حجاز" میں علامہ اقبالؒ مرحوم نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے نام سے، جو معرکتہ الآراء نظم لکھی ہے اس کا مرکزی مضمون بھی یہی ہے۔ مغرب آج تمام تر ابلیسی طاقتوں کا مظہر ہے اور وہی فیصلہ اس کا ہے، جو اپنی مجلس شوریٰ میں ابلیس نے صادر کیا تھا۔ اس کے بعض مشیر ابلیسی نظام کے لئے اشتراکیت کو اولین خطرہ قرار دیتے ہیں تو وہ صاف صاف کہتا ہے:۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ خو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

اس امت کے خطرے کا علاج بھی ابلیس کی نگاہ میں ہے، کہتا ہے، اس پر شرع پیغمبرؐ کی اصل روح آشکارا نہیں ہونی چاہئے یہ جڑ کو چھوڑ کر شاخوں ہی میں الجھی رہے۔ مذہبی جھگڑے اور فرقہ وارانہ موشگافیاں اسے اس بات کی مہلت بھی نہ دیں کہ وہ بنیادی حقیقتوں کی طرف متوجہ ہو۔

چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اس کے مذہبی افکار میں اصل اہمیت ان باتوں کو حاصل رہے، جو اسلام میں محض فروعی حیثیت رکھتی ہیں اس کا شعروادب اسے تھپکیاں دے دے کر سلانے والا ہو' اس کا تصوف اصل زندگی سے اس کا رشتہ ختم کرنے والا ہو وہ نجات ' دنیا کو دین بنانے کے بجائے دنیا سے فرار کرنے میں دیکھے اس لئے۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

خطرے کی شدت کا یہی احساس ہے جس کی وجہ سے آج مغربی دنیا میں جگہ جگہ ایسے تحقیقاتی ادارے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد علمی، عملی' معاشی اور سیاسی محاذ پر مسلمانوں کو پسپا کر کے ان میں پھوٹ ڈالنا اور انہیں احساس کمتری میں مبتلا کرنا ہے۔ مستشرقین عربی زبان اور اسلامی علوم سیکھنے میں زندگیاں کھپائے ہوئے ہیں اور اپنی کتابوں کے ذریعے ہمدردانہ پیرائے میں رات دن ایسے ایسے شگوفے چھوڑنے میں مشغول ہیں جن سے مسلمانوں کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے میں انتشار ذہنی پیدا ہو اور وہ اسلام کی شاندار شخصیات اور تعلیمات کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائے مجھے خود پاکستانی معاشرے میں ایسے بہت سے سربر آوردہ افراد سے واسطہ پڑتا ہے جو مختلف محفلوں میں انہی مستشرقین کے چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کرتے نظر آتے ہیں وہی اعتراضات کے تیر جو ان کی کمانوں سے نکل چکے ہیں چلتے ہیں اور ان محفلوں میں ناواقفوں کے سینوں سے پار ہو جاتے ہیں۔ سیاسی محاذ پر مغربی طاقتوں نے ہر مسلمان ملک میں اپنے "مرغان دست آموز" پال رکھے ہیں جو انہی کے اشارے پر ناچتے اور انہی کی بولی بولتے ہیں' ہر قابل ذکر مسلم رہنما کی فائل کھلی ہے جس میں اس کے متعلق الف سے ی تک تمام معلومات جمع ہیں اس کی خوبیاں بھی اور اس کی خامیاں بھی اور اب تو بعض یونیورسٹیوں میں عالم اسلام کی بعض مذہبی تنظیموں اور شخصیات پر ریسرچ کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ بھی ملنے لگی ہے ایسے "برین سیل" قائم ہیں جو زر کثیر کے صرف سے ان نفسیاتی راستوں کی کھوج میں ہیں جہاں سے مسلم معاشروں پر حملہ آور ہوا جا سکے اور ظاہر ہے ان میں آسان ترین راستہ مذہبی اختلافات کا ہے خدا جانے کتنے غیر ملکی ایجنٹ رات دن اس محاذ پر سرگرم عمل اور مسلمانوں کو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کی ناموس پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دینے میں کوشاں ہیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسی مذہبی شخصیات "پلانٹ" کی جائیں جن کے ارد گرد تقدس کا ہالہ ہو مگر وہ در حقیقت سامراجی عزائم کی تکمیل کا ذریعہ اور سبب ہوں اس سلسلے میں مغرب کی سب سے بڑی خواہش ایک ایسے "مہدی" کا ظہور ہے جو ان کا اپنا آدمی ہو اور وہ کوئی ایسا نشان یا معجزہ دکھا کر پورے عالم اسلام کو اپنا حلقہ بگوش بنانے میں کامیاب ہو جائے جس کی بظاہر کوئی تاویل و توجیہ

نہ کی جاسکے یوں تو تاریخ اسلام میں اپنی ذہنی خرابی یا غیروں کی سازش سے اب تک چالیس مہدیوں کا ظہور ہو چکا ہے مگر ان سب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مسلمانوں میں انہیں قبول عام حاصل نہیں ہو سکا اس لئے ایک ایسا "مہدی" مغرب کی ضرورت ہے جو ذہنی اور اعتقادی طور پر عالم اسلام کو مسخر کر سکے اور اپنے اس منصب سے خفیہ طور پر مغرب کی خدمت بجالائے۔

دیدہ دلیری کا عالم یہ ہے کہ اب یہ خواہش مغرب میں ایک کھلے راز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب یہ سیکرٹ ایجنسیوں کے دائرہ عمل سے نکل کر اہل قلم کے حلقہ تک پہنچ چکی ہے۔ دو سال قبل لندن سے اے جے کوئینل کا ایک ناول شائع ہوا تھا سال گذشتہ اس کا پیپر بیک شائع ہوا ہے اس کا نام ہی "دی مہدی" ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے ایک مغربی مبصر نے کہا ہے کہ:

"کاش! مسٹر کوئینل ناول لکھنے کے بجائے اپنے اس آئیڈیا کو سی آئی اے اور ایم۔ 16 کے ہاتھوں فروخت کر دیتے" جیسے کہ سی آئی اے اور ایم۔ 16 پہلے ہی اس طرح کے کئی منصوبوں پر عمل پیرا ہیں' کتاب کا پلاٹ مختصر لفظوں میں یوں ہے کہ برطانیہ اور امریکہ مل کر عالم اسلام کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک جھوٹے مہدی کے ظہور کا منصوبہ بناتے ہیں' اس مقصد کے لئے سعودی عرب میں ابو قادر نامی ایک زاہد و عابد آدمی کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے وہ ایک پہاڑی غار میں عبادت کرنے کا عادی ہے دور فاصلے پر صحرا میں ایک ایسا سیٹ اپ بنایا جاتا ہے جس کی ٹیپ ریکارڈنگ کا تعلق غار کی چھت سے جڑا ہوتا ہے' ابو قادر غار میں مختلف اوقات میں اپنا نام سنتا ہے جیسے کوئی پکارنے والا اسے پکار رہا ہو' کبھی دھیمے لہجے میں کبھی بلند آہنگی کے ساتھ' پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ٹیپ ریکارڈنگ کے ذریعے غار میں آیات قرآن کی گونج سنائی دیتی ہے اور کہنے والا اسے کہتا ہے کہ تو مہدی ہے اور تجھے نشان عطا کیا جائے گا' تو جدہ جا وہاں تیرا ساتھی تیرا منتظر ہے وہ تجھے پہچان لے گا تو اس کے مشوروں پر عمل کر' ابو قادر یہ سن کر فرط رعب و تحیّر سے زمین پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اسے یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی مہدی بنا کر بھیجا گیا ہے' ادھر برطانوی حکومت کا ایک ایجنٹ حاجی مستان خان کے نام سے جدہ میں بڑا تاجر اور با اثر شہری ہے وہ اپنی مسجد کے امام کو پہلے ہی اپنے خواب سنانا شروع کر دیتا ہے کہ اس طرح وہ خوابوں میں مسلسل ایک شخصیت کی زیارت کر رہا ہے' امام مسجد اس بات کو عام کر دیتا ہے حاجی مستان خان وہ آدمی ہے جس کے ذریعے مہدی کو قابو میں رکھنا مقصود ہے منصوبہ اول برطانیہ اور امریکہ نے بنایا تھا لیکن اس کے سربر آوردہ جاسوسوں کے مشترکہ اجلاسوں سے روس کو شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں طاقتیں کسی خاص مشن کے لئے کام کر رہی ہیں وہ اپنی ایک تربیت یافتہ جاسوس حسینہ کے ذریعے برطانوی جاسوس کو چکمہ دیتا ہے اور اس منصوبے تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ بعد میں تینوں طاقتیں مشترکہ طور پر اس "کار خیر" میں جدوجہد کرنے لگتی ہیں وہ اردن میں اس مقصد کے لئے ہیڈ کوارٹر قائم کر لیتی ہیں جہاں سے اس مہم کی نگرانی کی جاتی ہے۔

ظہور مہدی کے لئے حج کا موسم منتخب کیا جاتا ہے اور طے ہوتا ہے کہ مہدی عید الاضحیٰ کے دن معجزہ

دکھا کر پورے عالم اسلام پر اپنی دھاک قائم کر لے' اس مقصد کے لئے افواہوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کیا جاتا ہے سب سے پہلے انڈونیشیا میں یہ خبر اڑائی جاتی ہے کہ اس حج پر مہدی ظاہر ہو گا پھر پاکستان کے علاقہ پنجاب میں یہ افواہ پھیلتی ہے (یہ بات قابل غور ہے کہ غیروں کے نزدیک بھی پنجاب ہی وہ زرخیز علاقہ ہے جو ہر قسم کی افواہ طرازی اور افواہ سازی کے لئے مرکز کا کام دے سکتا ہے) یہاں تک کہ یہ افواہ پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہاں مصنف لکھتا ہے کہ اگر عالم اسلام کے ذرائع اطلاعات منظم اور سائنٹفک ہوتے تو وہ بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ اس افواہ کے پیچھے ضرور کوئی خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے (مگر ظاہر ہے عالم اسلام کی حکومتوں میں اتنی صلاحیت کار کہاں!) اس زمانے میں ابو قادر ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہونا شروع ہوتا ہے وہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا اسے سعودی عرب کی حکومت کا ڈر ہے۔ سعودی عرب کی حکومت پندرہویں صدی کے آغاز پر خانہ کعبہ میں ہونے والے ظہور مہدی کے خونیں ڈرامے سے خائف ہے۔ ابو قادر قاہرہ کا بھی دورہ کرتا ہے اس کے مریدوں کا حلقہ بڑھ رہا ہے' یہاں تک کہ حج کے دن آ جاتے ہیں عین قربانی کے دن ابو قادر اپنے مریدوں کے ہجوم میں وادیٔ منیٰ میں نشانی دکھانے کے لئے نکلتا ہے' حاجی مستان خان اس کے ساتھ ہے وہ ایک ذبح شدہ دنبہ اٹھائے ہوئے ہے جس کے پیٹ میں ایک مخصوص "ڈیوائس" رفٹ ہے ایک خاص مقام پر آ کر ابو قادر رک جاتا ہے بے پناہ' ہجوم اکٹھا ہے سعودی خفیہ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی موجود ہیں یہاں ابو قادر دنبے کو ایک جگہ رکھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا ہے اور بآواز بلند مہدی کے لئے نشانی کا طلب گار ہوتا ہے' آسمان سے اچانک ایک سبز رنگ کی روشنی نمودار ہوتی ہے جو پوری وادی میں چکاچوند کا عالم پیدا کر دیتی ہے جدہ والے بھی اس روشنی کو دیکھتے ہیں یہ دنبے تک پہنچ کر اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے (یہ "لیزر بیم" ہے' تابکاری شعاع جسے سیٹلائٹ کے ذریعے نیچے پھینکا جا رہا ہے) لوگ یہ دیکھ کر ابو قادر کی صداقت پر ایمان لے آتے ہیں اور اس طرح مہدی ظاہر ہو جاتا ہے۔

کتاب میں برطانیہ' روس اور امریکہ کی باہمی رقابتوں کا بھی دلچسپ اظہار ہوا ہے۔ انجام کار برطانیہ' روس اور امریکہ دونوں کو چالاکی اور عیاری سے اس منصوبے سے خارج کر دیتا اور آخر میں پتہ چلتا ہے کہ خود ابو قادر بھی ایک برطانوی خفیہ ایجنٹ کا بیٹا ہے جو پندرہ سال سے مسلمان بن کر زہد و عبادت کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہے۔

یہ کتاب ایک ناول سہی' سنجیدگی سے نوٹس لئے جانے کے ناقابل سہی مگر اس سے کیا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مغرب کس طرح اسلام کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے' کس طرح اس کی اسلامی روایات پر گہری نظر ہے' کس طرح وہ عالم اسلام پر کنٹرول کرنے کے لئے نت نئے منصوبے بنانے میں مشغول ہے۔ عباؤں اور قباؤں کو خریدنے میں وہ کتنی گہری دلچسپی رکھتا ہے' وقت آ گیا ہے کہ عالم اسلام دشمن کے ان ہتھکنڈوں سے کماحقہ واقف اور آگاہ ہو۔ وہ ہر محاذ پر اس کے حملوں کے توڑ کرے' مستشرقین

کے دانت علمی محاذ پر کھٹے کرے اور سیاسی محاذ پر اس کے ایجنٹوں کے تسلط سے بھی آزاد ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی مذہبی تنظیموں اور شخصیات کا بھی نگہ احتساب سے جائزہ لے جن کے آنگن میں رات دن ہن برستا ہے اور جو اپنی سرگرمیوں سے بالواسطہ سامراجی عزائم کی تقویت کا باعث بنتی ہیں نہ جانے کس کا شعر ہے مگر ہے حسب حال اور آج کی گفتگو اسی شعر پر ختم کرتا ہوں کہ ؎

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

(2ر فروری 1984ء)

ایک سفیر کی یادداشتیں

(1)

ہزایکسی لینسی پرویز راجی جون 74ء سے جنوری 79ء تک برطانیہ میں ایران کے سفیر تھے۔ کیمبرج کے تعلیم یافتہ چالیس سالہ روشن دماغ نوجوان۔ آج سے تقریباً ایک سال پہلے لندن سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام ہے "ان دی سروس آف پیکاک تھرون" (تخت طاؤس کی ملازمت میں) مجھے یہ کتاب حال ہی میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے یہ اصل میں سابق ایرانی سفیر کی اس ڈائری کے اقتباسات پر مشتمل ہے، جو وہ دوران ملازمت روزانہ لکھ لیا کرتے تھے۔

کتاب سے تیسری دنیا کی حکومتوں کے بعض پہلوؤں پر بڑی بھرپور معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں ایک ایسی حکومت کی سفارت کتنا مشکل کام ہے جو غیر جمہوری اور آمرانہ ہو اور جس میں شہری آزادیاں سلب کر لی گئی ہوں۔ سفیر بے چارا کتنی ہی پبلک ریلیشنگ کیوں نہ کرے اپنے ملک کے پروپیگنڈے اور پبلسٹی کے لئے کتنے ہی جتن کیوں نہ کرلے جمہوری ملکوں کی قیادت اور رائے ساز حلقوں کو ہموار کرنا اس کے بس کا کام نہیں ہوتا وہ پبلسٹی کو پالیسی کا بدل نہیں بنا سکتا۔

اس کتاب سے دوسری بات یہ مترشح ہوتی ہے کہ ایک جابر و قاہر حکومت کا کل پرزہ بن جانے کے بعد ایک اچھا خاصا باضمیر اور مختلف سوچ رکھنے والا انسان بھی مجبور محض بن کر رہ جاتا ہے اس کا ضمیر اسے کچوکے دیتا ہے وہ اپنی سوچ کے اظہار کے لئے اچھی اچھی تجاویز بھی اپنے اوپر کے حلقوں کو بھجواتا ہے لیکن

جب اس کی آراء کوردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے تو وہ پھر "اسی تنخواہ" پر کام کرنے لگ جاتا ہے اور تمام وقت دوران ملازمت وہ ضمیر اور ڈیوٹی کی کشمکش سے نجات حاصل نہیں کر پاتا۔ اس کتاب کے ذریعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مغرب کا پریس اور اس کے دوسرے ذرائع ابلاغ کتنے طاقتور اور مؤثر ہیں اپنے ملک کے میڈیا کا گلا گھونٹ دینے اور اسے خوف اور لالچ سے خاموش کر دینے کے باوجود تیسری دنیا کے آمر آزاد دنیا کے ذرائع ابلاغ سے لرزہ براندام رہتے ہیں کچھ انہیں اپنے "امیج" کی فکر ہوتی ہے، کچھ ان خیالات سے اپنے ملک کے باشعور طبقوں کے متاثر ہونے کا ڈر، وہ اپنے سفارت خانوں سے مسلسل یہی فرمائش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح وہ ان کی آزادانہ کارکردگی پر اثرانداز ہو کر انہیں موافقت اور حمایت کے لئے آمادہ کرلیں۔ یہ آمر بیرونی دنیا کی رائے کے آئینے میں اپنا اصل چہرہ دیکھنے کے بجائے اس آئینہ ہی کو توڑ دینا چاہتے ہیں یا اسے کم سے کم اتنا دھندلا کر دینا چاہتے ہیں کہ اس میں انہیں اپنے حقیقی خدوخال دیکھ کر کسی مایوسی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

یہ کتاب آمرانہ مزاج کے اسی پہلو کی بھی نقاب کشائی کرتی ہے کہ کس طرح:

نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد

یہ مزاج ذرا سے اختلاف رائے سے بھی بھڑک اٹھتا ہے اسے کتنی ہی خیر خواہی اور دور اندیشی سے آنے والے زمانے کے حوالے سے کسی حقیقت پر متوجہ کیا جائے وہ اسے سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تخت پر پوری شان فرعونی کے ساتھ براجمان ہوتا ہے اس کے دربار کے آداب اور ضابطے اس کا جاہ و جلال اور اس کا کروفر اسے ایک آن کے لئے بھی یہ نہیں سوچنے دیتا کہ آنے والا کل آج سے مختلف بھی ہو سکتا ہے، زوال دبے پاؤں اس کے عشرت کدوں میں داخل ہوتا اور اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتا ہے تب کہیں اس کی آنکھیں کھلتی ہیں مگر اب اتنی دیر ہو چکی ہوتی ہے کہ اصلاح احوال کے سب راستے مسدود ہو چکے ہوتے ہیں۔

اب ہمارے اخذ کردہ ان پہلوؤں کی روشنی میں کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے جو ہم نے قارئین کی سہولت کے لئے ایرانی سفیر کے تینوں سالوں کے روزناچوں سے منتخب کئے ہیں۔

"پرائیویٹ آئی" لندن کا ایک مشہور جریدہ ہے اس کے اکثر مشمولات زرد صحافت کی تعریف میں آتے ہیں۔ اسکینڈلز چھاپنے میں مہارت رکھتا ہے۔ کئی سربراہان مملکت اور عالمی مشاہیر کی پگڑی اچھال چکا ہے۔ 67ء کے ایک شمارے میں اس نے صدر ایوب خان مرحوم پر بھی ایک خوفناک مضمون شائع کیا تھا جس پر پاکستان کے سرکاری حلقوں میں کہرام مچ گیا تھا۔ میں اسی زمانہ میں لندن گیا اور "پرائیویٹ آئی" سے متعلق بعض قلم کاروں سے میری ملاقات ہوئی تو پتہ چلا اس کا لکھنے والا خیر سے خود ایک پاکستانی ہے۔ بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جریدہ کے ہاتھوں بڑے بڑے نہیں بچ سکے وہی بات ہے کہ۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں!

"پرائیویٹ آئی" شہنشاہ ایران کا بھی بے رحم نقاد رہا ہے اور برسوں انہیں "دی شٹ آف پرشیا" لکھتا رہا ہے۔ ایرانی سفیر نے چارج سنبھالتے ہی پہلی کوشش یہ کی کہ کسی طرح اس کا رویہ بدل جائے اس کے لئے 28 رجون 76ء کو اس نے لندن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے سفارتی خبر نگار مسٹر ڈیوڈ سپینسر کو دوپہر کے کھانے پر بلایا اور "برطانوی پریس میں ایرانی امیج" کے مسئلے پر اس سے بات چیت کی۔

اس پر مسٹر ڈیوڈ نے اسے پریس سے مسلسل رابطہ رکھنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے اسرائیل کی مثال پیش کی جس کے پندرہ بیس نمائندے مستقلاً اسی کام پر مامور ہیں کہ وہ برطانوی پریس کی رائے کو اسرائیل کے حق میں سازگار بناتے رہیں۔ اس بات چیت کے دوران ایران میں شہری آزادیوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ ایرانی سفیر نے حسب معمول انہی دلائل کا سہارا لیا جو تیسری دنیا کے ڈکٹیٹروں اور ان کے ہم نواؤں کے نوک زبان رہتے ہیں اس نے کہا: "ایران کا اصل مسئلہ شہری آزادیاں نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے معاشی مسائل اور ان میں ڈسپلن پیدا کرنا ہے۔ شہنشاہ اپنی رعایا کو قرون وسطیٰ کے عہد سے نکال کر بیسویں صدی کی روشنیوں میں لانے کی کوشش کر رہا ہے اس عمل میں کہیں نہ کہیں زیادتیوں کا ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ ہم ایرانی عوام کو آزادی کا ایسا لائسنس نہیں دے سکتے جو انتشار پر منتج ہو"۔ ٹائمز کا نمائندہ ظاہر ہے ان باتوں سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے کہا: "ایران کو دیانتدار ہونا چاہئے اور اپنا یہ امیج قائم کرنے کے لئے قدم اول کے طور پر اسے سیاسی قیدیوں کی صحیح تعداد کا اعلان کر دینا چاہئے"۔

"پرائیویٹ آئی" کا معاملہ زیر گفتگو آیا تو برطانوی اخبار نویس نے سفیر صاحب کو متنبہ کیا کہ وہ اخبار کو خریدنے کی کوشش ہرگز نہ کریں ورنہ اس کے نتائج اور خراب نکلیں گے سفیر نے لنچ کے بعد اس گفتگو کا خلاصہ ٹیلی گرام کے ذریعے تہران بھجوایا۔

معلوم ہوتا ہے شہنشاہ ایران اس طرح کے تمام تار خود پڑھتے تھے۔ ان کا وزیر خارجہ اس سلسلے میں اپنے سفیروں کو کوئی حتمی رہنمائی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس تار کو بھی شہنشاہ نے ملاحظہ کیا اور یکم جولائی کو سفیر کو اس کا جواب موصول ہو گیا۔ ذرا دیکھئے ایک آمر نے اس مشورے کا کیا اثر قبول کیا۔ شہنشاہ نے لکھا:

> "پریس کا رویہ تبدیل کرنے کے لئے تم جو بھی کر سکتے ہو ضرور کرو لیکن انہیں اس بات کا بھی احساس دلاؤ کہ ایران اپنی سپلائی کے ذرائع بدل سکتا ہے لیکن برطانیہ اپنی مصنوعات کے لئے ایرانی مارکیٹ سے محروم ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا"۔

مسٹر پرویز راجی کے لئے دوسرا اہم مسئلہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا تھا۔ یہ بین الاقوامی تنظیم جو 1960ء سے کام کر رہی ہے اور جس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں ہے 'اپنے ڈیڑھ سو سے زائد ہمہ وقتی

مستعد ملازمین کے ذریعے دنیا بھر میں انسانی بنیادی حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ ایسے لوگ جنہیں سیاسی اختلافات کی بنیاد پر قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے انہیں یہ تنظیم ""ضمیر کے قیدی"" کا نام دیتی ہے اور بین الاقوامی پریس کے ذریعے ان کی رہائی کی مہم چلانے کے علاوہ یہ براہ راست متعلقہ حکومتوں سے بھی اس سلسلے میں خط و کتابت کرتی ہے۔ دنیا بھر میں مختلف ملکوں کے بارے میں اس کی چھپنے والی رپورٹوں کو کافی وزن دیا جاتا ہے۔ شہنشاہ کے دور حکومت میں ایران میں سیاسی تشدد عام تھا اس لئے قدرتاً ایمنسٹی اس صورتحال کے خلاف دوسرے ملکوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی سرگرم عمل تھی۔

مسٹر پرویز راجی کا خیال تھا کہ ایمنسٹی کے لوگوں سے رابطہ پیدا کر کے اس کی مخالفت کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اب تک اس کا ذریعہ معلومات ایران کے وہ سیاسی کارکن ہیں جو شہنشاہ کی حکومت کے مخالف ہیں وہ تو جو اطلاعات بھی بہم پہنچائیں گے ظاہر ہے ان سے شہنشاہ کی بدنامی مقصود ہو گی اس کے مقابلے میں اگر حکومت خود ایمنسٹی سے رابطہ پیدا کر کے اسے صحیح صورتحال سے آگاہ کرتی رہے تو مخالفانہ پروپیگنڈے کی شدت میں خاصی کمی ہو سکتی ہے۔

جلد ہی ایرانی سفیر کو براہ راست شہنشاہ کی خدمت میں اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے شہنشاہ سے ایک خصوصی انٹرویو کی درخواست کی تھی وہ ان دنوں کیپیئن (سمندر) کے کنارے اپنی گرما کی رہائش گاہ نوشہر میں تشریف فرما تھے۔ یہ 19 ر جولائی 76ء کی بات ہے جب سفیر ان کے حضور باریاب ہوا وہ کمرہ ملاقات میں داخل ہوا تو پہلے شہنشاہ کا کتا اس پر بھونکا اور لپکا مگر شہنشاہ کا حکم سن کر وہ خاموش ہو گیا اور چمڑے کی آرام کرسی کے قریب آکر نگہبانی کے انداز میں بیٹھ گیا۔ سفیر تعظیم کے لئے جھکا اور شہنشاہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ شہنشاہ گفتگو کے دوران ٹہلتا رہا اور سفیر بے چارے کو ہر آن یہ خیال رکھنا پڑا کہ کہیں بے خیالی میں (اس کی پشت تو ایک طرف رہی) پورا چہرہ سامنے کے بجائے اس کا سائیڈ پوز شہنشاہ کے سامنے نہ آجائے اس کے لئے اسے جو مشقت برداشت کرنی پڑی ہو گی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بات چیت کچھ اس طرح شروع ہوئی:

""سفیر:۔ میں نے یہ شرف حضوری اس لئے حاصل کیا تاکہ مجھے بعض مسائل پر ہز امپیریل میجسٹی کی سوچ سے آگاہی کا اعزاز مل سکے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر دو معاملات میں ہدایات کا طلب گار ہوں پہلا معاملہ ""پرائیویٹ آئی"" کا ہے۔ ہر جمعرات کو جب یہ اخبار شائع ہوتا ہے مجھے اس میں ایران کے متعلق تحریریں پڑھ کر غصے کا سخت دورہ پڑتا ہے۔

شہنشاہ:۔ (سفیر کی بات کاٹتے ہوئے) مجھے اس کا اندازہ ہے کہ ہر محب وطن ایرانی کو اسے پڑھ کر اپنی توہین کا ضرور احساس ہوتا ہو گا۔

سفیر:۔ کیا شہنشاہ اس بات کی اجازت مرحمت فرمائیں گے اگر کچھ قابل اعتماد

دوست اس کے ادارہ سے کسی تیسری جگہ میری ملاقات کاایسا انتظام کر دیں جو بالکل اتفاقیہ اور حادثاتی نظر آئے اس ملاقات سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ ان کے رویے میں کوئی فوری تبدیلی رونما ہو جائے گی یا وہ اچانک ہماری تعریف کرنے لگیں گے البتہ اس سے ان کے لہجے میں نمایاں فرق واقع ہو سکتا ہے اور آخر کار وہ ہزامپیریل میجسٹی کے بارے میں جارحیت ختم کرنے پر بھی آمادہ ہو سکتے ہیں اور میں یہ عرض بھی کرنا چاہتا ہوں کہ انہیں خریدنے کی کوشش تباہ کن ہو گی کیونکہ یہ لوگ بعض اصولوں کے پابند ہیں۔

اس پر شہنشاہ غضبناک ہو گئے اور انہوں نے غصیلی نظروں سے سفیر کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اصول؟ کون سے اصول؟ یہ لوگ تو ہمیں اس لئے بھی معاف نہیں کرتے کہ ہم ان کے "کنکارڈ" خریدنے کے لئے تیار نہیں"۔

اب کمرے میں خاموشی چھا گئی، شہنشاہ برافروختگی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلتے رہے یہاں تک کہ کچھ وقت کے بعد سفیر کو دوبارہ لب کشائی کی ہمت ہوئی مگر اب کے اس کا موضوع سخن "پرائیویٹ آئی" کے بجائے "ایمنسٹی انٹرنیشنل" تھا اُس نے عرض کیا:

"سفیر:۔ میں ہزامپیریل میجسٹی کی اجازت سے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے موضوع پر بھی کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک کی ہدایات یہ ہیں کہ اس تنظیم سے تحریری یا زبانی کسی طرح کا کوئی رابطہ قائم نہ کیا جائے مگر اس کا نقصان یہ ہے کہ ایمنسٹی کو ایران کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے ایران کے سیاسی مخالفین پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں "ساوک" کے سربراہ مسٹر پرویز سے بھی بات کی ہے اور ہم دونوں کی یہ رائے ہے (جو ظاہر ہے ہزامپیریل میجسٹی کی منظوری کی محتاج ہے) کہ ہم ایمنسٹی کے بعض حکام کو اس بات کی اجازت دے دیں کہ وہ بعض صورتوں میں اپنی ذاتی حیثیت میں (نہ کہ تنظیم کے نمائندوں کی حیثیت سے) ایران آکر قیدیوں کو دیکھ سکتے ہیں"۔

شہنشاہ:۔ اگر ہم نے دروازہ کھول دیا تو ان کے مطالبات بڑھتے جائیں گے۔

سفیر:۔ ہم ایمنسٹی کے لئے وہی کچھ کریں گے جو ہم نے نیویارک ٹائمز کے رپورٹر مسٹر ایرک پیس کے لئے کیا تھا (ایرک پیس کو ایرانی قیدیوں سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی اور اس سلسلے میں بعد میں اس نے اپنے اخبار کے لئے ایک مضمون بھی لکھا تھا)۔

شہنشاہ: ۔ مگر اس شخص کو اجازت دینے کا بھی کون سا اچھا نتیجہ نکلا؟۔

اب پھر خاموشی چھا گئی یہاں تک کہ شہنشاہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ملاقاتی اسے چوم کر کمرے سے باہر نکل جائے۔

سفیر لکھتا ہے کہ بعد میں تہران جاتے ہوئے دوران پرواز میرا ضمیر برابر مجھے اپنی خوشامدانہ ذہنیت پر ملامت کرتا رہا۔

(22 ر مارچ 1984ء)

ایک سفیر کی یادداشتیں
(2)

شہنشاہ کے دور میں ایران میں بنیادی حقوق کی جو مٹی پلید ہو رہی تھی اس کی وجہ سے لندن میں ایران کا "امیج" بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ سفیر بے چارے کی کوشش تھی کہ کسی طرح برطانوی ذرائع ابلاغ اور دوسرے رائے ساز اداروں سے اس کا ذاتی رابطہ قائم ہو جائے تاکہ وہ ان پر اثر انداز ہو کر ایران کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کی شدت میں کچھ نہ کچھ کمی پیدا کر سکے مگر شہنشاہ کی انا اور ضد نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی ایسی تمام تجویزیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئیں۔

آخر کار سفیر کو اپنے نقطہ نظر کی تائید کے لئے ایک اور ہمنوا بھی مل گیا۔ یہ فریدون ہویدا تھے جو ایرانی وزیراعظم کے بھائی اور اقوام متحدہ میں ایران کے سفیر تھے (فریدون نے شہنشاہ کے زوال پر ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھی ہے) 31ر دسمبر 76ء کو ایرانی سفیر متعینہ لندن مسٹر پرویز راجی کو نیویارک میں مسٹر فریدون سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ اس سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے۔ معلوم ہوتا ہے ایران میں انسانی حقوق کی پامالی پر نیویارک میں انہیں لندن سے بھی کہیں زیادہ تنقید و تعریض کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

دونوں صاحبان...... آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں' کے مصداق ایک دوسرے کے ہم خیال نکلے، مسٹر فریدون نے بتایا کہ وہ جلد شاہ سے ملنے والے ہیں اس پر دونوں کے درمیان وہ نکات گفتگو طے پائے جو مسٹر فریدون کو شاہ کی ملاقات کے دوران اٹھانے تھے۔ ان میں سے پہلا نکتہ یہ تھا کہ مغربی پریس کا مقابلہ کرنے کی کوشش ترک کر دینی چاہئے اس میں ایران فتح حاصل نہیں کر سکتا یہ ایک ایسا مستحکم ادارہ ہے

جو بہر حال قائم رہے گا اس لئے اس کا احترام کرنا چاہئے اور دوسرا یہ کہ ایران کے خراب امیج کی بنیادی وجہ سیاسی قیدیوں پر تشدد اور اذیت رسانی ہے۔ یہ طریق کار فی الفور بند کر دینا چاہئے۔ 17ر جنوری کو شہنشاہ سے تہران میں ملاقات کرنے کے بعد مسٹر فریدون لندن پہنچے اور انہوں نے مسٹر پرویز راجی کو روداد گفتگو سنائی تو یہ نکتے اس میں سرے سے ندارد تھے۔ وہی بات ہوئی کہ۔

کہتے ہیں کہ یوں کہتے، یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس کے برعکس مسٹر فریدون شہنشاہ کے یہ احکام لے کر واپس لوٹے کہ تہران پریس کے ذریعے ایمنسٹی انٹرنیشنل پر بھرپور جوابی حملہ کیا جائے اور لندن سے بھی اسی طرح کی ایک مہم شروع کی جائے اس پر ایرانی سفیر اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:۔

"ایمنسٹی کے خلاف مہم؟ کیا ہی مہمل بات ہے ہم تو اس کے برعکس مشورہ دے رہے تھے کہ اس ادارے سے براہ راست رابطہ پیدا کر کے اس کے ساتھ مذاکرات شروع کئے جائیں، معلوم ہوتا ہے شہنشاہ سے ملاقات کے دوران مسٹر فریدون کے اعصاب جواب دے گئے تھے اس لئے وہ طے شدہ نکات نہیں اٹھا سکے مگر میں اس کے لئے انہیں کوئی الزام نہیں دیتا، اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کچھ کرتا، حکومت ایران کے ایک ملازم کے لئے اصل فیصلہ کن چیز نہ کامن سینس ہے نہ حُبِ وطن وہ تو صرف خوف کے تحت کام کر رہا ہے کتنی توہین آمیز اور پریشان کن ہے صورتحال"۔

اور ایرانی سفیر نے یہ بات غلط نہیں لکھی تھی، مسٹر فریدون کی طرح شہنشاہ کی رضا اور ناراضگی کے بالمقابل اس کے اعصاب بھی جواب دے گئے تھے، اس کے کسی تار پر شہنشاہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتا تو اس کے دل میں جل ترنگ سے بج اٹھتے وہ کسی بات پر اختلاف کر دیتا تو سفیر کو اپنی ملازمت کے لالے پڑ جاتے۔ ایک جگہ روزنامچے میں لکھتا ہے:

"سفارتخانے کا ایک کلرک مسٹر شمس تہران سے آنے والے ٹیلی گراموں کی فائل اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے آتے ہی کہا "سر مبارک ہو شہنشاہ نے ایمنسٹی کی رپورٹ پر ہمارے جواب کو پسند کیا ہے" میں اطمینان کی ایک گہری سانس لیتا ہوں اتنے میں میرے نمبر دو مسٹر مشکین پوش دوسرے سٹاف کے لوگوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہو کر مبارکباد دیتے ہیں کافی دیر یہ اندازہ لگایا جاتا رہا کہ ہمارے جواب کا کون سا پیراگراف شہنشاہ کو زیادہ پسند آیا ہو گا"۔

ایک طرف شہنشاہ کی طرف سے پسندیدگی کے اظہار پر پورے سفارتخانے میں جشن عید کا سماں ہے

دوسری طرف بے چارہ سفیر یہ سوچ کر اندر ہی اندر ترساں اور لرزاں بھی ہے کہ:

"جہاں مجھے شہنشاہ سے سفارتی مراسلت میں اپنی قابلیت پر پوری طرح اعتماد ہے وہیں مجھے یہ فکر بھی لاحق ہے کہ خدا جانے تمام تر حسن نیت سے لکھی جانے والی میری کسی بات کا کوئی بھی حصہ کب شہنشاہ کو ناگوار گزرے اور وہ مجھے سفارت ہی سے برطرف کر دے اگر ایسا ہوا تو یہ میرے کیریئر کا بڑا خوفناک انجام ہوگا"۔

اور شہنشاہ کا غصہ تو بات بے بات بھڑک ہی اٹھتا تھا چنانچہ ایک ایسے ہی معمولی واقعہ پر اس کا ردعمل غریب سفیر کے لئے بے حد تکلیف اور تشویش کا باعث بن گیا' ہوا یوں کہ سفیر نے سابق برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایڈورڈ ہیتھ کو ایک دن اپنے ہاں لنچ پر بلایا وہاں اس کی میز پر شہنشاہ کے بارے میں لکھی جانے والی ایک تازہ ترین کتاب رکھی تھی جو مارگریٹ لینگ کا نتیجۂ قلم تھی۔ سفیر نے ابھی اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا مگر "اسپیکیٹٹر" کے ایک تفصیلی تبصرہ سے اسے اس کے مندرجات کا اندازہ تھا۔ مسٹر ہیتھ نے کتاب کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ نوے فیصد تو ایران کی تائید و تعریف میں ہے لیکن جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا ذکر آتا ہے وہاں مصنفہ نے ہم پر تنقید بھی کی ہے' ایڈورڈ ہیتھ کے جانے کے بعد سفیر نے حسب معمول ایک ٹیلی گرام کے ذریعے مسٹر ہیتھ سے ہونے والی اس گفتگو کا خلاصہ تہران بھیج دیا چار دن کے بعد شہنشاہ کی طرف سے اس پر ایک غضبناک تار موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ سفیر کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے اب تک یہ کتاب نہیں پڑھی جو ایک غلط اور مہمل کتاب ہے رہا اس کتاب پر "اسپیکیٹٹر" میں ہونے والا تبصرہ تو اس میں مبصر نے میری اصلاحات کو درمیانہ درجے کی اصلاحات قرار دیا ہے اگر سفیر اس تبصرے کو سراہتا ہے تو اسے میرے سترہ نکاتی انقلابی اصلاحی پروگرام کے بارے میں ایک ریفریشر کورس کی ضرورت ہے۔

یہ تار پڑھ کر سفیر کی جو حالت ہو سکتی تھی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس نے فوراً اپنے نمبر دو افسر مسٹر مشکین پوش کو بلایا اور اسے شہنشاہ کا یہ تار دکھا کر اس کی رائے چاہی' مسٹر مشکین پوش کا کہنا تھا کہ ابھی شہنشاہ غصے میں ہے جب تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اسے کوئی جواب نہیں بھیجنا چاہئے سفیر بہت مضطرب تھا آخر دونوں نے مل کر تار کا یہ جواب تیار کیا:

"الف...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایک ایسی کتاب پر اظہار خیال کیا جو میں نے نہیں پڑھی تھی میں نے احمقانہ طور پر یہ فرض کیا تھا............ کہ چونکہ کتاب امپیریل کورٹ کے اشارہ و ایماء پر لکھی گئی ہے اور اس کا مسودہ چھپنے سے پہلے مصنفہ نے تہران بھجوایا تھا اس لئے اسے لازماً حکومت ایران کی منظوری حاصل ہو گی۔

ب...... جہاں تک تبصرے کا تعلق ہے اس میں شہنشاہ کی اصلاحات کو درمیانہ درجے کی اصلاحات کہنا تو یقیناً مبصر کی جہالت ہے مگر اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ

شہنشاہ کی شخصیت کسی بھی معیار کے اعتبار سے اس صدی کی ایک کامیاب شخصیت ہے اور یہ کہ شہنشاہ نے اپنے عوام کو خوشحال اور عزت کے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ آج سے دو عشرے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ج...... آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس تصور سے بے حد اذیت اور صدمہ ہے کہ میری کسی بات پر شہنشاہ خفا ہیں' یہ خیال میرے ذہن اور ضمیر پر ایک بھاری بوجھ بنا رہے گا"۔

کتاب میں اس کا ذکر نہیں کہ سفیر کے اس معافی نامہ کا شہنشاہ نے کیا جواب دیا مگر اس ایک واقعہ سے شہنشاہ کے انداز حکمرانی اور اس کے سفیروں کی معذوریوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے' اف رے مجبوریاں ملازم کی!۔

77ء کے وسط میں مسٹر پرویز راجی کی سفارت کا پہلا سال مکمل ہو گیا تھا اور اب یہ دوسرا سال حکومت ایران کی مشکلات کا آغاز لے کر شروع ہوا تھا۔ اندرون ملک بے چینی بڑھنے لگی تھی اور بیرونی دنیا میں جلاوطن ایرانی رہنماؤں اور مغربی اخبار نویسوں کی طرف سے ایران میں بنیادی حقوق کی خلاف ورزی پر سخت تنقید ہو رہی تھی ایسے میں ایک مرتبہ پھر مسٹر پرویز راجی کو یہ شوق چرایا کہ وہ شہنشاہ کو اپنے قیام لندن کے ایک سالہ تجربے کی روشنی میں بعض مشوروں پر مشتمل ایک جامع پیپر پیش کریں۔ سفیر کے نمبر دو نے اسے اس شوق فضول سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانا اس نے ایک پیپر تیار کیا اور اسے خود ہی شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے تہران چل کھڑا ہوا' اس سلسلے میں اس سے پہلے اس نے ایرانی وزیر اعظم مسٹر ہویدا کے ایک معاون خصوصی مسٹر صفا سے بھی بات کی تھی کہ اگر میں اس طرح کا کوئی مشورہ وزیر اعظم کی معرفت شہنشاہ کے ملاحظہ کے لئے بھجواؤں تو کیسا رہے گا؟ مسٹر صفا نے اس پر اسے اپنی آپ بیتی سنائی۔ اس نے کہا مجھے ایک مرتبہ مسٹر ہویدا نے ہدایت کی کہ میں ایران کی (واحد سیاسی) پارٹی رست خیز میں نوجوان نسل کی بھرپور شمولیت کے بارے میں اسے ایک میمورنڈم تیار کر کے دوں' میں نے اس کام پر بڑی محنت کی اور تیس صفحات پر مشتمل یہ میمورنڈم تیار کر دیا اور ایک دن میں نے خوشی خوشی اسے وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مسٹر ہویدا نے اسے دیکھ کر پوچھا "یہ کیا ہے" میں نے کہا "سر! یہ وہ میمورنڈم ہے جو آپ نے رست خیز میں ایرانی نوجوانوں کی شمولیت کے بارے میں تیار کرنے کے لئے کہا تھا" "مگر اتنا ضخیم؟ جن احمقوں نے بھی اسے مرتب کیا ہے ان سے کہو مجھے اتنے لمبے چوڑے مقالے کی ضرورت نہیں' میرے لئے اس کا آدھے صفحے کا ایک خلاصہ کافی ہو گا۔ احمق کہیں کے"۔ یہ مسٹر ہویدا کا جواب تھا۔ مگر سفیر اپنی دھن کا پکا تھا اس نے پیپر تیار کیا اور شہنشاہ کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کرنے تہران جا پہنچا۔ تہران ان دنوں جن واقعات اور افواہوں کی زد میں تھا' اپنی یادداشتوں میں سفیر نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ خود ایرانی وزیر اعظم نے اسے بتایا کہ شہنشاہ کی عائلی زندگی

سخت ناہمواریوں اور اضطرابات کی شکار ہے ملکہ فرح کی طرف سے کوئی کاغذ موصول ہوتا ہے تو شاہ کا حکم ہے کہ اگر وہ امور خانہ داری کو چھوڑ کر کسی اور مسئلے سے متعلق ہو تو اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ یہیں اسے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ اپنے خاندانی جھگڑوں اور شہزادی اشرف اور ملکہ فرح کی باہمی رقابتوں سے اتنا افسردہ رہنے لگا ہے کہ اب وہ ہفتے میں تین دن اپنے ایک یار غار کے گھر جا کر اپنا غم غلط کرنے کے لئے افیم کا نشہ کرنے لگا ہے۔ مسٹر ہویدا نے پیپر کے بارے میں اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ اسے اپنی آراء اور تجویز کا نام دینے کے بجائے یہ کہہ کر حضور شاہ میں پیش کرے کہ یہ لندن کے ماہرین تعلقات عامہ کے خیالات کا نچوڑ ہے۔ آخر ملاقات کا دن آ پہنچا' شہنشاہ کیسپئن ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سفیر کمرے میں داخل ہوا کمرہ ملاقات میں ایک سدھایا ہوا بڑا کتا خموشی سے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا ایک اور چھوٹا کتا ادھر ادھر دوڑ رہا تھا' رکوع میں جھکنے اور شہنشاہ کے ہاتھ پر بوسہ دینے کے بعد شہنشاہ اور سفیر میں بات چیت شروع ہوئی۔

شہنشاہ...... (کمرے میں ٹہلتے ہوئے) ان رپورٹوں کے علاوہ جو ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں اور کون سی نئی باتیں ہمیں بتانا چاہتے ہو' (قبل اس کے کہ سفیر جواب دے شہنشاہ کہتا ہے) میری سمجھ میں نہیں آتا برطانیہ ہماری اندھی مخالفت کیوں کر رہا ہے؟ کیا تم نے حال ہی میں "ٹائمز" میں ایران کے بارے میں آرٹیکل دیکھا ہے؟ ایسی باتیں کرنے سے برطانوی حکومت کون سا مفاد حاصل کرنا چاہتی ہے؟

سفیر...... ہمارے تعلقات حکومت اور تجارتی حلقوں سے تو بہت اچھے ہیں مگر پریس ہمارا مخالف ہے۔

شہنشاہ...... برطانوی جمہوریت باہر نہیں چل سکتی۔ یہ فرانس تک میں کامیاب نہیں رہی' ہم نے ایران میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ انگلینڈ' سویڈن اور فرانس سے بھی زیادہ ترقی پسندانہ ہیں۔ برطانوی نظام تو ایک زوال پذیر نظام ہے۔

سفیر...... (گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے) مجھے معلوم ہوا ہے کہ برطانوی سفیر متعینہ ایران مسٹر ٹونی پارسنز کو واشنگٹن میں سفیر مقرر کیا جا رہا ہے۔

شہنشاہ...... (خوشی اور حیرت سے) ایران برطانیہ کے لئے اہم ترین ملک ہے۔

سفیر...... (یہ جان کر کہ لوہا گرم ہے اور شہنشاہ اچھے موڈ میں ہے) لندن کے بعض ماہرین تعلقات عامہ کے مشوروں کی روشنی میں میں نے ایک میمورنڈم تیار کیا ہے۔

شہنشاہ...... (قبل اس کے کہ سفیر اپنے میمورنڈم کے اہم نکات بیان کرے) یہ میمورنڈم میرے پرنسپل سیکرٹری یا مسٹر ہویدا کو دے دیا جائے۔

سفیر...... میرا یہ میمورنڈم صرف دس صفحات پر مشتمل ہے اور میں شہنشاہ سے اس کے مطالعہ کی خصوصی درخواست کروں گا۔

شہنشاہ...... یہ میمورنڈم میرے پرنسپل سیکرٹری یا مسٹر ہویدا کو دے دیا جائے۔

سفیر...... (یہ جانتے ہوئے کہ اس صورت میں یہ کبھی شہنشاہ کی نظر سے نہیں گزرے گا کوشش کرتا ہے کہ اس کے بعض اہم نکتے شہنشاہ کے سامنے لے آئے دوران گفتگو ایک نازک اور حساس مسئلہ چھیڑنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے اور برطانوی ٹیلی ویژن پر شہنشاہ کے ایک حالیہ انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے) مجھے امید ہے کہ شہنشاہ میری اس جسارت کو معاف کریں گے اگر میں یہ عرض کروں کہ میڈیا پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہمیں تھوڑی سی ٹیکنیک ملحوظ رکھنی ہوگی اگر ہم اپنے انگریز ناظرین اور سامعین کے سامنے یہ کہیں کہ اہل برطانیہ ست اور کاہل ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں پہلا سا نظم و ضبط کھو دیا ہے تو اس سے ہم ان کی ہمدردیاں کھو بیٹھیں گے۔ تنقید کے بجائے تعریف زیادہ اچھی طرح قبول کی جاتی ہے۔

شہنشاہ...... (غضب ناک ہو کر) تعریف؟ میں ان کی تعریف کروں؟ تعریف تو تم لوگ کرو، ان کی عظمتوں کے ترانے تو تم لوگ گاؤ کہ سفیروں کا کام ہی یہی ہے اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ملاقات ختم ہو جاتی ہے۔ شہنشاہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے اور سفیر اسے چوم کر کمرہ ملاقات سے باہر نکل آتا ہے۔

ایرانی سفیر کی یہ یادداشتیں ہرچند کہ اس کے اپنے ملک کے نظام حکمرانی کا آئینہ ہیں مگر بین السطور اس میں تیسری دنیا کی ہر حکومت کے عروج و زوال کا عکس نظر آتا ہے۔ جب حکمران اقتدار کی کرسی پر متمکن ہوتا ہے تو بدقسمتی سے اسے اچھی اور سچی باتیں کڑوی لگتی ہیں وہ اظہار اختلاف کی معمولی سی جسارت پر بھڑک اٹھتا ہے وہ سمجھتا ہے میں اپنے عوام کو پابجولاں کر کے اور ان کی زبانوں پر پہرے بٹھا کر تا زیست حکومت کر سکتا ہوں لیکن فطرت کی تعزیریں بڑی سخت ہیں قانون قدرت اندر ہی اندر کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن "انا ولا غیری" کا ڈنکا بجانے والے حکمران کا تخت الٹ دیا جاتا ہے۔ میں نے 75ء میں ایک شعر کہا تھا اور آج کا کالم اسی پر ختم کر رہا ہوں کہ۔

وفور نشۂ طاقت میں جھومنے والو!
مری نظر میں ہیں تاریخ کے عروج و زوال

(3 مارچ 1984ء)

پیرزادہ صاحب کا کارنامہ

ارباب اختیار میں سے کسی کے تخلیقی کام کو سراہنا خاصے دل گردے کا کام ہے۔ خیر اول تو اس طبقے میں کم ہی ایسے افراد ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے واقعی کسی ایسی صلاحیت سے مالا مال کیا ہو لیکن الّا ماشاءاللہ اگر روایت کے خلاف ان میں کوئی ایسا شخص نکل بھی آئے اور آپ اس کی کسی شعری یا نثری یا علمی اور تحقیقی خدمت کی داد دینے بیٹھ جائیں تو عام طور پر لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپ کرسی کی وجہ سے تعریف کر رہے ہیں۔ جنرل عارف کا مجموعہ کلام "گرد سفر" شائع ہوا تو اس کی ایک جلد ازراہ کرم انہوں نے مجھے بھی بھجوا دی تھی۔ شعر و سخن کے اس ذوق بلند کی توقع کم از کم مجھے کسی فوجی جرنیل سے نہ تھی۔ جی چاہا کہ اس پر ایک کالم میں بھی لکھ ڈالوں مگر مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ اتنی اخلاقی جرأت مجھ میں نہ تھی کہ "خوفِ فسادِ خلق" کی سطح سے اوپر اٹھ سکتا۔ اسی طرح کی صورتحال سے اب پھر دوچار ہوں۔ پاکستان کے لائق وزیر قانون سید شریف الدین پیرزادہ نے اپنی تازہ ترین تالیف "دی کلیکٹڈ ورکس آف قائدِاعظم" (جلد اول) اپنے دستخطوں سے مزین کر کے مجھے ارسال کی ہے اور میں "خامہ بدنداں" اس گومگو میں ہوں کہ تالیف اور مؤلف کے بارے میں کچھ لکھوں یا نہ لکھوں۔ آخر یہ سوچ کر کہ پیرزادہ صاحب اب حکومت پاکستان میں چند ماہ کے مہمان ہیں اور عنقریب جدہ جانے والے ہیں میں نے قلم اٹھانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ مصلحت کی وجہ سے کسی فاضل روزگار کی کوشش و کاوش کو نظرانداز کر دینا نامناسب ہی نہیں ناانصافی بھی ہے۔

پیرزادہ صاحب سے میرا قریبی تعارف و تعلق 65ء سے ہے جب وہ پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ 66ء میں حکومت پاکستان نے جو حج وفد بھجوایا تھا اس کے قائد پیرزادہ صاحب تھے اور اسلامک ریسرچ

انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن، مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی کے ممبر مسٹر پیر الدین احمد اور میں اس کے رکن تھے۔ اس زمانے میں کم و بیش ایک ماہ ہم رات دن ایک ساتھ رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد ہے کہ کسی آدمی کو جانچنے کے لئے اس کے ساتھ طویل سفر کرنا ضروری ہے۔ سو اس طویل سفر میں میں نے پیرزادہ صاحب کو ہر طرح جانچنے پرکھنے کی کوشش کی اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے انہیں ایک سچا مسلمان، اچھا انسان، اول و آخر پاکستانی، ایک بہترین وکیل اور ایک اعلیٰ درجے کا محقق اور مدبر پایا۔ شاہ فیصل شہید سے ملاقات میں انہوں نے پاکستان کا کیس جس خوبصورت انداز میں پیش کیا یہ انہی کا حصہ تھا۔ سعودی پریس کے نمائندوں کو انہوں نے جو انٹرویو دیئے وہ انہیں ایک منجھا ہوا اور پختہ کار سیاستدان ثابت کرنے کے لئے کافی تھے۔ منیٰ کی دعوت میں انہوں نے جو تقریر کی اس کے پیرائے سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دلائل کی ایک جوئے رواں دھیرے دھیرے بہتے ہوئے سامعین کو اپنے ساتھ بہالئے جا رہی ہے۔ یہی انداز بعد میں ان کا سپریم کورٹ کے ایک کیس میں دیکھا۔ عدالت میں بطور وکیل بحث کرتے ہوئے میں نے اس روز انہیں پہلی دفعہ سنا تھا۔ جس وقار، متانت اور اعتماد سے انہوں نے عدالت کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور جس شستگی اور شائستگی سے انہوں نے فریق مخالف کے دلائل کا جائزہ لیا اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے جیسے محمد علی جناح بطور وکیل اپنے کیس کی پیروی کر رہے تھے۔ زیر نظر کتاب میں جس کا تعارف آگے چل کر کراؤں گا بمبئی کورٹ میں "تلک" کے کیس کے دوران قائداعظمؒ کی جو تقریر شامل کی گئی ہے اُس کا انداز ہو بہو ہی ہے جو اس دن سید شریف الدین پیرزادہ کی بحث کا تھا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں نے حرمین شریفین میں انہیں خشیتِ الٰہی سے ترساں و لرزاں پایا۔ مراسم حج کی ادائیگی میں انہوں نے ذرا سی کاہلی اور تن آسانی بھی روا نہیں رکھی۔ یہ ساری خوبیاں زبان پر بے اختیار یہ شعر جاری کرنے کے لئے کافی تھیں۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

اور یہی ہوا اس کے بعد سے جو پیرزادہ صاحب سے قلبی رابطہ قائم ہوا ہے تو حالات کے تمام نشیب و فراز کے باوجود اس میں کبھی کمی نہیں آئی۔

میں نے سطور بالا میں پیرزادہ صاحب کے اول و آخر پاکستانی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یوں تو اس دعویٰ کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ 41ء سے 44ء تک قائداعظمؒ مرحوم کے آنریری سیکرٹری رہ چکے ہیں، 45ء سے 47ء تک وہ بمبئی سٹی مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ جنرل الیکشن کے لئے بمبئی پراونشل مسلم لیگ نے جو پبلسٹی کمیٹی بنائی تھی وہ 45ء اور 46ء میں اس کے چیئرمین تھے مگر یہ ایک واقعہ جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے اس کے لئے فیصلہ کن سند فراہم کر دے گا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ پیرزادہ صاحب کو ان کی غیر حاضری میں یو این نے اپنی "ہیومن رائٹس سب کمیٹی آن مائنارٹیز" کا چیئرمین منتخب کیا تو کالعدم

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں انہوں نے اس کے اجلاس میں جانے کی اجازت طلب کی مگر حکومت وقت نے اپنی کسی سیاسی مصلحت کی وجہ سے انہیں اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر پیرزادہ صاحب نے عدالت کا دروازہ تو کھٹکھٹایا یو این کے سیکرٹری جنرل کو کچھ نہیں لکھا۔ دریں اثناء سیکرٹری جنرل نے اپنے ایک پیغام کے ذریعے پیرزادہ صاحب سے کہلایا کہ اگر وہ اپنی طرف سے اس سلسلے میں کوئی دو سطری تحریر بھجوا دیں تو اس کی بنیاد پر یو این حکومت پاکستان کو ناقابل فراموش سبق سکھا سکے گی مگر پیرزادہ صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے ملک کے خلاف کسی بیرونی فورم میں آواز اٹھانا حب وطن کے تقاضوں کے منافی سمجھتا ہوں۔ قصہ مختصر زمین بر سر زمین۔ جو ہو گا یہیں ہو گا اس وقت کے "اقتدار اعلیٰ" کو انٹیلی جنس نے اس نامہ و پیام کی اطلاع دی تو وہ بھی پیرزادہ صاحب کی شرافت اور جذبۂ حُبِ وطن کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گیا اور پیرزادہ صاحب کو بیرونِ ملک جانے کی اجازت مل گئی۔

پیرزادہ صاحب کو قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے جیسا کہ بتایا جا چکا وہ بمبئی مسلم لیگ کے ایک ممتاز رہنما اور قائداعظمؒ کے اعزازی سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ اس حیثیت سے قدرتاً وہ ان تمام مراحل سے واقف ہیں جو ملت کو قیام پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے دوران پیش آئے پھر مبداءِ فیاض نے انہیں جس طرح ایک اعلیٰ ذوق تحقیق سے نوازا ہے اور ایک بہترین قانون دان کی صلاحیتوں سے مالامال کیا ہے اس کی وجہ سے وہ اس سفر کے ہر موڑ کی نشاندہی کرنے کے لئے تاریخی دستاویزات اور مستند شواہد کے انبار لگا دینے کے عادی ہیں۔ پیش نظر تالیف اس سلسلے کی پہلی کڑی نہیں وہ اس راستے میں پہلے بھی کئی سنگ میل نصب کر چکے ہیں۔ ان کی کتاب "ای والوشن آف پاکستان" جس کا اردو ترجمہ "پاکستان منزل بہ منزل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کی روشن مثال ہے۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ نکالتے ہوئے قافلۂ آزادی کی ہر اس حرکت کو نہایت چابک دستی سے منضبط کر دیا ہے جس کا تحریک پاکستان سے کچھ بھی تعلق ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس سے کوئی بھی مؤرخ صرف نظر نہیں کر سکتا۔ تحریک پاکستان کی تاریخ کو اس طرح محفوظ کر دینے کے بعد اب انہوں نے بانیٔ پاکستان کے ذہنی سفر کی روداد سمیٹنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جو ایسے ایسے نوادرات پر مشتمل ہے کہ اس سے پہلے بہت کم لوگوں کو ان کی خبر ہو گی۔ قائداعظمؒ کے یہ "کلیکٹڈ ورکس" جن کی پہلی جلد 1906ء سے 1921ء تک کے اخباری بیانات، ان کی اسمبلی کی تقریروں، بمبئی میں ان کے جلسوں کی رودادوں، بعض ہم عصر مشاہیر کے سلسلے میں ان کے تاثرات، ان کی طرف سے بھیجے جانے والے مراسلوں اور پیش ہونے والی قرار دادوں اور ان کی وکیلانہ بحثوں کے بعض شاہکاروں پر مشتمل ہے اس قدر فکر افروز اور بصیرت نواز ہیں کہ انہیں پڑھ کر قاری قائد کی فراست اور سیاست کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔

قائداعظمؒ کے سوانح و افکار پر انگریزی اور اردو میں اب تک جو کچھ چھپا ہے، پورے کا پورا نہیں تو اس کا بہت بڑا حصہ میری نگاہ سے گزر چکا ہے مگر میں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ اس کتاب سے پہلے میں قائد کا وہ

تعارف نہیں رکھتا تھا جو یہ کتاب پڑھنے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مجھے یہ تو معلوم تھا کہ بمبئی میں قائداعظمؒ کی خدمات کے اعتراف میں "جناح ہال" کے نام سے ان کی زندگی ہی میں ان کی یادگار تعمیر کی گئی تھی جو اب تک موجود ہے یہ بھی جانتا تھا کہ مسز سروجنی نائیڈو نے انہیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" قرار دیا تھا مگر مجھے یہ خبر نہ تھی کہ وہ کون سی خدمات تھیں جن کی بنا پر ان کے معاصرین ان کی زندگی میں اس مظاہرۂ عقیدت پر مجبور ہو گئے تھے۔ سیّد صاحب نے نصف اور پون صدی کے پرانے اخبارات کھنگال کر اس داستان کا ایک ایک نقشِ جمیل اس خوبصورتی سے نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ ان تراشوں میں قائداعظمؒ سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ بمبئی کے وہ تمام جلسہ ہائے عام جن کی صدارت انہوں نے کی، وہ خطبے جو انہوں نے ان اجتماعات میں ارشاد فرمائے، ہندوستانی عوام کے بالعموم اور مسلمان عوام کے بالخصوص حقوق کے لئے انہوں نے جس نڈر طریقے سے جدوجہد کی ہر مرحلے پر آواز اٹھائی، انگریز حکام سے ٹکر لی، اس کی ایک ایک تفصیل فلم کی طرح پردۂ قرطاس پر آ جاتی ہے۔ یہ ساری تفصیلات جمع کرنے کے لئے سیّد صاحب نے جو انتھک کوشش کی ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس طرح کی تحقیق و تالیف کا کچھ بھی تجربہ ہے۔ مثال کے طور پر گجراتی اخبار (مورخہ 7 / اکتوبر 1906ء) میں قائداعظمؒ کا وہ خط شائع ہوا تھا جو انہوں نے ٹائمز آف انڈیا کو روانہ کیا تھا مگر اس انگریزی اخبار نے بعض وجوہ کی بنا پر قائد کا یہ خط شائع نہیں کیا تھا بعد میں قائد نے بمبئی کے اخبار گجراتی میں اس خط کو شائع کرایا۔ یہ ایک چند سطری مراسلہ ہے مگر سیّد صاحب نے اس کے حصول کے لئے رات دن ایک کر دیا۔ پہلے تو انہوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ گجراتی اخبار کی فائلیں بمبئی میں کس کے پاس ہیں جب یہ معلوم ہو گیا تو ان کی بیگم دو مرتبہ بمبئی تشریف لے گئیں تاکہ اس مراسلہ کی فوٹو کاپی حاصل کر سکیں۔ مالک کو بھی اندازہ ہو گیا کہ مراسلہ کی بڑی اہمیت ہے وہ نرخ بالا ہی کرتا چلا گیا آخر کار بیگم صاحبہ اسے منہ مانگے داموں پر خریدنے میں کامیاب ہو گئیں اور اب یہ کتاب کی زینت ہے۔ یہ تو صرف ایک نایاب دستاویزی داستان ہے جس کا تذکرہ خود سیّد صاحب نے اپنے مختصر مگر بے حد جامع دیباچہ میں کر دیا ہے ورنہ اس طرح کی دوسری لاتعداد دستاویزات کے حصول کے لئے انہیں زرِ کثیر کے جس صرف اور جانفشانی کے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہو گا اس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

کتاب سے پہلی دفعہ بعض دلچسپ مباحث اور حقائق سامنے آئے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہی تصور کیا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ ایک جدید تعلیم یافتہ وکیل تھے۔ اسلام کے ثقافتی ورثے اور لٹریچر سے انہیں دور کا بھی تعلق نہ تھا مگر اس کتاب میں قائداعظمؒ کی بعض ایسی تقریریں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اسلامی لٹریچر کو زیرِ نظر رکھتے تھے بلکہ اسلامی فقہ کے احکام سے جزئیات کی حد تک آگاہ تھے۔

مثال کے طور پر وہ تقریر ملاحظہ فرمایئے جو قائداعظمؒ نے 17 / مارچ 1911ء کو کلکتہ میں گورنر جنرل کی کونسل میں "وقف علی الاولاد" کے موضوع پر اپنا بل پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمائی تھی۔ اس کی تقریب

یوں پیدا ہوئی کہ پریوی کونسل نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو اولاد کے حق میں اپنی جائیداد وقف کرنے سے روک دیا تھا۔ قائداعظمؒ اسے مسلمانوں کے حقوق کا اتلاف اور ان کے پرسنل لاء میں مداخلت سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس کے ازالے کے لئے یہ بل پیش کیا تھا۔ اپنے بل کی توضیح کرتے ہوئے انہوں نے ایک تو سیّد امیر علی کے نقطہ نظر کا حوالہ دیا (اور اس کتاب کے بعض تراشوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہوں نے سیّد امیر علی کی جملہ تصنیفات کا مطالعہ کیا تھا) اور دوسرے ندوۃ العلماء کے ایک میمورنڈم کا تذکرہ کیا اور اس میں بطور خاص مولانا شبلی نعمانی کے علم و فضل کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس بل میں قائد نے مختلف فقہی مکاتب فکر کے حوالوں سے اسلامی فقہ کی جو تفصیلات پیش کی ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انہیں اسلامی لٹریچر سے بے بہرہ قرار نہیں دے سکتا۔

قائداعظمؒ نے شروع شروع میں ہندو مسلم یکجہتی کے لئے جس بھرپور طریقے سے کام کیا ہے۔ کتاب سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے جب گاندھی جی جنوبی افریقہ میں تحریک چلانے کے بعد اپنی بیوی کستورابائی کے ساتھ ہندوستان واپس لوٹے تو 14ر جنوری 1915ء کو ان کے اعزاز میں قائداعظمؒ کے زیر صدارت ایک گارڈن پارٹی دی گئی۔ اس موقع پر (بمبئی کرانیکل کی رپورٹ کے مطابق) قائداعظمؒ نے "تقریر کرتے ہوئے دونوں میاں بیوی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے کہا:

> "ان دونوں نے اپنی قربانیوں سے سرزمین ہند کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور آج پوری دنیا ان کی وجہ سے ہندوستان اور اس کے باشندوں کے مسائل کی طرف متوجہ ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کستورابائی کی جواں ہمتی کا خاص طور پر ذکر کیا۔ انہوں نے کہا اس خاتون نے جس طرح قدم قدم پر اس تحریک میں اپنے عظیم خاوند کا ساتھ دیا ہے یہاں تک کہ ان کے مشن کے لئے جیل کاٹی ہے وہ دنیا کے کسی بھی ملک کی خواتین کے لئے سرمایۂ افتخار ہے"۔

قائداعظمؒ نے 1919ء تک گاندھی جی کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس دوران انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو بیانات جاری کئے، جلسوں میں تقریریں کیں، دونوں مذاہب کے زعماء کی مشترک کمیٹیاں بنوائیں، اس کتاب کے مندرجات سے ان سب پر روشنی پڑتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ آغاز کار میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادیٔ وطن کی جنگ لڑنا چاہتے تھے مگر بعد میں انہیں جو تلخ تجربات ہوئے اس سے انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی۔

کتاب میں ایک دلچسپ اور قابل غور تقریر وہ بھی ہے جو قائداعظمؒ نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں 26ر جنوری 1912ء کو "سپیشل میرج بل" کے سلسلے میں کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے ایک مسلمان کی غیر مسلم (اور غیر کتابیہ) عورت کے ساتھ اور ایک غیر مسلم مرد کی مسلمان عورت کے ساتھ شادی کی زبردست حمایت اور وکالت کی ہے۔ اس سلسلے میں وراثت وغیرہ کے جو قوانین رکاوٹ بن سکتے

تھے انہوں نے ان سے بچاؤ کے بعض راستے بھی تجویز کیے ہیں۔ ان کی یہ تقریر بہت ابتدائی زمانے کی تقریر ہے کہا نہیں جاسکتا کہ وہ بعد میں بھی اسی نظریئے پر قائم رہے یا انہوں نے اس میں ترمیم کر لی لیکن ان کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے اس تقریر کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

سید صاحب چاہتے تو اپنی اس کتاب کو سرکاری اہتمام سے بھی شائع کرا سکتے تھے۔ اس پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن ان کے کام کرنے کا اسٹائل ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سرکاری پوزیشن سے کبھی کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب بھی ایک پرائیویٹ ادارے نے شائع کی ہے۔ یہ اس سلسلۂ تالیف کی پہلی جلد ہے غالباً کتاب کی دو جلدیں ابھی اور آنے والی ہوں گی۔ خدا کرے کہ سید صاحب کو اپنی مستقبل کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس اہم فرض کی انجام دہی کا بھی موقع مل جائے۔ (واضح رہے کہ سید صاحب پاکستان کی طرف سے اسلامک سیکرٹریٹ کی جنرل سیکرٹری شپ کے امیدوار ہیں اور اپنی وزارت خارجہ کے دوران انہوں نے عرب کاز کے لئے جو خدمات انجام دی تھیں اور خاص طور پر جنرل اسمبلی میں جس کامیابی کے ساتھ انہوں نے یروشلم پر ریزولیشن پیش کیا تھا اس کی وجہ سے عالم اسلام میں انہیں جس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے پیش نظر قوی امید ہے کہ وہ آئندہ چند ماہ میں اپنا یہ نیا منصب سنبھال لیں گے) یہ سلسلہ تالیف مکمل ہو گیا تو قائداعظمؒ کے بارے میں معلومات کا اتنا ذخیرہ جمع ہو جائے گا کہ اس کے بل پر آئندہ کوئی بھی مؤرخ ایک مستند اور مبسوط تذکرہ مرتب کر سکتا ہے۔

(10 / اکتوبر 1984ء)

کچھ پختونوں کے بارے میں

(1)

پختون قوم سے میری دلچسپی ایک قدرتی امر ہے' ایک تو یہ بہادر لوگ پاکستان کا بازوئے شمشیرزن ہیں' دوسرے سچے اور کھرے مسلمان ہیں' تیسرے نیازی ہونے کی حیثیت سے میں خود بھی اس قوم کا حصہ ہوں۔ پختون ماہرین انساب نے اپنے شجرۂ نسب کے سلسلے میں اب تک جو تحقیقات کی ہیں (اگرچہ الف کیرو نے اپنی کتاب "دی پٹھانز" میں اس پر بہت سے قابل غور سوالات اٹھائے ہیں) ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مشہور بادشاہ طالوت کا ایک پوتا تھا جس کا نام "افغانا" تھا یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مسلح افواج کے کمانڈر انچیف تھے۔ افغان قوم انہی کی نسل میں سے ہے۔ بخت نصر کے زمانے میں اس قوم کے افراد میں سے کچھ "غور" (افغانستان) کے پہاڑوں میں آ کر بسے۔ سعودی عرب اور صوبہ سرحد کے قریب "خیبر" کا نام اسی قدر مشترک کی طرف دلالت کرتا ہے' جب حضرت خالدؓ بن ولید نے اسلام قبول کیا (جو افغان روایات کے مطابق مکہ مکرمہ کے قریب جا آباد ہونے والے انہی افغانوں سے تعلق رکھتے تھے) تو انہوں نے ایک خط کے ذریعے "غور" کے عزیزوں کو بھی مشرف بہ اسلام ہونے کی دعوت دی چنانچہ یہاں سے اپنے سردار قیس کی قیادت میں افغانوں کا ایک وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور لشکر اسلام میں شامل ہو کر کفار کے خلاف جہاد میں بھی شریک ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر ان افغانوں کو دعاؤں اور برکتوں سے سرفراز فرمایا اور قیس کو "عبدالرشید" کا اسلامی نام عطا کیا۔ یہ بھی فرمایا کہ چونکہ وہ "ملک" (بادشاہ) طالوت کی نسل

میں سے ہیں اس لئے انہیں بھی "ملک" کہا جائے (یہی وجہ ہے کہ ہر پٹھان قبیلے کا سردار "ملک" کہلاتا ہے) آپ نے پیش گوئی فرمائی کہ ملک عبدالرشید کی آل اولاد میں اللہ تعالیٰ اتنی برکت عطا فرمائے گا کہ وہ تعداد میں تمام دوسرے قبیلوں کو پیچھے چھوڑ جائے گی نیز یہ اپنے معتقدات میں "پختون" (یا پٹھان) کی طرح ٹھوس اور پختہ ہو گی (پختون وہ تختہ ہے جس پر کیلیں ٹھونک کر جہاز بنایا جاتا ہے) کہا جاتا ہے کہ اسی دن سے ملک عبدالرشید کی اولاد کو پختون یا پٹھان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ملک عبدالرشید نے افغانستان واپس آ کر اپنے قبیلے کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اس طرح عہد رسالتؐ ہی میں ان کا قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ ملک عبدالرشید کے تین (اور بعض روایات کے مطابق چار) بیٹے ہوئے۔ ان میں سے دوسرے بیٹے کا نام بتین 'بتنی یا بیت تھا۔ یہ بہت اللہ والے بزرگ تھے اس لئے انہیں "شیخ بیت" کہا جاتا ہے۔ لودھی' سوری اور نیازی انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ شیر شاہ سوری کا مشہور جرنیل ہیبت خان نیازی تھا۔ بابر نے اپنی خود نوشت سوانح "تزک بابری" میں ایک جگہ نیازی قبیلے سے اپنی آویزش کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے جب میں بنوں سے ہوتا ہوا عیسیٰ خیل کے قریب پہنچا جو نیازیوں کا علاقہ تھا تو مجھے پورے کا پورا شہر خالی ملا۔ ایک فرد بشر اس میں موجود نہ تھا ہم نے خیمے لگائے رات کے وقت جشن منایا' داد عیش دے کر سو گئے۔ رات کے پچھلے پہر نیازیوں نے اچانک شب خون مارا اور میری فوج کا بری طرح نقصان ہوا۔

تو اس نیازی قبیلہ سے میرا بھی تعلق ہے اور اس تعلق کے ناطے پٹھانوں پر لکھی جانے والی کتابیں میری دلچسپی کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ الف کیرو کی کتاب کا ذکر گزر چکا' لارڈ رابرٹس کی کتاب "فارٹی ون ایئرز ان انڈیا" میں بھی افغانستان اور پٹھانوں کے بارے میں بہت قیمتی مواد موجود ہے۔ چارلس ملر کی کتاب "خیبر' برٹش انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنٹیئرز" ایک اور اچھی تالیف ہے۔ اس سلسلے میں اسپین کی کتاب "دی وے آف دی پٹھانز" کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں اور اب تو جب سے افغانستان میں روسی فوج داخل ہوئی ہے اور پٹھان اس کے خلاف گوریلا جنگ لڑنے میں مشغول ہیں' مغرب کے اہل قلم پٹھانوں پر بہت توجہ دے رہے ہیں اس طرح کی ایک تازہ ترین کتاب "لارڈز آف دی خیبر" ہے جسے اینڈرے سنگر نے لکھا ہے اور جو ابھی دو چار ماہ پہلے ہی منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں پیش کردہ بعض معلومات اور آرا ایسی ہیں جنہیں جاننا یقیناً قارئین کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔

افغانستان پر روس اور برطانیہ کی تقریباً ڈیڑھ صدی سے نظر ہے اس سارے عرصے میں دونوں طاقتیں اس پر برابر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے کوشاں رہی ہیں۔ برطانیہ اسے اپنے زیر نگین (یا کم سے کم زیر اثر) رکھ کر برصغیر کو روسی تاخت و تاراج سے محفوظ کرنا چاہتا تھا گویا برطانوی ہند اور روس کے درمیان اس وقت کا افغانستان "بفر اسٹیٹ" کا کام دیتا تھا اور روس اس پر قابض ہو کر "گرم پانیوں" تک رسائی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ برطانیہ نے اس سلسلے میں دو مرتبہ افغانستان پر چڑھائی کی پہلی مرتبہ اس کا

منصوبہ یہ تھا کہ وہ ایک پٹھو بادشاہ (شاہ شجاع) کو افغانستان کے تخت پر متمکن کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اسے وقتی طور پر کامیابی بھی ہو گئی لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں افغان اٹھ کھڑے ہوئے اور کابل میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ اور فوج کا وہ حشر ہوا کہ خدا کی پناہ' باقی ماندہ فوج خیبر کے راستے واپس ہندوستان جا رہی تھی کہ افغانوں نے اس کا بھی قلع قمع کر دیا' اس جنگ کے پس منظر اور مابعد کے واقعات پر ایک بہت عمدہ ناول "بی یانڈ آل فرنٹیرز" (بائی ایماڈرومنڈ) ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ جس میں کابل پر برطانوی حملے کی احمقانہ پالیسی کو بہت عمدگی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ پہلی جنگ تھی جو 1842ء میں لڑی گئی۔ دوسری مرتبہ 1878ء میں چڑھائی ہوئی یہ بھی روسی اثر و رسوخ کے نفاذ کو روکنے کے لئے تھی۔ اس کا نتیجہ بھی پہلی جنگ سے مختلف نہیں رہا۔ لارڈ لٹن اس زمانے میں وائسرائے تھے گلیڈ سٹون نے برطانوی پارلیمینٹ میں تقریر کرتے ہوئے اس کے اقدام پر زبردست تنقید کی۔ اس نے کہا:

"ہم نے 1838ء میں افغانستان سے جنگ کر کے غلطی کی تھی مگر غلطی کرنا انسان کی سرشت ہے اور اس لئے یہ غلطی قابل معافی تھی مگر دوسری مرتبہ ہم نے اسی غلط بنیاد پر دوبارہ غلطی کی اور اس کے لئے ظاہر ہے ہمارے پاس کوئی وجہ جواز موجود نہ تھی"۔

"لارڈز آف دی خیبر" میں ان دو بڑی برطانوی جنگوں اور بیچ میں انتقامی کارروائیوں پر مبنی دوسرے حملوں کی بڑی مؤثر تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ مؤلف کتاب کے تعارف میں لکھتا ہے:

"ایک سو چالیس سال قبل برطانیہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا اس کے نتیجے میں امیر دوست محمد خان کو ہٹا کر شاہ شجاع الملک کو تخت پر بٹھایا گیا شاہ شجاع نے دعویٰ کیا کہ برطانوی فوجوں کو بربنائے دوستی اس کا حق دلانے کے لئے (خود افغان عوام نے) دعوت دی تھی اس امداد کے عوض اس نے برطانوی ہند کو افغانستان کے راستے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی تھی"۔

مؤلف لکھتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ روسی فوج افغانستان میں داخل ہو گئی ہے اور ببرک کارمل کا دعویٰ ہے کہ افغان عوام ہی نے روسیوں کو اپنے تحفظ کے لئے کابل میں اپنی فوجیں رکھنے کی دعوت دی ہے۔ وہ روزنامہ "گارڈین" کی ایک رپورٹ نقل کرتا ہے کہ:

"اکتوبر 81ء میں کابل ملٹری اسکول کے ایک پروفیسر کو افغان سیکرٹ پولیس نے طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ تمہارے سکول میں طلبہ "شاہ شجاع ثانی مردہ باد" کے نعرے کیوں لگاتے ہیں اس میں تو درپردہ ببرک کارمل کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے"۔

کتاب کے ایک باب میں پختون قوم کی روایات اور کیریکٹر پر بھی بحث کی گئی ہے مؤلف لکھتا ہے کہ پختون

قوم کے رگ وریشہ میں اسلام کی محبت رچی بسی ہوئی ہے۔ اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہے۔ انگریزوں سے جہاد میں بھی اس کا یہی جذبہ کار فرما تھا اور آج بھی روسی فوج کے بالمقابل اس کی مزاحمت اور کامیاب مزاحمت کا یہی راز ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت اس کی مخصوص قومی روایات ہیں جسے وہ "پختون والی" کا نام دیتی ہے (یعنی پختونوں کا طریقہ) اس طریقے کے مطابق پٹھان اپنی آن کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے کسی کی مجال نہیں کہ اس کے دوست عزیز یا مہمان کی توہین کر سکے اس توہین کا بدلہ لینے کے لئے وہ اپنا سر تک کٹا دے گا۔ جیمز سپین جس کی کتاب "دی وے آف دی پٹھانز" کا ذکر اوپر گزر چکا ہے پٹھانوں کی مہمانداری اور مہمان نوازی کا تذکرہ کرتے ہوئے خود اپنے ساتھ بیتا ہوا ایک واقعہ سناتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں ایک سرحدی قبیلہ کے سردار کا مہمان تھا اس نے مجھے اپنا چغہ دینے پر اصرار کیا یہ گویا عزت کا ایک پہناوا تھا جو مجھے دیا جا رہا تھا۔ میں نے اسے پہن لیا بعد میں مَیں کراچی جانے کے لئے پشاور پہنچا تو یہاں کے قیام کے دوران میں نے محسوس کیا کہ دو آدمی برابر ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس سفر کے کافی عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ اس قبیلہ کے آدمی تھے جو اس چغہ پوشی کی وجہ سے میری حفاظت کرتے ہوئے اپنے سردار کی عزت کا تحفظ کر رہے تھے۔ پختون کیریکٹر پر روشنی ڈالتے ہوئے مؤلف نے "کرنل بسٹر گڈون" کی یہ رائے پیش کی ہے جو کرنل موصوف نے سرحد کی بیس سالہ جنگوں اور وہاں اپنے قیام کے نتیجے میں قائم کی تھی کہ:

> "پختونوں سے ہمارا معاملہ شریفانہ اصولوں کا معاملہ تھا۔ پٹھان کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو وہ وائسرائے یا انگلینڈ کے بادشاہ سے ملاقات کے وقت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہاتھ ملائے گا جیسے کہہ رہا ہو میں بھی ویسا ہی معزز ہوں جیسے تم"۔

افغانستان کی تاریخ اور احمد شاہ ابدالی امیر دوست محمد خاں اور دوسرے افغان حکمرانوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کتاب کے ایک بڑے حصہ میں موجودہ صوبہ سرحد اور اس کی شخصیات کے بارے میں بھی دلچسپ موادِ مطالعہ پایا جاتا ہے۔ خوشحال خان خٹک کی جدوجہد اور اس کی شاعری کے بعض تراجم کے علاوہ انگریز حکومت کے ان طور طریقوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو سرحد کے غیور پٹھانوں کو قابو میں رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے تھے۔ مؤلف اس سلسلے میں بڑے فخر کے ساتھ نکلسن کا ذکر کرتا ہے جو تین سال تک بنوں میں ڈپٹی کمشنر رہا یہ شخص پختونوں کے خلاف سرتا پا نفرت تھا اور اس نے جس مستبدانہ انداز سے حکومت کی اسے صوبہ سرحد کبھی نہیں بھلا سکے گا۔ ابھی وہ حاکم بن کر آیا ہی تھا کہ اس نے پٹھانوں کے ایک جرگہ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران ایک پٹھان نے نکلسن کی طرف رخ کر کے تھوکا (ہو سکتا ہے اس کے منہ میں وہ نشہ آور مرکب ہو جسے "بیڑا" کہتے ہیں اور جسے منہ میں رکھنے کے بعد بار بار تھوکنا پڑتا ہے) نکلسن نے اسے اپنی توہین قرار دیا اور "گربہ کشتن روز اول" کے مصداق اردلی کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اس شخص کو جبراً اپنی تھوک چٹوائے اردلی نے تعمیل کی اور اس

شخص کو گردن سے پکڑ کر اپنی تھوک چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

اسی طرح ایک دن نکلسن وزیرستان کے ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک مولوی صاحب نظر پڑے (کتاب میں لفظ "ملا" لکھا گیا ہے) نکلسن نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں اس کے لئے نفرت پائی جاتی ہے اس نے نکلسن کو سلام بھی نہیں کیا۔ فرنگی حاکم یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا اس نے مولوی صاحب کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اور بعد میں جب نکلسن کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تو اس نے بطور سزا ان کی داڑھی منڈوادی۔

مؤلف نے ان واقعات کا تذکرہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نکلسن ایک بہت مؤثر اور مضبوط حاکم اور ایڈمنسٹریٹر تھا لیکن جب وہ وزیرستان میں فقیر ایپی کی تحریک کا ذکر کرتا ہے تو یہ بھول جاتا ہے کہ اگرچہ فقیر صاحب کی تحریک بحیثیت مجموعی ہندوستان میں فرنگی راج کے خلاف تھی مگر بنوں اور وزیرستان میں اس کی مرکزیت میں نکلسن جیسے افسروں کی ان عاقبت نا اندیشانہ کارروائیوں کا بھی بڑا دخل تھا۔ مؤلف کہتا ہے کہ فقیر آف ایپی (جن کا اصل نام مرزا علی خان تھا اور جو وزیرستان میں ایپی نام کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے) برطانوی حکومت کے مقابلے میں اس لئے آئے کہ ایک گاؤں جھنڈو خیل کے ایک پٹھان نوجوان نے ایک ہندو لڑکی کو (اس کی مرضی سے) اغوا کر لیا اور بعد میں اسے مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی اس پر بنوں کے ہندو غیض و غضب میں آ گئے اور انہوں نے (برطانوی) حکومت سے مدد طلب کی۔ حکومت نے نوجوان کو گرفتار کر لیا اور لڑکی کو اس کے والدین کے سپرد کر دیا اس پر وزیر قبائل اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فقیر ایپی کی قیادت میں انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ فقیر صاحب ایپی کی باغیانہ (بلکہ انگریز کے دور میں مجاہدانہ) سرگرمیوں کا اصل سبب کیا تھا اور وہ اور ان کے پیشرو مُلاّ پاوندہ کس لئے انگریز کے مقابلے میں ڈٹ گئے تھے؟ کیا یہی اور اس سے ملتے جلتے دوسرے بعض واقعات تھے جن کی وجہ سے وہ میدان میں اترنے پر مجبور ہوئے یا اس کے پس پردہ کوئی اور عظیم مقصد بھی تھا۔ زندگی رہی تو کتاب کے مشمولات اور مندرجات کے حوالے سے ہم اپنے اگلے کالم میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔

(29 اکتوبر 84ء)

کچھ پختونوں کے بارے میں

(2)

فقیر ایپی کا نام ماضیٔ قریب کی تاریخ آزادی کا ایک درخشاں نام ہے لیکن اس سے پہلے کچھ ذکر مُلّا پاوندہ کا ہو جائے جو فقیر صاحب کے پیشرو اور وزیرستان میں انگریز دشمنی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔
انگریزوں نے قبائلی علاقے میں اپنے اثر و نفوذ کے فروغ کے لئے اپنے بعض "مرغان دست آموز" کو "مَلِک" کے ٹائٹل سے نواز کر اپنا وظیفہ خوار بنا رکھا تھا۔ 1893ء میں ایک انگریز افسر کو محسود قبیلہ کے کچھ افراد نے قتل کر دیا۔ ملکوں نے اس واقعہ میں ملوث پانچ قبائلیوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا جنہیں بعد میں مقدمہ چلا کر سزا سنادی گئی۔ اس پر قبائل مُلّا پاوندہ کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سب سے پہلے انگریزوں کے قائم کردہ "ملکی سسٹم" پر ضرب کاری لگائی، تین ملکوں کو قتل کر دیا گیا اور باقی ماندہ ملک ڈر کے مارے فرار ہو گئے۔

مُلّا پاوندہ سرحد اور قبائلی علاقے کے ان مذہبی اور روحانی رہنماؤں میں شامل تھے جن کے بارے میں عوام میں یہ مشہور تھا کہ ان کی دعا ہو تو گولیاں کنکریاں بن جاتی ہیں۔ مُلّا صاحب اور ان کے عقیدت مند کئی سال تک انگریز فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ انگریزوں نے تین سو میل پھیلے ہوئے بارڈر پر اپنی حفاظتی چوکیوں کے ذریعے محسودوں کی مکمل غذائی ناکہ بندی کر دی اس طرح نہ تو انہیں کہیں سے غلہ آسکتا تھا اور نہ وہ کہیں باہر جاسکتے تھے مگر ان مشکل حالات میں بھی بہادر محسود قبیلہ نے انگریز کا ناطقہ سالہا سال تک بند کئے رکھا یہاں تک کہ ان کے لیڈر مُلّا پاوندہ کو ایک انگریز ایڈمنسٹریٹر مسٹر ہاویل نے محسود قبیلے پر لکھی جانے والی 1929ء کی ایک رپورٹ میں یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا کہ:

"انگریز اپنے ہاں کے رائج شدہ معیار کے مطابق مُلّا پاوندہ کے کردار کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس معیار کے مطابق تو وہ لارڈ کرزن کی اصطلاح میں "ایک فرسٹ کلاس بدمعاش" ہی ٹھہریں گے لیکن جو لوگ اس ماحول پر نظر رکھتے ہیں جس میں مُلّا صاحب کی بود و ماند تھی وہ انہیں ایک محب وطن اور اپنے قبیلہ کی آزادی کا چیمپئن قرار دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ہمارے وہ افسر جنہیں کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے شہادت دیں گے کہ وہ اپنی وجاہت اور اپنی ترغیب آمیز گفتگو سے ہر اس شخص پر گہرا اثر ڈالتے تھے جسے ان سے ذاتی رابطہ قائم کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک شخص جو بالکل ان پڑھ ہو اور جسے موروثی طور پر بھی کوئی خاص برتری حاصل نہ ہو۔ تاریخ میں اس طرح کے ابواب کا اضافہ کرنے پر (جیسا کہ مُلّا صاحب نے کیا) یقیناً اپنے وقت کے بڑے آدمیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے"۔

مُلّا پاوندہ کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے بھی ان کے مقدس مشن کو جاری رکھا مگر مُلّا صاحب کے بعد محسودوں اور وزیروں کو جس شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جس نے اپنی گوریلا جنگ سے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے وہ فقیر صاحب ایپی تھے۔ "لارڈز آف دی خیبر" کا مؤلف لکھتا ہے کہ اپنی بغاوت کے پہلے ہی سال فقیر ایپی اور ان کے ساتھیوں نے انگریزی دستوں کے ایک ہزار جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا یہاں تک کہ برطانوی حکومت کو اپنی فوج کے تین مکمل ڈویژن جن میں پچاس ہزار سے زیادہ فوجی شامل تھے فقیر صاحب کے خلاف حرکت میں لانے پڑے۔ فقیر صاحب کا ہیڈ کوارٹر "وانا" میں تھا اور اس وقت ان کے صاحب کرامت ہونے کا اور زیادہ شہرہ ہو گیا جب گورکھا رجمنٹ انہیں گرفتار کرنے کی مہم میں بری طرح ناکام ہوئی۔ فقیر صاحب جب تک زندہ رہے انگریز کے خلاف لڑتے رہے۔ (کاش کہ عمر کے آخری حصہ میں قیام پاکستان کے بعد وہ تحریک پختونستان کے سربراہ نہ بنتے) 1960ء میں ان کا انتقال ہوا تو مشہور زمانہ اخبار "لندن ٹائمز" نے بھی انہیں "ایک با اصول اور پارسا شخصیت" کے عنوان سے خراج تحسین پیش کیا۔

انگریزوں کے خلاف پٹھانوں نے یہ جدوجہد کیوں کی تھی؟ وہ بے سروسامانی میں بھی سالہا سال تک ان کے خلاف کیوں برسرپیکار رہے؟ ہو سکتا ہے اس میں لوٹ مار کے جذبے کا بھی کچھ نہ کچھ دخل ہو مگر اس کا بنیادی سبب اسلام سے پٹھانوں کا وہ لاثانی اور لافانی تعلق تھا جو انہیں آج بھی ایک سپر پاور کے بالمقابل بے خوف و خطر ڈٹ جانا سکھائے ہوئے ہے۔ "لارڈز آف دی خیبر" میں بنوں کے ایک انگریز مشنری ڈاکٹر کی بیان شدہ داستان سے اس جذبے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

تھیوڈور پینیل ایک قابل اور ہونہار نوجوان ڈاکٹر تھا جو 1893ء میں اپنی والدہ کے ہمراہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بنوں میں مقیم ہوا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے اپنا ہسپتال قائم کیا

جس کے ذریعے وہ پٹھانوں کا مفت یا برائے نام معاوضہ لے کر علاج معالجہ کرتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وزیرستان میں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند ہو چکا تھا اور بنوں کے علاقے میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مسٹر تھیوڈور کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ بھی اس نفرت کا شکار نہ ہو جائے۔ اس سے بچنے کے لئے اس نے ایک عجیب چال چلی "ملا کاربوغا" بنوں کے انگریز دشمن مذہبی رہنما تھے۔ مسٹر تھیوڈور ایک دن گھوڑے پر سوار ہو کر ان سے ملنے کے لئے ان کے گاؤں جا پہنچے۔ مشنری کو معلوم تھا کہ پختون روایت کے مطابق جو شخص ایک مرتبہ کسی پٹھان کا مہمان بن جائے پھر اس کی عزت و حرمت کا تحفظ اس کا مذہبی فریضہ بن جاتا ہے۔ پشتو میں اسے "میل مستیا" یعنی مہمانداری اور مہمان نوازی کہتے ہیں۔ ملا کاربوغا گھر پر موجود نہ تھے ان کے بڑے صاحبزادے نے ان سے پوچھا "کیا وہ کھانے کے لئے کچھ لائے؟"۔ "مسٹر تھیوڈور اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؟ ہم تو آئے ہی اسی ارادے سے تھے کہ ہم ایک بار ملا صاحب کے مہمان بن جائیں تاکہ گردونواح میں اس بات کی شہرت ہو جائے کہ ڈاکٹر صاحب ملا صاحب کے مہمان بن چکے ہیں۔ ہم نے فوراً ہاں کہہ دی اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ جلد ہی دور قریب ہر جگہ یہ بات پھیل گئی اور ملا کاربوغا اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان میزبان اور مہمان کا ایسا رشتہ قائم ہو گیا جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی"۔

ڈاکٹر تھیوڈور نے جس جانفشانی سے بنوں میں پٹھانوں کی خدمت کی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر انہوں نے 34 ہزار مریضوں کا معائنہ کیا۔ ان میں سے ایک ہزار چھ سو پچپن افراد کو باقاعدہ ہسپتال میں رکھا گیا۔ تین ہزار آپریشن کئے گئے اور چھیاسی ہزار "آؤٹ ڈور" مریضوں کا علاج کیا گیا۔ اس محنت اور مشقت کے باوجود ("لارڈز آف دی خیبر" کا مصنف لکھتا ہے) کہ ڈاکٹر صاحب یہاں کے سخت جان پٹھانوں کو عیسائی بنانے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ بعض اکا دکا افراد عیسائی بنے بھی تو تبدیلی مذہب سے ان کا مقصد ملازمتوں کا حصول تھا اور بس۔ ڈاکٹر تھیوڈور لکھتا ہے کہ اس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پٹھان قوم دل و جان سے اسلام کی والہ و شیدا تھی اور کلمہ طیبہ کا اثر اس کے افراد پر ایسے ہوتا تھا جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ میں جو مشنری سرگرمیوں کی ناکامی پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ان سے مُلّا پاوندہ اور فقیر صاحب ایپی کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ جدوجہد کا پس منظر بھی روشن ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "کوئی خدا نہیں سوائے ایک خدا کے اور محمد اللہ کے رسولؐ ہیں۔ یہ وہ پکار ہے جو اپنے ماننے والوں میں بجلی کا کرنٹ دوڑا دیتی ہے اور انہیں اس کے لئے بے اختیار تیار کر دیتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے مذہب کے لئے کفار سے جہاد کریں۔ یہ ان کے نزدیک جنت میں جانے کا سب سے سہل ذریعہ ہے۔ یہی وہ پکار ہے جس کی صدائے بازگشت آج ہندوستان کے شمال مغربی صوبے میں سنائی دے رہی ہے۔ یہی

وہ پکار ہے جو افغانستان کے مُلّا اپنے ہم وطنوں میں انگریزوں سے لڑنے کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے بلند کر رہے ہیں۔ یہی وہ پکار ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو آپس میں متحد ہونے اور اسلام کے منکروں کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو شمال مغربی صوبہ سرحد کے غازی یا جنونی کو ایک انگریز افسر کے قتل کرنے پر فی الفور جنت کا مستحق بننے کا یقین دلاتی ہے۔ شمال مغربی صوبہ کے رہنے والوں کے اس جذبے کو ہم جنون کہیں یا تنگ نظری مگر اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ جذبہ وہ طاقت ہے جو ان کے دوسرے تمام رجحانات اور میلانات پر غالب ہے۔ اس پکار میں وہ اثر ہے کہ میں نے ایک پٹھان سردار سے گھوڑا مستعار لیا تو یہ کلمہ سننے پر وہ بھی برق رفتار ہو گیا کیونکہ گھوڑے یہ جانتے ہیں کہ جب یہ کلمہ پڑھا جاتا ہے تو دشمن کی طرف تیز رفتاری سے بڑھا جاتا ہے جب گھوڑوں پر اس کلمے کا یہ اثر ہے تو انسانوں پر اس کے اثر کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟"۔

"لارڈز آف دی خیبر" میں ریاست سوات کے حکمرانوں اور خاص طور پر حضرت اخوند صاحب آف سوات کے بارے میں بھی بعض دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو تاریخ خود ہمارے قلم کاروں کو قلمبند کرنی چاہئے تھی اس کے لئے بھی آج ہم غیروں کے محتاج ہیں۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے میں ریاست سوات کے قیام اور اس کے اولوالعزم بانی کی فرنگ دشمن جدوجہد کے بارے میں اتنا کچھ تو کیا اس کا عشر عشیر بھی نہیں جانتا تھا۔ ہم پاکستانیوں کے لئے شاید کتاب کا دلچسپ ترین باب وہ ہے جس میں قیام پاکستان کی جدوجہد کے زمانے میں صوبہ سرحد اور اس کے پٹھان رہنماؤں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے کتاب کا یہ حصہ انگریزی حکومت کے زمانے میں صوبہ سرحد کے گورنر الف کیرو کے ان انٹرویوز سے ماخوذ ہے جو انہوں نے مؤلف کو 79ء سے 82ء تک کے دوران مختلف نشستوں میں دیئے تھے۔ مسٹر کیرو کی گورنری اس زمانے پر بھی محیط ہے جس میں ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ وہ "خان برادران" بالخصوص "خان عبدالغفار خان" کے مداح ہیں۔ آزادی کی جدوجہد میں ان کی قربانیوں کو سراہتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد میں قیام پاکستان کے سلسلے میں ہونے والے ریفرنڈم کے سلسلے میں ان کے مضطربانہ اقدامات کی کہانی بھی سناتے ہیں۔ مسٹر کیرو کو کانگریس کے لیڈر مسلم لیگ کا آدمی کہتے تھے۔ انہوں نے ان انٹرویوز میں پٹھانوں کی نظریہ پاکستان سے والہانہ وابستگی کا بھی بار بار ذکر کیا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ پنڈت نہرو کی صوبہ سرحد میں آمد سے تعلق رکھتا ہے۔ مسٹر کیرو بتاتے ہیں:

اب شکاگو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اور عیسائی مذہبی فاضل مسٹر گریلے کے فرمودات سنئے وہ کہتے ہیں کہ:

"پنڈت نہرو (جو صوبہ سرحد میں تقسیم ہند کے خلاف زمین ہموار کرنے کے لئے آئے تھے) چاہتے تھے کہ خیبر سے بھی آگے جاکر آفریدی قبیلہ سے ملاقات کریں چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ لنڈی کوتل تشریف لے گئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے ایک آفریدی جرگے کا اہتمام کیا۔ ان جرگوں میں پشتو میں بات چیت کرنے کا رواج تھا۔ (ظاہر ہے پنڈت جی انگریزی میں بولے) اس پر آفریدی تشدد پر اتر آئے اور پنڈت نہرو کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو مجمع میں گھس کر انہیں انتباہ پر انتباہ دینا پڑا اور پنڈت جی خوش قسمتی سے بچ گئے۔ بعد میں انہوں نے پشاور کے شمال میں سوات کی طرف جانے پر اصرار کیا۔ اس موقع پر بھی ایک پولیٹیکل ایجنٹ ان کے ہمراہ تھا یہاں پر ان پر پتھر پھینکے گئے اور دو گولیاں بھی چلائی گئیں اس موقع پر بھی وہ خوش قسمتی سے محفوظ رہے۔ واپسی پر میں نے انہیں مختلف راستے سے پشاور بھجوایا کیونکہ راستے میں مسلمانوں کے زبردست ہجوم جمع تھے اور وہ انہیں پشاور واپسی پر ٹھکانے لگانا چاہتے تھے۔ پنڈت جی کو ایک دو پتھر لگ چکے تھے وہ قدرے زخمی حالت اور چڑچڑاہٹ میں واپس پشاور پہنچے۔ ہم نے کوئی خوشگوار گفتگو نہیں کی۔ میں نے ان سے کہا دیکھئے! میں نے تو آپ کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا اب آپ نے خود نتیجہ دیکھ لیا"۔

انگریزوں کے خلاف اس کتاب میں پٹھانوں کی جدوجہد کی جو روداد بیان کی گئی ہے اور اسلام سے ان کے اٹوٹ تعلق کی جو نقشہ کشی کی گئی ہے اس کے بعد کون ہے، جو یہ سوچ سکتا ہے کہ یہ کبھی غیروں کے غلبہ واستیلا کے سامنے ہتھیار ڈال سکتے ہیں یا اس پاک سرزمین کے حصے بخرے کرنے کے کسی منصوبہ میں شامل ہو سکتے ہیں جس کے حصول کے لئے ان کی بیتابیاں تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہیں۔

(6ر دسمبر 84ء)

وی ایس نیپال کی نئی کتاب

وی ایس نیپال بین الاقوامی شہرت کا مصنف اور ناول نگار ہے اس کے آباؤاجداد ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے مگر یہ خود ٹرینیڈاد میں پیدا ہوا وہیں پلا بڑھا اور اب لندن میں مقیم ہے اس کے موضوعاتِ نگارش بنیادی طور پر ناول نگاری اور سیاحت ہیں اب تک اس کی پندرہ بیس کتابیں چھپ چکی ہیں، نہ صرف چھپ چکی ہیں بلکہ دنیا بھر کے پڑھے لکھے حلقوں سے خراجِ تحسین بھی وصول کر چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں دو کتابیں بھارت سے متعلق ہیں "این ایریا آف ڈارکنس" (ایک منطقہ ظلمات) اور "انڈیا اے وونڈڈ سولائزیشن" "بھارت "ایک زخمی" تہذیب" ان میں جہاں مصنف کی انشاء پردازی اوجِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے وہاں اس کی جزرسی تجزیہ نگاری اور بے لاگ تنقید بھی قابلِ داد ہے۔ بھارت میں اچھوتوں پر جو کچھ گذرتی ہے اس کا واقعاتی نقش خود ایک ہندو نژاد مصنف کے قلم سے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور کھینچ سکا ہو۔ دو چار ماہ پیشتر جب بین الاقوامی اور شہرہ آفاق نوبل پرائز کا اعلان ہونے والا تھا ایک صاحب طرز مصنف کی حیثیت سے باخبر حلقوں میں مسٹر نیپال کو یہ اعزاز ملنے کے امکانات بڑے وثوق سے ظاہر کئے جا رہے تھے۔ انہی مسٹر نیپال نے ابھی چند ماہ پیشتر ایک اور کتاب لکھی ہے "امنگ دی بیلیورز" (اہل ایمان کے درمیان) یہ ان کے اس سفر کی روداد ہے، جو انہوں نے پچھلے ہی سال ایران، پاکستان، ملائشیا اور انڈونیشیا کا کیا ہے۔ اس کتاب کی بھی بین الاقوامی حلقوں میں بڑی شہرت ہوئی ہے۔ ٹائم جیسے جریدہ نے سرورق پر مصنف کی تصویر کے ساتھ کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔

کتاب چھپنے سے پہلے لندن کے آبزرور نے اپنی دو اشاعتوں میں صفحہ اول پر اس کے دو باب شائع کیے ہیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ جس دن کتاب لندن کے بک سٹالوں پر پہنچی ہے اسی دن مصنف کے چاہنے والے بڑے شوق سے اسے خرید رہے تھے میں نے پہلے تو لائبریری کی طرف رجوع کیا کہ شاید پڑھنے کو مل جائے مگر میرے جانے سے پہلے ہی کوئی صاحب اسے اپنے نام جاری کرا چکے تھے لائبریرین نے بتایا کہ ابھی کئی نام ویٹنگ لسٹ پر ہیں چاہو تو تم بھی اپنا نام درج کرا دو یہ حال دیکھ کر کتاب خریدتے ہی بنی اس مہنگائی کے زمانے میں ایک کتاب کے لئے پونے دو سو روپے خرچ کرنا بڑا ہی تکلیف دہ ہے مگر یہ کتاب ایسے موضوع پر تھی کہ قدرتاً مجھے اس سے دلچسپی تھی کتاب خریدی پڑھی' واپس آیا تو معلوم ہوا یہاں کے ایک آدھ اخبار نے اس پر لکھا بھی ہے مگر ہر شخص کا زاویۂ نظر اپنا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آج کی صحبت میں اس کتاب کے کم سے کم اس حصہ کی چند جھلکیوں کے بارے میں قارئین کو ضرور باخبر کر دوں جو پاکستان کے بارے میں ہے ہم "حال مست" ہیں، ہوا کریں پر باہر سے آنے والے تو ہمیں ان دعوؤں کی روشنی میں دیکھیں اور پرکھیں گے جن کی صدائے بازگشت آج چار دانگ عالم میں سنائی دے رہی ہے۔

سوچنے کا ایک انداز یہ ہے (اور یہی بدقسمتی سے رائج بھی ہے اور مقبول بھی) کہ لکھنے والا ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہے اس لئے دشمن پاکستان ہے اور دشمن اسلام' اس کی کتاب کے پیچھے صیہونی سازش کارفرما ہے۔ وہ سامراجی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے احیائے اسلام کی کوششوں کا مذاق اڑانا چاہتا ہے مگر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مصنف کو "دشمنان دین" کے اس دائرے میں شمار کرنا انصاف کی بات نہ ہو گی وہ اس سے پہلے ہندو تہذیب پر لکھ چکا ہے اور ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے اس کی یہ تحریریں ہمیشہ یادگار رہیں گی اصل میں وہ کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا لامذہب آدمی ہے' مذہبی معلومات بھی اس کی سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ اسلام پر اس کے خیالات بہت سطحی' ناقص اور بعض مقامات پر حقیقت کے برعکس ہیں پھر بھی دشمنی ان سے کہیں نہیں جھلکتی۔ اس نے بعض مسلمان ملکوں میں نظامِ اسلام کے نفاذ کا چرچا سنا تو وہ ان ملکوں کی سیاحت کو نکل کھڑا ہوا۔ یہاں کے معاشروں کو دیکھا' یہاں کے عوام و خواص سے ملا' ظاہری اور اندرونی معاشرت کی جھلکیاں دیکھیں اور دعوے اور عمل دونوں کو اپنے قلم کے ذریعے سے پیش کر دیا آیت اللہ شیرازی سے ملتے ہوئے اپنے گائیڈ کے مشورے پر اس نے اپنا مذہب "عیسائیت" بتایا وہ یہ بتا کر کہ میں ہندو خاندان میں پیدا ہوا ہوں۔ اصل میں قم کے ان پاکستانی طلبہ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا جو اسے بڑے شوق سے اپنے فاضل اور لائق احترام استاد سے ملانے لائے تھے اس نے لکھا ہے کہ وہ پہلے آیت اللہ شیرازی کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ وہ لامذہب ہے لیکن بعد میں جب اس کے گائیڈ نے کہا کہ اس سے آیت اللہ پر برا اثر پڑے گا اس نے اپنے آپ کو عیسائی کہنے کی اجازت دے دی کتاب کے اس طرح کے بعض مقامات سے قاری کے ذہن کو دھکا بھی لگتا ہے مگر یہ بات پھر قابل داد ہے کہ کم سے کم کتاب لکھتے وقت اس نے کسی ایسی کمزوری پر پردہ نہیں ڈالا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے

کہ ایک انداز نظر تو جارحانہ ہے کہ جو تمہارے معاشرے کا عکس تمہیں دکھائے اسے کافر کہہ کر دل خوش کر لو اور بسم اللہ کے گنبد میں محصور ہو کر بیٹھ جاؤ یہ انداز جب اپنوں ہی کو نہیں بخشتا تو غیروں کو کہاں معاف کرے گا۔ دوسرا انداز فکر ہر جگہ سے سیکھنے اور خود احتسابی کا ہے یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے سیدنا علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے اور وظیفہ زندگی بنانے کے لائق کہ یہ نہ دیکھو کس نے کہا ہے یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے۔ جو ایک آدھ تحریر میں نے نیپال کی اس کتاب پر دیکھی ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں یہ دوسرا انداز فکر نہیں پایا جاتا ان گالیوں کے جواب میں تو مصنف آسانی سے ہمیں یہ کہہ سکتا ہے کہ

آئینہ ہم نے دکھایا تو برا مان گئے!

مصنف پاکستان کا اسلامی معاشرہ دیکھنے کے لئے پاکستان آیا تھا اس کا نام کم سے کم اہل قلم کے لئے اجنبی نہ تھا یہاں اس نے سرکاری افسران سے بھی رابطہ قائم کیا ان سے استدعا کی کہ وہ اسے اسلامی نظام اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنے کے لئے کوئی مناسب کارروائی کریں مگر افسوس کہ انہوں نے اس کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی، یہی نہیں اس کے دورے کے آخری مرحلہ میں انہیں یہ معلوم ہو پایا کہ یہ آدمی ہے کون؟ مگر اس وقت تک پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا تھا اس وقت تک یہ حضرات بہت سی ایسی باتیں کہہ گئے جو انہیں معلوم ہوتا کہ کس سے کہی جا رہی ہیں تو شاید نہ کہتے مگر جو انہوں نے کہا وہ منبر و محراب اور ذرائع ابلاغ سے نشر ہو یا نہ ہو ہے کم و بیش ہر آدمی کا احساس، مصنف ایک سرکاری افسر مسٹر احمد سے ملتا ہے تو احمد صاحب کہتے ہیں:

"جب میں بچہ تھا اور ہم نے سنا پاکستان بن گیا ہے تو میں بتا نہیں سکتا ہمارے احساسات کیا تھے میں پاکستان کو یوں دیکھتا تھا جیسے یہ ملک میرے لئے خدا ہے"۔

مگر پھر کیا ہوا؟ پاکستان بنا تو یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اس لئے کہ:

"یہاں لوگ بُرے تھے وہ اپنے عقیدہ کے مطابق عمل نہ کر سکے"

سرکاری افسران نے نیپال کو اسلامی نظام اور پاکستان میں اس کی پیشرفت سے آگاہ کرنے کے لئے کراچی میں جن اصحاب سے ملایا ان میں ایک اخبار نویس، ایک دانشور مسٹر مرزا اور ایک مشہور وکیل شامل ہیں ان وکیل سے ملنے کا مشورہ انہیں ان کے مداح اخبار نویس نے یہ کہہ کر دیا تھا کہ وہ ہر ماہ بیس ہزار روپے کی کتابیں خریدتے ہیں یہ ممتاز وکیل اسلامی مشاورتی کونسل کے بھی رکن تھے انہوں نے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی حرفِ برہنہ کہا۔ بتایا کہ قوم منجمد دین اور "ملاؤں" میں پھنسی ہوئی ہے حکومت نے نفاذ اسلام کے لئے "ملاؤں" سے رجوع کیا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان سے کیا پوچھا جا رہا ہے وہ صرف یہی سوچ سکتے تھے کہ "صالحین" کو ہر چیز سونپ دینی چاہئے یہ لوگ کسی قسم کے اوامر و نہی کا تصور نہیں رکھتے وہ یہی نہیں جانتے کہ ہم کس چیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں یہ گفتگو سن کر مصنف پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ لکھتا ہے:

"اس کے بعد میں نے سوچا کہ پاکستان میں کوئی ایسے اسلامی تجربات نہیں ہو رہے
جنہیں میں دیکھ سکوں"۔

اگر افسران حکومت کو اس دورے اور اس قلمکار کی اہمیت سے آگاہ کر سکتے تو شاید ایک پروگرام کے تحت اس ملک میں متعدد ایسے اہل علم و فضل سے اسے ملایا جا سکتا جن سے مل کر اس کی تسلی بھی ہوتی اور ذہنی اشکالات بھی دور ہوتے لیکن "بیوروکریٹ" تو افسری کرنا جانتا ہے ضروری نہیں کہ زندگی کے جملہ پہلوؤں میں اس کی معلومات بھی وسیع ہوں۔

افسروں اور دانشوروں کے علاوہ قدرتاً اس کا رابطہ عام پاکستانی سے بھی ہوا۔ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا۔ یہ ایک نوجوان طالب علم تھا جو کراچی میں اپنے فارغ اوقات میں ٹیکسی چلا کر اپنے اخراجات پورے کر رہا تھا رمضان کا مہینہ تھا نیپال نے ڈرائیور سے پوچھا "کیا تم روزے سے ہو" اس نے کہا "نہیں میں خدا سے ناراض ہوں" اس پر اسے خیال آیا کہیں میں کسی مسلمان سے تو مخاطب نہیں۔ اس نے پوچھا کیا تم مسلمان ہو؟ مصنف نے نفی میں جواب دیا تو نوجوان نے کہا:

"مسلمان بہت خراب لوگ ہیں وہ بہت چھوٹے ہیں یہ ایک المناک کہانی ہے میں یہ
آپ کو نہیں سناؤں گا"۔

وہ کراچی میں انٹر کانٹی نینٹل میں قیام پذیر ہے لابی میں ایک سندھی نوجوان سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے نوجوان نے اس سے پوچھا "کیفے ٹیریا کہاں ہے؟" وہ اسے کافی شاپ دکھاتا ہے نوجوان کہتا ہے کیا یہاں کچھ اور نہیں؟" "اوپر کیا کیا ہے" "کمرے" "کیا صرف کمرے؟" "آپ یہیں رہتے ہیں؟" "ہاں چند دنوں سے" "تالاب کہاں ہے؟" "وہ تو حکومت نے بند کر دیا ہے" اس پر نوجوان اسے بتاتا ہے کہ وہ سکھر سے کراچی میں کچھ بزنس کرنے آیا تھا انٹر کانٹی نینٹل میں وہ "ٹریفک" (یعنی عورتوں کی چلت پھرت) دیکھنے آیا تھا۔ بعد میں مسٹر احمد نے مصنف کو بتایا:

"یہاں امیر پاکستانیوں کا یہی وطیرہ ہے وہ یہاں ایسے کمرے کرائے پر لیتے ہیں جہاں
سے وہ سوئمنگ پول کا نظارہ کر سکیں بعض فلسطینی مسلمان مغربی عورتوں کے
ہمراہ یہاں مقیم ہیں، کہانی پھیل گئی ہے (اور نوجوان ان عورتوں کو دیکھنے کے لئے
یہاں آتے رہتے ہیں)"۔

سرکاری افسران نے حیدر آباد کے سرکٹ ہاؤس میں اس کی ریزرویشن کرا دی تھی وہ مسٹر احمد کے مشورے پر سندھی صوفیاء کے مزاروں پر حاضری دینے یہاں آیا تھا مگر جب وہ سرکٹ ہاؤس پہنچا تو دو سرکاری ملازمین نے اسے بتایا کہ "غیر متوقع طور پر ایک وزیر صاحب دورے پر آ گئے ہیں اس لئے اس کی ریزرویشن منسوخ کر دی گئی ہے اس لئے اسے ہوٹل میں ٹھہرنا ہو گا مگر ہوٹل اے کلاس ہے" "اے کلاس" جب مصنف اس "اے کلاس ہوٹل" میں پہنچا تو گرمی کی شدت میں اس کا ایئر کنڈیشنر کام نہیں کر رہا تھا اور اس

کے بیت الخلاء کے کموڈ کی نشست ٹوٹی ہوئی تھی کھڑکی کھولتا تھاتو مچھر حملہ آور ہوتے تھے بند کرتا تھاتو حبس سے نیند نہیں آتی تھی۔ پاکستان میں مصنف نے چھ ماہ کا عرصہ گذارا۔ کراچی آنے پر اس کی ملاقات انگریزی اخبار کے ایک صحافی سے ہوئی وہ پاکستان اور اس میں اسلام کی آمد کے بارے میں بڑا پرجوش تھا لیکن جب مصنف پاکستان کے دوسرے شہروں کا دورہ کرنے کے بعد واپس روانہ ہونے کے لئے چھ ماہ بعد دوبارہ کراچی آیاتو یہ پُرجوش اور ذہین نوجوان بجھ کر رہ گیا تھااور اس پر مایوسی کے دورے پڑرہے تھے۔

مصنف نے ایک دن ہمارے ہاں کا نظام عدل دیکھنے کے لئے کراچی کے سیشن کورٹ کا بھی چکر لگایا نیشنل پریس ٹرسٹ کے انگریزی اخبار کا مذکورہ بالا صحافی اس کے ہمراہ تھا کئی کمروں میں سے صرف ایک کمرے میں ایک مجسٹریٹ کام کر رہا تھا۔ اس کی عدالت میں چوری کا ایک مقدمہ زیر سماعت تھا مگر پولیس ایک سال گزرنے کے باوجود ابھی تک گواہ نہیں پیش کرسکی تھی مقدمہ صرف ایک بار پھر ملتوی کرنے کے لئے عدالت میں پیش کیا جارہا تھا۔

فیڈرل پراسیکیوٹر نے انہیں بتایا کہ کچھ دیر کے بعد وہ خود ایک کیس پیش کرنے والا ہے یہ کیس ایک سرکاری سکول ٹیچر کے خلاف تھا جس نے پاسپورٹ کے حصول کی درخواست دیتے وقت غلط اطلاع دی تھی اسے بیرونی سفر کے لئے این او سی چاہئے تھا مگر اس نے بات چھپائی کہ وہ سرکاری ملازم ہے۔ پراسیکیوٹر نے بتایا کہ کیس دس منٹ میں لگنے والا ہے اس کی کارروائی آپ دیکھتے جائیں مگر مصنف وقت کے بارے میں ہمارے تصورات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے پاکستانی جب کوئی وقت دیں تو اس میں آدھ گھنٹہ آپ سے آپ شامل کرلینا چاہئے اس حساب سے دس منٹ کا بیان کردہ وقت ایک اچھا خاصا لمباوقفہ ہوتا اس لئے ہم آگے بڑھ گئے اور جب ہم نے کافی دیر کے بعد پلٹ کر دیکھاتو پراسیکیوٹر کا کیس ابھی تک نہیں لگ پایا تھا۔

سیشن کورٹ میں طرح طرح کے جرائم میں ملوث قیدی لائے گئے تھے ان میں قاتل بھی تھے اور بدکردار بھی۔ ایک عورت اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ بنچ پر بیٹھی تھی اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اس نے چار ہزار روپے کا کوئی سودا کیا تھا جس میں کچھ گڑبڑ تھی وہ تین دن سے متواتر عدالت کے چکر کاٹ رہی تھی مگر آج بھی کوئی مجسٹریٹ عدالت میں موجود نہ تھا۔ ایک لڑکا اس لئے گرفتار کرکے لایا گیا تھا کہ وہ بڑے خطرناک طریقے سے اپنی روزی کمارہا تھاوہ چلتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو کر دھینگامشتی سے ایک سیٹ پر قبضہ کرتا اور پھر اسے بیس پچیس روپے لے کر کسی ضرورت مند کو فروخت کر دیتا۔ دو ماں بیٹیاں یہ شکایت لے کر آئی تھیں کہ ان کے کرایہ دار نے ان کی پانچ سال کی کوشش کے نتیجے میں گھر توخالی کر دیا ہے لیکن پچاس روپے ماہوار کے حساب سے تین ہزار روپے اس کے ذمے واجب الادا ہیں اس مکان کی لیز کا بھی پرابلم تھا کسی نے ان سے تین ہزار روپے رشوت لے لی مگر کام نہ کیا دوسرے نے رشوت کی یہ رقم واپس کرانے کے لئے ان سے آٹھ سو روپیہ ہتھیالیا مگر مسئلہ جوں کا توں رہا۔

دریں اثناء نماز ظہر کی اذان ہو گئی سرکاری ملازمین وقفۂ نماز کا جو استعمال کرتے ہیں اس پر مصنف لکھتا ہے:۔

"اتنے میں اذان ہو گئی حکومت نے سرکاری محکموں کو ہدایت کی ہے کہ وہ نمازوں کی ادائیگی کے لئے کام چھوڑ دیں اور عدالتوں میں جو اس صبح پہلے ہی کوئی خاص کام نہیں کر رہی تھیں اذان نماز کی ادائیگی سے زیادہ اس امر کا سگنل تھا کہ وہ لوگ جو پہلے ہی برائے نام کام کر رہے تھے اب بالکل کچھ نہ کریں"۔

کتاب میں اور بھی بہت کچھ قابل غور ہے۔ مصنف نے راولپنڈی، کاغان اور لاہور کا بھی سفر کیا یہاں اس نے شیعہ مسلک رکھنے والے چند پاکستانیوں کی محفل میں شرکت کی وہ بعض احمدیوں سے بھی ملا اس نے رائے ونڈ کا تبلیغی اجتماع بھی دیکھا اس سے متاثر بھی ہوا اس کالم میں ساری قابل ذکر باتوں کا احاطہ کرنا مقصود نہیں۔ میں نے آپ کو یہاں اپنی ملکی اور قومی زندگی کی ان چند جھلکیوں کا مشاہدہ کرایا ہے۔ جو ایک غیر ملکی مصنف نے چھ ماہ کے قیام کے بعد اپنی کتاب میں پیش کی ہیں آپ چاہیں تو یہ کہہ کر بھی دل کو خوش کر سکتے ہیں کہ یہ سب بکواس ہے لکھنے والا کافر تھا وہ مکھی کی طرح ہمارے معاشرے میں ایک ایک گندی جگہ پر بیٹھا اور اس طرح اس نے غلاظتیں سمیٹ کر صفحہ قرطاس پر انڈیل دیں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ باتیں بڑی معمولی ہیں کہاں نہیں ہوتیں ہر جگہ ہوتی ہیں لیکن ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ ہم اس آئینے میں اپنی اور اپنے معاشرے کی وہ تصویر دیکھیں جو باہر سے آنے والوں کو نظر آتی ہے سرکاری حکام اور دفاتر کی کارکردگی ہمارے دعوے اور ہمارے عمل ہمارے دانشوروں کا فکری افلاس، ہمارے نوجوانوں کی مایوسی اور کج روی، ہمارے ریسٹ ہاؤسوں اور ہوٹلوں کا نظام ہمارا قانون لاقانونی، ہمارے ہاں کا مہنگا انصاف اور معاشرے میں پکنے والی رنگ برنگے جرائم کی فصل۔ یہ سارا نقشہ صرف انہی چند اقتباسات سے نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ جو اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔

کاش! ہمیں معلوم ہوتا کہ اسلام اندر سے آتا ہے وہ "باہر" سے نہیں آتا ہم سب اس انتظار میں ہیں کہ اسلام آنے والا ہے لیکن یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ وہ کہاں سے آئے گا؟ وہ تو صدیوں سے آچکا ہے بلکہ انسان اول کے ہمراہ آچکا ہے وہ اب بھی یہیں ہے ہر مسلمان کے پاس، ہم سب کے پاس ہم میں سے جو کوئی چاہے اسے فوراً لے آئے اپنے اندر سے نکال کر باہر لے آئے مگر ہم اسے بغل میں دبا کر شہر میں ڈھنڈورا دیتے پھرتے ہیں ہر شخص چشم براہ ہے کہ وہ کب آئے گا مگر یہ کوئی نہیں سوچتا وہ تو خود اس کے پاس موجود ہے۔

کیا کبھی کالے پتھر اکٹھے کر دینے سے ہیرے کا حصول ممکن ہوا ہے؟ کانٹوں کے انبار پھولوں کی پنکھڑیوں میں تبدیل ہوئے ہیں؟ نیم کے پتوں کو نچوڑ کر عرق گلاب کشید ہو سکا ہے؟ ہربرٹ اسپنسر نے کہا تھا "سیاسی کایا پلٹ سیسے جیسے ادنیٰ اعمال کو سونے جیسی اعلیٰ فطرت میں تبدیل نہیں کر سکتی"۔ ہم اسلامی

نظام حیات کے طلب گار ہیں مگر خود اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ”کوئی سیاسی اکسیر سیسے جیسے افراد سے سونے جیسی ہیئت اجتماعیہ پیدا نہیں کر سکتی“۔ ہم قانون کے زور سے انقلاب لانا چاہتے ہیں مگر قانون نافذ کرنے والے ادارے اس کے لئے ضروری اور بنیادی ”صالحیت“ رکھتے ہیں نہ صلاحیت، جبر سے جسم جھک سکتے ہیں لیکن دلوں کو مسخر نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے روحانی انقلاب کی ضرورت ہے اور روحانی انقلاب اس وقت آئے گا جب ہم باہر سے آنے والے اسلام کا انتظار چھوڑ کر اپنے پاس موجود اسلام کا پرچم اپنی اس نگری میں اونچا کرنے کا عزم کر لیں گے جسے دل اور روح کی نگری کہتے ہیں۔

خیالات

بوہرہ جماعت کی ایک تقریب

پاکستان کے وزیر مذہبی امور ہونے کی حیثیت سے مجھے جن مذہبی جماعتوں اور گروہوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے امور و مسائل کا تحقیقی جائزہ لینے کا موقع ملا ہے ان میں داؤدی بوہرہ جماعت بھی شامل ہے۔ اس کے داعی ڈاکٹر سیدنا برہان الدین بمبئی میں رہتے ہیں۔ پاکستان بھی تشریف لاتے رہتے ہیں میری تجویز پر پہلی بار انہیں اسٹیٹ گیسٹ کا مرتبہ دیا گیا اور مجھے خوشی ہے کہ اہل "مراسم" نے اب تک ان کا یہ درجہ نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اس میں اضافہ ہی کیا ہے۔ میں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ضمن میں کئی مرتبہ اس جماعت کی تقریبات میں شریک ہوا ہوں اور ہمیشہ مجھے اس جماعت کی تنظیم' اس کے ارکان کے مخصوص لباس اور وضع قطع' اس کی امن پسندی اور تعلیمی اور رفاہی کاموں میں اس کے شغف نے متاثر کیا ہے۔ میں نے سیدنا سے بھی کئی بار شرف ملاقات حاصل کیا ہے وہ اپنے عقائد کے مطابق ایک زاہد و عابد بزرگ' خوش اخلاق اور سادہ انداز و اطوار کے مالک ایک نفاست پسند انسان ہیں۔ اس جماعت میں یوں تو اکثریت تعلیم یافتہ اور ذہین لوگوں کی ہے مگر سیدنا کے بھائی ڈاکٹر یوسف نجم الدین تو بلامبالغہ ایک عبقری اور فاضل و مفکر عالم ہیں۔ اردو' فارسی' عربی' انگریزی چاروں زبانوں پر انہیں کامل عبور حاصل ہے۔ جب کبھی ان سے ملنا ہوا ہے ان کی وسعت مطالعہ' خوش گفتاری اور علم مجلس کا نقش ہی دل پر قائم ہوا ہے اور ویسے بھی اتنے وضعدار کہ جب بھی ملو جوش کا یہ شعر یاد آجائے۔

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

بوہرہ جماعت کی کوئی باقاعدہ مستند تاریخ اب تک منظر عام پر نہیں آئی۔ فاطمی اور اسماعیلی تذکروں میں کہیں کہیں ضمناً ان کے عقیدہ و تنظیم کا تعارف ہو جاتا ہے اور بس' یا پھر عربی زبان کی ایک کتاب "الترجمتہ الظاہرہ لفرق ابو رھۃ الباہرہ" جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں جھاویری نے کیا ہے اس موضوع پر کسی لٹریچر کی عدم اشاعت کا سبب خود بوہرہ جماعت کا وہ طرز عمل بھی ہے جس کی رو سے وہ اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کو محض اپنے دائرے تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ بنیادی طور پر بوہرے شیعہ مسلک رکھتے ہیں مگر اثنا عشریوں اور بوہروں میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ جہاں اول الذکر اپنے عقیدے کی زور و شور سے تبلیغ کرتے اور دوسرے لوگوں کو بھی قائل اور متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں بوہرے اپنے عقائد کی تعلیم و تلقین کو دوسرے حلقوں تک پہنچانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر محرم کی مجالس دونوں کے ہاں جزو عبادت بلکہ عین عبادت ہیں لیکن جہاں اثنا عشری لاؤڈ سپیکر کے ذریعے انہیں ہر چہار طرف نشر کرتے ہیں وہاں یہ کمرے میں منعقد ہونے والی مجلس کا دروازہ بھی بند کر لیتے ہیں تاکہ آواز باہر نہ جانے پائے۔ اسماعیلیہ اور شیعہ امامیہ میں اختلاف کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات امام جعفر صادق کے بعد حضرت موسیٰ کاظم کو ساتواں امام مانتے ہیں جبکہ اسماعیلی حضرت امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے جناب اسماعیل کو امام قرار دیتے ہیں انہی حضرت اسماعیل کی اولاد فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لئے اپنے آپ کو "بنو فاطمہ" کہلاتی ہے۔ بنو فاطمہ شمالی افریقہ کے علاوہ مصر پر دو سو سال حکومت کرتے رہے ہیں اور ان کے دور میں علم و فن کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ دنیا بھر کے فنون لطیفہ میں فاطمی فن تعمیر ایک نمایاں مقام رکھتا ہے اور آرنلڈ نے "پینٹنگز اِن اسلام" میں اسے زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انہی بنو فاطمہ کے ایک مشہور خلیفہ "المستنصر" کی جانشینی پر یہ نزاع پیدا ہوا ہے کہ ان کے بعد ان کا بڑا بیٹا نزار تخت کا وارث ہو یا "المستعلی" جو لوگ ہندوستان کے اسماعیلیوں میں "نزار" کے حامی ہیں وہ خوجے کہلاتے ہیں اور جو "المستعلی" کے ہم نوا ہیں وہ "بوہرہ" ہیں۔ بوہرہ اصل میں گجراتی کا لفظ "وہورو" ہے جس کے معنی تاجر یا سوداگر کے ہیں چونکہ اس فرقے میں شامل اکثر و بیشتر لوگ تجارت پیشہ ہیں اس لئے انہیں بوہرہ کہا جاتا ہے۔

مصر میں بنو فاطمہ کے زوال کے بعد ان کا مرکز یمن قرار پایا۔ یہیں سے ان کے "داعی مطلق" ہدایات جاری کرتے تھے۔ 400ھ میں پہلا اسماعیلی مبلغ عبداللہ (یا محمد علی؟) جنوبی ہندوستان میں آیا جس نے یہاں کے ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ کی اور اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ (اسماعیلی) مسلمان ہو گئے۔ یہ لوگ دسویں صدی ہجری کے وسط تک مذہبی لحاظ سے یمن ہی کو اپنا مرکز بنائے رہے۔ یہیں سے اپنے تمام مسائل کے حل کے لئے رجوع کرتے اور یہیں اپنے داعی کی زیارت کے لئے سفر کر کے جاتے۔ 946ھ میں ناموافق حالات کی وجہ سے "مستعلی" فرقہ کے داعی مطلق نے اپنا مرکز بمبئی کے قریب منتقل کر لیا۔ داؤد بن عجب شاہ مہاجر داعی مطلق یوسف ابن سلیمان کے جانشین تھے۔ داؤد بن

عجب شاہ فوت ہوئے تو ان کے بعد گجرات کے بوہروں نے داؤد ابن قطب شاہ کو داعی مطلق تسلیم کر لیا' انہی داؤد کی نسبت سے یہاں کے بوہرے داؤدی بوہرے کہلاتے ہیں۔ موجودہ داعی سیدنا برہان الدین اس سلسلہ داعیان میں باون (52) نمبر پر آتے ہیں اس سے پہلے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین 51 نمبر داعی تھے۔ سیدنا طاہر سیف الدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چانسلر بھی رہے ہیں آپ اپنے علم و فضل اور عربی زبان و ادب پر عبور کے سلسلے میں عالمی شہرت رکھتے تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں ان کا ایک عربی قصیدہ بہت مشہور ہے جس کے دو شعر تبرکاً ذیل میں درج کرتا ہوں۔

من عمل البرو ماودہ

اخزاہ ذوالعرش ولم یثب

لو لاہداہ لم یجد مہتدٍ

نہج الرشاد لا ولم یصب

ترجمہ..... (جس نے نیکی کا کام کیا مگر آپ سے محبت نہ کی اسے عرش کا مالک پروردگار رسوا ہی کرے گا اجر نہ دے گا (اس لئے) کہ جسے آپ ہدایت کا راستہ نہ دکھائیں نہ تو وہ راہ یاب ہو سکتا ہے اور نہ ہی صراط مستقیم پر چل سکتا ہے)۔

80ء میں مَیں بمبئی گیا تو سیدنا طاہر سیف الدین کے مزار پر بھی حاضری دی۔ پورا مزار فاطمی فن تعمیر کا نمونہ تو ہے ہی، مقبرے کی دیواروں اور چھت پر پورا قرآن حکیم بھی حسین رسم الخط میں نقش کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس اعتبار سے یہ مقبرہ پوری دنیا میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

بھارت میں سورت کے مقام پر ڈاکٹر سیدنا طاہر سیف الدین مرحوم نے "جامعہ سیفیہ" کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی تھی جو سالوں سے بڑی کامیابی سے تشنگان دین و دانش کی پیاس بجھا رہی ہے۔ ان کے خلف الرشید سیدنا برہان الدین نے انہی خطوط پر اب کراچی میں بھی "جامعہ سیفیہ" کا اجراء کیا ہے اس کے ریکٹر ڈاکٹر یوسف نجم الدین ہیں۔ 5 ر نومبر کو "جامعہ سیفیہ" کی افتتاحی تقریب تھی صدر جنرل محمد ضیاء الحق مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے تو خط کے ذریعے اس تقریب میں شمولیت کی دعوت دی بعد میں از راہ کرم زبانی بھی اصرار کیا۔ دیرینہ تعلقات کی وجہ سے انکار ممکن نہ تھا اس لئے حاضر ہونا پڑا۔ خیال تھا یہ ایک رسمی انداز کی تقریب ہو گی مہمان خصوصی کی خدمت میں سپاسنامہ پڑھا جائے گا وہ جوابی تقریر ارشاد فرما دیں گے اور اس کے بعد ڈنر میں "پلاؤ کھائیں گے احباب' فاتحہ ہو گا" اللہ اللہ خیر سلا۔ مگر تقریب میں پہنچا تو آنکھیں کھل گئیں یہ تو.......... از جہان دیگر است..... کی قبیل کی چیز تھی اس میں شمولیت نہ ہوتی تو واقعی افسوس رہتا۔

جامعہ سیفیہ شمالی ناظم آباد کے ایک خوبصورت سلسلہ تعمیرات میں واقع ہے۔ یہاں..... لائبریری

ہے' سیمینار ہال ہے' ڈائننگ ہال ہے' رہائشی بلاک ہیں مگر سب عمارتوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ سب کی سب قبلہ رو بنائی گئی ہیں۔ کیمپس کے وسط میں ایک حسین و جمیل مسجد ہے اور اس کے آگے اس کا وسیع صحن' یوں لگتا ہے جیسے ہم فاطمی عہد کے مصر کی کسی مسجد میں آنکلے ہیں۔ مسجد ان تمام تعمیرات میں مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اپنے احباب کے ہمراہ جامعہ کے گیٹ پر پہنچا تو دو رویہ سینکڑوں کی تعداد میں بوہرہ نوجوان اسکاؤٹ خوبصورت وردی پہنے بڑے نظم و ضبط کے ساتھ ایستادہ تھے۔ مہمانوں کے جوتے سنبھالنے کے لئے بھی ایک پوری ٹیم مصروف عمل تھی۔ یہ مہمان سے جوتا لیتے اور اسے ایک مخصوص نمبر الاٹ کر دیتے۔ جوتا اتارنے کی جگہ سے لے کر جامعہ کے ہال تک کافی فاصلہ تھا مگر تمام راستے (اور بعد میں معلوم ہوا ہال سے لے کر دوسری تمام عمارات تک بھی) ایک ہی انداز کے دری نما قالین بچھے ہوئے تھے۔ جوتے اتارنے کی جگہ سے لے کر ہال میں بوہرہ جماعت کے چیدہ چیدہ اراکین اپنی ممتاز اور مخصوص پوشاک میں ملبوس دونوں طرف مہمانوں کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ ہم وقت مقررہ سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ رہے تھے خیال تھا ہماری کرسیاں نشان زد ہوں گی کوئی دقت پیش نہیں آئے گی' مگر ہال میں پہنچے تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی پہلی دفعہ یہ دیکھا کہ ایسی تقریب جس میں صدر مملکت بطور مہمان خصوصی شامل ہو رہے تھے کرسیوں کے بجائے فرش پر منعقد ہو رہی تھی۔ تمام کے تمام شرکاء زمین پر بیٹھے تھے ان میں وزرائے کرام بھی تھے اور علمائے عظّام بھی' سفیر بھی تھے اور کراچی شہر کے بڑے بڑے امیر کبیر بھی' اسٹیج پر کوئی کرسی نہ تھی خوبصورت قالینوں پر گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے انہی سے ٹیک لگا کر صدر اور گورنر کو سیدنا اور جامعہ کے ریکٹر کے ساتھ تشریف فرما ہونا تھا۔ مجھے اسٹیج کے بالکل پاس اگلی صف میں جگہ ملی یہیں جناب محمود ہارون بھی تھے اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی بھی' ڈاکٹر جمیل جالبی بھی تھے اور سید ہاشم رضا بھی' نوابزادہ عبدالغفور ہوتی بھی تھے اور سید شریف الدین پیرزادہ بھی' حکیم محمد سعید دہلوی بھی تھے اور موتمر عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل انعام اللہ خان بھی' جو حضرات سوٹ میں تھے ان کا برا حال تھا ایسے ہی ایک رکن شوریٰ تو اپنا کوٹ کندھے پر ڈال کر صدر صاحب کے آنے سے پہلے پہلے چند منٹ کے اندر تقریب سے نکل کھڑے ہوئے ان سے پتلون کے ساتھ فرش پر بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ بعض حضرات گھٹنوں کو پکڑے درد کی شکایت کر رہے تھے۔ تہذیب جدید نے ہمیں کرسی میز سے کس طرح باندھ کر رکھ دیا ہے اس کا اندازہ اس تقریب سے ہوا۔

صدر صاحب آئے تو جامعہ کے طلبہ نے پہلے قومی ترانہ پڑھا۔ تمام حاضرین بھی ان کے ساتھ احتراماً کھڑے ہوئے بعد میں جلسے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ تلاوت کے بعد اردو میں ڈاکٹر یوسف نجم الدین نے خیر مقدمی الفاظ کہے اور ان کے بعد سیدنا برہان الدین نے اپنا خطبہ پڑھا۔ سیدنا عام بول چال میں اردو زبان قدرے مشکل سے بولتے ہیں مگر تحریر انہوں نے کامل صحت تلفظ کے ساتھ بڑی روانی سے پڑھی ان کے خطبے کا وہ ٹکڑا بڑا ہی فکر انگیز تھا جس میں انہوں نے کہا کہ:-

"اسلام اپنی فکر میں' عقیدے میں' تاریخی اور جغرافیائی حیثیت میں عالمی ہے۔

مفاتح الارض یعنی زمین کی چابیاں مالک ارض و سمٰوات نے اپنے دست قدرت سے اسلامیوں کو عطا کی ہیں خشکی اور تری کے تمام انٹرنیشنل راستے زمین کی ان چابیوں سے ہو کر گزرتے ہیں جن پر مسلم ملکوں یا مسلم آبادیوں کا پہرہ ہے۔ کراچی بھی ان میں سے ایک اہم چوکی ہے جس کا وزن ووقار آج تمام دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بندر گاہ ایشیا' افریقہ' یورپ اور امریکہ کے مسائل کے لئے آج ایک کلید ہے اور یہیں ہم نے اپنے درس کا کلیدی مرکز پھر سے قائم کیا ہے"۔

مصر کے موجودہ نائب وزیر اعظم اور اسلامک سیکرٹریٹ کے سابق سیکرٹری جنرل السید محمد حسن التہامی حکومت مصر کی نمائندگی کرنے کے لئے بطور خاص اس تقریب میں شریک تھے۔ تہامی صاحب بڑے پر جوش مسلمان اور روایتی عرب خطیب ہیں 'اب شمع ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے عربی زبان میں خوب خوب داد خطابت دی۔ مترجم کو بھی آفرین کہ وہ ساتھ کے ساتھ بڑی مہارت سے اردو میں ترجمہ پیش کرتا جارہا تھا۔ اس دوران مجمع بھی مقررین کے اچھے جملوں اور نکتوں پر دل کھول کر داد دے رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے مقرر اور اجتماع کے درمیان کوئی فاصلہ موجود نہیں۔

جنرل صاحب نے بھی لکھی ہوئی تقریر پڑھی۔ معلوم ہوتا ہے فوج کے زمانے میں وہ زیادہ تر انگریزی ہی لکھتے بولتے رہے ہیں اس لئے اردو میں رواں ہوتے ہوتے انہیں خاصا وقت لگا ہے۔ کبھی کبھی وہ عینک اتار کر اور مسودہ کو ایک طرف رکھ کر فی البدیہہ بھی تقریر کرنے لگتے ہیں بس وہی لمحہ دل کی بات زبان پر آنے کا ہوتا ہے یہاں بھی انہوں نے عینک اتار کر مسودہ ایک طرف رکھ دیا اور اس منفرد تقریب کے بارے میں اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے اسے ایک مثالی اسلامی تقریب قرار دیا۔ اجتماع کے نظم وضبط سے متاثر ہو کر انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ کاش ہماری سیاست میں بھی یہی اسلامیت ہو جائے۔ صدر صاحب سے عرض اب است ملک اور معاشرے کے مجموعی مزاج سے ہوتا ہے۔ زہریلے دودھ سے صحت مند مکھن نہیں نکالا جاسکتا۔ آپ معاشرے کو رست سیاست سے آپ درست ہو جائے گی لیکن مشکل یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کا کام بھی اچھی سیاست کے ذریعے سے ہو سکتا محض تعزیرات اور انتظامی اقدامات سے نہیں' آپ سیاست کو ایک اسلامی فریم ورک کے اندر آزاد کر دیجئے نظم وضبط اور اسلامیت اس میں بتدریج پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال اس جملہ معترضہ سے قطع نظر صدر صاحب نے اعتماد سے باتیں کر کے داد بھی خوب سمیٹی اور داد کے ڈونگروں پر ان کا جھک کر عاجزی سے سلام کرنے کا انداز تو اور بھی قابل داد تھا۔

آخر میں جامعہ کے ریکٹر نے دنیا بھر میں اسلامی نظام تعلیم کا آغاز کرنے کے لئے ایک کروڑ روپے سے ایک ٹرسٹ قائم کرنے کا بھی اعلان کیا اور یہ بھی بتایا کہ جناب محمود ہارون اور جناب شریف پیرزادہ نے اس کی رکنیت قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔

بعد میں پر تکلف کھانا ہوا اور ڈھائی تین گھنٹے کی یہ فرشی نشست اختتام کو پہنچی۔

میں جامعہ سے باہر نکلا تو خیالات کا ہجوم میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں سوچ رہا تھا چند لاکھ افراد پر مشتمل یہ جماعت جس طرح کی قابل رشک تنظیم رکھتی ہے اور تعلیمی اور سماجی میدانوں میں جس طرح برابر پیشرفت کر رہی ہے کیا ویسا ہی انداز سواد اعظم کی جماعتیں بھی اختیار کر سکیں گی؟ انہیں تو مسلمان حکومتوں سے بے تحاشا مالی امداد بھی ملتی ہے سیاست اور اقتدار میں بھی جگہ جگہ ان کا عمل دخل ہے اور یہ جماعت نہ تو سیاست سے کوئی علاقہ رکھتی ہے نہ کسی مسلمان حکومت سے گرانٹ کی خواستگار ہے کوئی اکثریتی مکتب فکر میں ایسا رجل رشید جو اس لمحۂ فکریہ پر غور و خوض کر سکے۔

(2، ستمبر 80ء)

جگر لخت لخت!

(1)

پچھلے دنوں ایک صاحب نے فون کیا "میں کبھی آپ سے نہیں ملا۔ آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ صرف ہمارا ایک درد مشترک ہے اس رشتے سے ملاقات کیلئے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "تشریف لے آیئے۔" اگلے دن وقت مقررہ پر تشریف لے آئے۔ سانولے رنگ کے دبلے پتلے دھان پان آدمی۔ مجسمۂ تہذیب و شرافت' آزادی سے پہلے لکھنؤ سے تعلق تھا اس لئے قدرتاً زبان بہت شائستہ اور نستعلیق، کہنے لگے "آج آنا بہت مشکل تھا ابھی ابھی بیوی کو ہسپتال میں داخل کرا کے آ رہا ہوں وہ بلڈ پریشر میں مبتلا ہے لیکن صرف اس لئے آ گیا کہ آپ سے ملنے کا وقت طے تھا۔" میں منتظر تھا کہ یہ ابھی کوئی حرف مطلب کہیں گے لوگ اکثر تمہیدیں بہت شاندار باندھتے ہیں مگر چند منٹ ہی میں اپنی اصلیت پر آ جاتے ہیں۔ چائے کیلئے پوچھا تو اس کے لئے بھی معذرت کر دی۔ کہنے لگے میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ ان پندرہ منٹوں میں اپنے ذاتی اور خاندانی حالات بیان کئے ایک تصویر دکھائی یہ دو نوجوانوں کی تصویر تھی ان میں سے ایک فوجی وردی میں تھا لیفٹیننٹ یا کیپٹن' دوسرا اس سے دو چار سال بڑا ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے یہ دوستوں جیسے بھائی اور بھائیوں جیسے دوست لگ رہے تھے کہنے لگے "یہ دونوں میرے بیٹے ہیں' ان میں سے ایک پچھلے سال اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دوسرا اس سال ایک کار کے حادثے میں بچھڑ گیا۔ میں نے فاروق کی برسی پر آپ کا کالم دیکھا تو جی چاہا تعزیت کروں اور یہ بھی بتاؤں کہ اس دنیا میں مجھ ایسے کیسے کیسے دکھی انسان زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔"

شیخ سعدی شیرازیؒ کی مشہور حکایت ہے دورانِ سفر جوتا پھٹ گیا۔ چلنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کتنا کم نصیب ہوں جوتا بھی میسر نہیں معاً ایک شخص پر نظر پڑی اس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے بے ساختہ حمد اور شکر کے کلمات زبان پر جاری ہو گئے "اے اللہ تیرا شکر ہے، جوتا نہیں تو کیا ہوا پاؤں تو سلامت ہیں۔"

فاروق کی برسی پر تعزیت بہت سے احباب نے کی عنایت نامے بھی لکھے لیکن میری آنکھیں کھولنے کیلئے ایک دکھی اور مجبور باپ کی طرف سے پرسا دینے کا یہ انداز سب سے نرالا تھا۔ ہم کتنے بے صبر اور ناشکرے ہیں۔ اپنی تکلیف اور غم پر بلبلانے اور فریاد کرنے لگتے ہیں مگر اپنے ارد گرد آنکھ اٹھا کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ہم سے کہیں زیادہ کتنے دوسرے بندگان خدا کیسے کیسے صدمے جھیل چکے ہیں۔ میں نے تو ایک بیٹا کھویا یہ بزرگوار دونوں ہی بیٹے اپنے رب کو سونپ چکے تھے اور اس کے باوجود اس کی رضا پر صابر و شاکر تھے۔

(2)

پچھلے ایک دو ہفتوں سے خان عبدالولی خان کے ایک انٹرویو پر چیخم دھاڑ مچی ہوئی ہے۔ کئی دوستوں نے مجھ سے بھی فرمائش کی ہے کہ اس پر لکھو، میری مشکل یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے وقت میں بچہ تھا آزادی سے سال چھ ماہ پہلے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کیا لیکن کچھ ایسا قابل ذکر نہیں کہ تحریک پاکستان کا سپاہی کہلاؤں۔ خان صاحب کے اٹھائے ہوئے نکات پر اصل روشنی تو وہ اکابر ڈال سکتے ہیں جنھوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ ہی نہیں لیا بلکہ قوم کی راہنمائی بھی کی ہے ایسے چند اصحاب ابھی بفضل خدا زندہ ہیں وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں تو یہ یقیناً ہمارے لئے بصیرت افروزی کا باعث ہوگا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک نسل جوان ہو گئی لیکن تحریک پاکستان کی مستند تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہو سکی۔ خود مسلم لیگ کئی سال برسراقتدار رہی قومی وسائل اس کے لیڈروں کی تحویل میں تھے۔ ان کے حافظے تروتازہ تھے اور یادیں شگفتہ و شاداب۔ وہ چاہتے تو یہ تاریخ بہت آسانی سے محفوظ ہو جاتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طرح طرح کی بولیاں بولی جا رہی ہیں نئے نئے نکتے اٹھائے جا رہے ہیں اور 13ر اور 14ر اگست کی درمیانی رات کو پیدا ہونے والی نسل کا ذہنی الجھاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

میں خان عبدالولی خان کو بہت قریب سے نہیں جانتا۔ ذاتی ملاقاتیں ہماری گنی چنی ہیں ہاں قومی اسمبلی میں ان کی کارکردگی دیکھی ہے یا پھر لندن میں ان کی علمی مصروفیات کی کچھ کچھ مجھے خبر ہے۔ وہ بہت پڑھے لکھے، شریف و شائستہ اور خوش گفتار انسان ہیں۔ پشتو تو ان کی مادری زبان ہے، اردو اور انگریزی پر بھی انھیں کامل عبور ہے۔ پارلیمانی مقرر اس دور میں ان کے پائے کے کم ہی ہونگے۔ لندن میں ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی تو بتایا تھا کہ آج کل وہ ایک کتاب کے سلسلے میں ضروری مواد اکٹھا کر رہے ہیں۔ وہاں کی انڈیا آفس لائبریری میں تقسیم سے قبل کی دستاویزات، انگریز حکمرانوں اور ہندو مسلم راہنماؤں کی

خط و کتابت سی آئی ڈی کی خفیہ رپورٹیں اب عام ملاحظے اور مطالعے کیلئے دستیاب ہیں خان صاحب نے سر ظفراللہ خان کی طرف سے منسوب تقسیم ہند کا جو فارمولا اپنے ہینڈ رائٹنگ میں ہفت روزہ "چٹان" کو برائے اشاعت دیا ہے یہ انہوں نے لندن کی اسی لائبریری کے کاغذات سے حاصل کیا ہوگا میرے خیال میں غلطیاں ان سے دو ہوئیں ایک تو ایسے نازک موضوعات پر انٹرویو نہیں دیئے جاتے انہیں خود اپنے لفظوں میں ضبط تحریر میں لانا مناسب ہوتا ہے۔ انٹرویو لینے والا کتنا ذہین اور دیانت دار کیوں نہ ہو (اور یہ انٹرویو پڑھ کر اسے لکھنے والے کی صحافیانہ صلاحیت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے) وہ کسی کے ما فی الضمیر کو ایک آدھ لفظ کے الٹ پھیر یا غیر دانستہ فروگزاشت کیوجہ سے کچھ کا کچھ بنا سکتا ہے دوسرے سر ظفراللہ خان کے فارمولے کی تفصیل خان صاحب کے عکس تحریر کے بجائے خود دستاویز کے عکس پر مشتمل ہونی چاہئے تھی۔ ان کے ہاتھ کے لکھے کو کوئی بھی چیلنج کر سکتا ہے۔

خان صاحب کے اس "انکشاف" پر سیاسی حلقوں میں جو ردعمل ہوا وہ ہمارے ناپختہ جذباتی اور غیر سائنسی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ بعض لیڈروں نے جواباً خان صاحب پر ذاتی حملے کئے' ان کے خاندان کو رگید اانہیں غداری کی پرانی "سندات" تقسیم کیں مگر کسی نے یہ تکلیف گوارا نہیں کی کہ لندن جا کر اصل دستاویزات کا مطالعہ کرتا اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ خانصاحب کے دعوے کی تردید کرتا۔ "غدار گری" کا حربہ تو پرانا ہو چکا۔ اس الزام تراشی کے مزاج نے تو محبّ وطن اور "غدار" جیسے الفاظ کی اہمیت ہی ختم کر دی ہے۔ پاکستان ان دنوں پھر ایک بار تاریخ کے دوراہے پر کھڑا ہے اقلیتی صوبوں کے عوام یا راہنماؤں کے خلاف اسطرح کی بدزبانی اور بدگمانی ہمیں کسی بھی صورت حال سے دوچار کر سکتی ہے۔ اس لئے اے قارئین کرام! میں تو اس موضوع پر کچھ لکھنے سے معذور ہوں صرف اس کالم کی وساطت سے مسلم لیگی راہنماؤں کی خدمت میں عرض پرداز ہوں کہ "کالعدم سیاست" میں اپنا وقت برباد کرنے کی بجائے تحریک پاکستان کی تاریخ محفوظ کرنے کا قرض اور فرض ادا کریں۔ خانصاحب کے انٹرویو کا جواب دینا ہو تو لندن جا کر کچھ وقت متعلقہ کاغذات کی چھان بین کریں' محض گالیاں دینے سے مسئلے کا حل نہیں نکلے گا۔

اور ہاں! بر سبیل تذکرہ کوئی صحافی سر ظفراللہ خان سے بھی انٹرویو لے وہ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟

(3)

"مشاہدات و تاثرات" میں اپنے سفر لندن کے حوالے سے میں نے "لائن آف دی ڈیزرٹ" پر جو کالم لکھا تھا اور فلم کے میڈیا کو تعمیری اور اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر جو زور دیا تھا' الحمدللہ' اس کا "خاطر خواہ" نتیجہ بر آمد ہوا میں اس نتیجے سے بے خبر رہتا اگر عزیزی مسعود شورش مجھے "چٹان" کا وہ شمارہ نہ بھجواتے جس میں "انجمن اتحاد المسلمین" اندرون دہلی گیٹ ملتان کے ایک احتجاجی مراسلہ پر

چٹان کے ایک قلمکار سعید اظہر صاحب نے تبصرہ کیا ہے' اس تبصرے سے معلوم ہوا کہ انجمن مذکور کے جنرل سیکرٹری صاحب نے اپنے دستخطوں سے ایک مراسلہ تمام اخبارات کو بھجوایا ہے جس میں فلموں کو نیک مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا نظریہ پیش کرنے پر مجھے "جہنمی' بے دین' اسلام کے خلاف ناپاک سازش کرنے والا' ملعون' اسلام کا دشمن اور اسلام کا منکر" قرار دیا ہے اور اسلامیان پاکستان سے اپیل کی ہے کہ وہ یہ احتجاجی مراسلہ انجمن کے دفتر سے منگا کر زیادہ سے زیادہ تعداد میں متعلقہ افراد تک پہنچائیں۔ چٹان کے مضمون نگار بنیادی طور پر جماعت اسلامی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں مگر اختلاف کے باوجود انہوں نے انجمن کے اس مراسلہ پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ دراصل ہم مسلمانوں کی حرماں نصیبی ہے۔ جو سینکڑوں سالوں سے شروع ہے مسلمانوں کے ملکوں میں موجود اس قسم کے افراد یا گروہ جو علم اور ارتقاء سے ناواقف اور اس کے دشمن ہیں۔ جنھوں نے ملت اسلامیہ کی ریڑھ کی ہڈی سے مغز تک نکال لیا ہے یہ لوگ نہ مسلمانوں کو دنیا کے علوم وفنون کی طرف دھیان دینے دیتے ہیں' نہ ہی فطرت کے تقاضوں کو "اون" کرنے دیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی دور میں مسلمانوں کو زندگی کے مسائل کا فطری جائزہ لینے دیں یا تجزیہ کرنے دیں یا عمل پیرا ہونے دیں' ایسا ہوا نہیں اور ان لوگوں نے اسے "خدا سے بغاوت" قرار دیا نہیں۔"

مضمون نگار نے سیکرٹری صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ

"ان سے ہو سکے تو "اسلام اور فلم" کے عنوان سے مولانا مودودی کے اس انٹرویو کا مطالعہ کریں جو انہوں نے ایک زمانے میں علی سفیان آفاقی کو دیا تھا انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایسے مسائل حیات پر گفتگو ہو سکتی ہے اور جو شخص اس پر اپنے افکار و آراء کا اظہار کرے اس سے شدید ترین اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کے دین وایمان پر انگلی اٹھانا کسی طور جائز نہیں۔"

پاکستان میں رات دن فلمیں چل رہی ہیں سینما گھر آباد ہیں کبھی آپ نے سنا کسی انجمن نے ان کے خلاف کوئی احتجاجی مہم چلائی؟ مذہبی سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لینے کیلئے اپنے منشور شائع کرتی رہی ہیں۔ کبھی کسی نے یہ پروگرام پیش کیا سینما گھر بند کر دیئے جائیں گے؟ ٹیلی ویژن پر فلمیں ہوتی ہیں کبھی آپ نے سنا کسی واعظ مولوی یا مفسر نے ٹیلی ویژن پر آنے سے انکار کر دیا ہو؟ الٹا مطالبے ہوتے ہیں درس اور وعظ کا وقت بڑھا دیا جائے' میں نے مسلمان دنیا کے اس نفاق و تضاد کی نشاندہی کی اور علماء سے درخواست کی کہ وہ اپنی تشریحات پر نظر ثانی کریں یہ ایجادات حضور کے زمانے میں نہ تھیں بعد میں ہوئیں' یہ بذات خود اچھی یا بری نہیں ہیں ان کا استعمال انہیں اچھا یا برا بناتا ہے آپ انہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے

استعمال کریں یہ اچھی ہیں۔ برے مقاصد کے لئے استعمال کریں بری ہیں۔ اسی ذیل میں میں نے مسلمان حکومتوں اور بالخصوص حکومت پاکستان سے عرض کیا تھا کہ وہ مغربی دنیا کو اسلامی اقدار سے روشناس کرانے کیلئے فلمی میڈیا سے بھی کام لیں۔ انجمن اتحاد المسلمین نے دین دشمنی اور انکار اسلام کا تمغہ مجھے اسی جرم عظیم پر عطا کیا ہے مناسب ہے کہ اب میں اپنے مؤقف میں ترمیم کر لوں، فلم کو بدستور فحاشی عریانی اور آوارگی پھیلانے کا ذریعہ بنائے رکھنا چاہئے، عالم مغرب کو کھلی چھٹی ہو کہ وہ اپنی تاریخی اور سائنسی فلموں سے عالم اسلام کی ذہنی دھلائی کرتا رہے۔ ہر مسلمان حکومت فلم بینی اور فلمسازی کو گناہ بھی سمجھے اور فلمی صنعت کے فروغ و تحفظ پر کروڑوں روپے بھی خرچ کرے۔ ٹیلی ویژن کو عقیدے کی رو سے حرام سمجھا جائے اور اس میں فلموں کے ساتھ ساتھ محفل وعظ بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کیلئے برپا ہوتی رہے تو لوائے کفر اور اسلام، دوزخ اور بہشت کے کلید بردارو! میری توبہ قبول کرو، میں کبھی نہیں کہوں گا کہ فلم کو اسلامی اور تعمیری مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے، شوق سے اسی انداز میں کاروبار زندگی جاری رکھو اور مجھ گناہ گار سے "اصلاح احوال" کی جو مذموم حرکت سرزد ہوئی ہے للہ اسے معاف کردو۔ اپنے اسلامی معاشرے کی شہریت اور رکنیت مجھ سے نہ چھینو۔ میں نفاق اور تضاد کی اس زندگی پر دل سے راضی ہوں۔

(7 جنوری 1982ء)

کچھ فن خطابت کے بارے میں

جس طرح برصغیر کی سیاسی تاریخ قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے تفصیلی تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہلائی جا سکتی اسی طرح اس کے تذکرۂ خطابت میں بھی ان کا ذکر انتہائی اہم ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ برصغیر میں مسلمان قوم کے عظیم اور انتہائی سربر آوردہ رہنما کروڑوں مسلمانوں کے نجات دہندہ اور پاکستانی قوم کے باعظمت باپ ہیں لیکن اس کا احساس شاید کم لوگوں کو ہے کہ انتہائی بلند کردار، راست گفتار اور عظیم سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے پارلیمانی مقرر بھی تھے، کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ وطن بنوا کر ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جس نے انہیں بقائے دوام کی سند عطا کی ہے لیکن یہ کارنامہ جہاں بڑی حد تک ان کی ایمانی قوت اور حسن تدبر کا نتیجہ ہے وہاں اس کیلئے ان کی مہارت تقریر کو بھی خراج تحسین پیش کرنا پڑے گا۔ تعلیم کے دوران وہ برطانوی پارلیمنٹ میں مسٹر گلیڈ اسٹون، مسٹر مورلے، مسٹر چیمبرلین اور دوسرے برطانوی مدبرین کی تقریریں بڑے ذوق وشوق سے سنا کرتے تھے اور ان کا ذہن اندر ہی اندر آئینی مباحثوں اور سیاسی تقریروں کیلئے تیار ہو رہا تھا۔ 1909ء میں وہ ہندوستان کی مرکزی کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور 1947ء تک متواتر منتخب ہوتے رہے۔ پارلیمانی بحث مباحثوں میں کوئی شخص ان کے مقابل کھڑا نہ ہو سکتا تھا اسمبلی میں ان کی تقریریں جوش اور ہوش کا حسین امتزاج ہوا کرتی تھیں۔ وہ جس موضوع پر بولنے کا ارادہ کرتے اس کے متعلق پوری تیاری کر کے اسمبلی میں جایا کرتے تھے۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال میں کوئی ان کا ثانی نہ

تھا۔ ان کا انداز تقریر نہایت واضح اور غیر مبہم تھا وہ نہ بہت تیز بولتے تھے اور نہ بہت آہستہ اور نہ بہت اونچی اور نہ بہت دھیمی آواز میں، ان کی تقریر ولولہ انگیز ہوتی تھی لیکن اس کے اندر ٹھوس منطقی استدلال ہوتا تھا اور ہر چند کہ ان کی ہر تقریر میں جوش اور جذبہ پایا جاتا تھا لیکن جذبات کو مشتعل کرنے والی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ وہ الفاظ کے استعمال پر پوری طرح قادر تھے اور اپنی تقریر میں ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی استعمال نہ کرتے تھے۔ اسمبلی کے طویل زمانہ رکنیت میں انہوں نے جو تقریریں کی ہیں وہ ان کی غیر معمولی قانونی قابلیت اور آئینی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

پارلیمانی خطابت سے گزر کر جب ہم عوامی جلسوں میں ان کی تقریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں بھی ان کی عظمت کا اعتراض کرنا پڑتا ہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں وہ عام طور پر پہلے سے تیار کئے ہوئے خطبات سے کام لیتے تھے لیکن بسا اوقات انہیں فی البدیہہ تقریریں بھی کرنا پڑتی تھیں اور یہ فی البدیہہ تقریریں کبھی کبھی بہت طویل بھی ہوتی تھیں لیکن کیا مجال جو کہیں ربط ٹوٹے یا ذرہ برابر جھول آئے، لوگ ان کی تقریروں سے مسحور ہو جایا کرتے تھے اور وہ لوگ بھی جو ان کی تقریر سمجھ نہ سکتے تھے ان کے لب ولہجہ اور انداز خطابت سے ایسے متاثر ہوتے کہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھے نہایت عقیدت اور احترام سے ان کی تقریر سنتے رہتے۔

خطابت کی دنیا میں ماضی قریب کا ایک درخشاں نام سابق وزیر اعظم بھٹو مرحوم کا ہے، جس طرح وہ سیاست میں اپنا ایک جداگانہ اسلوب رکھتے تھے اسی طرح خطابت میں بھی ان کا ایک مخصوص اور منفرد انداز تھا، پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد کے زمانے میں مجھے ان کے ساتھ کئی جلسوں سے خطاب کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی ہر تقریر کے بعد میں نے ان کے انداز خطابت اور مواد سے بہت کچھ حاصل کیا ہے خدا کا شکر ہے کہ مجھ میں یہ استکبار نفس کبھی پیدا نہیں ہوا کہ...... "مجھ سا ہو تو سامنے آئے" لیکن یہ ضرور ہے کہ بہت کم خطیبوں کی تقریر سننے کی آرزو میرے دل میں پیدا ہوئی بطور سامع میں انہی جلسوں میں عام طور پر شریک رہا ہوں جن میں دوسرے مقررین کے ساتھ مجھے بھی بولنا ہوتا تھا جو تقریریں فنی اور علمی لحاظ سے وقیع نہ ہوں ان کا سننا میرے لئے بڑا صبر طلب ہے۔ بھٹو مرحوم ان خطیبوں میں سرفہرست ہیں جن کے سامعین میں شامل ہو کر مجھے خوشی حاصل ہوتی تھی۔ انگریزی ان کا اصل میدان تھا اور اس میں انہوں نے بڑے بڑوں سے لوہا منوایا تھا وہ جب انگریزی بولتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ مترادفات کا ایک دریا موجزن ہے وہ ہنساتے بھی اور رلاتے بھی چٹکی بھی لیتے اور نشتر بھی لگاتے، مشہور امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر کسنجر پاکستان آئے تو سابق وزیر اعظم نے ان کے اعزاز میں ایک ضیافت دی۔ تقریر حسب معمول لکھی ہوئی تھی کیونکہ ایسے مواقع پر ایک ایک لفظ تول کر بولا جاتا ہے مگر انہوں نے لکھی ہوئی تقریر جیب میں ہی رہنے دی اور اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں فی البدیہہ اور برجستہ تقریر کی اس تقریر کی

ادبیت، طنز و ظرافت اور فصاحت و بلاغت کا اثر یہ تھا کہ کسنجر جیسے عالمی مدبر کو بھی بر سر محفل یہ اعتراف کرنا پڑا کہ سابق وزیر اعظم کی تقریر میں جو روانی اور جولانی ہے میں اس کا جواب لانے سے قاصر ہوں۔ اس دن سبھی حاضرین نے محسوس کیا ان کی اور کسنجر کی خطابت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انگریزی کے بعد روانی کے لحاظ سے ان کی تقریروں میں دوسرا نمبر سندھی کا تھا۔ سندھی ان کی مادری زبان تھی گو انگریزی پڑھے لکھے لوگ اور خاص طور پر یورپ میں تعلیم پانے والے لوگ اپنی مادری زبان بھول جاتے ہیں کچھ تو اس میں بات کرنا بھی کسر شان سمجھتے ہیں اور کچھ کا حافظہ ہی انگریزی زبان سے اتنا مرعوب ہو جاتا ہے کہ وہ کسی دیسی زبان کیلئے اس میں کوئی گنجائش نہیں پاتے مگر سابق وزیر اعظم کا معاملہ مختلف تھا۔ سندھ کے اکثر علاقوں میں سابق وزیر اعظم اردو کے علاوہ سندھی زبان میں خطاب کرتے۔ میں نے لاڑکانہ میں ان کی ایک سندھی تقریر سنی، لاڑکانہ کے شہریوں نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا انتظام کیا تھا اور تقریر سپاسنامے کے جواب میں تھی۔ اس تقریر میں بھی انگریزی سے کم روانی نہ تھی مزید بر آں یہ اتنی سادہ اور عام فہم تھی کہ کوئی بھی اردو بولنے والا اسے بآسانی سمجھ سکتا تھا یوں لگتا تھا جیسے یورپ میں اعلیٰ تعلیم پانے والا کوئی شخص نہیں بلکہ سندھی زبان کا ایک عوامی خطیب لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہو۔

.بھٹو صاحب صدر ایوب کی حکومت سے علیحدہ ہوئے اور انہوں نے سیاسی میدان میں نئی جدوجہد شروع کی تو پرانے سیاستدانوں کا خیال یہ تھا کہ وہ پاکستانی عوام کے قائد نہیں بن سکیں گے ان کے نزدیک اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ وہ زیادہ اچھی اردو نہیں جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ موچی دروازہ چوک یادگار، نشتر پارک اور لیاقت باغ میں انگریزی زبان کو ذریعۂ اظہار نہیں بنایا جا سکتا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی خوش فہمی دور ہو گئی، آہستہ آہستہ سابق وزیر اعظم کو اردو زبان پر بھی عبور حاصل ہوتا چلا گیا انہوں نے اس سلسلے میں بڑی محنت سے کام لیا۔ مصروفیات کے اژدہام کے باوجود اردو سیکھنے کیلئے وقت نکالا، بول چال کی مشق کی اپنے قریبی ساتھیوں سے الفاظ اور اصطلاحوں کے صحیح تلفظ اور محل استعمال کے بارے میں بحث و تمحیص کی اور اتنا ذخیرۂ الفاظ جمع کر لیا کہ وہ ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے بے تکان اردو زبان میں خطاب کرتے اور انہیں کوئی دِقّت محسوس نہ ہوتی یہ ٹھیک ہے کہ اردو زبان میں کبھی کبھی ان سے تذکیر و تانیث یا تلفظ کی کوئی نہ کوئی فروگزاشت ہو جایا کرتی تھی مگر وہ ایسی معصومانہ ہوتی کہ بھونڈی لگنے کی بجائے بھلی لگتی اور عوام اس سے الٹا محظوظ ہوتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تقریریں سکون سے سنی جاتی تھیں لیکن اس چیز میں ان کے کسی کمال خطابت کو دخل نہ تھا۔ ان کی تقریر ایک تحریری مقالے کی طرح ہوتی تھی جس میں وہ خشک اور جذبات سے عاری انداز اختیار کر کے تقریر کو اچھا خاصا بوجھل بنا لیتے اور جو کچھ وہ کہتے اوسط درجے کے سامع کیلئے آسانی سے قابل فہم نہ ہوتا۔ کوئی اور شخص اس قسم کی تقریر کرتا تو شاید مجمع

تھوڑی ہی دیر کے بعد اٹھ کھڑا ہوتا لیکن مولانا کی علمی شہرت و وجاہت اور اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ان کا احترام دو ایسے عوامل تھے جن کے بل پر وہ جلسوں میں پوری توجہ سے سنے جاتے البتہ پٹھانکوٹ کے زمانہ قیام میں انہوں نے ایک مقامی مسجد میں خطبات جمعہ کا جو سلسلہ شروع کیا تھا (اور جواب کتابی صورت میں بھی دستیاب ہے) اس میں علمی شان کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک عوامی انداز بھی پایا جاتا تھا لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے مولانا موصوف یہ خطبے بھی تحریری صورت میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے ان کا شمار خطابت کے شہ پاروں میں نہیں کیا جا سکتا۔

جماعت اسلامی والے عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے خطابت میں ایک نیا انداز اور نیا اسلوب پیدا کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر جماعت کا مکتب فکر خطیبانہ جوہر نہیں رکھتا۔ جس طرح مجلس احرار خطابت کیوجہ سے آگے بڑھی ہے اس جماعت کے اکابر اپنی تحریروں کی وجہ سے معروف ہیں ان کی تقریریں خشک تحریروں کی مانند ہوتی ہیں اور ان تقریروں میں وہ ایسی لق و دق اور نامانوس اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جو اکثر اوقات سامعین کے سر سے گزر جاتی ہیں البتہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت اس جماعتی رنگ سے مستثنیٰ تھی (جو مولانا مودودی مرحوم کی غیر حاضری میں امیر جماعت ہوتے تھے مگر بعد میں جماعت سے اختلافات کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے تھے) مولانا اصلاحی نہایت بلند پایہ خطیب ہیں اور ان کی تقریریں علم اور جذبے کا حسین آمیزہ ہوتی ہیں یا پھر مولانا گلزار احمد مظاہری ہیں جن کا وعظ و خطابت میں اپنا ایک رنگ ہے مگر یہ رنگ ان میں مجلس احرار کے سابقہ تعلق کے زیر اثر پیدا ہوا ہے اس میں جماعت کا کوئی عمل دخل نہیں۔

اس مکتب فکر کے ایک ممتاز ادیب اور شاعر جناب نعیم صدیقی ہیں جو جماعت کے دائرے میں ایک اعلیٰ پائے کے مقرر بھی شمار ہوتے ہیں اور اس میں شک نہیں وہ ایک اچھے لیکچرار ہیں، اپنے موضوع پر خوب محنت کرتے اور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عوامی خطابت کے جوہر سے وہ بھی محروم ہیں ایک بار موصوف کے فن تقریر پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے نہایت عمدہ اور موزوں تبصرہ کیا تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب 53ء میں ہم لوگ لاہور سنٹرل جیل میں نظر بند تھے۔ ان ایام اسیری کے دوران کبھی کبھی مجلس شعر بھی آراستہ ہوتی تھی۔ شاہ جی اور اکابرین احرار "دیوانی گھر" میں تھے اور ہم لوگ ایک دوسرے احاطہ "بم کیس" میں۔ جمعہ کے جمعہ شاہ جی ہمارے ہاں تشریف لاتے تو شعر و شاعری کی محفل بھی برپا ہوتی۔ ایک ایسی ہی محفل میں جناب نعیم صدیقی کا تعارف ان سے کرایا گیا تو فرمانے لگے۔

> "اچھا آپ ہیں نعیم صدیقی! خوب! کچھ تعارف تو آپ سے پہلے بھی ہے وہ اس طرح کہ ایک بار میں قاسم باغ کے قریب سے گزر رہا تھا وہاں کوئی جلسہ تھا جس میں ایک تقریر جاری تھی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو پوچھنے پر پتہ چلا کہ مشین نہ تھی آپ تھے۔"

مسلمانان ہند میں نظم وضبط، عسکریت اور روح جہاد پیدا کرنے میں خاکسار تحریک کی خدمات ناقابل فراموش ہیں مگر اس کے قائد علامہ عنایت اللہ خان المشرقی مرحوم کی اصل وجہ شہرت ان کی قابلیت اور پرجوش تحریریں تھیں یا پھر ان کا وہ جذبۂ قربانی جس کے تحت انہوں نے کوئی اعلیٰ ترین کیریئر اپنانے کی بجائے، جس کے وہ ہر طرح اہل تھے، اپنی خداداد صلاحیتوں کو ملک وملت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ علامہ صاحب کی تقریریں میں نے سنی ہیں بلکہ ایک دفعہ تو ان کے ساتھ مجھے ایک جلسہ میں خطاب کرنے کا بھی اتفاق ہوا، وہ اپنی تقریر لکھ کر لایا کرتے تھے اور اسے جلسے میں پڑھ کر سنا دیتے تھے اور بس، گو ان کی تحریری تقریر میں بھی لفظوں کی گھن گرج اور جذبات کا خروش قابل دید و شنید ہوتا تھا مگر ظاہر ہے یہ ایک خطیب کے برجستہ خطاب کا بدل نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی سامعین علامہ صاحب کو عزت و احترام سے سنتے اور فضا ان کے خطبے کے دوران نعرہ ہائے تکبیر سے گونجتی رہتی۔

خاکسار تحریک میں اپنے ادیبانہ اور جذباتی رنگ خطابت کی وجہ سے البتہ ابو شوکت صفدر سلیمی مرحوم کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، یہ علامہ صاحب کی وفات کے بعد خاکسار تحریک کے میاں بشیر احمد صدیقی گروپ سے وابستہ ہو گئے تھے اور ہفت روزہ "الاصلاح" کے مدیر تھے۔ جناب غلام احمد پرویز کے جریدہ "طلوع اسلام" کو بھی ایک عرصے تک ایڈٹ کرتے رہے۔ بڑے اچھے خطیب تھے۔ ہم نے ایک ساتھ کتنے ہی جلسوں سے خطاب کیا، افسوس جوانی میں اللہ کو پیارے ہوئے، زندہ رہتے تو دنیائے خطابت میں بڑا نام پیدا کرتے۔

(7راپریل 1983ء)

دنیا کے چند مشہور خطیب

ذہنی تحفظات سے قطع نظراس تاریخی حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ انگلستان آزاد منش اور حریت پسند لوگوں کا وطن ہے اور ان کی اس حریت پسندی اور آزاد منشی کی نشوونما میں ان نڈر بیباک اور پرجوش مقررین کا حصہ بہت اہم ہے جنھوں نے اپنی خطیبانہ صلاحیتوں سے کام لیکر حریت اور آزادی کے اس جذبے کو برقرار رکھا ہے۔ انگریز مقررین کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بیشتر پارلیمانی انداز خطابت کے ماہر تھے انگلستانی پارلیمان چونکہ پارلیمانوں کی ماں کہلاتی ہے اس لئے بڑے بڑے انگریز مقررین کی تربیت قومی پارلیمنٹ کی وسیع آغوش ہی میں ہوئی چنانچہ چارلس جیمز فاکس، ایڈمنڈ برک، ہنری جان پامراسٹن، بینجمن ڈسرائیلی، جان برائٹ، ولیم گلیڈ اسٹون، مورلے جوزف چیمبرلین اور ونسٹن چرچل سب کے سب عظیم پارلیمانی مقررین تھے۔ ان پارلیمانی مقررین میں برک کو ان تقاریر کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی تھی جو اس نے پارلیمنٹ میں وارن ہیسٹنگز پر چلائے جانے والے مقدمے میں ہیسٹنگز کے خلاف کی تھیں جب اس نے بیگمات اودھ کیساتھ وارن ہیسٹنگز کے متشددانہ سلوک کی تصویر کھینچی تو تماشائیوں کی گیلریوں میں بیٹھی ہوئی معزز انگریز خواتین سسکیاں بھر بھر رونے لگیں اور جب اس نے ہیسٹنگز کی بدعہدیوں کی داستان سنانی شروع کی تو ہر طرف سے شرم شرم کے آوازے بلند ہوئے۔ اثر آفرینی کی انتہا یہ تھی کہ اپنے خلاف برک کی تقریر سننے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے اعتراف کیا کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔

چارلس جیمز فاکس بھی اپنے وقت کا نہایت بلند پایہ مقرر تھا وہ عموماً حزب اختلاف میں ہوتا اور اپنے زور بیان اور مدلل انداز خطابت سے حکومتی بنچوں کی طرف سے ہونے والی تقریروں کے پرخچے اڑا دیا کرتا تھا۔ اس کا شمار اٹھارویں صدی کے اواخر اور 19 ویں صدی کے اوائل کے عظیم ترین خطیبوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تقریر کی بنیادی خوبیاں اس کے کلاسیکی ادب کے وسیع مطالعے پر مبنی تھیں اس کے علاوہ وہ انقلاب فرانس کے زبردست حامیوں میں تھا اور مساوات انسانی پر پختہ یقین رکھنے کی بنا پر اس کی تقریر میں عقیدے کی قوت پائی جاتی تھی وہ کہا کرتا تھا کہ مساوات کے بغیر حقیقی آزادی کا تصور محال ہے۔

پامرسٹن اور ڈسرائیلی بھی اپنے اپنے وقت میں انگلستان کے نہایت کامیاب وزیر اعظم رہے تقریر کے مرد میدان تھے۔ ان دونوں کو ان کی شاندار خدمات کے عوض لارڈ بنا دیا گیا۔ پامرسٹن کو 19 ویں صدی کا کامیاب ترین وزیر خارجہ سمجھا جاتا ہے وہ سولہ سال تک وزیر خارجہ اور نو سال تک وزیر اعظم رہا اگرچہ وہ اپنی تقریر میں بہت بلند آہنگ نہ تھا اور نہ ہی اس میں فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ خوبیاں تھیں تاہم اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایسی زبان استعمال کرتا تھا جو سامعین کی سمجھ اور عقل کے مطابق ہوتی تھی لہٰذا اس کی تقریر بڑی مؤثر ہوتی تھی۔ اپنی قوت تقریر کے بل بوتے پر وہ کئی بار ڈسرائیلی اور گلیڈ اسٹون ایسے مخالفین کی شعلہ بیانیوں کے باوجود پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

بینجمن ڈسرائیلی نے سیاست اور ادب میں نمایاں شہرت حاصل کی۔ اسے برطانوی کنزرویٹو پارٹی کا بانی شمار کیا جاتا ہے جب وہ پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کرنے اٹھا تو اس پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ چند بے تکی باتوں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا چنانچہ پارلیمنٹ میں قہقہوں اور شور و غل کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اسے مجبور ہو کر بیٹھ جانا پڑا لیکن بیٹھتے ہوئے اس نے اتنا ضرور کہا کہ سردست میں بیٹھ جاتا ہوں لیکن وقت آئے گا جب آپ میری تقریر خاموشی سے سنیں گے۔ وہ نہایت عزم و حوصلے اور فن تقریر میں مشق اور محنت کیوجہ سے آہستہ آہستہ بڑے پائے کا مقرر بن گیا اور سیاست اور خطابت دونوں پر قدرت ہونے کے سبب وزارت عظمیٰ تک پہنچا۔

برصغیر کے ہندو مسلمان پارسی عیسائی غرض تمام چھوٹی بڑی اقوام کے سیاسی رہنما سب سے زیادہ انگلستانی مقررین ہی سے متاثر ہوتے تھے بلکہ فن تقریر اور میدان سیاست دونوں میں انہی کی تقلید کرتے تھے جس زمانے میں قائد اعظمؒ تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگلستان گئے مسٹر گلیڈ اسٹون انگلستان کے وزیر اعظم تھے اس کے علاوہ مسٹر مورلے، مسٹر بالفور اور مسٹر جوزف چیمبرلین جیسے نامور پارلیمانی مقررین ایوان کے ارکان میں شامل تھے وہ پارلیمنٹ کے ان ارکان سے جو سب کے سب لبرل تھے بہت متاثر تھے اور ان کی تقریروں کو بڑے غور سے سنا کرتے تھے۔ ولیم گلیڈ اسٹون کا شمار 19 ویں صدی کے عظیم برطانوی مدبرین میں ہوتا ہے وہ آزاد خیال (لبرل) تھا اور اس بنا پر برطانوی عوام میں بے حد مقبول تھا اسے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ نے اسے چار بار وزیر اعظم منتخب کیا وہ بلا کا ذہین اور نہایت عمدہ مقرر تھا وہ

ایک اعلیٰ پائے کا ادیب بھی تھا جس کی وجہ سے اس کی تقریر ادبی خوبیوں سے مرصع ہوتی تھی اس پر مستزاد یہ کہ تقریر کی تیاری میں بڑی محنت سے کام لیتا تھا۔

جب بیورلے نکلسن ہندوستان آیا اور اس نے بہت سے ہندوستانی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں تو جس شخصیت سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تھی برطانوی پارلیمانی مقررین سے قائداعظمؒ کے ذہنی شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے اس موقع پر قائداعظمؒ جان برائٹ کی تقاریر کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جان برائٹ 19 ویں صدی کا انقلابی سیاستدان تھا وہ عوام اور مزدوروں کا ہمدرد تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھا اس نے انگلستان کے "قوانین غلہ" کے خلاف جو بڑے زمینداروں کے مفادات کی حفاظت کیلئے نافذ کئے گئے تھے زبردست تحریک چلائی جس کی وجہ سے بالآخر حکومت کو یہ قوانین منسوخ کرنے پڑے۔

اس کی خطابت میں قوت، طنطنہ اور وقار پایا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے عظیم سیاستدان مسٹر ونسٹن چرچل کے نام سے کون شخص ناواقف ہوگا۔

چرچل نے جو سر اور بعدازاں لارڈ کا خطاب پانے کے باوجود بھی مسٹر چرچل ہی کہلوانا پسند کرتے تھے پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی وزیر بحریہ کی حیثیت سے قوم کی بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں لیکن دوسری جنگ میں ہٹلر کی قہرمانی بری اور فضائی قوتوں سے توانہوں نے جس طرح انگریز قوم کو بچایا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے تدبیر سیاست کے علاوہ مسٹر چرچل کو تقریر و خطابت کی صلاحیتیں بھی فراوانی سے عطا ہوئی تھیں اپنی تقریروں میں انہوں نے مبالغہ آمیزی سے کام لینے کے بجائے صاف گوئی کا راستہ اختیار کیا اور قوم کو آنے والی مشکلات سے خبردار کرتے ہوئے سخت محنت کی تلقین کی۔ یہ ان کی حقیقت پسندانہ خطابت کا اثر تھا جس نے انگریز قوم کو ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے پر کمربستہ کر دیا۔ چرچل کا انداز بیان بلند آہنگ الفاظ کا مرہون منت نہ تھا وہ جذبات سے اپیل کرتے مگر مقصد پر یقین ان کی تقریروں میں جان ڈال دیتا اور وہ اپنے سامعین کو حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نبرد آزما ہونے کی جرأت عطا کر دیتے جنگ کے پانچ سال کے دوران انہوں نے اپنے زور خطابت سے جس طرح انگریز قوم کا حوصلہ بلند رکھا وہ انہی کا حصہ ہے اس دوران انہوں نے امریکی کانگریس اور سینیٹ کے اجلاس میں جو تقاریر کیں وہ بھی بڑی معرکتہ الآراء تھیں۔

....

انگلستان کی طرح امریکہ کے بعض سرکردہ سیاستدان اور ارباب اقتدار بھی نہایت عمدہ مقرر تھے۔ امریکی قوم کے محسن اول جارج واشنگٹن ایک اعلیٰ مدبّر اور فوجی کمانڈر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اچھے مقرر بھی تھے امریکی اتحاد کو قائم رکھنے والے اور موجودہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حقیقی بانی ابراہام لنکن بھی بڑے اعلیٰ درجے کے پارلیمینٹرین تھے۔ لنکن کی تقریر مختصر لیکن جامع ہوتی تھی وہ مختصر الفاظ کے

اندرونی معنی اور مفاہیم کی لامحدود وسعتوں کو سمیٹ لینے پر قادر تھے ان کی تقاریر انقلاب اور آزادی کی مقصدیت کی حامل تھیں اور وہ ان دونوں خصوصیات کے زبردست ترجمان تھے ان کے بعض جملے تو ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ "من گفتم و محاورہ شد" کی مثال صحیح معنوں میں لنکن پر صادق آتی ہے۔

عصر جدید کے خطیبوں میں مؤثر خطابت کیلئے ولیم فرینکلن عرف بلی گراہم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک عیسائی مبلغ ہے اور اپنے فن کو عیسائیت کی تبلیغ کیلئے استعمال کرتا ہے وہ ایک مقناطیسی اثر رکھنے والا جادو بیان مقرر ہے اور اسے سننے کیلئے بہت زیادہ لوگ جمع ہوتے ہیں۔ 1949ء میں اس نے لاس اینجلز میں آٹھ ہفتوں کا اجتماع کیا جس میں اس نے ساڑھے تین لاکھ انسانوں کو مذہب پر کار بندر ہنے کیلئے نئے سرے سے پابند عہد کیا ایک بار گلاسگو میں اس کی تقریر دس لاکھ آدمیوں نے سنی ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے اس نے ہزاروں آدمیوں کو عیسائی بنا دیا اس کے انداز خطابت کے مؤثر ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ لوگ اسے سن کر تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بلی گراہم کی تقریروں کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں سامعین کی ضیافت طبع کا مکمل سامان ہوتا ہے اس کی تقریر طویل تو ہوتی ہے مگر ساتھ ہی جذباتی بھی ہوتی ہے وہ جوش بیان میں اسٹیج پر پنجرے میں بند شیر کی طرح ادھر سے ادھر چکر کاٹتا ہے کہا جاتا ہے کہ بعض تقاریر میں وہ اسطرح اسٹیج پر ہی میل میل بھر کا سفر طے کر لیتا ہے۔

....

عصر حاضر کے بعض دوسرے نامور خطیبوں میں ہٹلر، مسولینی، جمال عبدالناصر، احمد سوئیکارنو اور فائیڈل کاسترو خطیبانہ شہرت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ ہٹلر جو ایڈولف ہٹلر کے نام سے ایک گمنام اور معمولی انسان تھا اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کی بدولت جن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے تنظیمی صلاحیتیں بھی فراوانی سے عطا کی تھیں جرمنی کا مطلق العنان فرمانروا بن گیا۔ اس کی گھمبیر آواز جذباتی وارفتگی اور جنون آمیز اندازِ تقریر نے اسے قوم کا محبوب رہنما بنا دیا۔ وہ جرمنی کی عظمت رفتہ کو موضوع سخن بنا کر اس کی بازیافت کا نعرہ لگاتا تھا اور اسی نعرے نے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ وہ استدلالی منطق سے بھی کام لیتا تھا اس کی تقریر سے سامعین کے جذبات و احساسات میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ اپنے وطن اور اپنی قوم کیلئے جان و مال کی ہر قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔

ادبی لحاظ سے ہٹلر کی تقریر کا معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا وہ اکثر فحش الفاظ اور عامیانہ تراکیب بھی استعمال کرتا اور گرامر اور الفاظ کو اپنے جذبات کے ماتحت سمجھتا تھا۔ تقریر کے دوران اس کی حرکات و سکنات سامعین کیلئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوتی تھیں۔ تقریر کرنے سے پہلے وہ ان اداؤں کی باقاعدہ ریہرسل کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو اپنے سامعین کے جذبات کو مشتعل کرنے کے بعد وہ خود بھی جلسے کے جذباتی ماحول سے متاثر ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

مسولینی فسطائی نظام کا بانی تھا وہ اس لحاظ سے ہٹلر کا پیشرو تھا لیکن ہٹلر دیکھتے ہی دیکھتے اس سے آگے نکل گیا مسولینی بھی بہت بڑا مقرر تھا اور وہ اہل اطالیہ کو ان کی قدیم عظمت اور سربلندی یاد دلا دلا کر ان کے جذبات کو برانگیختہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی تقریر میں اطالویوں کو "اے آلِ سیزر" کے نام سے مخاطب کر کے ان کی انا کو ابھارنے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ صرف ماضی کی یادوں کے ذریعے ہی قوم کو خوش رکھنے پر اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ انہیں ایک روشن مستقبل کی امیدیں بھی دلاتا رہا وہ بحیرہ روم کو "ہمارا سمندر" اور یورپ کے علم و ادب کو "رومیوں کا عطا کردہ علم و ادب" کہا کرتا تھا۔ فن خطابت کے زور پر وہ 1922ء سے 1944ء تک اٹلی کے سیاہ و سفید کا مالک بنا رہا۔

مصر کے جمال عبد الناصر دنیائے عرب کے بالعموم اور اہل مصر کے بالخصوص مقبول رہنما تھے۔ انہوں نے عربوں کی قومی انا کو جو ایک عرصہ دراز سے عالم خوابیدگی میں تھی بیدار کرنے کیلئے فن خطابت کو نہایت طریقے اور سلیقے سے استعمال کیا اور عربوں میں خود اعتمادی کی لہر دوڑا دی۔ وہ عصر حاضر کے بعض دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح عقلی دلائل اور منطقی استدلال سے کام لیتے تھے لیکن اس میں جذبے کے خلوص اور شدت کا وہ عالم ہوتا تھا کہ عقلی اور استدلالی پہلو کی حیثیت ثانوی ہو جاتی تھی۔ ان کی آواز میں جادو کا اثر تھا چنانچہ جب وہ تقریر کرتے تھے تو تمام دنیائے عرب اسے مسحور ہو کر سنتی تھی۔ اس جادو بیانی کی مثال ان کی وہ تقریر ہے جو عرب اسرائیل جنگ میں شکست کھانے کے بعد انہوں نے مشتعل اور مایوس مصری عوام کے ایک عظیم اجتماع کے سامنے کی تھی۔ خطیب کیلئے دیانت ایک بنیادی وصف ہے اور اس گھڑی جمال عبد الناصر اس وصف کا عملی مظاہرہ کر چکے تھے انہوں نے جنگ میں ناکامی کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور اس نتیجے میں وہ مستعفی ہو چکے تھے مگر جب انہوں نے مصری عوام کے سامنے اپنے استعفے کا اعلان کیا تو ان کی خطابت یہ اثر دکھا چکی تھی کہ مجمع نے بیک آواز "نہیں نہیں" کی صدائیں بلند کیں اور اسطرح پھر سے انہیں صدارت کا عہدہ سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔

انڈونیشیا کے احمد سوئیکارنو بھی ایک ماہر خطیب تھے اپنے عوام کی امیدوں خواہشوں اور امنگوں کی ترجمانی میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ انڈونیشیا کے ماضی کی عظیم روایات اور مستقبل کے روشن امکانات کا بیان ایسے پُراثر انداز میں کرتے تھے کہ سامعین کے دلوں میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی پُراثر خطابت کے زور سے لاکھوں کے مجمع کو مسحور کر دیتے تھے اور اس عالم مسحوریت میں سوئیکارنو انہیں جو بھی حکم دیتے تھے لوگ اپنی جان پر کھیل کر اس کی تعمیل پر کمربستہ ہو جاتے۔ سوئیکارنو کی تقریروں میں وہ منظر خاص طور پر قابل دید ہوتا تھا جب وہ اپنی خطابت سے مسحور عظیم اجتماع کو پوری طرح گرفت میں لے لیتے اور اپنی عوامی مقبولیت کے اظہار کیلئے مجمع کو ہدایت کرتے کہ جب میں ہاتھ بلند کر کے گراؤں تو سب لوگ "آزادی زندہ باد" کا نعرہ لگائیں۔ ایک لمحے کیلئے تمام مجمع ساکت ہو جاتا۔ پھر جب سوئیکارنو اپنا ہاتھ بلند کر کے گراتے تو اجتماع سے بیک وقت آزادی کا نعرہ بلند ہوتا اور تمام فضا گونج اٹھتی وہ اس عمل کو بار بار دھرا کر

اپنے مخالفین پر ثابت کر دیتے تھے کہ عوام ان کے ساتھ ہیں۔ سوئیکارنو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنے انداز خطابت کا ایک دلچسپ نمونہ پیش کیا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ تقریر کرتے وقت سامعین کی نفسیات پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور اسلامی روایات وعقائد کو مضمون کی وضاحت کیلئے کس طرح بر محل استعمال کیا کرتے تھے۔ صدر سوئیکارنو اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

"میرا کوئی ذاتی مکان نہیں۔ میرے پاس نہ زمین ہے نہ کوئی رقم۔ کتنی ہی بار میرے پاس گھر کا خرچہ چلانے کیلئے ایک روپیہ بھی نہیں ہوتا ایک سفیر نے میرے لئے پاجامہ خرید کر دیا۔ دنیا میں مَیں واحد صدر ہوں جس کے پاس رہنے کیلئے ذاتی جگہ تک نہیں ہے ایک بار کچھ لوگوں نے میرے لئے مکان بنانا چاہا مگر میں نے انہیں منع کر دیا۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے کہ اپنے عوام سے مانگوں میں تو انہیں کچھ دینا چاہتا ہوں میری تقریروں میں اکثر جدائی کے لمحات کا تذکرہ ہوتا ہے اور وہ اس لئے کہ موت ہر انسان کیلئے مقدر ہو چکی ہے میں اس کے لئے اپنے عوام کو ہر وقت آمادہ وتیار رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت پر بھی یقین ہے اور زندگی بعد از موت پر بھی۔ میرا عقیدہ ہے کہ میرے دونوں کندھوں پر دو فرشتے ہر وقت موجود ہیں۔ میرے دائیں جانب کا فرشتہ اچھے اعمال لکھتا رہتا ہے۔ قیامت کے دن وہ کہے گا کہ سوئیکارنو! یہ تمہارے اچھے اعمال ہیں انہیں دیکھو۔ اس کے بعد بائیں جانب کا فرشتہ پکارے گا کہ نہیں۔ تمہارے گناہ اور تمہاری خطائیں بڑی طویل ہیں اور اس کے بعد ہم مجبور ہیں کہ تمہیں دوزخ میں ڈال دیں اور واقعی میرے اعمال ہیں بھی اسی لائق۔ لیکن میں یہ سوچنے کی زحمت کیوں کروں کہ اللہ مجھے کہاں بھیجے گا میں تو اس وقت صرف یہی سوچتا ہوں کہ جب میری آخری گھڑی آئے تو اس میں زیادہ دیر نہ لگے اور ہاں جب میں مروں تو میری قبر پر القاب وخطابات نہ لکھنا مجھے اسلام کے مطابق دفنا دینا اور ایک سادہ کتبہ لگا دینا کہ یہ "بابائے قوم" کی قبر ہے جو انڈونیشیا کے عوام کا ترجمان تھا۔"

موجودہ دور میں امریکہ جیسی عظیم ترین طاقت کے پہلو میں کیوبا کا چھوٹا سا جزیرہ خار بن کر کھٹک رہا ہے اور یہ ساری کھٹک فائیڈل کاسترو کی بدولت ہے جو کیوبا کا فرمانروائے مطلق ہے کاسترو ظاہراً تو جنگی لباس میں ملبوس ایک ہمہ وقتی سپاہی نظر آتا ہے لیکن اس کی سیاسی طاقت اس کی سپاہیانہ وضع قطع کی مرہون منت نہیں بلکہ اس مسلسل بے تکان اور استدلالی انداز میں بولنے کی بے پناہ قوت کی وجہ سے ہے جو قدرت نے اسے نہایت فراوانی سے عطا کی ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے تقریر کر سکتا ہے اور چونکہ دوران تقریر وہ جذبات کے ہر رخ کو کامیابی کیساتھ نطق وبیان کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور ایک ہی وقت میں اور ایک ہی تقریر کے دوران خوشی، غم، جرأت ومردانگی، غصے اور مزاح کے مختلف جذبات کی بخوبی عکاسی کر لیتا ہے اس لئے

لوگ گھنٹوں محویت کے عالم میں اس کی تقریر سنتے رہتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔

یوں تو ہر عرب پیدائشی خطیب ہوتا ہے اور موجودہ دور کے کم و بیش تمام عرب رہنماؤں میں یہ صفت کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے لیکن ان میں شاہ فیصل، یاسر عرفات اور کرنل قذافی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں نے شاہ فیصل شہید کی کم و بیش بارہ تقریریں سنی ہیں وہ ایک داعی اور مبلّغ کے انداز میں کلام کرتے تھے۔ ان کی عربی اتنی سہل اور سادہ ہوتی کہ عربی نہ جاننے والے بھی اسے آسانی سے سمجھ لیتے۔ بڑی متانت سے بولتے، جذبات سے زیادہ دماغ کو اپیل کرتے لیکن جہاں کسی نکتے پر زور دینے کا موقع آتا وہاں جوش سے بھی کام لے لیا کرتے۔

یاسر عرفات اور قذافی دونوں بنیادی طور پر سپاہی ہیں اور اس لحاظ سے ان کی تقریروں میں اسکالر کا سا لب و لہجہ متوقع نہیں ہو سکتا مگر جن لوگوں نے قذافی اسٹیڈیم لاہور میں کرنل قذافی کی تقریر سنی ہے انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ گھن گرج سے زیادہ نسبتاً دھیمے انداز استدلال پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر میں دریا کی روانی کے بجائے ایک سبک خرام ندی کا بہاؤ محسوس ہوتا ہے اس کے برعکس عرفات آتش بیانی سے آگ لگا دیتے ہیں ان کے منہ سے پھول نہیں انگارے برستے ہیں گویا قذافی اگر جمال کا مظہر ہے تو عرفات جلال کا پیکر۔

(3، مارچ 83ء)

برصغیر کے نامور خطیب اور واعظ

برصغیر پاک و ہند کے خطیبوں کا جائزہ لیا جائے تو جو چیز نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان نامور خطبا اور مقررین میں اکثر و بیشتر شخصیات مسلمان تھیں جیسے مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا محمد علی جوہر' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولانا ظفر علی خاں' مولانا شبیر احمد عثمانی اور نواب بہادر یار جنگ' ان عوامی مقررین کے علاوہ بعض ایسے وکلاء بھی گزرے ہیں جو قانونی امور پر بحث و تمحیص میں یکتائے روزگار تھے جیسے سر فیروز شاہ مہندر جناب بدرالدین طیب جی اور قائد اعظم محمد علی جناح۔ بہت تھوڑے ہندو مقررین ایسے ہیں جو عوامی مقرر اور خطیب کی حیثیت سے نام پیدا کر سکے جیسے مسز سروجنی نائیڈو اور مسٹر سبھاش چندر بوس پارلیمانی زندگی سے وابستہ دیوان چمن لال اور پنڈت موتی لال نہرو منجھے ہوئے مقرر تھے۔

....

بیسویں صدی میں برصغیر میں جو چند نابغۂ روزگار شخصیتیں ابھری ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مقام بہت بلند ہے۔ مولانا بنیادی طور پر ایک اعلیٰ پائے کے انشا پرداز تھے انہوں نے انشا پردازی کے ذریعے صحافت میں نام پیدا کیا اور صحافت کے راستے سیاست میں داخل ہوئے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تحریر و تقریر دونوں میں یکتا ہوں مولانا کی نثر کے متعلق حسرت موہانی نے کہا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

سیاست، صحافت، تفسیر حدیث فقہ اور علم کلام کا یہ شہسوار فن خطابت میں بھی بے مثال اور نادر روزگار تھا وہ خود فرماتے ہیں:

"لوگوں کی نگاہیں میرے ہونٹوں کی جنبش کا انتظار کرتی ہیں۔"

حضرت مولانا امین احسن اصلاحی فرمایا کرتے تھے کہ:

"ابوالکلام کا دماغ کئی ہزار دماغوں کا نچوڑ ہے۔" اور مشہور صحافی ملک نصراللہ خاں عزیز کے قول کے مطابق:

"جب مولانا تقریر کرتے تو سامعین پر نور کی ایک چادر تن جاتی تھی۔"

مولانا ابوالکلام کی زبان تمامتر کمال کے باوجود عوام کیلئے مشکل ہوتی تھی عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کیوجہ سے ان کی اردو "معرب" اور "مفرس" تھی ان کی تشبیہات، استعاروں اور فارسی زبان کے اشعار کو سمجھنے کیلئے علمی پس منظر کی ضرورت تھی اور یہ خواص میں تو تھا مگر عوام میں نہیں، یہی سبب ہے کہ وہ بہت بڑے خطیب ہونے کے باوجود اہل علم کے طبقے سے نہیں نکل سکے۔ عوام اگر ان کی تقریروں پر سر دھنتے تھے تو محض حسن عقیدت اور اس جذبہ و تاثیر کے ماتحت کہ وہ امام الہند کی تقریر سن رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح مولانا محمد علی جوہر بھی ایک بہت بڑے صحافی، سیاست دان، انشاپرداز اور مقرر تھے۔ مولانا آزاد عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے لیکن مولانا محمد علی جوہر آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ انہوں نے دو اخبار کامریڈ (انگریزی) اور ہمدرد (اردو) میں جاری کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی دھوم مچ گئی وہ جتنے اعلیٰ پایہ کے انشاپرداز تھے اس سے کہیں بڑھ کر مقرر تھے ان کے انداز خطابت کا اعتراف اپنے بیگانوں سب نے کیا ہے۔

انگریزی زبان کے شہرۂ آفاق مصنف ایچ۔جی ویلز نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ

"محمد علی کا دل نپولین کا، قلم میکالے کا اور زبان برک کی تھی"

مولانا محمد علی کی لذتِ تقریر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اپنے زیورات تک اتار کر تحریک خلافت کے فنڈ میں دے دیا کرتی تھیں اور جب انہوں نے ہندوستان کو دارا کفر قرار دیتے ہوئے، ہجرت کی تحریک شروع کی تو ہزاروں لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر کابل جا بسے، زور بیان اور روانی کے علاوہ ان کی برجستہ گوئی اور حاضر جوابی اپنی مثال آپ تھی، طنز و ظرافت کی چاشنی سے بھی کام لیتے تھے آواز ایسی پاٹ دار تھی کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں بولتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے

"کارخانے میں توپیں ڈھالی جارہی ہیں"

مولانا محمد علی جوہر کی طرح مولانا ظفر علی خان بھی بیک وقت سیاست دان صحافی انشاپرداز اور شاعر تھے۔ اپنی متنوع صلاحیتوں میں سے ہر ایک صلاحیت میں وہ درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ تاہم ان کی اعلیٰ

درجے کی شاعری زندگی میں بھی ان کیلئے باعث عزوافتخار رہی اور مرنے کے بعد بھی اس صنف نے انہیں جاودانی زندگی عطا کی ہے۔ خطیب وہ اس پائے کے تھے کہ لاکھوں کے اجتماع تقریر کے دوران ساکت و صامت ہو جاتے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے بدنام زمانہ جلاد صفت جنرل ڈائر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "ظفر علی خان تقریر نہیں کرتے انگارے برساتے ہیں۔" پنجاب میں جن لوگوں نے احرار کی شعلہ بیانی کا مقابلہ کیا تھا ان میں مولانا ظفر علی خان کا نام سرفہرست ہے۔

....

اگرچہ بیسویں صدی کے نصف اول کے دوران اسلامیان ہند کے درمیان ایک سے ایک بڑا خطیب اور مقرر پیدا ہوا لیکن جس شخص نے پشاور سے کلکتہ اور کشمیر سے راس کماری تک تمام ہندوستان میں اپنی خطابت کا لوہا منوایا وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ بڑے بڑے جلسوں کو اپنی تقریر کے جادو سے مسحور کر دینے کے فن میں کوئی شخص شاہ جی کا ہم پلہ نہ تھا۔ وہ رات کے نو دس بجے تقریر شروع کرتے تو صبح تک کئے جاتے اور سننے والے اسطرح جم کر بیٹھتے گویا تمام عمر تقریر ہوتی رہے تو وہ تمام عمریوں ہی بیٹھے رہیں گے۔ تقریر میں جذبات کی شدت پیدا کر کے لوگوں کو بے اختیار رلا دینا' ایثار و قربانی کے بیان سے انہیں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کر دینا اور چٹکلوں اور لطیفوں سے روتی ہوئی محفل کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

احراری مکتب فکر نے مسلمانان ہند کی کوئی ٹھوس سیاسی خدمت کرنے میں تو کامیابی حاصل نہیں کی لیکن اس جماعت میں بعض بڑے پائے کے عوامی مقررین پیدا ہوئے جن میں شیخ حسام الدین' ماسٹر تاج الدین انصاری' قاضی احسان احمد شجاع آبادی' مولانا محمد علی جالندھری' مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا مظہر علی اظہر' آغا شورش کاشمیری' صاحبزادہ فیض الحسن' سید مظفر علی شمسی اور مولانا تاج محمود کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مقررین کی نمایاں خصوصیات ان کا جذباتی انداز بیاں' شعروادب کی چاشنی اور مذہب سے حد درجہ شیفتگی تھیں۔ ان کے مداحوں سے قطع نظر ان کے مخالفین بھی ان کے جلسوں میں ان کی تقریروں سے لطف اندوز ہونے کیلئے شوق سے جاتے تھے اور ان کے لطیفوں' چٹکلوں اور دلچسپ انداز بیاں کا دل سے اعتراف کرتے تھے۔

....

مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقاریر بھی ثقاہت' نفاست اور لطف بیان کے محاسن سے آراستہ ہوتی تھیں۔ مولانا عثمانی سیاست میں سرگرم حصہ لینے کے بجائے علمی محاذ پر مسلمانوں کی خدمات انجام دیتے رہے لیکن جب حصول پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے اپنی خدمات مسلم لیگ کیلئے وقف کر دیں۔ مولانا کے علم و فضل کا شہرہ تو بہت ہے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ قرآن کا یہ مفسّر اور حدیث کا یہ شارح ایک بلند پایہ خطیب بھی تھا۔ مولانا نے یوپی کے الیکشن میں جمعیت علمائے ہند کے مقابلے میں مسلم

لیگی امیدواروں کی حمایت میں جو تقریریں کیں ان سے الیکشن کی فضا ہی بدل گئی اور مسلمانوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے یہ علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے پاکستان کی دل کھول کر حمایت کی مولانا کے انداز خطابت میں عالمانہ وقار پایا جاتا تھا اور وہ قرآن و حدیث کے حوالوں سے اپنی تقریر کو مزین کرتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ بھی تحریک پاکستان کے بڑے سرگرم رہنما اور قائدِ اعظمؒ کے انتہائی مخلص اور جان نثار ساتھیوں میں سے تھے دکن کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا اپنی خطابت کے زور پر وہ جلد ہی ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور اور مقبول ہوگئے۔ میری عمر تو اتنی نہیں کہ میں ان کے سننے والوں میں ہوتا مگر جن لوگوں نے ان کی تقریر سنی ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کی تقریر موضوع کی مناسبت سے کبھی آتش فشاں لاوے کی طرح ہوتی تھی اور کبھی نرم روجوئے بار کی طرح۔

تحریک پاکستان کے مقررین میں مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، علامہ علاؤالدین صدیقی اور مولانا محمد بخش مسلم کے نام بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے قائد اعظمؒ کے پیغام کو عام کرنے کیلئے ان حضرات نے ملک کے طول و عرض میں تقریریں کی ہیں اور قیام پاکستان کے بعد بھی وہ ہمیشہ اتحاد اسلامی کیلئے کوشاں رہے۔

فن خطابت میں شیعہ مکتب فکر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ اسکول بنیادی طور پر خطابت ہی کی مدد سے آگے بڑھا ہے۔ خطابت کی جتنی مانگ جتنی پہچان اور جتنی قدر یہاں ہے دوسری کسی جماعت میں نہیں وہ لوگ جو سُنّی شیعہ دونوں مکاتب فکر کے اجتماعات میں شامل ہوتے رہے ہیں وہ ان دونوں کے باہمی فرق سے بخوبی واقف ہیں۔ سُنّیوں کا اجتماع عام طور پر ایسا ہوتا ہے جیسے قبرستان میں اذان دی جارہی ہو اور جواب میں صدائے برنخاست کی کیفیت ہو۔ کبھی کبھی سُنّیوں کے چپ چاپ اور جذباتی طور پر سرد اجتماعات کے متعلق میں کہا کرتا ہوں کہ لفظ "سُنّی" شاید بنا ہی اس چیز سے ہے کہ یہ لوگ سن سن کر سُن ہوگئے ہیں اس لئے واعظ اور خطیب کے زور بیان اور جوش خطابت کی مناسب اور گرم جوشانہ انداز میں داد بھی نہیں دے سکتے اور جب واعظ خطیب یا شاعر کو اپنی گرمی گفتار کی مناسب داد ہی نہ مل سکے تو اس پر مضامین کی آمد کیا خاک ہوگی۔

سُنّیوں کے اجتماعات کے برعکس شیعہ اجتماع ایک زندہ اجتماع ہوتا ہے اس اجتماع میں نہ صرف خطیب کے ہر خوبصورت فقرے کی داد دی جائے گی بلکہ عمدہ اور حسین قسم کے الفاظ تراکیب پر بھی جزاک اللہ اور سبحان اللہ کے ڈونگرے برسائے جائیں گے سامعین پوری طرح داد سخن دے رہے ہوں تو خطیب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور خطیب اور سامع کے درمیان ایک رشتہ موانست قائم ہوجاتا ہے جو فن خطابت کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ شیعہ اجتماعات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہاں خطیبوں کی قدر افزائی صرف زبانی

طور پر نہیں کی جاتی بلکہ مالی طور پر بھی ان کی بہت خدمت کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیعہ خطیب اور واعظ حضرات فکرِ معاش سے آزاد ہو جاتے ہیں اور خطابت، وعظ اور مجلس خوانی ان کا ہمہ وقتی پیشہ بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ جس چیز پر پورا وقت دیا جائے وہ اس سے یقیناً بہتر ہوگی

برصغیر میں مرثیہ گوئی کی طرح شیعہ طرز وعظ و خطابت کا سب سے بڑا مرکز بھی لکھنؤ ہی رہا ہے چنانچہ اس مکتبِ فکر کے ممتاز ترین خطیبوں اور واعظوں نے اسی شہر میں نشوونما پائی ہے ان میں مولانا سبط حسن اور حکیم مرتضیٰ حسین بیسویں صدی کے ربع اول میں خطیبانہ عظمت اور شہرت میں بلند مقام پر فائز تھے۔ حکیم مرتضیٰ حسین خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے۔ ان کے خاص موضوعات توحید اور معراج تھے جس پر وہ مجلس پڑھتے تھے اور بسا اوقات چھ چھ گھنٹے بے تکان بولتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی وفات کو تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔

ان کے ہم عصر مولانا محمد حسین محقق ہند لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے ان کے گھر کو مجتہد ہاؤس کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے علاوہ اطراف ہند میں دور دور جا کر مجلس پڑھتے تھے بڑے پائے کے خطیب تھے۔

اسی دور کے ایک اور مشہور واعظ شمس العلماء مولانا ناصر حسین تھے۔ واعظ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک منجھے ہوئے اہل قلم بھی تھے۔ ان کے والد گرامی جناب حامد حسین موسوی نے ایک کتاب بنام "کتاب الانوار" شروع کی تھی انہوں نے تصنیف کے اس کام کو جاری رکھا اور اپنے والد بزرگوار کے کئے ہوئے کام پر بہت سی جلدوں کا اضافہ کیا ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے سعید الملت سید محمد سعید نے بھی اسے آگے بڑھایا اس وقت تک اس کتاب کی بتیس جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ سعید الملت کا انتقال آج سے تقریباً بیس سال پہلے ہوا۔

شمس العلماء مولانا نجم الحسن بھی عالم، مجتہد اور واعظ تھے وہ بھی لکھنؤ سے ابھرنے والے خطیبوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے ان کے ایک نواسے علامہ سید محمد رضی آج کل کراچی میں مقیم ہیں ریڈیو اور ٹی وی سے ان کی تقاریر نشر ہوتی رہتی ہیں۔

علامہ باقر علی نجفی بھی لکھنؤ کے مشہور عالم دین اور خطیب تھے لیکن وہ تقسیم ہند سے پہلے پاکستان میں آباد ہو گئے تھے۔ میں جب میانوالی گورنمنٹ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا تو وہ وہاں اردو اور فارسی کے مدرس تھے۔ اکثر اسکول کے بعد بھی ان کی مجالس میں مجھے بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کی تقریر میں تفہیم اور تعلیم کا رنگ نمایاں تھا اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے حضرت علامہ سے کافی فیض حاصل کیا ہے۔

علامہ سید محمد دہلوی بھی شیعہ علماء میں ایک قد آور خطیب تھے، خواجہ حسن نظامی مرحوم نے انہیں خطیب اعظم کا خطاب دیا تھا۔ انہوں نے بمبئی کی طرف خطابت اور مجالس خوانی میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا پھر پاکستان چلے آئے۔ دس گیارہ سال پہلے کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ یوپی سے لاہور میں آنے والے علامہ حافظ کفایت حسین بھی ایک نامور شیعہ عالم دین تھے وہ فلسفی خطیب اور واعظ تھے اور

اپنے فن میں بڑے کامل، زندگی بھر انہیں وعظ و خطابت سے کام رہا۔

علامہ رشید ترابی اصلاً حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے تھے کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ مجلس خوانی میں بڑے باکمال تھے۔ انداز اتنا دلکش اور دلنشین تھا کہ لوگ گھنٹوں بیٹھے سنتے رہتے اور پھر بھی سیر نہ ہوتے۔ حضرت علامہ جدید علوم سے بھی بہرہ ور تھے اس لئے ان کی تقریریں بڑی خیال انگیز ہوتی تھیں وہ مذہب اور سائنس کے تقابل میں نہیں بلکہ باہمی تعاون اور تفاہیم میں یقین رکھتے تھے۔ فقروں کی ادائیگی کا انداز ان کا مخصوص تھا۔ اس میں ہاتھوں کے اشاروں کی آمیزش ایک عجب ماحول پیدا کر دیتی تھی آج کئی شیعہ نوجوان خطیب ان کی آواز اور ان کے انداز کی نقالی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نقل نقل ہے اور اصل اصل۔

علامہ ابن حسن جارچوی مرحوم بھی پائے کے خطیب تھے اور دل درد مند کے مالک، قومی سیاست میں حصہ لینے کیوجہ سے وہ شیعہ اور سنی عوام میں یکساں مقبول تھے اپنی فقرہ بازی سے لوگوں کو ہنساتے بھی اور مصائب اہل بیت بیان کرنے پر آتے تو دل کھول کر رلاتے بھی۔

اس وقت شیعہ خطیبوں میں مولانا سید اظہر حسن زیدی، علامہ نصیر الاجتہادی، علامہ ابن حسن نجفی، مولانا عباس کمیلی، علامہ عباس حیدر عابدی، علامہ طالب جوہری، علامہ عقیل ترابی اور مولانا عرفان حیدر عابدی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خطیبوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں علماء کا ایک ایسا سلسلہ بھی چلتا ہے جسے ہم واعظین کا سلسلہ کہتے ہیں۔ وعظ خطابت ہی کی ایک شاخ ہے اور ہر واعظ خطیب ہوتا ہے مگر ہر خطیب کو واعظ نہیں کہہ سکتے۔ وعظ میں عام طور پر دینی مسائل کا بیان ہوتا ہے اس کے ذریعے سامعین کو نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں اوامر و نواہی سے آگاہ کیا جاتا ہے اور انہیں نیکی کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

واعظوں کیلئے خوش الحان ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے دوران وعظ وہ جو آیات قرآنی تلاوت کرتے ہیں یا احادیث رسولؐ سناتے ہیں ان کی قرأت نہایت خوش الحانی سے کرتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم سے چیدہ چیدہ اشعار بھی پڑھتے ہیں جس کی ایک مخصوص لے ہوتی ہے۔ نعتیہ اشعار بھی بکثرت سناتے ہیں اور علاقائی زبانوں کے عشق و معرفت کے اشعار بھی پڑھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پند و نصائح کے لئے نہایت دلکش پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس سے لوگ یقیناً متاثر ہوتے ہیں۔

ماضئ قریب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بڑے بلند پایہ واعظ ہو گزرے ہیں۔ علمی اعتبار سے مولانا کو بہت اونچا مقام حاصل تھا اور ان کے مواعظ میں ان کا یہ علمی مقام خوب خوب منعکس ہوتا تھا ان کے کئی کئی گھنٹوں کے ایک ایک وعظ میں سینکڑوں ہزاروں کتب کا عطر سمٹ آتا اور اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کے ایک ایک وعظ سے دور جدید کے مصنفین کئی کئی کتابیں لکھ سکتے ہیں۔ بریلوی مکتب

فکر کے امام حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی بھی شیریں بیان واعظ تھے ان کی امتیازی خصوصیت ان کا عشقِ رسولؐ ہے۔ جس میں وہ سرتاپا ڈوبے ہوئے تھے چنانچہ ان کا نعتیہ کلام بھی سوز و گداز کی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور مذہبی تقریبات میں بڑے ذوق و شوق اور احترام سے پڑھا جاتا ہے۔

پاکستان میں مولانا احتشام الحق تھانوی صف اول کے واعظ تھے اور ان کا قرآن پڑھنے کا انداز بہت دلکش اور منفرد تھا۔ قرآن حکیم کے مطالب و معنی اور اسرار و رموز کے بیان میں وہ اپنے سامعین کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر بات کرتے۔ ریڈیو پاکستان سے ان کا جو درسِ قرآن براڈ کاسٹ ہوتا تھا وہ ملک بھر میں ذوق و شوق سے سنا جاتا تھا۔

آج کل علامہ احسان الٰہی ظہیر، محمد شفیع اوکاڑوی، سید عنایت اللہ شاہ بخاری، مولانا ضیاء القاسمی، مولانا عبدالقادر آزاد، مولانا محمد حسین شیخوپوری، مولانا عبدالشکور دین پوری اور صاحبزادہ فیض علی فیضی مانے ہوئے واعظ ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ بھی ملک میں بہت سے دوسرے واعظان کرام شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں لیکن یہاں ان کے تذکرے کی گنجائش نہیں۔

(10 / مارچ 83ء)

لاہور کا فاؤنٹین ہاؤس

وسیع و عریض اور خوبصورت لان میں ایک میز کے ارد گرد چند کرسیاں رکھی تھیں ، میں اپنے دوستوں کے ہمراہ ابھی جا کر بیٹھا ہی تھا کہ دو صاف ستھرے نوجوان مجھے خوش آمدید کہنے کیلئے لپکے:

"بہت عرصے کے بعد آپ کو دیکھا آپ کا قیام تو لندن میں ہے یہاں کب پہنچے"

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ دوسرا نوجوان بولا:

"بھٹو صاحب الیکشن کب کرا رہے ہیں؟ آپ کھر صاحب کو بھی بلا لیجئے انہیں بھی تو الیکشن لڑنا ہو گا۔"

میں نقشِ حیرت ہی بنا رہتا اگر حامد مجید اور جعفر علی میر مجھے یہ نہ بتاتے کہ یہ "فاؤنٹین ہاؤس" کے دو "ممبر" ہیں اور یہاں کی انجمن کے عہدیدار۔ میں نے حامد سے ہنستے ہوئے کہا:

"لگتا ہے ، ڈاکٹر رشید چودھری کو اپنے "فاؤنٹین ہاؤس" میں جلد ہی ایک "وی آئی پی" سیکشن کا بھی اضافہ کرنا ہو گا ملکی سیاست دانوں پر ہفت سالہ مارشل لاء میں کیا کچھ نہ بیت گیا ہو گا۔ اب تک تو وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہوتے رہے ہیں حالات کا صحیح جائزہ اور تجزیہ نہ کرنے اور بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنے رہنے کے باعث اب شاید ان میں سے بہت سوں کو "شفاخانہ امراض دماغی" کا بھی رخ کرنا پڑے۔

یہ لاہور میں دماغی امراض کے ممتاز معالج ڈاکٹر محمد رشید چودھری کے قائم کردہ "فاؤنٹین ہاؤس" کا واقعہ ہے۔ جس کی انتظامیہ نے ابھی حال ہی میں مجھے اس کا معائنہ کرنے کی دعوت دی تھی۔

خدمت خلق اسلام میں ایک اعلیٰ عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ بزرگان دین اور صوفیائے کرام نے اسے ہمیشہ بڑی اہمیت دی ہے لیکن بدقسمتی سے اس دور انحطاط میں ہماری یہ خصوصیت بھی غیروں نے چھین لی ہے۔ عیسائی مشنریوں نے اسی راستے سے اپنے مذہب کی تبلیغ کا انداز اختیار کیا ہے اور دکھی انسانیت کی خدمت کیلئے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر بے ساختہ تحسین کہنی پڑتی ہے۔

کلکتہ کی مادام تھریسا تو خیر اس میدان میں بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں اور جذام زدہ انسانوں کیلئے ان کی خدمات دنیا بھر میں ضرب المثل بن چکی ہیں خود ہمارے ملک میں بھی عیسائیوں نے ایسے ایسے ادارے قائم کر رکھے ہیں کہ ان کی نظیر نہیں ملتی۔ کراچی کی کشمیر روڈ پر ایک ایسا ہی ادارہ "دارالسکون" کے نام سے کم و بیش بیس سال سے کام کر رہا ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو یتیم مجنون اور اپاہج بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے لاہور میں بھی اس کی شاخ قائم ہے اور ہر سال برابر اس میں توسیع کا عمل جاری ہے۔ یہ ادارہ ایک ستر سالہ عیسائی نن ٹروس لیمنس کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جو 1939ء میں ہالینڈ سے کراچی آئی تھیں اور اس وقت سے خدمت کے کاموں میں مشغول ہیں۔ وہ بچے جنھیں ماں باپ بھی ان کی ہیئیتی اور پاگل پن کی وجہ سے باہر سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں یا جو زیادہ سے زیادہ بھک منگوں کے منظم ٹولوں کا آلہ کار بن کر گداگری میں زندگی گزار دیتے ہیں یہ بوڑھی خاتون اپنی نورکنی ٹیم کے ساتھ انہیں "دارالسکون" میں پناہ دے کر اپنے سینے سے لگاتی اور پیار محبت سے پروان چڑھاتی ہے۔ مادام ٹروس کینسر کی مریضہ ہیں ان کے تین آپریشن ہو چکے ہیں لیکن وہ اپنی بیماری سے بے نیاز رات دن ان بچوں کی خدمت کے لئے مستعد مسکراہٹ کے پھول بکھیرتی رہتی ہیں ہالینڈ کے مخیّر افراد اور رفاہی ادارے "دارالسکون" کے لئے چندہ دیتے اور اس کے توسیعی پروگرام کو آگے بڑھانے کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ "کے ایل ایم" کی کراچی آنے والی ہر پرواز ان بچوں کیلئے کچھ نہ کچھ تحفے اور ہدیئے ضرور لاتی ہے اور اس کا عملہ کراچی میں اپنے قیام کے دوران "دارالسکون" کے عملے کیساتھ ان محتاج بچوں کی سیوا میں وقت گزارنا اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہے۔

....

عیسائی مشنریوں پر ہی موقوف نہیں، ہندوؤں میں بھی ایسے بیشمار سادھو اور یوگی ہیں جنھوں نے خدمت خلق کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ دنیا بھر میں انہوں نے ایسے آشرم قائم کر رکھے ہیں جو شب و روز خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہیں یوگ اور ہندو مت کے فلسفہ کے مطابق روحانیت کی تعلیم دینے کے علاوہ وہ بے آسرا لوگوں کیلئے سہارا بنتے اور کشمکش حیات کے دوران ان کے جسم و جان پر لگے ہوئے زخموں پر محبت کی مرہم لگاتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں بھارت میں تھا۔ (انشاءاللہ اس سفر کی مختصر روئیداد آئندہ ہفتے قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا) وہاں جگہ جگہ ایسے آشرم قائم دیکھے جو بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے اور معاشرے میں انہیں باعزت مقام دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض آشرم اسکینڈلز میں بھی ملوث ہیں لیکن ایسے بے ریا اور بے نفس لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ہر قسم کی گندگی سے دامن بچائے محض خدمت کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں۔ مہاراشٹر میں ایک ایسی ہی شخصیت "سائیں بابا" کی ہے جن سے ہندو اور مسلمان دونوں یکساں عقیدت رکھتے ہیں وہ ایک شہر میں مندر بنواتے ہیں تو ایک شہر میں مسجد۔ کتنے ہی رفاہی ادارے ان کی سرپرستی میں قائم اور کتنے ہی بے کس ان کے پیار کی چھاؤں میں آلام و مصائب کی کڑی دھوپ سے محفوظ ہیں۔ میری خواہش تھی کہ ان سے ملوں مگر افسوس کہ وہ دورے پر تھے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خدمت خلق ہمارا اشعار تھا مگر اسے غیروں نے اپنا لیا۔ ہم نے تو مذہب کو بھی سیاست کا لبادہ پہنا کر اسے نفرت اور تشدد کا علم بردار بنا دیا ہے۔ یتیم خانے ہمارے ہاں بھی قائم ہیں مگر الا ماشاء اللہ سب کے سب کاروبار کا ذریعہ اور جلب منفعت کا وسیلہ ہیں لے دے کر ایک روشن اور درخشاں مثال قائد اعظمؒ کے رفیق کار اور مشہور قومی رہنما ایم ایچ اصفہانی مرحوم کی بیگم خانم اصفہانی کے قائم کردہ "کاشانۂ اطفال" کی ہے جو کراچی میں بے آسرا بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کا فریضہ انجام دے رہا ہے اور جو ابتک بیسیوں بے ماں باپ کی بچیوں کے ہاتھ پیلے کر چکا ہے۔ انفرادی طور پر بھی ہمارے ہاں بہت سے اہل خیر موجود ہیں جو خاموشی سے حسب توفیق و استطاعت اپنے ہم وطنوں کا دکھ درد بٹاتے اور صدقہ و خیرات کی تابندہ روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ملت اور قوم کی حیثیت سے بحیثیت مجموعی ہم اپنے اصل راستے سے بھٹک چکے ہیں۔ ان حالات میں سماجی بہبود اور انسانی خدمت کا کوئی منظم کام نظر آتا ہے تو دل سے اس کے بانیوں کیلئے دعائیں نکلتی ہیں اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی امنگیں کروٹیں لینے لگتی ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ لاہور کا "فاؤنٹین ہاؤس" ایک ایسا ہی منصوبہ ہے جسے زیر عمل دیکھ کر میرا سر فخر سے تن گیا اور پہلی بار مجھے دوسری قوموں کے بالمقابل اس میدان میں بھی ایک گونہ برابری کا احساس عطا ہوا۔

....

یوں تو اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بکھری ہوئی ہیں۔ حضرت انسان ہر سانس کے ساتھ بھی ان نعمتوں کا شکر ادا کرے تو ان کا حق ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کی سب سے بڑی نعمت عقل ہے جس سے وہ اپنے خالق کو پہنچانتا اور اس کی مخلوق کے حقوق جانتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اور اس سے بڑی بات عقل کے بارے میں اور کیا کہی جا سکتی ہے:

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

(کہ بے علم خدا کو نہیں پہنچان سکتا)

اور عقل نہ ہو تو علم کہاں سے آئے گا۔ علم کے بغیر عقل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے لیکن عقل کے بغیر علم کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عالم برزخ کے بارے میں سامعین کو اپنے ارشادات سے سرفراز فرما رہے تھے دوران گفتگو آپؐ نے حضرت عمر فاروقؓ

سے پوچھا:

"اے عمر! قبر میں جب فرشتے تم سے سوال کریں گے تو تم انہیں جواب دے لو گے؟"

"یا رسول اللہ! کیا اس وقت میری عقل میرے پاس ہوگی۔"

فرمایا........ "ہاں! وہ تو ہوگی"

عرض کیا........ "پھر میں جواب دے لوں گا"

تو عقل اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس دنیا ہی میں نہیں آنے والی دنیا میں بھی اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور جن لوگوں سے یہ نعمت چھن جاتی ہے ان کی بدقسمتی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم پاگل کہتے اور سنگ وخشت کا مستحق سمجھتے ہیں۔ گھر کا کوئی فرد پاگل ہوا سب نے اس سے منہ موڑ لیا۔ رسیوں سے جکڑ دیا کہ کوئی نقصان دہ حرکت نہ کر بیٹھے اور یہ پاگل پن اس دور میں اتنا عام ہے کہ خود امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے اعداد و شمار کے مطابق ہر سال چھ لاکھ افراد کو دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل کیا جاتا ہے ان میں تقریباً ایک لاکھ آدمی ایسے ہوتے ہیں جو دوسری یا تیسری مرتبہ بیمار ہو کر داخلہ لیتے ہیں ہر سال پندرہ لاکھ آدمی ایسے ہیں جو داخل تو نہیں ہوتے لیکن جزوقتی طور پر ایسے ہسپتالوں میں زیر علاج رہتے ہیں۔ ملک کے دوسرے تمام ہسپتالوں کے بھی نصف سے زائد بستر دماغی مریضوں سے بھرے رہتے ہیں اور بڑھتے ہوئے ان دماغی عوارض کا سبب یہ ہے کہ مشینی زندگی نے انسانی اعصاب کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا ہے۔ مادیت نے ذہنی تناؤ میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ انسان اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے اور یہ حالت صرف ترقی یافتہ ملکوں ہی کی نہیں ترقی پذیر ملکوں میں بھی ایک سروے کے مطابق اس وقت چار کروڑ افراد دماغی امراض کا شکار ہیں خود پاکستان میں ایسے مریضوں کے علاج کیلئے کم سے کم ایک لاکھ بستروں کی ضرورت ہے۔

"فاؤنٹین ہاؤس" لاہور کے بانی ڈاکٹر محمد رشید چودھری کو میں ربع صدی سے جانتا ہوں۔ جن دنوں میں لاہور میں قیام پذیر تھا ان سے رات دن کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہ جتنے ظاہر میں صاف ستھرے اور اجلے آدمی ہیں اتنا ہی شفاف باطن رکھتے ہیں۔ ہمدرد و غم گسار اور ہنس مکھ اتنے کہ ان کے قریبی احباب کو بھی انہیں غصے میں دیکھنے کی حسرت ہے۔ باصلاحیت اتنے کہ پنجاب سے ایم بی بی ایس، برطانیہ سے ڈی پی ایم اور ایم آر سی اور پاکستان سے ایم ڈی اور ایف سی پی ایس کی ڈگریاں لیں۔ تجربہ اتنا کہ بیس سال سے ذہنی مریضوں کا علاج کر رہے ہیں اور اب تک تقریباً چالیس ہزار ایسے مریضوں کا مکمل ریکارڈ ان کے پاس موجود ہے۔ برسہا برس مینٹل ہسپتال لاہور کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ رہ چکے ہیں ان سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ دماغی مریض شفایاب ہو بھی جائیں تو معاشرے میں ان کی دوبارہ آبادکاری کتنا مشکل کام ہے ضروری ہے کہ انہیں تدریجی مراحل سے گزار کر ایک مفید شہری بنایا جائے ورنہ یک لخت ان کے دماغ پر بوجھ پڑنے سے ان کی شخصیت اس کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے اسی مقصد کیلئے انہوں نے لاہور مینٹل ہیلتھ

ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جس کے بانی اراکین میں جہاں علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم جیسے عالم دین اور ڈاکٹر محمد اجمل جیسے ماہر نفسیات شامل تھے وہاں حامد مجید جیسے فعال اور باصلاحیت نوجوان بھی اس میں پیش پیش تھے۔ 1971ء میں اسی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام "فاؤنٹین ہاؤس" کا قیام عمل میں آیا جو اب تک سات سو دماغی مریضوں کو سوسائٹی کا کار آمد رکن بنا چکا ہے۔

دنیا میں اس وقت دس "فاؤنٹین ہاؤس" کام کر رہے ہیں۔ سب سے پہلا "فاؤنٹین ہاؤس" 1941ء میں نیویارک میں قائم ہوا۔ اس کی عمارت میں ایک خوبصورت فوارہ نصب تھا جس کی مناسبت سے اس کا نام ہی "فاؤنٹین ہاؤس" پڑ گیا۔ لاہور کے "فاؤنٹین ہاؤس" میں بھی ایک فوارہ ہے میں اس کے معائنہ کیلئے گیا تو یہ چل تو نہیں رہا تھا مگر عمارت کے آگے عین وسط میں اس کی تنصیب آنکھوں کو بھلی معلوم ہوئی۔

....

اب یاد نہیں پڑتا کہ 71ء سے قائم ہونے والے اس ادارے میں اب تک میں کیوں نہ جا سکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور جناب حامد مجید نے کئی بار کہا بھی مگر مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ میں نے اس ادارے کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی سماجی بہبود کا کوئی ایسا ویسا ہی ادارہ ہو گا جو سطحی نوعیت کا کچھ کام کر کے حکومت سے گرانٹ منظور کرا لیا کرتا ہے اس کے بعد اللہ خیر سلا لیکن پہنچا تو آنکھیں کھل گئیں بہت پچھتایا کہ پہلے کیوں نہیں آیا۔ اس دور میں آتا تو ادارے کی کچھ خدمت بھی کر سکتا اب تو محض لفظی پھول ہی نچھاور کر سکتا ہوں۔ پھر بھی ہو سکتا ہے میری تحریک اور تحریر سے کچھ اہل دل متاثر ہو جائیں اور ادارے کیلئے ذرائع و وسائل کی فراہمی میں کچھ آسانی پیدا ہو جائے۔

"فاؤنٹین ہاؤس" میں رہنے والے افراد کو مریض کے بجائے "ممبر" کہتے ہیں اس وقت تقریباً ایک سو ممبر یہاں زیر تربیت ہیں۔ صاف ستھری اور خوبصورت عمارت کے پہلو میں ایک نو تعمیر شدہ مسجد ہے جہاں نماز فجر کے بعد درس قرآن سے فاؤنٹین ہاؤس کے ممبران اپنے دن کا آغاز کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد اسمبلی ہوتی ہے اور پھر ممبران اپنے اپنے شعبوں میں کام کرنے کے لئے تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ورکشاپ میں انہیں کئی ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں۔ میں نے بہت سے ممبران کو ٹائپ سیکھتے کاغذی پھول بناتے باغبانی کا کام کرتے اور فرنیچر بناتے دیکھا ہے۔ دفتری کاموں میں بھی ممبران اسٹاف کے شانہ بشانہ کام کرتے ہیں۔ باورچی خانے کا نظم و نسق بھی انہی کے ذمے ہے ہاؤس میں ایک سنیک بار بھی قائم ہے جس میں ممبران کی تیار کردہ اشیاء سے مہمانوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ ایک ایئر کنڈیشنڈ لائبریری بھی ہے جہاں بیٹھ کر ممبران اخبارات و جرائد اور کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ موسیقی کا شعبہ مجھے خاص طور پر پسند آیا میرے آنے پر اس دن ایک خصوصی نشست منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر رشید چودھری اور میں نے خطاب کیا بعد ازاں ایک ممبر نے طبلے اور ہارمونیم کی سنگت میں گانا گایا۔ اگر اس نوجوان کی ٹی وی ریڈیو سرپرستی

کریں تو یہ مستقبل کا محمد رفیع بن سکتا ہے۔ ہاؤس اپنا ایک خبرنامہ بھی جاری کرتا ہے جسے خود ممبران مرتب اور ایڈٹ کرتے ہیں۔ شعبہ خواتین بھی کام کر رہا ہے جو باپردہ ہے اور اس کی نئی عمارت میں خواتین کو سلائی اور ننگ وغیرہ سکھانے کیلئے الگ ورکشاپ ہے۔ 1981ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ہاؤس کا معائنہ کیا تو انہوں نے اس کیلئے پانچ لاکھ روپے سالانہ کی گرانٹ منظور کر دی خاموش معاونین اس کے علاوہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہاؤس چلانے میں شروع شروع میں خاصی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اب وہ بڑی حد تک اس بوجھ سے آزاد ہیں مگر پھر بھی کام کی روز افزوں وسعت بیش از بیش مالی وسائل کی طلب گار ہے اور جو لوگ خدمت خلق کے ٹھوس کام میں عطیات دے کر خالق کی خوشنودی چاہتے ہیں انہیں ادارے کو کاملاً اس فکر سے بے نیاز کر دینا چاہئے۔

(10، مئی 84ء)

خطبات

کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے؟

ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں میں نے راولپنڈی میں "شام ہمدرد" کی تقریب سے خطاب کیا تھا جس میں 27 رمضان المبارک کو قیام پاکستان کی مناسبت سے بعض اہم مضامین زیر بحث آئے۔ آج کے کالم میں اس تقریر کا مکمل متن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

....

میرے لئے یہ بات بے حد خوشی کی بات ہے کہ آج سالوں کے بعد ایک مرتبہ پھر "شام ہمدرد" کے اجتماع سے مخاطب ہوں۔ "شام ہمدرد" کے آغاز کے وقت...... یہی کوئی بیس بائیس برس پہلے...... حکیم محمد سعید دہلوی نے جن چند قریبی احباب کا اجلاس بلایا تھا جس میں اس ماہانہ تقریب کا نام تجویز ہوا اس میں میں بھی شامل تھا بلکہ "شام ہمدرد" کا یہ نام بھی حکیم صاحب کو یاد ہو گا میرا ہی تجویز کردہ تھا اس کے بعد حکیم صاحب تو ثبات قدم کے ساتھ علم و ادب اور فکر و فن کے چراغ جلانے میں لگے رہے اور ہم خارزار سیاست میں جا نکلے گویا وہی بات ہوئی کہ

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
اُو بہ بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رُسوا شدیم

ایک ہوتی ہے تعریف، ایک ہوتا ہے اعتراف، کسی کے سامنے اس کی تعریف کرنا پسندیدہ نہیں مگر اس کی خدمات کا اعتراف کرنا مستحسن ہے۔ زندہ قومیں اور زندہ قوموں کے افراد وطن کے محسنوں کی

خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا کرتے ہیں ان کے مرنے کے بعد نہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں بھی حکیم صاحب سے ربع صدی کی شناسائی کے بعد یہ کہہ سکوں کہ جیسے حکیم صاحب کا ظاہر اجلا ہے ویسے ہی ان کا باطن صاف اور شفاف ہے وہ چاہتے تو اپنے فن کے باعث اربوں میں کھیلتے لیکن اس وقت اپنے اداروں کے کارکنوں میں پانچ لاکھ روپیہ یومیہ کی تنخواہیں تقسیم کرنے والا یہ مرد قلندر اپنے ذاتی تصرف میں کچھ بھی تو نہیں رکھتا جو کچھ ہے حکیم صاحب کا نہیں ہمدرد ٹرسٹ کا ہے۔ علم و فن اور ثقافت و ثقاہت کی دنیا میں پاکستان ہی میں نہیں بین الاقوامی حلقوں میں بھی وہ اپنے ملک کا تشخص ہیں۔ لاتعداد بیرونی ادارے پاکستان کو حکیم سعید کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اندرون ملک بے شمار دوسرے رفاہی اور سماجی کاموں کے علاوہ تنہا وہ اسی شام ہمدرد سے ذہنوں کو اجالنے کا جو کام کر رہے ہیں وہ ملک میں موجود دوسری تمام تنظیموں کے مجموعی کام پر بھاری ہے۔ سرکاری طور پر وہ مشاورت کے مقام پر فائز ہوئے جو مراسم کے اعتبار سے وزارت کے برابر تھا مگر اسے خود چھوڑ کر چلے آئے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس ملک کیلئے اور کچھ نہ کرتا صرف ہر صوبے میں ایک ایک حکیم سعید ہی پیدا کر دیتا تو آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

....

حکیم صاحب نے وقتاً فوقتاً کئی تحریکات شروع کی ہیں ان میں سے کئی کامیاب ہوئیں کئی کامیابی کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ کئی کی کامیابی کی توقع ہے۔ انہی میں سے ایک مبارک تحریک یہ بھی ہے کہ یوم پاکستان 14 / اگست کے بجائے 27 / رمضان المبارک کو منایا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ "شام ہمدرد" ہی کے پلیٹ فارم سے 6 / جنوری 1962ء کو لاہور کے ایک اجتماع میں میں نے خود یہ آواز اٹھائی تھی۔ سترہ اٹھارہ سال تو اس بات کو ہو گئے مگر افسوس کہ کسی حکومت کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس معاملے میں وہ اپنا قبلہ صحیح کر سکے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جس حکومت میں شامل تھا اس سے یہ بات منوانے کی میں نے کوئی کوشش نہ کی ہو گی، کی، بہت کی مگر کامیابی نہ ہوئی اسی طرح حکیم سعید جس حکومت میں مشیر تھے انہوں نے ضرور اس کے سامنے یہ بات رکھی ہو گی مگر نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ جو لوگ کسی حکومت کی میکنیزم، اس کے پریشر گروپس اور اس کی ورکنگ سے ناواقف ہوتے ہیں ان کے لئے یہ اچنبھے کی بات ہو گی کہ آج سابق حکومتوں کے وزیر اور مشیر موجودہ حکومت سے وہ مطالبہ کر رہے ہیں جو وہ اپنے عہد میں پورا نہ کرا سکے مگر جو لوگ حکومت کی ہیئت ترکیبی اور اس کے اصل ارباب اقتدار کی حقیقی سوچ سے واقف ہوتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اس اعتراض میں کتنا وزن ہے میں ایسے اصحابِ تنقید و تعریض کی خدمت میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ:

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی
تپیدنِ دلِ مُرغان رشتہ بر پارا

یا پھر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان میں سے راستہ بنانے والوں کی مشکلات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اے موج بلا! ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی ساحل پہ کھڑے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

بہر حال! حکیم صاحب کی یہ تحریک بہت صاف سیدھی، سمجھ میں آنے والی، قومی اور دینی تقاضوں سے ہم آہنگ، قابل عمل اور بہت دور رس اور نتیجہ خیز تحریک ہے۔ صاف بات ہے ہمیں یہ تو یاد رہا کہ پاکستان 14 / اگست کو بنا لیکن ہم یہ بھول گئے کہ اس دن اسلامی تقویم کے لحاظ سے 27 / رمضان کی تاریخ تھی۔ ہم نے 14 / اگست کو یوم آزادی منانے کیلئے منتخب کر لیا اور 27 / رمضان کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ کہاں اگست اور کہاں رمضان۔ دونوں میں لفظی اور معنوی اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم نے لفظ "اگست" کی وجہ تسمیہ جاننے کیلئے انگریزی کی دو مشہور کتابوں ولفریڈ کی "ورڈ اور جنز" اور جے ٹی شیلے کی "ڈکشنری آف ورڈ اور جنز" کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا یہ ایک نہایت ہی مہمل اور لغو قسم کا پس منظر رکھتا ہے۔ اصلاً یہ رومی سال کا چھٹا مہینہ ہے اسے شروع میں "سکس ٹیلیس" کہا جاتا تھا ہوا یہ کہ شہنشاہ اوکٹووین نے جو جولیس سیزر کا بھتیجا تھا اسے اپنے نام سے موسوم کر لیا۔ گو اس کا یوم پیدائش ستمبر میں تھا لیکن اس مہینے میں اسے بعض ایسی خوش بختیاں اور کامرانیاں نصیب ہوئیں کہ اس نے اسے اپنا نام دے دیا، اسے آگسٹس کا خطاب مل چکا تھا اسی مناسبت سے یہ مہینہ بھی آگسٹس ہو گیا۔ اس کا مخفف "اگست" ہے اور یہی وہ اگست ہے جو اب ہمارے گلے کا ہار بن چکا ہے۔ اس کے برعکس رمضان کو دیکھئے مشہور مفسّر قرآن "قاضی بیضاوی" کے نزدیک یہ لفظ رَمَضَ کا مصدر ہے جو جلنے کے معنی میں مستعمل ہے روزے کی حالت میں بھوک پیاس سے سوختگی بھی ہوتی ہے اور اس میں گناہ بھی جلتے ہیں اس لئے اسے رمضان کہا گیا "فتح الباری" جلد چہارم میں اس مہینے کے ساتھ نام مذکور ہوئے ہیں ایک روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے صحائف آسمانی اتارے اسی مہینے میں اتارے اور اس پر تو نصِ صریح ہے کہ قرآن حکیم اسی مبارک مہینے میں اترا۔ کب اترا قرآن میں تاریخ تو نہیں بتائی گئی لیکن اغلب یہی ہے اور احادیث رسول ؐ سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ 27 / رمضان کی رات کو اترا یعنی وہی رات جس رات پاکستان قائم ہوا۔ یہ قرآن السعدین بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ جمعہ کا دن، رمضان کا مہینہ، لیلۃ القدر، نزول قرآن کی رات اور قیام پاکستان کی ساعت، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت اور مقصد سے خالی ہے اگر نہیں تو پھر یہ قرآن السعدین بھی زبان حال سے ہمیں یہ کہہ رہا ہے کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

رمضان میں غزوۂ بدر ہوااور رمضان ہی میں فتح مکہ۔ یعنی اسی مہینے میں دفاع کے اسلامی قوانین کا آغاز ہوااور اسی میں یہ تکمیل کو پہنچے۔ اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ پاکستان کا تحفظ اور دفاع بھی اللہ تعالیٰ کی ملکوتی طاقتیں کرتی رہیں گی۔

یہ کتناہی دشمنوں کے درمیان "سینڈوچ" کیوں نہ بن جائے یہ قائم رہنے کیلئے بنا ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہ انشاءاللہ دشمنوں کے ہاتھوں تاخت و تاراج نہیں ہونے پائے گا۔ ہاں ہماری اپنی بات دوسری ہے اگر ہم خود ہی اس کا تیا پانچہ کرنے پر تل جائیں۔ اپنی غلطیوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں تو قانونِ قدرت کی کسی سے رشتہ داری نہیں۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے والا جل کے رہے گا خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ ہر عمل کا نتیجہ نکل کے رہتا ہے اور آج تک ہم نے اپنے دامن میں جو کچھ سمیٹا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال ہی کے نتائج ہیں۔ یہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ 27 رمضان کو یوم پاکستان ہونے کی خاص خدائی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں اور ان حکمتوں اور مصلحتوں سے آشنا ہونے کا حقدار بننے اور ان سے فیض یاب و بہرہ ور ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے یوم آزادی کا رشتہ 14 اگست کے بجائے 27 رمضان ہی سے قائم رکھیں۔

انتظامی نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں تو 14 اگست کا دن منانے کیلئے ہمیں کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے۔ کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں تب کہیں جاکر ایک محدود ذہنی فضا تیار ہوتی ہے مگر 27 رمضان کو تو یہ فضا یہ روحانی فضا آپ سے آپ قائم ہے۔ یہ عبادت کا دن ہے کوئی گیا گزرا سے گیا گزرا مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو اس کی مبارک ساعتوں کا حصہ دار بننے کا آرزومند نہ ہو ٹیلینے ہوتے ہیں، ختم قرآن کی محفلیں ہوتی ہیں، صلوٰۃ و سلام ہوتا ہے۔ دعا کا غلغلہ ہوتا ہے، یوم پاکستان کیلئے بنا بنایا اسٹیج موجود ہے اگر اسی کے ساتھ ساتھ حکومتی اور سرکاری کوششیں بھی شامل ہوجائیں تو ایسا دن منایا جائے کہ تاریخ کا حصہ بن جائے۔ وہ حکومت یقیناً بڑی باسعادت ہوگی جو اس تحریک کی ہم نوا ہو کر 14 اگست کے بجائے 27 رمضان کو یوم آزادی منانے کا فیصلہ کرے گی۔ یہ سال تو چلا گیا اب اگلے 27 رمضان تک قوم کے ہر فرد اور ہر طبقے کی طرف سے یہ آواز اس زور و شور سے بلند ہونی چاہئے کہ ایوان اقتدار کے در و بام اس سے گونج اٹھیں۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ حکومت جو اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے اپنا تعارف چاہتی ہے زیادہ دیر تک اس مطالبے کو نہیں ٹال سکے گی۔

بہر حال سرکاری سطح پر جو ہو سو ہو حکیم صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے پچھلے دو تین سالوں سے 27 رمضان ہی کو "یوم پاکستان" منانے کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ آج کا اجتماع اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور میں اسی مناسبت سے قیام پاکستان اور جدوجہد پاکستان کے موضوع پر چند گزارشات پیش کروں گا۔

قیام پاکستان کے بعد سے لیکر اب تک ایک نسل "چہل سال عمر عزیزت گزشت" کی منزل پر پہنچنے والی ہے "جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں" کے مصداق تحریک پاکستان کے رہنما ایک ایک کر کے اٹھ گئے جو موجود ہیں وہ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں" کی تصویر ہیں۔ تحریک پاکستان پر کوئی فلم موجود نہیں، کوئی جامع مستند مبسوط تذکرہ نہیں انفرادی سطح پر جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں ان تک نئی نسل کی رسائی نہیں رسائی ہو بھی تو اسے پڑھنے پڑھانے کی ایسی کوئی خاص عادت ہی نہیں۔ ادھر بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد کی ہماری تاریخ کوئی ایسی روشن اور درخشاں تاریخ بھی نہیں۔ اس پوری تاریخ کو سمیٹ کر ایک شعر میں پیش کرنا چاہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس دوران برابر اہل وطن کا تاثر یہی رہا کہ ۔

خدا جانے ! مرے گلشن تیرا انجام کیا ہوگا
جسے مالی بناتا ہوں وہی صیاد ہوتا ہے

ایک بے خبری دوسرے حالات سے مایوسی تیسرے مخالفین کی وسوسہ اندازی شدہ شدہ اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ بعض دانشور اور انٹیلیکچوئل یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ اصل میں ہمیں ہندوؤں کے ساتھ ہی مل کر رہنا چاہئے تھا۔ قیام پاکستان کی جدوجہد ہی غلط تھی۔ دو قومی نظریہ ہی صحیح نہ تھا۔ اب پاکستان قائم نہیں رہ سکے گا۔ ابھی حال ہی میں لندن سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے

"CAN PAKISTAN SURVIVE"?

کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے؟ ...... لکھنے والا بدقسمتی سے ایک پاکستانی سیاسی کارکن اور انٹیلیکچوئل ہے۔ اس نے اس کتاب میں کم و بیش انہی خطوط پر بحث کی ہے یہ تو کم و بیش ایسی ہی بات ہوئی کہ آباؤ اجداد قیمتی ترکہ اور ورثہ چھوڑ جائیں ناخلف اولاد اسے برباد کرتی جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتی جائے کہ اصل میں اس ورثہ اور ترکہ ہی میں خرابی تھی کوئی یہ نہ سوچے کہ

اک مصور نے جو سونپی تھی امانت کی طرح
کیا یہ لازم ہے وہ تصویر بگاڑی جائے

آیئے ہم تحریک پاکستان کے نظریاتی اور واقعاتی پہلوؤں کا مختصر جائزہ لے کر دیکھیں کہ یہ وسوسے کہاں تک درست ہیں؟

سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان ایک فاتح اقلیت بن کر داخل ہوئے محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا "چچ نامہ" میں وہ معاہدہ آج بھی موجود ہے جس میں مفتوحہ علاقہ کے غیر مسلموں کو اہل کتاب کے برابر حقوق دیئے گئے لیکن اس کے باوجود محمود غزنوی کے حملوں سے لیکر عالمگیر تک ہندوؤں کا تعلق مسلمانوں سے معاندانہ ہی رہا اسی لئے مسلمان ہندوستان کو "دارالحرب" ہی سمجھتے رہے جیسے کہ وہ مستقل حالت جنگ میں ہوں، یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنا علیحدہ قومی تشخص برقرار رکھنا پڑا۔ اکبر نے "دین الٰہی" کا تصور پیش کر کے ایک سیاسی وحدت قائم کرنے کی کوشش کی مگر مرہٹے مسلمانوں سے اس

زمانے میں بھی برابر برسر جنگ رہے اور اکبر کی یہ مصنوعی کوششیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی جدوجہد سے نقش بر آب ثابت ہوئیں یہ گویا دو قومی نظریئے کا پہلا دور تھا جو دارالحرب کے تصورات کی قانونی بنیادوں پر استوار تھا مغلوں کے عہد زوال میں دو قومی نظریئے کا دوسرا دور شروع ہوا جب مرہٹے جاٹ وغیرہ زیادہ طاقتور ہوگئے تو مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے اپنی بقا کی فکر لاحق ہوئی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتوبات میں اس فکر کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ جن میں انہوں نے ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ برصغیر قرار دیا ہے یعنی ایک ایسا وسیع علاقہ جس میں کئی قومیں آباد ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اگر زمین کا رشتہ ہی سب کچھ ہوتا نظریہ اور عقیدہ کی اہمیت نہ ہوتی تو وہ احمد شاہ ابدالی کو کبھی (اپنے وطن) ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت نہ دیتے مگر انہوں نے اس سلسلے میں ابدالی کو باقاعدہ ایک خط لکھا اور یہ کہہ کر اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی کہ:

"لاجرم بر آں حضرت فرض عین است، قصد ہندوستان کردن و تسلط کفار مرہٹہ برہم زدن۔ وضعفائے مسلمین را کہ در دست کفار اسیر انند خلاص فرمودن اگر غلبہ کفار معاذاللہ ہمیں مرتبہ ماند مسلمانان اسلام فراموش کنند و اندکے از زمان بگذرد "کہ قومے شوند کہ نہ اسلام دانند نہ کفر را" (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص52)

یعنی بلاشبہ آپ کا فرض منصبی ہے کہ آپ ہندوستان پر حملہ کرکے کافر مرہٹوں کے غلبہ کو ختم کریں اور ان کمزور مسلمانوں کو کہ جو کافروں کے ہاتھ قیدی بن چکے ہیں رہا کرائیں اگر خدانخواستہ کافروں کا تسلط اسی طرح رہا تو مسلمان اسلام کو بھلا دیں گے اور زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ وہ ایک ایسی قوم بن جائیں گے جو نہ اسلام کو جانتی ہوگی نہ کفر کو"۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے فرزندان معنوی سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کے مظالم سے بچانے کیلئے جہاد کیا گویا محدث دہلوی نے جس دو قومی نظریہ کی حفاظت کے لئے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی یہ تحریک مجاہدین اسی کے تحفظ کیلئے اب خود جانی قربانیاں پیش کر رہی تھی انگریزوں کا زمانہ آیا تو اب مسلمانوں کو دو محاذوں پر جنگ لڑنی پڑی۔ ہندوؤں سے تو ان کی صدیوں کی آویزش چلی آ رہی تھی انگریزوں نے بھی انہیں سابق حکمران سمجھ کر اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنالیا۔

1857ء کی جدوجہد میں گو مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا ایک طبقہ بھی شریک تھا مگر جنگ آزادی کے بعد انتقامی کارروائیوں کا ہدف صرف مسلمانوں کو بنایا گیا سکھوں اور گورکھوں کی مدد سے انگریز نے اس جدوجہد کو کچلا اور اس کے بعد دلی میں مسلمانوں کی جائیدادیں نیلام کیں نیلامی میں بڑھ چڑھ

کر بولی دینے والے یہی ہندو تھے دلی کی جامع مسجد پر پانچ سال انگریز کا پہرہ رہا اور مسجد اس زمانے میں ویران رہی مگر ہندوؤں کے کسی معبد پر ایسی پابندی نہ تھی اس زمانے میں سرسید احمد خاں مرحوم نے یہ حکمت عملی وضع کی کہ انگریز کے خلاف مسلمان اپنا محاذ موقوف کر کے مستقبل کیلئے ہندو اکثریت کے بالمقابل آنے کی تیاری کریں انگریز ہندوؤں کو مساوی طور پر مضبوط کرنے میں لگے ہوئے تھے مغربی جمہوریت کی بنیاد پر ہندوستان کی آزادی کا مفہوم صاف صاف ہندو اکثریت کی حکمرانی ہوتا سرسید اس نتیجے کو جانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن انگریز اس ملک سے جائے گا اس وقت مسلمان قوم اتنی تعلیم یافتہ اور منظم ہو کہ وہ اس ملک میں ہندو اکثریت کے مقابلے میں اپنا حق حاصل کر سکے۔ سرسید کے ذہن میں دو قومی نظریہ اتنا واضح اور اجاگر تھا کہ جب ایک انگریز مسٹر ہیوم نے 1858ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی تو انہوں نے اس پر زبردست تنقید کی سرسید کا کہنا تھا کہ جب ہندوستان میں ایک قوم آباد نہیں تو پھر نیشنل کانگریس کے قیام کا کیا جواز ہے۔ اس زمانہ میں اردو ہندی نزاع کے مسئلہ پر ہندو مسلم فسادات بھڑک اٹھے اور انہوں نے اتنی سنگین صورت اختیار کر لی کہ مشہور مصنف اور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کو اپنے رسالہ "تہذیب" کے اداریہ میں یہاں تک لکھنا پڑا کہ:

> "اوقات کچھ ایسے ہیں کہ ایک قوم کی مذہبی عبادات اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتیں جب تک کہ وہ دوسری قوم کے زود اثر جذبات کو ٹھیس نہ لگائیں اور نہ صبر و تحمل کا ایسا کوئی عنصر موجود ہے جو اہانت کو نظر انداز کرے اگر نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہندوستان کو ہندو صوبوں اور مسلمان صوبوں میں منقسم کر دیا جائے اور آبادیوں کا تبادلہ ہو جائے ہندو بظاہر اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کو بحیثیت پڑوسی رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے نہ ہی انہیں یہ بات پسند ہے کہ ان کے مندروں کے ناقوس کی آوازیں مسلمان کافروں کے کانوں میں گونجیں اور نہ وہ خود اذان کی آواز سننا پسند کرتے ہیں یقیناً یہ حل مسلمانوں کیلئے قابل قبول ہوگا اس لئے کہ وہ بھی ہندوؤں سے غالباً تنگ آچکے ہیں۔"

واضح رہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر نے یہ تحریر 23 ر اگست 1890ء میں لکھی تھی گویا اس وقت بھی ہندوستان کی صورت حال یہ تھی کہ مسلمان اہل فکر نہ صرف دو قومی نظریئے کے علمبردار تھے بلکہ انہیں مسئلے کا حل ہی یہی دکھائی دیتا تھا کہ ہندوستان کو ہندو مسلم آبادی کی بنیاد پر تقسیم کر دیا جائے۔

اسی زمانے میں بنگال کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا بنگال ایک بہت بڑی انتظامی وحدت تھی برطانوی حکومت جب سے ہندوستان میں قائم ہوئی تھی وہ اسے اپنی سہولت کیلئے دو صوبوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی۔ 1905ء میں آخر کار اسے دو الگ الگ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن چونکہ مشرقی بنگال اور آسام میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ان علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کا ایک ایسا اکثریتی صوبہ بن رہا تھا جس

میں مسلمانوں کے حقوق کی باسانی نگہداشت ہو سکتی تھی اس لئے ہندوؤں نے اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھالیااس تقسیم کو کالی دیوی کی توہین قرار دیا گیااس کے خلاف ایک لامتناہی تحریک منظم کی گئی ہندوؤں نے متعدد مقامات پر دہشت گردی کی' فسادات کرائے' ایک متعصب ہندو بنکم چندر چٹرجی نے ''انند ماٹھ'' یعنی (خوشیوں کا مندر) کے نام سے ایک ناول لکھا جس میں چند دہشت گرد لوٹ مار اور قتل وغارت کے ذریعے ہندوستان سے مسلم حکومت کا خاتمہ کرتے دکھائے گئے ہیں اس میں ایک نغمہ ہے ''بندے ماترم'' یعنی دھرتی ماتا کو ان کے بیٹوں کا سلام۔ یہ نغمہ ظاہر ہے مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا شرانگیزی پر مبنی تھامگر تقسیم بنگال کے خلاف تحریک کے دوران انڈین نیشنل کانگریس نے اسے قومی نغمہ بنا کر اپنا لیااس موقع پر مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ اور تقسیم بنگال کی تائید میں جدوجہد کرنے نیز جداگانہ انتخاب کا حق حاصل کرنے کیلئے ڈھاکہ میں ایک جلسہ منعقد کیا نواب وقار الملک نے ہندوستان بھر کے مسلم راہنماؤں کو اس میں مدعو کیا اور اس طرح دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

اس مختصر سے تاریخی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ دو قومی نظریہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی تخلیق نہ تھا بر صغیر کی فضاؤں میں سینکڑوں سالوں سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ دو الگ الگ قوموں کی حیثیت سے دریا کے دو کنارے بنے رہے اور مسلمانوں کی کوششوں کے باوجود ہندوؤں کے دلوں سے وہ نفرت اور مغائرت ختم نہیں ہو سکی جو وہ اس فاتح اقلیت کے خلاف رکھتے تھے انہیں جب بھی موقع ملا انہوں نے انتقام لینے کی ٹھانی جو لوگ ہندومت پر نظر رکھتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ تبلیغی مذہب نہیں' ہندو پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا مگر شدھی' آریہ سماج اور سنگھٹن کے نام سے ہندوؤں نے جو تنظیمیں قائم کیں ان کا مقصد مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ہندومت قبول کرنے پر آمادہ کرنا تھا ہی نہیں انہوں نے راشٹریہ سیوک سنگھ کے نام سے ایک دہشت پسند تنظیم بھی قائم کی جس کا مقصد بزور مسلمانوں کے دماغ ٹھکانے لگانا تھا ذبیحہ گاؤ کے مسئلے ہی کو لے لیجئے سب جانتے ہیں کہ اصل گائے خور تو انگریز ہے جو ''بیف'' سے عشق کرتا ہے وہ فوجی چھاؤنیوں میں بے دریغ گائے کا ذبیحہ کرتا تھا لیکن اسے کوئی پوچھنے والا نہ تھا مگر مسلمانوں کے خلاف ذبیحہ گاؤ کی آڑ میں وقتاً فوقتاً جو فسادات برپا کیے گئے ان کا کوئی شمار و قطار نہیں تنہا 1926ء میں ایک سال کے اندر اندر 26 بڑے فسادات ہوئے۔

جو لوگ کہتے ہیں ہمیں ہندوؤں کے ساتھ ہی رہنا چاہئے تھا ہم نے ایک الگ مملکت بنا کر غلطی کی ہے وہ کانگریس کی قائم کردہ ان صوبائی حکومتوں ہی کو یاد کر لیں جو مطالبہ پاکستان سے کہیں پہلے قائم ہوئی تھیں (دیکھا جائے تو پاکستان کا ذکر ہمیں مسلم لیگ کی 1940ء کی قرارداد لاہور میں بھی نہیں ملتا یہ تو ہندو پریس تھا جس نے اس قرارداد کو مطالبہ پاکستان کی سرخیوں کے ساتھ اتنی اہمیت سے شائع کیا کہ اگلے دن پاکستان کا لفظ ہر کہ ومہ کی زبان پر تھا) مولانا ابوالکلام مرحوم نے پاکستان کے نام پر تنقید کرتے ہوئے

لکھاہے کہ یہ گویاہندوستان کے خطوں کو پاک اور ناپاک قرار دینے کی ایک کوشش تھی مگر مولانا کا یہ فرمودہ اس لئے صحیح نہیں کہ پاکستان کا لفظ اصل میں چودھری رحمت علی مرحوم اور ان کے بعض نوجوان ساتھیوں کی ذہنی تخلیق تھا اور اس کے شروع کے حرفوں سے وہ علاقے مراد تھے جو ریاست میں شامل ہوتے جیسے پ سے پنجاب اسے افغانستان (سرحد) ک سے کشمیر س سے سندھ تان سے بلوچستان وغیرہ)

1937ء میں صوبائی انتخابات کے نتیجے میں جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں ان کا طرز حکومت یہ تھا

ا) کانگریس کا ترنگا جھنڈا تمام سرکاری عمارتوں پر لہرانے کے احکام جاری ہوئے۔

ب) مشہور مسلم دشمن ترانہ "بندے ماترم" تمام صوبوں کا قومی ترانہ قرار پایا۔

ج) ہندی کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔

د) تعلیمی نظام کے طور "ودیامندرا سکیم" جاری کی گئی جس کا مقصد ہندومت کی ترویج تھا۔

یہ صوبائی حکومتیں کم وبیش دو سال قائم رہیں مگر ان دو سالوں میں بھی انہوں نے جو گل کھلائے وہ آنے والی بہار کا صاف صاف پتہ دے رہے تھے یہی وجہ ہے کہ جب ان کا خاتمہ ہوا تو قائداعظمؒ نے مسلمانان ہند سے یوم نجات منانے کی اپیل کی۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کا مصور اور اس کا خالق دونوں ہی عرصہ دراز تک ہندو مسلم اتحاد کے نامور داعیوں میں شامل رہے ہیں میری مراد علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے ہے 'اقبالیات کے بھی طالب علم جانتے ہیں کہ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے اقبالؒ ایک مدت مدید تک وطنیت کی بنیاد پر متحدہ قومیت کے علمبردار رہے ہیں وہ ہندو سوامیوں کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مذاہب کی خارجی ہیئت سے بالاتر ہو کر ایک قسم کی داخلی روحانیت کے پرچارک تھے ایک زمانے میں تو انہوں نے یہاں تک کہا کہ

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

اور ان کی وہ نظم تو بہت مشہور ہے جس میں انہوں نے برہمن سے خطاب کرتے ہوئے واعظ و برہمن دونوں ہی کو خوب لتاڑا ہے!

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

اپنی عملی سیاست میں بھی وہ 1922ء سے 1930ء تک ہندو مسلم اتحاد ہی کیلئے کوشاں رہے یہاں تک کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبہ الہ آباد میں بھی انہوں نے خود مختار مسلم

صوبوں کا جو تصور پیش کیا اور جس جداگانہ ریاست کی طرف اشارہ کیا وہ بھی وفاق ہند ہی کا ایک حصہ تھی۔

آج "اقبالیات" کے موضوع پر بھارت میں جو ریسرچ ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں خطبہ الہ آباد ہی کی مجمل عبارت کو مرکز و محور بنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اقبال کسی آزاد مسلم ریاست کے بجائے مختلف ریاستوں کے ایک ہندی وفاق پر یقین رکھتے تھے لیکن یہ ریسرچ اسکالر صاحبان اور ان کے سرپرست یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ہندوؤں کی تنگ نظری تعصب اور ان کے مستقبل کے عزائم کی جھلکیاں تھیں جنھوں نے خطبہ الہ آباد کے بعد حضرت علامہ کو مجبور کیا کہ وہ 1937ء اور 1938ء میں اپنے خطوط کے ذریعے قائداعظمؒ پر مسلمانوں کیلئے ایک جداگانہ مملکت حاصل کرنے کیلئے زور دیں ایک آزاد مسلم ریاست کا یہ تصور اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی اس خط و کتابت میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے اور پڑھا جا سکتا ہے۔ یہی صورت ہمیں قائداعظمؒ کی زندگی میں کارفرما نظر آتی ہے وہ شروع میں کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں شامل تھے کانگریس کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ 1914ء میں جدید اصلاحات پر ملک کا نقطۂ نظر بتانے کیلئے برطانوی پارلیمینٹ کیلئے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کا لیڈر انہیں ہی منتخب کیا گیا۔ بڑے بڑے کانگریسی رہنما انہیں ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار سمجھتے تھے مسز سروجنی نائیڈو نے اس زمانے میں قائداعظمؒ پر جو کتاب لکھی تھی اس کا نام ہی "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" تھا۔ ان کی انہی خدمات کے پیش نظر 1921ء میں بمبئی میں "جناح ہال" تعمیر کیا گیا۔ قائداعظمؒ اس کی رسم افتتاح کے موقع پر پیرس میں تھے مسز نائیڈو نے انہیں جو تار بھیجا اس میں کہا "پیغمبر کی زندگی میں قوم نے اس کی قدر جان لی"۔

لیکن جب کانگریس کی مسلم دشمنی ان پر کھل گئی تو اس مقام قیادت کو انہوں نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ ہندو کی نظر میں "اتحاد کا پیغمبر" اب نفاق کا داعی بن گیا ان کی کردار کشی کی گئی۔ ان پر قاتلانہ حملے ہوئے لیکن قائداعظمؒ ذرہ برابر نہیں گھبرائے۔ انہوں نے مسلم قوم کو منظم کیا تحریک پاکستان کا پرچم اٹھایا اور انگریز اور ہندو دونوں کو اپنے تدبر اور فراست سے شکست فاش دے کر یہ مملکت خداداد پاکستان قائم کر دکھائی۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہو متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند !

تو عزیزان گرامی! یہ ہے پاکستان کی جدوجہد کا مختصر جائزہ۔ قائداعظمؒ کے الفاظ میں "دو قومی نظریہ اسی وقت سامنے آ گیا تھا جب پہلا مسلمان ہندوستان میں داخل ہوا" یہ کوئی نیا نظریہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ تاثر بھی بے بنیاد ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ چلنے کی کوشش نہیں کی مسلمان ساتھ چلے اور بہت ساتھ چلے مگر تجربات نے ثابت کر دیا کہ ہندوؤں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ آج آزادی کے بعد کی اب تک کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ہندوؤں نے اب تک مسلمانوں کو قبول کرنا تو کجا گوارا کرنا بھی شروع نہیں کیا۔ بھارت میں آزادی کے بعد سے اب تک پانچ سو سے زیادہ ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں۔ حکومت وہاں اکثریت ہی کر رہی ہے اور مسلم اقلیت اس کے رحم و کرم پر ہے۔ ایک بھی مسلمان آج تک ملک کا

وزیراعظم تو کجا کسی مؤثر کلیدی عہدے پر فائز نہیں ہوسکا۔ اس لئے اے برادران وطن! پاکستان کے قیام پر خوشیاں مناؤ اپنا سر اپنے رب کے سامنے ٹیکو کہ کم سے کم یہ کروڑوں مسلمان انگریز کے بعد ہندو اکثریت کی غلامی میں تو مبتلا نہیں ہوئے۔ حکومتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں ان کی مخالفت کو وطن کی مخالفت نہ بنالو، حکومت اور ملک گورنمنٹ اور اسٹیٹ میں فرق کرنا سیکھو، اس مقصد کے حصول کیلئے پیش قدمی کرو جس کیلئے یہ ملک 27 رمضان کو قائم ہوا۔ اسلامی نظام کے اس تصور اور نظریئے سے اپنے فکر و عمل کو اجالو جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے الفاظ میں "سیاست عادلہ" پر قائم ہو۔ جس میں ہر شخص کو انصاف ملے جس میں کوئی شخص بھوکا نہ سوئے کسی کی عزت غیر محفوظ نہ ہو، شخصیتوں کے ارد گرد تانا بانا بننے کی بجائے مضبوط اداروں کا قیام عمل میں لاؤ۔ شخصیتیں فانی ہیں آنی جانی ہیں ایسا کیوں ہو کہ جو حکمران جائے اپنے پیچھے یہ سوال چھوڑ جائے کہ اب اس کے بعد پاکستان کا کیا بنے گا؟ ایسے مضبوط آئینی ادارے ہونے چاہئیں جو ہر خلاء کو پُر کرسکیں۔ میں جانتا ہوں "شام ہمدرد" کا پلیٹ فارم غیر سیاسی ہے اس لئے تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ ارباب حکومت سے بھی صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اقتدار ایک شخص یا ایک گروہ میں مرتکز کرنے کے بجائے عوام کو اس کا حصہ دار بناؤ۔ انہیں کاروبار مملکت میں احساس شرکت دو۔ انہیں ملک کے حال اور مستقبل سے غیر متعلق نہ بنادو اور یہ نہ بھولو کہ آج وہ اہل سیاست کیساتھ نہیں تو حکومت کیساتھ بھی نہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ حاضرین گرامی! میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں صرف آخر میں یہ عرض کروں گا کہ حالات جیسے بھی ہوں اہل وطن کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، حالات کی سنگینی ہے تو ہمیں پاکستان کے تحفظ کیلئے اور زیادہ آمادہ و مستعد ہوجانا چاہئے یہ ملک کسی ایک فرد کا نہیں کسی ایک گروہ کا نہیں آٹھ کروڑ مسلمانوں کا ہے ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اس ملک کیلئے وہ جو کچھ بھی کرسکتا ہے اس سے دریغ نہ کرے۔

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے ، نالۂ ، آہے ، فغانے

علماء کنونشن میں چند معروضات

پچھلے سال 21۔ 22ر اگست کو پاکستان گیر بنیادوں پر صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی صدارت میں اسلام آباد میں جو علماء کنونشن ہوا تھا اس میں، میں بھی شریک تھا اور میں نے اس موقع پر ارباب حکومت اور علمائے کرام کی خدمت میں کچھ گذارشات بھی پیش کی تھیں۔ میری یہ تقریر اتفاق سے وزارت مذہبی امور کی شائع کردہ روئداد بعنوان "تقاریر و تجاویز علماء کنونشن" میں من و عن شامل کر دی گئی ہے، مناسب ہو گا اگر آج کی صحبت میں قارئین اس تقریر کے اٹھائے ہوئے نکات پر غور فرمائیں۔ فرق اتنا ضرور ہے کہ تقریر میں تحریر کا سا ربط نہ ملے گا کیونکہ دونوں شعبوں کے آداب اور تقاضے الگ الگ ہیں اس ایک بات کے سوا باتیں آپ اس میں بھی وہی پائیں گے جو ان کالموں میں کبھی بین السطور اور کبھی کھل کر عرض کی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی زیر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ "تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" کے مصداق اچھائی اور بھلائی کے کام میں تعاون ہر کسی کے ساتھ اپنا شعار ہے مگر انشاء اللہ اس میں نہ کبھی آپ خوشامد پائیں گے نہ مداہنت، جو دل میں محسوس کریں گے وہی زبان پر ہو گا ہاں کوشش یہ ضرور ہو گی کہ بات کہنے کا اسلوب ایسا ہو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ کلمہ حق "ڈانگ مارنے" کے انداز میں بھی کہا جا سکتا ہے مگر اس کا نتیجہ کبھی تعمیری بر آمد نہ ہو گا۔ اپنا مشن یہی ہے کہ بات نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں ہو لیکن اگر اس پر بھی کسی کو اعتراض ہو اور کوئی اتنی جسارت بھی برداشت نہ کرے تو اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں ان ابتدائی معروضات کے بعد اب پندرہ منٹ کی یہ تقریر ملاحظہ فرمائیے۔

جناب صدر! حاضرین گرامی! میرے لئے آج کی مجلس میں لب کشا ہونا بوجوہ بڑا نازک اور کٹھن ہے مگر جناب صدر ایک تو یہ آپ کا حکم ہے اس لئے ازراہ امتثال امر کچھ کہنا لازم ہے دوسرے ابھی ابھی مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں ایک مصرعہ پڑھا تھا مجھے پورا شعر یاد آ رہا ہے۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

مگر دقّت یہ ہے کہ اتنی تقریریں ہو چکی ہیں اور اتنی فاضلانہ تقریریں ہو چکی ہیں کہ ان کے بعد کوئی نئی بات کہنا بہت مشکل کام ہے وہی بات ہے کہ۔

اڑا لی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

مگر بہرحال کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا اس لئے کہ یہ کنونشن بہت ہی تاریخ ساز کنونشن ہے اور ایسے مرحلے میں منعقد ہو رہا ہے، جو عالمی پس منظر میں نہایت ہی اہمیت اور نزاکت کا حامل ہے۔ جہاں تک آج کی تقاریر کا لب لباب ہے جناب صدر! آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علمائے کرام کے کسی طبقے میں اسلامی نظام کے نفاذ پر کوئی اختلاف نہیں تمام علماء بیک آواز اس کے حامی بلکہ نقیب ہیں ہاں ایک بات جس کی صدائے بازگشت بار بار سنی گئی وہ فقہی اختلافات ہیں یہ اختلافات کیا ہیں؟ کب پیدا ہوئے؟ ان کا حل کیا ہے؟ یہ ایک بہت ہی علمی موضوع ہے اور اس پر صدیوں سے لکھا جا رہا ہے خود ہمارے برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے لے کر علامہ اقبالؒ تک اور علامہ اقبالؒ سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تک بھی اہل علم نے اس پر قلم اٹھایا، ظاہر ہے اتنے وسیع الاطراف موضوع کو یہاں چند منٹ کے اندر پوری طرح سمو کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

مختصراً عرض کرنا چاہوں تو یوں کہوں گا کہ ایک زمانہ تھا جب کوئی فقہی اختلافات نہیں تھے یہ صحابہؓ کرام کا دور تھا۔ خلافت راشدہ کا دور تھا بعد میں فقہ کا دور آیا، فقہا کا دور آیا فقہی اختلافات پیدا ہوئے، لیکن یہ بھی اختلافات تھے انہوں نے مخالفت کی شکل اختیار نہ کی تھی، یہ اختلافات تھے لیکن انہوں نے فرقہ وارانہ انداز اختیار نہیں کیا تھا اس لئے کہ ایک نظریہ جتنا مضبوط، جتنا جاندار اور جتنا پائیدار ہوتا ہے اتنا ہی اس کے بطن سے مختلف مکاتب فکر، اسکولز آف تھاٹ پیدا ہوتے ہیں اسلام کے لئے یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے یہ اسلام کے حق میں اس کے جاندار اور پائیدار اور ازلی اور ابدی نظریہ ہونے کی دلیل ہے پھر بدقسمتی سے وہ دور آیا کہ فقہی اختلافات فرقی اختلافات میں تبدیل ہو گئے اور اصل خرابی کا آغاز میں بصد ادب عرض کروں گا کہ حقیقت میں یہیں سے شروع ہوا۔ لیکن جناب صدر! اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقہی اختلافات کی اس ساری ہنگامہ آرائی میں علمائے کرام آپ کو بددل کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی نظام کا بیڑا نہ اٹھائیں۔ فقہی اختلافات کا دائرہ اسلام کے نظام حیات میں صرف اس کے تشریعی پہلو

کے اندر اور وہ بھی اس کے کچھ اجزا میں سامنے آیا لیکن اسلام کا نظام حیات صرف اس کا تشریعی نظام نہیں ہے وہ اس کا ایک جزو ہے اس تشریعی نظام میں اور اس کے ساتھ ہی قانونی نظام میں بھی سو میں سے نوے باتیں ایسی ہیں جن پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے۔

فقہی جزئیات کی بات سے پہلے مجھے ایک اور بات یاد آ گئی یہاں 22 نکات کا بہت چرچا ہوا۔ علمائے کرام نے ایک زمانے میں اسلامی نظام کا جو خاکہ تیار کیا تھا اور متفقہ خاکہ تیار کیا تھا اور مجھے امید ہے کہ اس کنونشن کے نتیجے میں بھی علمائے کرام ضرور کوئی ایسا مشترکہ اعلامیہ تیار کر کے اٹھیں گے جو اسی طرح تاریخ کا حصہ بنے گا یہ میری خواہش بھی ہے اور میری دعا بھی ہے۔ ان 22 نکات کی ترتیب میں جو قائدین شریک تھے ان میں سے بہت تو اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے مگر آج شیعہ سنی کی نزاع کے اندر خوش قسمتی سے شیعہ حضرات کی قیادت جس عالم جلیل کے ہاتھ میں ہے میری مراد حضرت مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ سے ہے ان کے دستخط بھی ان 22 نکات پر ثبت ہیں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب کبھی اپنے ان دستخطوں کے خلاف کوئی ایسا اقدام اپنے ماننے والوں اور اپنے عقیدت مندوں کو نہیں کرنے دیں گے جس سے ان 22 نکات کی تردید ہوتی ہو۔

تو جناب والا! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تشریعی پہلوؤں کے چند اجزا میں آپ کو یہ اختلاف نظر آئے گا مگر بے شمار باتیں ایسی ہیں جو متفق علیہ ہیں اس حقیقت کے پیش نظر اصل ضرورت ترجیحات کے تعین کی ہے کہ آغاز کار کہاں سے ہو اور کون سی چیزیں زیادہ اہم ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ متفق علیہ باتوں سے آغاز کیجئے کوئی مکتب فکر آپ کو اس سے نہیں روکے گا کہ آپ نظام تعلیم کی اصلاح کریں جو اگر قیام پاکستان کے وقت سے ہوئی ہوتی تو آج ایک مسلمان نسل کے پیدا ہونے کا باعث بن چکی ہوتی۔ کوئی مکتب فکر آپ کو اس سے نہیں روکے گا کہ آپ دین متین کی تبلیغ فرمائیں اپنے ذرائع ابلاغ سے بھی اور اپنے جملہ وسائل سے بھی' اس میں تمام علمائے کرام شامل ہوں گے کوئی مکتب فکر آپ کو اس سے نہیں روکے گا بلکہ آپ کا ممد و معاون ہو گا اگر آپ عبادات کے فروغ اور ان کے فلسفے کو عام کرنے اور اس کے لئے فضا تیار کرنے کا اہتمام کریں کوئی مکتب فکر آپ کو اس سے نہیں روکے گا اگر آپ عریانی اور فحاشی کا سدباب فرمائیں گے کوئی مکتب فکر آپ کو اسلام کے تصوراتِ عدل و انصاف کو عام کرنے کے مشن میں رکاوٹ دکھائی نہیں دے گا تو پھر فقہی اختلافات کا ڈر کیا ہے؟۔

یہ چند بنیادی باتیں ہیں ان باتوں کے کرنے میں بھی تو کچھ وقت لگے گا بلکہ بہت وقت لگے گا پھر جب فضا تیار ہو گی تو انشاء اللہ اس وقت تک آپ جو کمیٹیاں بنائیں گے اور علمائے کرام سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو اختلافات کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا اس وقت تک نظام اسلام کے کام کو معطل تو نہیں کیا جا سکتا۔

جناب والا! میں یہ بھی عرض کروں گا کہ اسلامی نظام صرف فارم اور ہیئت کا نام نہیں روح اور سپرٹ کا بھی نام ہے جتنے انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے قرآن حکیم نے ان کی بعثت کے مقاصد میں

عدل اور قسط کے قیام کو بھی سرفہرست جگہ دی ہے۔ اسلامی نظام حیات عدل اور انصاف کا ضامن ہے اگر عدل و انصاف نہیں' اگر ایک آدمی بھوکا ہے' حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا تھا کہ میں اس بات پر مامور ہوا ہوں کہ اپنی رعایا کے لوگوں کی دعائیں عرش معلیٰ تک پہنچنے سے روک لوں۔ اگر عدل و انصاف کا یہ نظام قائم نہیں ہوتا اور آپ "فارم" قائم کر دیتے ہیں، ہیئت قائم کر دیتے ہیں تو یہ ایک ایسا جسد ہے جو بے جان ہے اس کی روح عدل اور انصاف ہے۔ میں نہیں کہتا اقبال سے بڑھ کر ہمارے ہاں اس نظام حیات کا رمز شناس اور کون ہو گا۔ وہ کہتا ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبین این است و بس

کوئی کسی کا محتاج نہ ہو۔ شرع مبین کا نکتہ یہ ہے اس کی حقیقت' اس کی اصلیت اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ جہاں میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو کوئی کسی کی احتیاج کو ایکسپلائٹ کرنے والا نہ ہو' آپ استحصال کو ختم کیجئے' آپ احتیاج کو ختم کیجئے' آپ ہاتھ ضرور کاٹیں مگر وہ معاشی نظام بھی لائیں جس کے تحت کوئی ہاتھ احتیاج کے مارے پھیلنے نہ پائے آپ سزا دیجئے مگر جزا کا بھی اہتمام فرمائیے اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے ڈرایا ہے مگر جنت کا مژدہ بھی دیا ہے اس نے ترہیب سے کام لیا ہے مگر ترغیب بھی دی ہے اس نے عذاب سے ڈرایا ہے مگر انعام سے سرفراز کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے جزا اور سزا ترغیب و ترہیب' یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں انہیں آج بھی ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔

آج ایک عام آدمی انصاف حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ انصاف بکتا ہے اور بہت مہنگا بکتا ہے وہ وکیل کی فیس نہیں دے سکتا۔ آج عدالت میں' میں بغیر عدالتوں کی توہین کئے عرض کر رہا ہوں انصاف وہی جا کر خرید سکتا ہے جس کی جیب میں کھنکتے ہوئے سکے ہوں' غریب آدمی ان اونچے ایوانوں میں پھٹک بھی نہیں سکتا آپ انصاف کو سہل الحصول کیجئے' آپ انصاف کو لوگوں کے دروازوں تک لے جایئے۔

اسی طرح آپ احتیاج کو ختم کیجئے آپ نے زکوٰۃ کا نظام رائج کیا' نئے کاموں میں ٹھوکریں لگتی ہیں لغزشیں ہوتی ہیں۔ علمائے کرام کی کمیٹیاں بنائیں وہ آپ کو تجاویز دیں گے اور مجھے امید ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی سقم ہے تو یقیناً آپ اس پر اصرار نہیں کریں گے جب نئے اقدام ہوتے ہیں اور انقلابی انداز میں ہوتے ہیں ان میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور غلطیوں پر اصرار بھی مردان حق آگاہ کا شیوہ نہیں ہوتا آپ یقیناً ان اسقام کو دور کریں گے لیکن اس زکوٰۃ کے نظام کی طرح ایک وسیع تر ایسا معاشی نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جس کے اندر عدل اور انصاف کی روح کار فرما ہو۔

....

آج کی تقریروں میں بعض علمائے کرام نے سابقہ حکومتوں پر تنقید کی ہے آپ شوق سے سابقہ حکومتوں پر تنقید فرمائیے۔ ہم اقراری گناہ گار ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ سابقہ حکومتوں میں ایک بات تو تھی

ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہ کیا تھا کہ اسلامی حکومت قائم ہو گئی یا اسلامی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ یہ خواب لوگوں کو کاملانہ دکھایا گیا تھا اس کے جہاں نقصانات تھے وہاں یہ فائدہ بھی تھا کہ لوگ ایک رومان میں مبتلا تھے وہ سمجھتے تھے ہماری تمام تر خرابیاں اسی لئے ہیں کہ اسلامی نظام حیات قائم نہیں ہوا وہ قائم ہو گیا تو ہمارے تمام دلدر دور ہو جائیں گے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اب جہاں آپ نے اس نیک عزم کا اظہار کیا ہے اس میں قدم قدم پر خطرے بھی ہیں۔

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

اس میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جب اسلامی نظام کے آجانے کی بات ہو گی مگر لوگوں کے مسئلے وہیں رہیں گے، لوگوں کی تکلیفیں بڑھیں گی اور رشوت بھی اسی طرح ہو گی اور لوگ اسی طرح افلاس میں مبتلا رہیں گے اور اسی طرح تکالیف اور اسی طرح آلام کے گرداب میں گھرے رہیں گے تو پھر وہ نئی نسل جو اسلام سے بے بہرہ ہے کہے گی کیا یہی وہ اسلامی نظام تھا جس کا ہم صدیوں سے خواب دیکھتے چلے آرہے ہیں اور خدانخواستہ جس دن یہ مایوسی لاحق ہو گئی اس کے بعد پھر اشتراکیت کا دیو اس نسل کو ہڑپ کرنے کیلئے آپ کی سرحدوں پر تیار کھڑا ہے لیکن یقیناً یہ تنہا آپ کا کام نہیں یہ چیلنج پوری ملت اسلامیہ کو ہے، یہ چیلنج تمام علمائے کرام کو ہے انہیں مل جل کر اس بات کو پورا کرنا ہے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر بنانا ہے کہ رومان ختم ہوا اور اب ہم حقیقت کا سامنا کر رہے ہیں تو اسلامی نظام کی راہ میں ہم فقہی اختلافات کو آڑے نہ آنے دیں، ہم فرقہ وارانہ چپقلشوں کا شکار نہ ہوں، ہم ایک دوسرے کے گریبانوں پر ہاتھ نہ ڈالیں۔ ایک طرف ہماری سرحدوں کے قریب کمیونزم کی حکمرانی ہے اس سے بعید، بیت المقدس میں صہیونیوں کی راجدھانی ہے اور تیسری جانب بھارت میں خون مسلم کی ارزانی ہے ایسے میں اگر پاکستان میں فرقہ واریت پیدا ہو گئی اور خدانخواستہ یہاں کسی ایسے فساد کی کوئی چنگاری بھڑک اٹھی تو پھر کس منہ سے ہم دوسرے ملکوں کے اندر ہونے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکیں گے۔

اس لئے جناب والا! پوری ملت کا فرض ہے کہ وہ تمام عصبیتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسلامی نظام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر بنائے کیونکہ یہ انسانیت کی آرزو ہے، انسانیت آج زخموں سے چور چور ہے اس سے خون رس رہا ہے، وہ کراہ رہی ہے غم و آلام کے مارے رو رہی ہے، سر پیٹ رہی ہے مگر کوئی اس کے دکھوں کا مداوا کرنے والا نہیں اب یہ وقت بتائے گا کہ یہ اعزاز کس کے نصیب میں ہے کہ وہ اسلامی نظام کا احیاء کرے اور دنیا کے سامنے وہ نسخہ شفا پیش کرے جو ہمیں قرآن حکیم نے عطا کیا ہے خدا کرے کہ یہ پاکستان کی ملت اسلامیہ کا مقدر ہو، میری دعا بھی ہے، میری خواہش بھی اور مجھے اپنی قوم کی دینی اور ایمانی امنگوں پر یقین بھی ہے کہ انشاء اللہ وہی سب سے پہلے پاکستان کو اسلام کا مرکز اور حقیقی معنوں میں اس کا قلعہ بنا کر دم لے گی۔

(30 جولائی 81ء)

مارشل لاء کی حکومت اور خدمت اسلام

5ر جولائی 87ء کو صدر ضیاء الحق کے اقتدار کا ایک عشرہ پورا ہو گیا' اس شام ایک استقبالیہ میں بعض غیر ملکی اخبار نویسوں نے مجھ سے میرا ردعمل دریافت کیا تو میں نے کہا "ابھی تو بچہ نابالغ ہے ذرا اسے جوان ہو جانے دیجئے پھر بات کریں گے" اور واقعی صورتحال ہے بھی کچھ ایسی ہی' صدر صاحب ماشاء اللہ "پابندِ اسلام" ہیں وہ جانتے ہیں اسلامی تاریخ میں یا تو خلفا ہوئے ہیں یا ملوک اور ان کے اقتدار کی کوئی تحدید نہیں ہوتی وہ تازیست سریر آرائے حکومت رہتے ہیں' یہ صدارت کی "بدعت" تو دور حاضر کی ایجاد ہے اس لئے انہوں نے مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ جیتے جی یہ عہدہ نہیں چھوڑیں گے یہ الگ بات ہے کہ قدرت کو کچھ اور منظور ہو۔

ان دس سالوں میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیل میں جانا مطلوب نہیں واقعہ یہ ہے کہ مارشل لاء کے زمانے میں بیرون ملک اپنے آپ کو پاکستانی کہلاتے شرم محسوس ہوتی تھی البتہ صدر صاحب اور ان کے اردگرد ایک مخصوص مذہبی حلقہ ایسا ہے جو اس دور میں ہونے والی "خدمت اسلام" کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتا مگر ان بلند بانگ دعووں کی حقیقت کیا ہے یہ جاننے کے لئے میں آپ کو اپنی ایک تقریر کے مطالعہ کی زحمت دوں گا جو میں نے 3ر فروری 86ء کو سینیٹ کے اجلاس میں کی تھی۔ موقع یہ تھا کہ ایوان میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ برائے سال 78-1977ء زیر بحث تھی' کونسل کی سالانہ رپورٹوں کا پارلیمنٹ میں زیر بحث آنا ایک آئینی ضرورت ہے مگر چونکہ مارچ 85ء تک کوئی منتخب پارلیمنٹ موجود

نہیں تھی اس لئے یہ آئینی ضرورت پوری نہ ہو سکی، موجودہ نیم سول اور نیم فوجی حکومت برسر اقتدار آئی تو اس نے یہ رپورٹیں ایوان میں پیش کیں جن پر بحث کا سلسلہ 1986ء کے آغاز سے شروع ہوا ہے اور اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا، گویا سارا عمل بحث برائے بحث کے زمرے میں آتا ہے مگر پھر بھی کم سے کم ملک کے سب سے بڑے اور سب سے معتبر فورم پر "احقاق حق" اور "ابطال باطل" کا موقع تو ہاتھ آ گیا ہے اور نہیں تو اس طرح مارشل لاء کے دور میں جنرل ضیاء الحق صاحب کی طرف سے دعوئ خدمتِ اسلام کا جائزہ تو لیا جاسکتا ہے پارلیمینٹ میں ہونے والی یہ تقریریں اس لئے بھی اہم ہیں کہ ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور یہ مطبوعہ صورت میں دستیاب بھی رہتی ہیں، چنانچہ اپنی یہ تقریر سینیٹ کی باقاعدہ سرکاری رپورٹ سے نقل کر کے پیش کر رہا ہوں اس میں اپنی طرف سے نہ کوئی اضافہ کیا ہے نہ ترمیم۔

اس تعارفی پیش لفظ کے بعد یہ تقریر ملاحظہ فرمایئے۔

جناب چیئرمین! اسلامی مشاورتی کونسل کی جو رپورٹ ہمارے زیر غور ہے اس کی بعض سفارشات گفتگو کرنے سے قبل میں چند اصولی باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

نو دس سال سے ملک میں غلغلہ ہے کہ اسلام آرہا ہے مگر اب تک یہ نہیں بتایا گیا کہ کہاں سے آرہا ہے؟ کیا وہ کہیں گیا ہوا ہے کہ اسے وہاں سے دوبارہ یہاں قدم رنجہ فرمانا ہے یا وہ آیا ہی نہیں اور اب پہلی بار اس کی آمد کی نوید سنائی جارہی ہے، اسلام تو چودہ سو سال پہلے آچکا ہے یہ کوئی مسافر نہیں کہ جس کے بارے میں پیش گوئی کی جارہی ہو کہ وہ تیز گام سے آرہا ہے یا بذریعہ طیارہ آرہا ہے، وہ تو چودہ سو سال سے آچکا ہے اور ہمارے پاس موجود ہے، حقیقت میں وہ باہر سے کبھی نہیں آئے گا جب آئے گا اندر سے آئے گا، خارج سے جو لوگ اسے لارہے ہیں وہ اسی لئے ناکام ہوتے ہیں کیونکہ یہ خارج سے نہیں داخل سے آتا ہے، علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے طریقہ کار میں یہی ایک فرق ہے کہ صوفیاء اسے داخل سے لاتے ہیں اور جب وہ لاتے ہیں تو پھر یہ کہیں نہیں جاتا لیکن بدقسمتی سے علماء (اور میں علمائے حق کی بات نہیں کرتا وہ تو خود صوفیاء ہوتے ہیں میں علمائے ظاہر کی بات کر رہا ہوں) جب محض جبر سے، محض شور و غوغا سے پروپیگنڈے اور سیاست سے اسے لانے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب سے پاکستان بنا ہے اس مارشل لاء سے پہلے کوئی حکومت ایسی نہیں رہی جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ وہ اسلامی حکومت قائم کر چکی ہے اور اب اسلام آگیا ہے ہر حکومت نے اسلام کا نام ضرور استعمال کیا لیکن ہر ایک کہتی تھی کہ ہم گنہگار ہیں، اسلام کو بنیاد بنا کر کسی نے حکومت نہیں کی مگر ان نو سالوں میں جو حکومت قائم رہی ہے اس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس نے اسلام کو بنیاد بنا کر حکمرانی کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی کوششوں سے اسلام آگیا ہے، پہلی حکومتوں کے ضمن میں پھر یہ شک کا فائدہ تھا کہ لوگ یہ کہتے تھے ہمارے مسئلے اس لئے الجھے ہوئے ہیں کہ یہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی، یہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہوا جب وہ آئے گا تو ہمارے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن جب صدر ضیاء کی حکومت نے یہ

مژدہ جانفزا سنایا کہ اسلام آگیا اور اسلامی حکومت قائم ہو گئی ہے اور لوگوں نے دیکھا کہ ان کی مشکلات پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، رشوت عام سے عام تر ہو گئی ہے، مہنگائی کے ہاتھوں جینا دوبھر ہو گیا ہے، ظلم و ستم اور بدامنی کی حد ہو گئی ہے تو انہوں نے کہا اگر یہ اسلام تھا تو ہم اس کے بغیر ہی اچھے تھے۔ اس طرح اس نام نہاد اسلامی حکومت نے جناب چیئرمین! وہ رومانس ختم کر دیا جو اس قوم کا اسلامی نظام کے ساتھ قائم تھا جو اسے زندگی کی کٹھن گھڑیوں میں بہت سہارا دیتا تھا جو اسے مشکل وقت میں یہ بتاتا تھا کہ تمام تر مسائل کا باعث یہ ہے کہ اسلام نہیں آرہا جب وہ آئے گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے مگر اس حکومت نے اسلام پر سب سے بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ اس نے قوم کی وہ ساری امیدیں اور اس کا وہ سارا رومان ختم کر دیا ہے جو اسلامی نظام کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس حکومت نے عجیب طرح کی "اسلام کاری" کی، ایک طرف اس نے یہ بھی چاہا کہ استحصال بھی رہے، غریب غریب تر ہوتے جائیں، امرائے کے سرمائے میں اضافہ ہوتا رہے، سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کا نظام بھی پھلے پھولے، استحصالی طبقات کی مراعات بھی اسی طرح ہوں اور حقوق بھی اسی طرح، دوسری طرف لوگوں کو کھیلنے کے لئے ایک ایسا کھلونا دے دیا جائے جس سے وہ بہل جائیں، جس سے ان کو یہ سمجھایا جاسکے کہ جس اسلام کا وہ عرصہ دراز سے انتظار کر رہے تھے وہ اسلام ان کو مل گیا ہے، اگر اسلام کے کام کا آغاز عوام کو انصاف دینے سے ہوتا جو ان کی اصل ضرورت ہے، اگر ان کا معاشی مسئلہ حل کیا جاتا جس کی وجہ سے انہیں ایمان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اگر ان کی معاشرتی ناہمواریاں ختم کی جاتیں جن کی وجہ سے سوسائٹی میں اونچ نیچ پیدا ہو گئی ہے، اگر عورتوں پر ہونے والا وہ ظلم و ستم ختم کیا جاتا جس کی وجہ سے انہیں ملک کے ایک بہت بڑے حصے میں جانوروں کی سی زندگی گزارنا پڑ رہی ہے تو شاید وہ نتائج پیدا ہو سکتے جو اسلامی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے، پھر ہم مغرب پر اسلام کے دروازے بند نہ کرتے، آج مغربی دنیا میں اسلامی حکومت کا جہاں تذکرہ آتا ہے وہاں پاکستان کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے اور مغربی دنیا یہ کہتی ہے کہ اگر اسلامی نظام سے وہی معاشرہ پیدا ہوتا ہے اور وہی سیاسی نظام جنم لیتا ہے جو پاکستان میں ہے تو اس سے بہتر تو ہم خود ہیں پھر ایسے اسلام کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟ اس طرح ہم نے غیروں پر اسلام کے دروازے بند کر دیئے ہیں، ہم نے ان نو سالوں کے اندر اسلام کی اتنی "ڈس سروس" کی ہے جناب چیئرمین! کہ اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا، سچ تو یہ ہے کہ ہم بنو امیہ کے حکمرانوں کا اسلام لانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے اندر استحصال بھی رہے بادشاہتیں بھی رہیں، ظلم و ستم بھی رہے، بڑے بڑے خاندان بھی رہیں ان کے مفادات کا تحفظ بھی ہو، غریب اسی طرح پستا رہے اور یہ پروپیگنڈہ بھی رہے کہ اسلام کی بہت خدمت ہو رہی ہے اور اسلام کا بہت کام ہو رہا ہے۔ جناب چیئرمین ہمارے صدر صاحب وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ پر تنقید کرتے رہتے ہیں انہیں گلہ ہے کہ یہ اسلام کا نام نہیں لیتی، میں کہتا ہوں کہ یہ پارلیمنٹ کم سے کم اس لئے تو قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اسلام کا نام استعمال نہیں کیا یہ نعرہ لگا کر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش نہیں کی اس کے برعکس اس حکومت

کے ذیلی اداروں کا حال یہ ہے کہ وہ محض نعرہ بازی پر زندہ ہیں' اسی کونسل کو لے لیجئے نہ تو اس نے کوئی گائیڈ لائن دی ہے جس سے غریب کو عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ملے جس سے اس کی بنیادی ضروریات زندگی پوری ہوں جس سے اس کو انصاف ملے اور نہ ہی خود حکومت نے اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ حدود کے قوانین دیئے گئے مگر اس طرح کہ قصاص و دیت کو نفی کر دیا گیا' اگر اب حدود کے قوانین نافذ ہوں اور قصاص و دیت کا قانون نافذ نہ ہو تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طرح کے ادھورے قانون سے کیا مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور کیا نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے؟۔

کونسل کی رپورٹ دیکھی جائے تو نظر آتا ہے کہ اس نے محض لیجسلیشن (قانون سازی) اور لیگلائزیشن (قانون کاری) پر زور دیا ہے' اس نے محض قوانین سے معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی ہے حالانکہ محض قوانین سے معاشرے نہیں بدلا کرتے اس کے لئے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے یہ ٹھیک ہے رپورٹ میں بڑے اچھے وعظ کئے گئے ہیں' تبلیغی انداز کی بڑی تجاویز دی گئی ہیں کہ کتبے کیسے لگائے جائیں' لباس کیسا ہونا چاہئے' شناختی کارڈ پر اندراجات کیا کیا ہوں' تعلیمی اداروں میں مذاکرات کن موضوعات پر منعقد ہوں' کالجوں میں تربیتی کیمپ کیسے قائم کئے جائیں' چودھویں صدی ہجری کی تقریبات کیسے منعقد کی جائیں مگر اس طرح کے سطحی اقدامات سے ظاہر ہے قوم کو ایک منصفانہ اور عادلانہ نظام نہیں مل سکتا' کونسل کی ایک اور "معرکتہ الآراء" سفارش یہ ہے کہ ٹی وی پر اذان نشر کی جائے' مارشل لاء حکومت جو پہلے ہی اس طرح کے "ریاکارانہ" اقدامات کی دلدادہ تھی اس نے فوراً اس پر عمل کیا مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ پشاور کی اذان راولپنڈی سے سنائی جاتی ہے تو راولپنڈی کی اذان لاہور سے' نماز کا وقت ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لوگوں کو خلجان میں مبتلا کرنے کے لئے اذانیں نشر کی جا رہی ہیں۔ شیعہ حضرات الگ اس پر برہم ہیں وہ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کی اذان بھی ٹی وی پر نشر کی جائے۔ پھر ستم یہ ہے کہ اذان کے فوراً بعد ٹی وی پر کوئی وقفہ نہیں ہوتا الٹا کوئی نہ کوئی ایسا دلچسپ پروگرام ہوتا ہے جسے ناظرین "مس" کر کے اذان کے تقاضے پورے کرنے پر مائل نہیں ہو پاتے۔ کونسل کی ان سفارشات اور حکومت کی طرف سے جاری ہونے والے (ظاہری) شرعی قوانین حدود کے باوجود ملک میں جرائم کی شرح برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہ قوانین عملاً جاری کئے ہی نہیں گئے محض انہیں پروپیگنڈہ سٹنٹ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ورنہ یہ ہو نہیں سکتا کہ اسلامی قوانین جاری ہوں اور ان کے ساتھ ساتھ جرائم بھی ترقی پر ہوں۔ سعودی عرب کی مثال لے لیجئے میں اس میں رائج نظام کو بھی کاملاً اسلامی نظام نہیں مانتا لیکن قوانین بہر حال وہاں اسلامی رائج ہیں ان اسلامی قوانین کی ترویج کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جرائم نہیں ہیں۔ وہاں باہر کے لوگ جاتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ معاشرہ کتنا پر امن معاشرہ ہے لیکن یہاں حدود کے قوانین رائج ہوئے کئی سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور آپ اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ جرائم گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئے ہیں' میں محض دعویٰ نہیں کرتا اس کے لئے آپ کی خدمت میں باقاعدہ ثبوت بھی پیش کرتا ہوں'

وزارت داخلہ کا بیورو آف ریسرچ سال کے سال جرائم کی جو رپورٹ شائع کرتا ہے اسے ملاحظہ فرمائیں تو آپ پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ اس رپورٹ کے مطابق 77ء میں زنا کے کیس صرف باون تھے۔ (اس 77ء میں جس کے نصف اول میں ایک "گنہگار" حکومت بر سر اقتدار تھی) لیکن 1980ء میں ان کی تعداد 1085 ہو گئی اسی طرح اغوا کے مقدمات 1977ء میں تین ہزار ایک سو ستاون تھے مگر جناب والا! 1980ء میں ان کی تعداد 4195 ہو گئی اور 1984ء میں اگرچہ یہ تعداد 80ء کے بالمقابل کم رہی مگر 77ء کے مقابلے میں بہر حال زیادہ ہے۔ 84ء میں اغوا کی 3811 وارداتیں ہوئیں اسی طرح آپ شراب نوشی کے واقعات کو دیکھئے جو قابل دخل اندازی قانون ٹھہرے۔ 77ء میں ان کی تعداد 27679 تھی لیکن 80ء میں یہ تعداد 31325 ہو گئی تو کیا اب یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ یہ حدود کے قوانین محض کاغذی پھول تھے جنہیں رپورٹوں کے گلدانوں میں سجا دیا گیا مگر ان کی خوشبو سے مشام جاں معطر نہیں ہوئی۔ شروع میں ممکن ہے مجرموں کو کچھ ڈر اور خوف لاحق رہا ہو لیکن جب انتظامیہ نے اپنے عمل سے پوری طرح .... مجرموں کی تسلی کرا دی کہ اسلامی قوانین محض برائے بیت اور برائے نام آئے ہیں ان سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں تو مجرموں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور جرائم کی رفتار پہلے سے بھی تیز ہو گئی۔

جناب چیئرمین! حقیقت تو یہ ہے کہ اس ملک کے اندر زمام کار اپنے .... ہاتھ میں رکھنے والے لوگ وہ ہیں جو دل سے آسمانی قانون 'ڈیوائن لاء کی فوقیت اور برتری کو تسلیم ہی نہیں کرتے اسی لئے اب تک یہ بحثیں جاری ہیں کہ قطع یُد سے کیا مراد ہے؟ آپ نے قطع یُد کی سزا تو مقرر کر دی مگر جن کو یہ کام سونپا کہ اس کی تنفیذ کریں ان کی تربیت کسی اور قانون کے فریم ورک میں ہوئی ہے وہ دل سے اس پر مطمئن نہیں کہ "قطع یُد" کی سزا صحیح ہے اور اگر صحیح ہے بھی تو اس دور میں اسے نافذ بھی کیا جا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ حدود رائج ہونے کے بعد ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہوا جس پر عملاً یہ سزا دی گئی ہو اس وقت اس موضوع کو جانے دیجئے کہ شیعہ اور سنی مکاتب فکر قطع ید میں کیا تمیز روا رکھتے ہیں اس پر میں الگ بات کروں گا اس وقت میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اسلام کے اجرائمیں کس طرح ہم نے حکمت عملی (پریکٹیکل وزڈم) کا ثبوت نہیں دیا۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ادارے نہ ہونے کی وجہ سے رجال کار نہ ہونے کی وجہ سے .... معاشرہ تیار نہ ہونے کی وجہ سے 'لوگوں کی ذہنی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے .... کارپردازوں کے سرخ فیتے کی وجہ سے حدود کے یہ قوانین بالکل غیر مؤثر اور بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ جناب چیئرمین! ابھی ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ اسلامی قوانین کے اجرا میں ہم نے حکمت عملی سے کام نہیں لیا ذرا تھوڑی سی تشریح اس کی بھی سن لیجئے 'اسلام کے اندر سو میں سے نوے باتیں ایسی ہیں جن پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے اور بمشکل دس باتیں ایسی ہوں گی جو اختلافی ہیں اگر ہم اسلام کا کام کرنا چاہتے تھے تو پہلے ان متفقہ نوے

باتوں سے آغاز کرتے ، لیکن ہم نے آغاز وہاں سے کیا جہاں ہمارے درمیان فرقہ وارانہ اختلافات تھے تاکہ پنڈورا باکس کھل جائے۔ فرقے آپس میں لڑنے لگ جائیں اور یہ کام معطل ہو جائے ،

ذمہ داری ان لوگوں پر ہو جو اس میں رکاوٹ بنے اور ہم کہیں کہ فرقہ وارانہ جھگڑے اتنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ اب آگے پیش رفت ہی ممکن نہیں اگر یہ کوشش شعوری طور پر کی گئی تو یہ ایک سازش تھی اور غیر شعوری طور پر کی گئی تو اسلام کے ساتھ نادان دوستی!

ابھی مجھ سے پہلے میرے بزرگ دوست حضرت مولانا قاضی عبدالطیف صاحب نے زکوۃ کے مسئلے پر اظہار خیال کیا جناب چیئرمین! کاش وہ یہ کہتے کہ وہ حکومت جس کے جسم و جان کے سارے ریشے سود سے بنے ہوئے ہوں اور جس کا بیت المال سود سے لبالب بھرا ہو اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ زکوۃ وصول کرے؟ سود اور زکوۃ دونوں متوازی نہیں چل سکتے جو حکومت سودی کاروبار کرتی ہے اسے زکوۃ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس نام نہاد قانونِ زکوۃ سے پہلے یہ تھا کہ لوگ اپنے غریب رشتہ داروں اور نادار پڑوسیوں کو زکوۃ دے لیتے تھے انہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے محلے میں ، ہمارے گاؤں میں ہمارے قریب کون سا ایسا آدمی ہے جو اس کا حق رکھتا ہے لیکن اب تو وہ اس حق سے بھی محروم ہو گئے ہیں اب زکوۃ سرکاری ملازمین وصول کرتے ہیں اور اپنے اندازے اس کو تقسیم کرتے ہیں ، کس کو دیتے ہیں کس کو نہیں دیتے اس میں زکوۃ دینے والے کا کوئی عمل دخل نہیں اس طرح وہ جو ایک محدود فائدہ پہلے زکوۃ سے انفرادی طور پر ہو رہا تھا وہ بھی نہیں ہو رہا پھر زکوۃ کا یہ قانون نافذ کرتے وقت یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ شیعہ سُنّی مکاتبِ فکر میں کیا کیا اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پہلے یہ قانون سب پر لاگو کیا گیا بعد میں شیعہ مظاہرین نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کیا تو مارشل لاء حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے اور انہیں اس قانون سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ اس حکومت کو اسلامی حکومت کہلانے کا کیا حق پہنچتا ہے جس کے ہاں دو متبادل قوانین چل رہے ہوں۔ ایک طبقہ قانون سے مستثنیٰ ہو اور دوسرے طبقے پر وہ قانون لاگو ہو اور دونوں کلمہ گو ہوں اور دونوں مسلمان ہوں۔

جناب چیئرمین! آپ کو معلوم ہے آج شیعہ سُنّی مسئلہ کیوں بڑھ گیا ہے۔ شاید آپ سے کسی نے یہ حرف برہنہ نہ کہا ہو میں اس کی جرأت کرتا ہوں اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جب آپ کی نام نہاد اسلامی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ شیعہ حضرات زکوۃ سے مستثنیٰ ہیں تو بے شمار سُنّیوں نے زکوۃ سے بچنے کے لئے جو انہیں جبری ٹیکس کی طرح ادا کرنی پڑ رہی ہے شیعہ بننے کا اعلان کر دیا۔ آپ کبھی بائی روڈ اسلام آباد سے لاہور جائیں سڑک کے ارد گرد دیہاتوں میں گھروں پر آپ کو کالے جھنڈے دکھائی دیں گے یہ کالے جھنڈے یہ اعلان کرنے کے لئے لگائے گئے ہیں کہ ہم شیعہ ہیں ، ہم عشر و زکوۃ (کا ٹیکس) دینے کے لئے تیار نہیں ، جب سُنّی مولویوں نے دیکھا کہ سُنّیوں پر مشتمل دیہاتوں کے دیہات شیعہ ہوتے جا رہے ہیں اور یہی وہ لوگ تھے جو ہم سے میلاد اور گیارہویں پڑھایا کرتے تھے ، ہمیں نذرانے دیتے تھے اور

اب یہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئے ہیں تو وہ شیعوں کے مد مقابل آ گئے اور اس طرح شیعہ سُنّی نزاع میں تلخی بڑھنے لگی۔ سن لیجئے کہ جب تک آپ احمقانہ طریقے سے زکوٰۃ کا یہ قانون رائج رکھیں گے یہ تلخی کم نہیں ہوگی بڑھتی ہی رہے گی۔

ہونا یہ چاہئے تھا کہ پہلے پوری طرح ملک میں اسلامی نظام حکومت قائم کیا جاتا پھر آپ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق بھی رکھتے تھے لیکن اگر ابھی یہ حکومت کاملاً اسلامی حکومت نہیں بنی تھی تو آپ اجتماعی بیت المال قائم کر کے لوگوں کو دعوت دیتے کہ جو لوگ اختیاری طور پر اس بیت المال میں اپنی زکوٰۃ جمع کرانا چاہتے ہیں وہ زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کا تجربہ کرنے کے لئے شوق سے اپنی زکوٰۃ جمع کرائیں مگر آپ نے کیا نظام زکوٰۃ جاری کیا؟ بینکوں میں اصل زر پر جو نفع ملتا ہے آپ اس سے جبری زکوٰۃ کاٹ رہے ہیں۔ ادھر آپ کا فتویٰ یہ بھی ہے کہ یہ نفع نہیں سود ہے گویا آپ سود پر زکوٰۃ لے رہے ہیں اس سے آپ نے ایک زکوٰۃ فاؤنڈیشن قائم کر لی ہے سینکڑوں سرکاری ملازمین اس کی تنخواہوں پر پل رہے ہیں لیکن سڑکوں پر بھیک مانگنے والے ہاتھ آج بھی اسی طرح پھیلے ہوئے ہیں ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کونسل کی اچھی سفارشات میں سے ایک اچھی سفارش یہ بھی تھی کہ زکوٰۃ کی اس رقم سے صنعتی ادارے قائم کئے جائیں جن میں ان گداگروں کو صنعت و حرفت سکھائی جائے' اس کونسل نے یہ بھی سفارش کی تھی کہ اس سے شفاخانے بنائے جائیں جہاں غریب اور نادار لوگوں کا فری علاج ہو مگر آپ نے ان میں سے کسی سفارش پر بھی عمل نہیں کیا۔ آپ ان فقہی جھگڑوں سے ڈر گئے جو مسئلہ "تملیک" کے ضمن میں پیدا ہوئے ہیں اس طرح آپ کے حامی مذہبی مدرسے آپ کے مخالف ہو جاتے لہٰذا آپ کے اس ادھورے اور ناقص تجربے سے یہ فائدہ بھی نہ پہنچا الٹا آپ نے اپنے نظام زکوٰۃ سے ملک کو نقصان پہنچایا۔ آپ نے فرقہ واریت کو ہوا دی اور اسلام کے اجتماعی نظام کے یہ غلط اور ناقص نتائج دکھا کر آپ نے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی

جناب چیئرمین! اس کونسل نے ایک اور معقول سفارش بھی کی تھی کاش۔.......... "مارشل لاء کے مذہبی آمروں" نے اس پر ہی عمل کر لیا ہوتا تو کم سے کم کوڑے کھا کھا کر غریب سیاسی کارکنوں کے چمڑے نہ ادھڑ گئے ہوتے مگر کونسل کی سفارش کے برعکس ان بے چاروں کو اس طرح کوڑے مارے گئے کہ اگر وہ ہاتھی کو مارے جاتے تو وہ بھی زمین پر ڈھے جاتا۔ کونسل نے ان کوڑوں کے بارے میں کیا سفارش کی تھی میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔

> "کوڑوں کی سزا کے اجراء کے وقت موسم سخت سرد ہو یا سخت گرم ہو تو موسم کے معمول پر آنے تک سزا کا اجراء ملتوی رکھا جائے' کوڑے مارنے والا شخص غیر جانبدار اور پختہ ذہن کا مالک ہو"۔

حضرت مولانا سیدؒ ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں لکھا ہے کہ کوڑے مارنے

والا عالم دین ہونا چاہئے لیکن یہاں عالم اور غیر عالم تو کجا سیاسی کارکنوں کو جمعداروں اور بھنگیوں سے کوڑے مروائے گئے۔ کونسل کہتی ہے کہ کوڑے مارنے والا غیر جانبدار اور پختہ ذہن کا مالک ہو مگر یہاں ان کا انتخاب کیا گیا جن کا سرے سے ذہن ہی نہیں تھا تاکہ ان پر کسی نالہ وفریاد کا اثر ہی نہ ہونے پائے کونسل نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی ہے کہ کوڑے والا ہاتھ سر سے اونچا کئے بغیر درمیانی طاقت سے لگایا جائے اور نہ ہی کوڑا گھما کر مارا جائے لیکن یہاں تو کوڑا مارنے والوں نے پل کر اور پل کر جس طرح ان کارکنوں کو کوڑے مارے ہیں ان کی کوئی فلم بنالی جاتی تو بیرونی دنیا میں اس ڈاکومنٹری سے بڑھ کر کوئی اور فلم مقبول ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ کونسل نے یہ بھی لکھا ہے کہ سزایاب کو ننگے بدن کوڑے نہ مارے جائیں ایسے کپڑے اس کے بدن پر رہنے دیئے جائیں جو اسلامی احکام کے مطابق ضروری ہیں لیکن یہاں تو ان غریبوں کی قسمت میں ایک لنگوٹی تھی ان کا باقی سارا جسم ننگا ہوتا تھا ٹکٹکی پر باندھ کر کبڈی کے انداز میں دور سے بھاگ کر ان کو کوڑے مارے جاتے تھے اور مارنے والا ہاتھ میں کوڑا ذہن سے کورا' یہ ہے وہ عمل درآمد جو صدر ضیاء کی حکومت نے اسلامی کونسل کی سفارشات پر کیا ہے۔

جناب چیئرمین! کونسل کی سفارشات میں سے ایک سفارش ایسی ہے جس سے مجھے باادب اختلاف ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں ڈر اور خوف کی بنیاد پر اپنے خیالات چھپانے کا عادی نہیں ہوں۔ اس سفارش میں کہا گیا ہے کہ قومی پرچم پر کلمۂ طیبہ کا اضافہ کیا جائے۔ جناب والا! قومی پرچم روز روز نہیں بنتے پاکستان کو بنے چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے چالیس سال کے بعد اپنے پرچم میں اضافہ و ترمیم کرنا کسی آزاد قوم کا شیوہ نہیں محض اس لئے کہ کونسل ہمارے مذہبی جذبے کو اپیل کر رہی ہے اور ایک ایسا سلوگن دے رہی ہے جس کی مخالفت کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا ہمیں آنکھیں بند کر کے اپنے گھٹنے نہیں ٹیک دینے چاہئیں میں کہتا ہوں کل یہ مطالبہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلمے کے ساتھ درود شریف بھی پرچم پر ہونا چاہئے۔ جناب والا! یہ طرز فکر صدر ضیاء اور ان کی کونسل کو مبارک ہو ہم اپنے قومی پرچم کے ساتھ نہیں کھیل سکتے آخر اس کی کون سی چیز غیر اسلامی ہے چاند اللہ کا ہے' تارا اللہ کا ہے' جو رنگ اس میں ہیں وہ اللہ کے دیئے ہوئے ہیں تو پھر اسے مزید اسلامی بنانے کی کیا ضرورت ہے؟۔

اسی طرح جناب چیئرمین! میں نے اس رپورٹ کو غائر نظر سے دیکھا مگر مجھے اول سے آخر تک ایک سفارش بھی پاکستان کی عورتوں کے بارے میں نہیں ملی کیا ہم وہ اسلام لائیں گے جس میں عورتیں خارج از بحث ہیں جس میں عورتوں کا کوئی حق نہیں جن میں ان کے مسائل کا کوئی حل تجویز نہیں کیا جائے گا جس میں انہیں یکسر اور بیک قلم نظر انداز کر دیا جائے گا اگر ہم اپنی 51 فیصد آبادی سے اس طرح اغماز برتیں گے' اس طرح بے اعتنائی کریں گے' اسی طرح "ڈسٹ بن" میں پھینک دیں گے اور نام اسلام کا لیں گے تو پڑھی لکھی خواتین یہی سمجھیں گی کہ اسلام ان کے مسائل کو حل نہیں کرتا کاش! اللہ تعالیٰ کونسل کو یہ توفیق دیتا کہ وہ اس غریب مخلوق کے بارے میں بھی کوئی سفارش کرتی' کوئی تجویز حکومت کو دیتی۔ جناب چیئرمین! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا اگر زندگی رہی تو کونسل کی بعد کے سالوں کی رپورٹوں پر بھی

اپنی گذارشات پیش کروں گا۔ آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ جنہیں یہ حکومت بھی ترجمانِ حقیقت کہتی ہے اور جن کی یادگاریں قائم کی جارہی ہیں، جن کے یوم ولادت پر بھی ہم نے چھٹی کی ہے اور یوم وفات پر بھی، آیئے ہم انہیں حکم مانیں اور ان سے پوچھیں کہ اسلامی نظام کیا ہے وہ ایک رند منش انسان شاید کتنے ہی علماء سے بہتر اس مسئلے میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ جناب والا! وہ اقبالؒ اسلامی نظام کے بارے میں کہتا ہے۔

کس نبا شد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبین ایں است و بس

یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو ہماری شریعت کی اصل روح یہی ہے تو گویا اسلامی نظام کی اصل بنیاد یہ ہے کہ احتیاج ختم کر دی جائے۔ ایکسپلائٹیشن اور استحصال کا خاتمہ کر دیا جائے نہ کوئی ہاتھ پھیلنے والا ہو اور نہ کوئی ہاتھ چھیننے والا ہو۔ خدا کرے کہ اسلامی حکومت کے دعویدار اقبالؒ کے دکھائے ہوئے راستے کی طرف چل سکیں"۔

(17ر جولائی 87ء)

پارلیمینٹ سے صدر صاحب کا خطاب

مسٹر زیڈ اے سلیری نے اپنے ایک حالیہ کالم میں میری اس تقریر پر (اپنے موضوع سے ہٹ کر) غیظ و غضب کا اظہار فرمایا ہے جو میں نے سینٹ کے پچھلے سیشن میں پارلیمینٹ سے صدر صاحب کے خطاب کو زیر بحث لاتے ہوئے کی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری کتاب "دیدہ ور" مکمل ہی ہوئی تھی کہ مارشل لاء لگ گیا اور وہ تلف کر دی گئی حالانکہ کتب بین حلقوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ سلیری صاحب چاہیں تو میرے پبلشر شیخ غلام اینڈ سنز لاہور کو خط لکھ کر کتاب منگوا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کا ارشاد ہے کہ میں بھٹو صاحب کے مارشل لاء میں بطور وزیر حکومت میں رہا مگر وہ یہ بھول گئے کہ یہ ایک منتخب حکومت تھی اور میں قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے آئینی طور پر اس میں شرکت کا مجاز تھا۔ مارشل لاء کی حکومتوں میں بلا استحقاق اور بلا انتخاب (پی این اے کے رہنماؤں کی طرح) مجھے وزیر بننے کا شوق ہوتا تو میں صدر ضیاء کے اسلامی مارشل لاء میں تین مرتبہ وزارت کی دعوت کو ٹھکرا نہ دیتا۔

بہر حال سلیری صاحب کے اس آرٹیکل کے ذریعے مجھے ایوان صدر سے اپنی تقریر کی رسید ضرور مل گئی کیونکہ سلیری صاحب کے فرمودات کی تو وہی بات ہوتی ہے کہ۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں
زبان میری ہے بات ان کی

اس تمہید کے بعد اب قارئین کرام ذیل میں سینٹ کی وہ تقریر ملاحظہ فرمائیں جس پر سلیری صاحب نے تبصرہ تو فرمادیا ہے مگر اس کا متن نقل نہیں کیا۔

....

"ہمارے آئین میں ہر سال پارلیمینٹ کے اجلاس سے صدر صاحب کے خطاب کی جو شق رکھی گئی ہے' اس کا فلسفہ یہ ہے کہ صدر صاحب اس تقریر میں سال گذشتہ کی کارگزاری اور سال آئندہ کے لئے مختلف شعبوں میں حکومت کی پالیسی بیان کرتے ہیں اور پھر دونوں ایوان اپنے اپنے اجلاسوں میں اس پر بحث و تمحیص کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جمہوری ملک میں صدر کی یہ تقریر کابینہ تیار کرتی ہے اور صدر من و عن وہی تقریر پارلیمینٹ میں دہرا دیتا ہے لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جس تقریر پر آج ہم بحث کر رہے ہیں یہ حکومت کی تیار کردہ نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے اور حکومت اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی کہ تقریر کا جو مسودہ صدر صاحب کو پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کی طرف سے بھیجا گیا تھا وہ انہوں نے پورے کا پورا بدل دیا اور اس کی جگہ اپنے "تقریر نگاروں" سے انہوں نے ایک بالکل ہی نئی تقریر لکھوا کر ہمارے سامنے ارشاد فرمادی۔ مثال کے طور پر وزیر اعظم کی طرف سے بھیجے جانے والے سکرپٹ میں "پانچ نکاتی پروگرام" کی بہت پروجیکشن کی گئی تھی مگر صدر صاحب نے اپنے خطاب میں اس کا صرف اتنا نوٹس لیا کہ صفحہ 7 پر ارشاد فرمایا:

> "جناب وزیر اعظم کا خیال ہے' 1990ء تک جب پانچ نکاتی پروگرام پایہ تکمیل کو پہنچے گا تو ملک کے تمام حصوں اور معاشرے کے تمام طبقوں میں ایک خوشگوار انقلاب آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب فرمائے"۔

صدر صاحب کے ان فقروں میں "جناب وزیر اعظم کا خیال ہے" کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ گویا صدر صاحب کو اس کا یقین نہیں ہے یہ صرف وزیر اعظم کا خیال ہے۔ صدر صاحب تو اس کی کامیابی کے لئے فقط دعا فرما رہے ہیں تو جناب چیئرمین! یہ خطاب جس پر ہم بحث کر رہے ہیں یہ حکومت کا تیار کردہ نہیں' یہ صرف صدر صاحب کے ذاتی خیالات ہیں مگر ان کے ان ذاتی خیالات کا بھی تجزیہ کیا جائے تو عجیب و غریب صورت نظر آتی ہے۔ اس تقریر دلپذیر میں کچھ تو حسب عادت وعظ ہے' کچھ اپوزیشن لیڈروں کے انداز میں حکومت پر تنقید ہے' کچھ غلط بیانی اور حقائق پوشی ہے' کچھ اپنی ذمہ داریوں سے اعراض و اغماض ہے' کچھ مارشل لاء کی تعریف ہے کچھ فوج اور افغان مہاجرین کا تذکرہ ہے' کچھ لفاظی اور طول کلام ہے۔

سب سے پہلے اس خطاب کے ایک دو نمونے ملاحظہ فرمایئے' ص۔ 2 پر ارشاد ہوتا ہے:

> "چوری چکاری' قتل' ڈاکہ' اغوا اور دیگر جرائم ان پھوڑوں کی طرح ہوتے ہیں جو معاشرے کے جسم پر اس وقت نمودار ہوتے ہیں جب معاشرے میں کوئی بیماری ہو گندہ خون ہو' صالح اقدار کا فقدان ہو' خناس ہو' فاسد مادہ موجود ہو' آپ جب تک

معاشرے کی ان اندرونی بیماریوں کا تدارک نہیں کریں گے صرف امن عامہ قائم رکھنے والے اداروں کے ذریعے ان پھوڑوں کو بند نہیں کر سکیں گے' وغیرہ وغیرہ وغیرہ"۔

آگے ارشاد ہوتا ہے:

"نوجوان نسل خاص طور پر طلبہ اور طالبات ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ ان کی ہمتیں جوان اور صلاحیتیں لامحدود ہیں' ان کی صلاحیتوں کو اظہار کا موقع دیجئے۔ ان کی ہمتوں سے استفادہ کیجئے اور قوت و طاقت کے اس عظیم ذخیرے کو ملک و قوم کی تعمیر نو پر صرف کیجئے' وغیرہ وغیرہ وغیرہ"۔

سوال یہ ہے کہ آیا کسی ملک کے صدر کا کام محض تقریر کرنا ہے یا حکومت کے لاتعداد اور ان گنت وسائل کو بروئے کار لا کر ان اچھی باتوں کو عملی جامہ پہنانا؟ جب آپ آٹھ ساڑھے آٹھ سال تک چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر تھے اور ملک کے سیاہ و سفید کے بلا شرکت غیرے مالک تو آپ کو ان باتوں پر عمل کرنے سے کس نے روکا تھا۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا اگر آپ آج پارلیمنٹ کو وعظ فرمانے کے بجائے اپنے گذشتہ سالوں کا نمونہ عمل پیش فرماتے؟

اور آگے چلئے' وعظ گوئی تو خیر پھر نظر انداز کی جا سکتی ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ صدر صاحب نے اس پارلیمنٹ کے جمہوری فورم پر' جو براہ راست عوام سے منتخب شدہ ہے' مارشل لاء کی تعریف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ فرماتے ہیں:

"اس ایوان کے مشترکہ اجلاس میں 30ر دسمبر 85ء کو وقت کے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور پانچ سال کے لئے منتخب صدر نے مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ایک دور ختم ہوا' نئے دور کا آغاز ہوا اور تاریخ کا یہی سنگم ہے' جس پر میں نے کہا تھا کہ جو عہد اپنی بساط لپیٹ رہا ہے وہ بھی قابل عزت ہے اور جو دور شروع ہو رہا ہے وہ بھی لائق احترام ہے" (ص۔ 18)

کون سا عہد اپنی بساط لپیٹ رہا تھا جو صدر صاحب کے نزدیک قابل عزت ہے' مارشل لاء کا عہد' وہ مارشل لاء جو سراسر غیر اسلامی نظام ہے' جو ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے' جس میں اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے ملک کے منتخب وزیر اعظم کی حکومت کا خاتمہ کیا گیا' جس میں اسلام کا بدترین استحصال ہوا' جس میں سیاسی کارکنوں کو کوڑے لگائے گئے' جس میں آزادی صحافت کو مفلوج کر دیا گیا' جس میں ملک کو پہلی دفعہ ہیروئن اور کلاشن کوف کے تحائف تقسیم ہوئے' جس میں بموں کے دھماکوں کی تخم ریزی کی گئی اور جس میں پورے ملک کا کورٹ مارشل کر دیا گیا۔

جناب چیئرمین! میں آپ ہی سے انصاف طلب ہوں' کیا یہ اس منتخب جمہوری ادارے کی توہین نہیں

ہے کہ اس میں کھلم کھلا مارشل لاء کی تعریف کی جائے؟ پھر صدر صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا انہوں نے اپنے خطاب میں مارشل لاء کی تعریف کے ساتھ ساتھ فوجی عدالتوں کی بھی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"غالباً حصول انصاف میں انہی دشواریوں کا نتیجہ تھا کہ مارشل لاء کے دور میں مظلوم دادرسی کے لئے فوجی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے اور ملزم سول عدالتوں کو ترجیح دیتے تھے" (ص۔ 8)

جناب والا! کون نہیں جانتا کہ فوجی عدالتوں میں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کی سہولتیں حاصل نہیں۔ ان عدالتوں میں مقدمہ کی سماعت سے پہلے ہی سزا کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ فیصلہ اوپر سے نازل کر دیا جاتا ہے۔ ان کے فیصلوں کو شرعی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا میری اپنی مثال لے لیجئے۔ 1970ء میں ایک فوجی عدالت نے بعض تحریروں اور تقریروں کی بنا پر مجھے پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ چند ماہ کے بعد قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کی وجہ سے مجھے رہا کر دیا گیا تو اتفاق سے ایک دن وہ بریگیڈیئر صاحب جو اس فوجی عدالت کے سربراہ تھے میرے ہم سفر ہو گئے۔ میں وہ منظر نہیں بھول سکتا جب انہوں نے نگاہیں نیچی کر کے مجھے یہ بتایا کہ وہ مجھے سزا سنانے پر مجبور تھے کیونکہ اس کے لئے انہیں اوپر سے آرڈر دیئے گئے تھے۔ چند ہی دنوں کے بعد سنا کہ یہ بریگیڈیئر صاحب جو بہت صحت مند اور تندرست تھے دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گئے۔ شاید ضمیر کی خلش نے انہیں زیادہ دیر جینے نہیں دیا اس وقت بھی دیکھ لیجئے کہ ایک نوجوان طالب علم کامران رضوی مارشل لاء کے خلاف پوسٹر لگانے کے جرم میں دس سال کی سزا بھگت رہا ہے وہ جیل سے امسال ایم اے کا امتحان دے رہا ہے مگر اسے اتنی سہولت مہیا کرنے سے بھی گریز کیا جا رہا ہے کہ وہ ساہیوال جیل سے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں منتقل ہو سکے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کو دیکھ لیجئے وہ اس بنا پر گرفتار بلا ہیں کہ مارشل لاء کے حکم کے تحت وہ ایک ڈیکلیریشن فارم پُر نہیں کر سکے۔ ان کی غیر حاضری میں انہیں چودہ سال کی سزا سنا ڈالی گئی۔ کیا یہ فوجی عدالتیں ہیں اور یہ ان کے فیصلے ہیں جن کا صدر صاحب اراکین پارلیمینٹ کے سامنے تذکرہ کر رہے ہیں؟۔

اب ذرا ایک انہونی بھی ملاحظہ کیجئے۔ صدر صاحب کے اس خطاب میں بعض حصے ایسے بھی ہیں جن میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ صدر مملکت بول رہے ہیں یا موچی دروازے کے باغ میں کوئی اپوزیشن رہنما حکومت پر برس رہا ہے۔ اسی صفحہ 8 پر ارشاد ہوتا ہے:

"عدلیہ آزاد ہے، بار کونسلیں موجود ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ جج صاحبان ہیں، عمدہ سے عمدہ وکیل اور ذہین سے ذہین قانون دان موجود ہیں لیکن جرم و سزا کی جو حالت ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ دن دیہاڑے ایک واردات ہوتی ہے بیسیوں آدمی اس کے عینی شاہد ہوتے ہیں، سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت متاثرین سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور جلد از جلد ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا وعدہ کرتے ہیں لیکن ہفتے بلکہ مہینے

گزر جاتے ہیں اور ملزم گرفتار نہیں ہوتے۔ ملزم گرفتار ہوتے ہیں تو چشم دید گواہ غائب ہو جاتے ہیں۔ تفتیش کا عمل اکتا دینے کی حد تک جاری رہتا ہے پھر عدالتوں کے چکر شروع ہوتے ہیں' تاریخوں پر تاریخیں پڑتی ہیں اور حصول انصاف کی تگ و دو میں لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں اور بعض فوت بھی ہو جاتے ہیں"۔

سوال یہ ہے کہ نو سال آپ نے مارشل لاء کے سنگھاسن پر بیٹھ کر راج کیا۔ خود آپ کے اپنے الفاظ میں آپ اس سارے زمانے میں (خاکم بدہن) "قادر مطلق" تھے۔ اس صورتحال کی اصلاح کے لئے آپ نے کیا کیا؟ اب جو آپ ایک ناقد اور مصلح بلکہ اپوزیشن لیڈر بن کر موجودہ سول حکومت کے کھاتے میں یہ باتیں ڈال رہے ہیں کیا مارشل لاء کے دور میں اس سے کچھ مختلف صورتحال پائی جاتی تھی؟۔

صدر صاحب کے اس خطاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں انہوں نے اپنی ذمہ داریوں سے اعراض و اغماض کرتے ہوئے سارا بوجھ دوسروں پر ڈال دیا ہے۔ ص۔ 11' 12 پر فرماتے ہیں:

"دو اور مسائل ہیں جو ملک کے دوسرے طبقوں کے علاوہ ہماری نوجوان نسل کو بری طرح متاثر کر رہے ہیں۔ ایک ہے منشیات کی وبا اور دوسرے بیروزگاری۔ آج سے چند سال پہلے تک منشیات کی لعنت دور دراز ملکوں میں سنی جاتی تھی لیکن اب یہ ہمارے گھروں میں گھس آئی ہے............ دوسرا مسئلہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار مہیا کرنے کا ہے...... لیکن میرے خیال میں اہم ترین کام جو حکومت انجام دے سکتی ہے اسے انجام دے کر عوام کی امنگوں پر پورا اتر سکتی ہے اور اس دنیا اور اگلی دنیا میں اپنے آپ کو سرخرو کر سکتی ہے وہ نظام اسلام کا عملی نفاذ ہے"۔

جناب چیئرمین! آپ نے غور فرمایا صدر صاحب کہتے ہیں کہ چند سال پہلے منشیات کا دور دورہ صرف دوسرے ملکوں میں تھا اب یہ وباء ہمارے گھروں میں گھس آئی ہے یہ وباء ہمارے گھروں میں کب گھسی؟ جب یہاں اسلامی مارشل لاء نافذ تھا۔ اس سے پہلے تو ہم نے "ہیروئن" کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ بیروزگاری عام ہوئی تو اسی سنہری دور میں' رشوت کا بھاؤ چڑھا تو اسی عہد نوشیروانی میں' خود صدر صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جو کام پہلے پچاس روپے میں ہوتا تھا اب پانچ سو روپے میں ہوتا ہے۔ گویا

اے باد صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست

اور ان سب باتوں کا حل جنرل صاحب نے یہ تجویز کیا ہے کہ حکومت اسلامی نظام کا عملی نفاذ کرے۔ مگر جناب! کیا ہم یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ نو سال تک آپ کیا کرتے رہے؟ "اسلام آگیا' اسلام آگیا" کے بلند بانگ دعوے تو آپ نے فرمائے اتنے عرصے میں تو اسلام اگر سعودی عرب سے پیدل بھی چل کر آتا تو پاکستان پہنچ چکا ہوتا مگر کیا ستم ظریفی ہے کہ اب آپ اپنے زیر سایہ بننے والی حکومت کو نصیحت کر رہے ہیں کہ وہ اس دنیا اور اگلی دنیا میں اپنے آپ کو سرخرو کرنے کے لئے اسلامی نظام نافذ کر دے۔ کیا

اس دنیا اور اگلی دنیا میں سرخرو ہونے کی تمنا آپ کو نہ تھی۔ آپ ہی نے یہ فرض کیوں نہ سرانجام دے دیا کہ اب اس کے لئے دوسروں کو کہنا پڑ رہا ہے؟

جناب چیئرمین! میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس خطاب میں جو حقائق پوشی ہے' اس کا ثبوت بھی پیش کرتا ہوں' خطاب کے ص۔ 21 پر کہا گیا ہے کہ:

> "پاکستان نے اپنے قومی مفادات کے حصول کے لئے پچھلے دس سالوں میں ایک ایسی پالیسی اپنائی ہے کہ آج اسے ایک بحرانی علاقے میں امن و استحکام کا جزیرہ استحکام تصور کیا جاتا ہے"

آزمائش شرط ہے آپ بدامنی' لاقانونیت اور عدم تحفظ کے اس گرداب میں گھرے ہوئے کسی بھی پاکستانی کو یہ اقتباس سنا دیجئے اور اس سے فیصلہ کرا لیجئے وہ اسے غلط بیانی سے کم کسی لفظ کا مستحق قرار دے دے تو ہم مجرم ہیں۔ اس اخلاقی جرأت کی کون داد نہیں دے گا کہ اس ملک کو "جزیرہ امن و استحکام" ٹھہرایا جا رہا ہے' جس میں کسی کی عزت' جان' مال' آبرو محفوظ نہیں۔ جہاں دن دیہاڑے لوگوں کو اغواء کر لیا جاتا ہے اور ان سے منہ مانگی رقم لے کر انہیں رہا کیا جاتا ہے' جہاں شاہراہوں پر ڈاکو دندناتے پھرتے ہیں' جہاں بموں کے دھماکوں سے بے گناہ شہری لقمۂ اجل ہو رہے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ۔

گل چیں کا خوف' دام کا خطرہ' قفس کا ڈر
کیا گل کھلے ہوئے ہیں بہاروں کی گود میں

خطاب کا ایک خاصا طویل حصہ افغان مہاجرین کی تعریف کے لئے وقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں' مظلوم ہیں' ہمیں ان سے پوری ہمدردی ہے لیکن جوش خطابت میں انہیں مہاجرینؓ مکہ اور اپنے آپ کو انصار مدینہ قرار دے دینا مبالغہ آرائی کی ایک بھونڈی مثال ہے۔ خطاب میں فرمایا گیا ہے کہ:

> "اہل پاکستان' خاص کر صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کے باشندوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا' اپنے اپنے گھر خالی کئے اور ان کے سپرد کر دیئے' اپنی چراگاہیں اور پانی کے کنوئیں ان کے حوالے کر دیئے اور اگر ان کے پاس روٹی تھی تو آدھی اپنے مہمانوں کی نذر کر دی اور آدھی سے اپنا گزارا کیا اور اس بے مثال مہمان نوازی کے ذریعے انہوں نے انصار مدینہ کی یاد تازہ کر دی"۔ (ص۔ 24)

افغان مہاجرین کی وجہ سے ہماری سوسائٹی میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا ہے اور جس طرح مقامی آبادی کے لئے طرح طرح کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کو تو جانے دیجئے۔ سوال صدر محترم سے یہ ہے کہ حضور! اگر آپ نے ہم اہل پاکستان کو انصار مدینہ بنا دیا ہے تو غریب بہاری پاکستانیوں نے کیا قصور کیا ہے کہ اب تک وطن عزیز کے دروازے ان کے لئے نہیں کھل سکے؟ یہ غریب تو پاکستان کے لئے دو

دفعہ اجڑ چکے، کچھ تھوڑی سی "انصاریت" ان کے حصے میں بھی آجاتی تو آپ کا کیا بگڑ جاتا۔

اوروں کی طرف پھینکے ہیں گل بلکہ ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

اور جناب چیئرمین! خطاب میں ٹیپ کا بند اور اس کا اصل مرکزی نکتہ فوج کی وہ تعریف ہے، جو صفحہ 14 سے صفحہ 18 تک پھیلی ہوئی ہے اس میں صدر صاحب نے وہ کارنامے گنوائے ہیں جو ہماری فوج انجام دیتی ہے، فرمایا ہماری فوج سیلاب میں امدادی کام کرتی ہے، زلزلہ زدگان کو ریلیف پہنچاتی ہے، ٹڈی دل تباہ کرتی ہے، کرفیو نافذ کرتی ہے، ڈاکوؤں کو کنٹرول کرتی ہے، کوئی طیارہ اغوا ہو جائے تو جان ہتھیلی پر رکھ لیتی ہے، سڑکیں تعمیر کرتی ہے، سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے، مگر جناب والا! سوال یہ ہے کہ دنیا میں کس ملک کی فوج ہے، جو یہ کام نہیں کرتی؟ کیا ان کاموں کے لئے اسے تنخواہ نہیں دی جاتی؟ پھر کریڈٹ کس بات کا؟ اصل غور طلب مسئلہ تو یہ ہے کہ آپ کو پارلیمنٹ کے سامنے فوج کی طول طویل تعریف کیوں کرنا پڑی؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ ہماری اپنی فوج ہے، جو ہمیں جان و دل سے عزیز رہی ہے۔ 65ء میں جس کا کوئی جوان سڑک پر نظر آتا تھا تو عوام فرط عقیدت سے اس کے ہاتھ چومنے لگتے تھے اب عوام اور اس کے درمیان اتنی دوریاں کیوں پیدا ہو گئی ہیں کہ آپ کو اس کا قصیدہ پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ میں بتاتا ہوں اس کی ضرورت اس وقت سے محسوس ہونے لگی ہے، جب:

☆......یحییٰ خان کے مارشل لاء میں ملک دو نیم ہو گیا۔

☆......جب آپ نوے دن کے لئے آئے اور نوے ہزار دنوں کے لئے حکومت کرتے رہے۔

☆......جب آپ کمانڈر انچیف کے پیریڈ کو غیر آئینی طور پر خود ہی بڑھاتے چلے گئے۔

☆......جب سیاچن کا بڑا حصہ چلا گیا اور آپ نے مسلح افواج کے سربراہ کی حیثیت سے یہ بیان دیا کہ اس کا کیا ہے وہاں تو گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اگتا۔

☆......جب ذیل سنگھ جسے معلوم تھا کہ وہ دو چار ماہ میں ریٹائر ہونے والا ہے سیاچن جا کر اپنے جوانوں کے حوصلے بڑھا آیا لیکن آپ میرے دوست سردار عبدالقیوم خان کے "باغ" میں استقبالیہ دعوتوں تک محدود رہے۔

☆......جب آپ نے اپنے دورۂ بھارت کے دوران رکوع میں جھک کر سونیا کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور راجیو کو جان اور مال کی دعائیں دیں، یہ الگ بات ہے کہ

میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

آپ اگر فوج کی عزت بحال کرنا چاہتے ہیں تو آٹھویں ترمیمی بل کو منسوخ کرائیے۔ 73ء کا آئین اصل فارم میں بحال کیجئے، سول حکومت کو آزادانہ کام کرنے دیجئے، خود کمانڈر انچیف کا عہدہ چھوڑ دیجئے آپ دیکھیں گے فوج اور عوام میں پیدا ہونے والا فاصلہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔

جناب چیئرمین! مجھے احساس ہے کہ میری معروضات طویل ہو گئیں، میں آخر میں ایوان کے

اراکین سے اپیل کروں گا کہ وہ جماعتی سیاست سے بالاتر ہو کر اپنی ضمیر کی آواز کے مطابق خدا اور عوام کے سامنے جوابدہی کا احساس کرتے ہوئے صدر صاحب کے حضور اس ناکام خطاب پر ہدیۂ تشکر پیش کرنے کی بجائے قرارداد میں میری ترمیم کی حمایت کریں جس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایوان پارلیمینٹ سے صدر صاحب کے اس خطاب کو مایوس کن قرار دیتا ہے۔

(19ر اگست 87ء)

ماورائے نفسیات

احوال غیب جاننے کی خواہش

ایک انسان کی کمزوری کی حد تک...... یہ خواہش بھی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے مستقبل میں جھانک کر دیکھ سکے اور یہ معلوم کر سکے کہ آنے والا زمانہ کیسا ہو گا؟ اس کی عمر کتنی لمبی ہو گی؟ وہ آگے چل کر غم دیکھے گا یا خوشیاں؟ حادثے اور سانحے کب اور کہاں پیش آئیں گے اور شادمانی کے اسباب کیا کیا میسر ہوں گے؟ اگر خالق کائنات انسان کو یہ سب کچھ پیشگی بتا دیتا تو زندگی اس کے لئے موت سے بدتر ہو جاتی۔ آنے والے غموں کے تصور میں اس کی موجودہ معلوم خوشیاں بھی زہر کا پیالہ بن جاتیں اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ زندگی کے کس کس مرحلے میں اس کے کون کون سے پیارے اس کو داغ مفارقت دینے والے ہیں تو ایک اسی غم سے ہی دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے مستقبل پر غیب کے پردے ڈال رکھے ہیں اور دیکھا جائے تو یہ بھی اللہ کی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔

....

مستقبل غیب ہے اور غیب کا کلی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے مگر وہ جس کو چاہے اپنی مصلحتوں کے تحت اس سے باخبر بھی کر دیتا ہے۔ اس کا ایک رستہ تو روحانی ہے کہ بندہ اپنی خواہشات کا غلام بننے کی بجائے خواہشات کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ "مرضیٔ مولیٰ اس کے لیے از ہمہ اولیٰ" ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب کچھ احکام خداوندی کے مطابق ڈھل جاتا ہے اور اس کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور اس کی آنکھ خدا کی آنکھ بن جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جسے اقبالؒ نے "ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا

ہاتھ " اور "گفتہ او گفتہ اللہ بُود " کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور جس کی تائید کئی احادیث نبویؐ سے بھی ہوتی ہے۔ غیب کے بارے میں انبیائے کرام کی اطلاعات ان کے معجزات اور اولیاء اللہ کی پیش گوئیاں اور کرامات اسی روحانیت کا نتیجہ ہیں مگر اس خالص الہامی راستے کے علاوہ بہت سے لوگوں نے مختلف ادوار میں تپسیا' ریاضت اور نفس کشی کے ذریعے غیب بینی کے کچھ اور دروازے بھی کھولنے کی کوشش کی ہے جن میں انہیں کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے تو کبھی کبھی وہ جزوی کامیابی سے بھی ہمکنار ہوئے ہیں۔ بھارت کے یوگی' رشی' منی' تبت کے لاما اور جاپان کے بھکشو اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

....

جین مت' بدھ مت اور ہندو دھرم کے سنیاسی اور یوگیوں نے اس سلسلے میں حیران کن ریاضتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں۔ ان میں سے بعض کئی کئی ماہ بلکہ سال فاقے سے رہتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں آگ کے دائرے میں کپڑے اتار کر نفس کشی کرتے ہیں۔ بعض اپنے آپ کو زمین میں گاڑ دیتے ہیں صرف ان کا سر باہر رہتا ہے اور اسی حال میں وہ ایک مدت گزار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نروان اور نجات ملنے کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ کون کتنا دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش بلکہ متنفر ہو جاتا ہے۔ جسم کو اذیت دینے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خیالات کو ایک نقطے پر مرتکز کرنے کے لئے بھی طرح طرح کی مشقیں کرتے ہیں۔ سانس بند کر کے مخصوص آسنوں میں بیٹھے رہنا' غوطہ لگا کر دیر تک زیر آب رہنا' قبر کھدوا کر اس میں دفن ہو جانا اور ایک مدت کے بعد اس میں سے برآمد ہونا' یہ اور اس طرح کے کئی معمولات ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔ تصورات اور خیالات کے ارتکاز سے ایک انسان اپنے اندر کتنی تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے اس کا ایک دلچسپ واقعہ بدھ مذہب کے لٹریچر میں پایا جاتا ہے' کہتے ہیں کہ ایک گورو نے اپنے چیلے کو کہا کہ وہ آنکھیں بند کر کے خالی الذہن ہو جائے اور اس بات پر اپنے تمام تصورات کو مرتکز کرنے کی کوشش کرے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ دنوں بعد اس کے گورو نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ اس نے کہا:

"اور تو میں ہر چیز کو اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن جب بھی میں اپنے خیالات میں مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں میرا سینگوں والا بیل میرے سامنے آ جاتا ہے"۔

گورو نے کہا:

"اسی بیل کے تصور پر اپنی توجہ مرتکز کر دو"۔

چند دنوں کے بعد گورو دوبارہ اپنے شاگرد کے پاس آیا اور اب کے اس نے کمرے کی کھڑکی کھول کر اس سے کہا کہ اس کھڑکی کے رستے باہر آ جاؤ' شاگرد نے جواب دیا...... "نہیں' میرے سینگ بہت بڑے ہیں میں اس سے باہر نہیں نکل سکتا"۔

تصورات اور خیالات میں مرکزیت پیدا کرنے کی مشقوں میں تبت کے "لاماؤں" کا جواب نہیں۔ وہ تو یہاں تک ریاض کرتے ہیں کہ انہیں یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ان کی روح ان کے جسم سے علیحدہ ہو گئی ہے ان کا جسم ایک جگہ پر پڑا ہے اور ان کی روح دور دراز مقامات پر سفر کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں "ایونز وینز" نے تبتش گریٹ یوگی" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اور جسے آکسفورڈ پریس نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اس میں اس طرح کی بہت سی عجیب و غریب تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سب صحیح ہوں ان میں یقیناً مبالغہ آمیزی بھی ہو گی لیکن اتنی بات بہر حال مُسلّم ہے کہ غیب بینی اور غیب دانی کی صلاحیت اور نجات و نروان حاصل کرنے کی تمنا میں حضرت انسان نے ایسی ایسی کوششیں کی ہیں کہ انہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بھارت میں قریب کی مثال "سوامی راما کرشنا" ہیں جو 1836ء میں پیدا ہوئے اور 1886ء میں فوت ہوئے اس وقت ان کی یوگی تحریک ہندوستان سے نکل کر یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل چکی ہے۔ بھارت، امریکہ، انگلستان، فرانس، ارجنٹینا اور بعض دوسرے ملکوں میں اس کی سو سے زیادہ شاخیں کام کر رہی ہیں اور ہندوؤں کے علاوہ انگریز اور امریکی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی اس کے اراکین میں شامل ہیں۔ سوامی رام کرشنا کی تعلیمات میں نفس کشی اور ریاضت کو اہم مقام حاصل ہے اور وہ اس راستے سے انسان کو اس "بلندی" پر پہنچا دینا چاہتے ہیں جہاں وہ حال اور مستقبل کے درمیان کی دیواروں کو گرا کر غب و شہود کے طلسم کو پاش پاش کر دے۔ "کرسٹو فرائیشروڈ" کی کتاب "راما کرشنا اینڈ ہز ڈسا ئپلز" (مطبوعہ نیویارک) اس سلسلے میں بڑی دلچسپ تفصیلات کی حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقبل کے حالات پر مطلع کرنے کا ایک رستہ خواب بھی ہیں اور اس کی سند خود قرآن حکیم میں موجود ہے جہاں جیل خانے میں حضرت یوسفؑ کے قیدی ساتھیوں کا خواب اور آپ کی طرف سے ان کی تعبیر بیان ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معنی خیز خواب ضروری نہیں کہ صرف نیکو کاروں اور صالحین ہی کو آئے، مجرموں اور قیدیوں کو بھی آ سکتا ہے البتہ ان کی تعبیر ہر شخص نہیں کر سکتا اس کے لئے خاص نظر اور علم کی ضرورت ہے ہمارے ہاں امام جعفر صادق تعبیر خواب پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے میرے پاس اس کا فارسی ترجمہ ہے جو میں نے تہران سے خریدا تھا۔ امام جعفر صادق کے بعد دوسرا نام مشہور تابعی بزرگ محمد ابن سیرینؒ کا ہے جنہیں اس فن میں یدِ طولیٰ حاصل تھا اور جن کے بہت سے واقعات سلفِ صالحین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے بھی تعبیر خواب کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے مشہور ماہر نفسیات فرائڈ نے ہر چند خوابوں کی دنیا پر بالکل مختلف انداز میں روشنی ڈالی (اور اس میں جزوی صداقت بھی ہے) لیکن مغرب اب خود خوابوں کا دلدادہ ہے اور اس کے اہل علم کی تعبیرِ خواب کے موضوع پر آئے دن کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ خود ایک زمانہ مجھ پر ایسا گزرا ہے کہ میں دوسروں کو پیش آنے والے واقعات خواب میں دیکھ لیا کرتا تھا۔ یہ 1953ء کی بات ہے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور میں تھے میری عمر یہی کوئی 17، 18 برس

ہو گی جماعت اسلامی کے رہنماؤں کے علاوہ مجلس احرار، جمعیت اہلحدیث، جمعیت العلماء اور جماعت اہلسنت کے اکابر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم سب لوگ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں چھ چھ ماہ کے لئے نظر بند تھے۔ یہ مدت پوری ہونے لگتی تو بعض کی نظر بندی میں اضافہ ہو جاتا اور بعض کو رہا کر دیا جاتا۔ میں اس زمانہ میں اکثر خواب میں دیکھ لیتا کہ کون رہا ہو رہا ہے اور کس کی میعاد بڑھائی جارہی ہے۔ رہائی یا اضافے کے ٹائپ شدہ کاغذات خواب میں میری نگاہوں کے سامنے آجاتے اور میں اگلے دن صبح نماز فجر کے اجتماع میں احباب کو بتادیتا اور اس کی صداقت ایک آدھ دن میں ہو بہو سامنے آجاتی۔ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ یک لخت سات علماء رہا کر دیئے گئے ہیں ان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا خدا بخش ملتانی (مرحوم ومغفور) کا نام بھی تھا۔ حسب معمول صبح میں نے اعلان کر دیا۔ اس زمانے میں دینی حلقہ جماعت اسلامی پر یہ اعتراض بھی کرتا تھا کہ وہ تصوف کی منکر ہے۔ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی ہمارے ساتھ نظر بند تھے اور ہمیں قرآن حکیم اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے انہوں نے ان خوابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مزاحاً ان علماء سے کہا تھا "آپ لوگ کہتے ہیں ہم تصوف کے منکر ہیں دیکھو تو ہمارا ایک نوجوان روزانہ سچے خواب دیکھتا ہے"۔ اگلے دن باقی سب علماء تو رہا ہو گئے لیکن حضرت مولانا خدا بخش کی رہائی کے احکام موصول نہ ہوئے۔ میرے خوابوں کی مسلسل صداقت کی وجہ سے جیل کے احاطے میں فضا یہ بن چکی تھی کہ ایک بار میں رہا شدگان کے نام سنا تا تو اس کے لئے ذہن تیار ہو جاتے۔ حضرت مولانا بھی ذہنی طور پر رہائی کے لئے تیار تھے یہاں تک کہ سامان بھی باندھ چکے تھے۔ رہائی نامہ نہ آیا تو قدرتاً انہیں بھی کوفت ہوئی۔ چار بجے جیل کا دفتر بند ہو جاتا تھا جب ساڑھے چار بج چکے تو انہوں نے سامان کھول دیا اچانک پانچ بجے شام جیل کا ایک افسر ان کی رہائی کا حکم نامہ لئے دوڑا دوڑا آیا۔ مولانا سے معذرت چاہی اور کہا "معاف فرمایئے یہ کاغذ ہم سے ادھر ادھر ہو گیا تھا اسی لئے تاخیر ہو گئی، بہر حال اب تیار ہو جایئے"۔ حضرت مولانا اس پر بے حد خوش ہوئے مجھے سینے سے لگایا اور ان کے پاس ملتان کا حلوہ، کھانے پینے کی جو اور چیزیں آئی رکھی تھیں مجھے عطا کیں اور خوشی خوشی رخصت ہوئے۔

مقصد اس ذاتی تجربہ سے اپنے کمال کا اظہار نہیں کہ اس بارے میں تو بقول غالب مرتے وقت یہی زبان پر ہو گا۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

مقصد عرض کرنے کا یہ ہے کہ خوابوں کے ذریعے سے بھی کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مستقبل کے احوال پر باخبر کر دیتا ہے اور یہ سنی سنائی بات نہیں میرا اپنا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔

مستقبل بینی کا ایک ادھورا ذریعہ وہ علوم و فنون بھی ہیں جو دست شناسی اور نجوم وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جفر، رمل اور علم الاعداد بھی اسی شعبہ میں شمار ہونے چاہئیں۔ ان میں سے کوئی علم و فن ایسا نہیں جس کے نتائج پر یقین کیا جاسکے۔ یہ حساب کتاب کی باتیں ہیں کبھی صحیح ہو گئیں کبھی غلط، تقدیر پر کامل یقین نہ ہو تو انسان ان کے ذریعے وہمی بن کر صراط مستقیم سے بھٹک بھی سکتا ہے مگر یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے کچھ لوگ ان امور میں غور و خوض کرتے ہیں تو ان کا ایمان پروردگار عالم پر اور بڑھ جاتا ہے کچھ ان میں پڑ کر صحتِ عقیدہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پیشہ ور دست شناسوں اور نجومیوں کی وجہ سے اس شعبے کی جو بدنامی ہوئی ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ بھارت اور پاکستان میں جدھر نکل جاؤ نام نہاد "منجم الملک" فٹ پاتھوں زائچے پھیلائے غیب دانی کے دعویدار بنے ہوئے ہیں۔ ادعا یہ ہے کہ ہاتھ دکھانے والوں اور زائچہ بنوانے والوں کی تقدیر بدل کر رکھ دیں گے مگر خود یہ اہل کمال و ہنر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو بہر حال ایک بات طے ہے ان علوم کو پیشہ بنانا نہ شرعاً جائز ہے نہ اخلاقاً اور اس میں دلچسپی رکھنے والوں کو انہیں ظنی اور تخمینی سمجھنا چاہیے نہ کہ حتمی اور یقینی، یہ پیش نظر ہو تو مجرد ان علوم میں شغف باعث فخر ہو گا نہ کہ وجہ شرمندگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بار بار کائنات میں تدبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ ستارے اور انسانی ہاتھ بھی اسی کائنات کا حصہ ہیں ان سے باہر تو نہیں۔ ان کے تغیر و تبدل پر غور و خوض آیات قرآنی کے منشاء و مصداق سے کیونکر متصادم ہو گا؟ مجھے علم نجوم سے تو کوئی ایسی دلچسپی نہیں صرف سائنسی حد تک فلکیات کا سرسری مطالعہ کیا ہے مگر دست شناسی سے خاصا لگاؤ ہے۔ اس پر بہت پڑھا بھی ہے اور اس کے ماہرین سے ملاقاتیں اور بحثیں بھی کی ہیں جیسے علم قیافہ ہے کہ تجربہ کار اصحابِ نظر چہرہ دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں آدمی کس قماش کا ہے اسی طرح انسانی ہاتھ ہے کہ اس کی انگلیوں کی بناوٹ، اس کے انگوٹھے اور اس کے طول و عرض اور اس کی نرمی و گرمی سے بآسانی ہاتھ والے کے کردار اور اس کی شخصیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت کے بغیر نہیں اس نے جو کچھ بنایا ہے بامقصد بنایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہاتھ کی لکیریں کیوں مختلف ہیں؟ ایک شخص کے ہاتھ کی لکیریں بعینہٖ ویسی کیوں نہیں ہیں جیسی دوسرے شخص کے ہاتھ کی لکیریں ہیں؟ ہاتھ کی لکیریں بدلتی کیوں رہتی ہیں؟ کبھی ایک لکیر دھندلی پڑ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ایک نئی لکیر جنم لے لیتی ہے؟ ان سوالات کا ایک صاف سیدھا جواب تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ مہمل اور بے مقصد ہے مگر جو شخص یہ کہتا ہے وہ اللہ پر ایک بے مقصد اور بے حکمت کام کرنے کی تہمت لگاتا ہے۔ دوسرا جواب وہ ہے جو پامسٹری اور دست شناسی فراہم کرتی ہے آپ اسے یقینی نہ سمجھیں کوئی بڑے سے بڑا پامسٹ اور دست شناس بھی اسے یقینی نہیں سمجھتا لیکن کائنات میں تدبّر کی ایک کوشش قرار دیتے ہوئے کم سے کم اس سے دلچسپی ظاہر کرنے کو تو جائز جانیں۔

....

دست شناسی اصلاً مشرق ہی کا علم وفن ہے مشرق قریب اور مشرق بعید میں اس میدان کے کتنے ہی شاہ سوار ہو گزرے ہیں ان میں مسلم بھی تھے اور غیر مسلم بھی مگر ہمارے قریبی زمانے میں اس ہنر میں یکتائی کا جو شہرہ "کیرو" کو حاصل ہوا ہے وہ کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ مستقبل بینی کی کوششوں اور ذرائع و وسائل میں اب تک تذکرہ ہم نے مشرقی دنیا کا کیا ہے اس سے مغربی دنیا کی دلچسپیاں آگے چل کر بیان ہوں گی اور کیرو کا تعلق مشرق سے اس لئے بنتا ہے کہ وہ سولہ سترہ سال کی عمر ہی میں انگلینڈ سے ہندوستان بھاگ آیا تھا اس کے والدین نے پامسٹری سے اس کی جنون کی حد تک دلچسپی دیکھ کر اس پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں اور یہ فرار اسی کا نتیجہ تھا ویسے بھی اس نے سن رکھا تھا کہ یہ علم سیکھنے کی اصل جگہ ہندوستان ہی ہے۔ یہاں بمبئی میں اس نے ایک ہندو گرو سے تین سال تک یہ علم حاصل کیا اس کے بعد مصر گیا اور چوبیس سال کی عمر میں لندن واپس آکر دست شناسی کی پریکٹس شروع کر دی۔ امریکہ کے دورے میں اس نے سزائے موت پانے والے ایک مجرم "ہنری میئر" کا ہاتھ دیکھا اور اسے بتایا کہ اسے پھانسی نہیں دی جائے گی عین اس دن جب مجرم کو پھانسی دی جانی تھی اس کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی اور اس طرح کیرو کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ کیرو نے لارڈ کچنر کو ہدایت کی تھی کہ وہ 66 سال کی عمر میں سمندری جہاز میں سفر نہ کرے مگر اس نے اس کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا چنانچہ جب وہ زار سے ملنے کے لئے سکاٹ لینڈ سے روس جا رہا تھا جرمن آبدوزوں نے اس کے جہاز پر حملہ کر دیا اور وہ ڈوب گیا۔ انگلینڈ کے شاہ ایڈورڈ ہفتم بھی کیرو کے بڑے معتقد تھے انہی کے ذریعے وہ زار کے بھی بہت قریب آ گیا یہیں اس کی ایک محفل میں راسپوٹین سے اس کی ملاقات ہوئی دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور کیرو نے پیش گوئی کی کہ راسپوٹین کو زہر دے کر اور چاقو مار کر دریائے نیوا کے برفیلے پانی میں غرق کر دیا جائے گا ٹھیک گیارہ سال کے بعد راسپوٹین اپنے اسی انجام کو پہنچ گیا۔

کیرو نے اپنی زندگی میں جو پیش گوئیاں کی تھیں ان میں ہندوستان کی تقسیم' پاکستان اور اسرائیل کا قیام' چین اور روس کے انقلابات اور پہلی جنگ عظیم تو پوری ہو چکی ہیں لیکن ابھی تک اس کی کئی پیش گوئیاں پوری نہیں ہوئیں ان میں فرانس میں ڈکٹیٹر شپ' جاپان اور چین کا سیاسی اتحاد اور ایشیا پر ان کا مکمل کنٹرول' نیویارک کے ایک بہت بڑے حصہ کی ایک خوفناک زلزلے میں تباہی اور لندن پر روس کی تباہ کن بمباری شامل ہے۔ اس کی ایک دلچسپ پیش بینی یہ بھی ہے کہ روس' لیبیا' ایتھوپیا اور ایران مل کر اسرائیل پر حملہ کریں گے۔

مشرق میں قدیم بادشاہوں کی طرف سے کسی اہم اقدام سے پہلے نجومیوں اور جوتشیوں کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ بہت پرانا ہے' خود قرآن حکیم میں فرعون مصر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اسے نجومیوں نے پیشگی بنی اسرائیل میں اس بچے کی پیدائش کے بارے میں اطلاع دے دی تھی جس کے ہاتھوں اس کی تباہی مقدر تھی۔ اسی پیش گوئی کی وجہ سے اس نے یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والی بچیوں کو تو زندہ چھوڑ دیتا تھا لیکن بچوں کو ہلاک کرا دیتا تھا۔ لیکن جوتشیوں' نجومیوں اور دست

شناسوں سے اہم امور میں مشاورت تھاقدیم بادشاہوں ہی کا دستور نہ تھااس دور میں بھی اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور روشن خیال حکمران اسی طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی اپنے جوتشیوں سے ہر کام کے لئے "شبھ" گھڑی کا تعین کرالیتی ہیں' مرحوم سوئیکارنو بظاہر بڑے ترقی پسند تھے لیکن علم الاعداد میں زبردست یقین رکھتے تھے وہ جون میں پیدا ہوئے تھے جو سال کا چھٹا مہینہ ہے اور پیدا بھی 6 تاریخ کو ہوئے اس لئے ان کے نزدیک اس حسنِ اتفاق نے ان کی شخصیت کو دہرا اور پہلودار بنادیا تھا۔ ان کے جانشین صدر سوہار تو بدھ اور جمعرات کو اپنی زندگی کے لئے انتہائی اہم دن تصور کرتے ہیں۔ اس لئے انہیں جب بھی کوئی اہم اعلان کرنا ہوتا ہے اس کے لئے وہ انہی دنوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ فلپائن کے صدر مارکوس سات کے ہندسے کو خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں اس لئے وہ جس کشتی میں سفر کرتے ہیں اس کا نام بھی 777 (سات سو ستتر ہے) ہانگ کانگ ایک مدت سے برٹش کالونی ہے مگر اس کے چینی باشندے آج تک "تاؤ" جوگیوں سے مشورہ کر کے اپنی تقریبات کے دن مقرر کرتے ہیں۔ جاپان اور تھائی لینڈ کے اکثر و بیشتر سیاستدان بھی آئے دن زائچے بنواتے رہتے ہیں اور ان زائچوں کے بل پر ان میں سے بعض کو کامل یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور برسراقتدار آکر رہیں گے۔ پاکستان کے حکمران ایک اسلامی ریاست کے سربراہ ہونے کے ناطے کھل کر تو اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوتے لیکن ان میں سے کئی اس طرح کے ماہرین سے مشورے حاصل کرتے رہے ہیں۔ ہمارے دور میں سابق وزیراعظم بھٹو نے بھی الیکشن کی تاریخ کے تعین کے لئے سری لنکا کے نجومیوں سے مشورہ حاصل کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان کے مشہور دست شناس جناب ایم اے ملک کو اپنے ہاتھ کا پرنٹ بھجوایا تھا۔ جناب ملک واقعی اپنے فن میں صاحب کمال ہیں۔ خود یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں دست شناسی ان کا پیشہ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سلسلے میں خاص بصیرت دی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کیا کہا یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے ہم تو فقط یہ بتا رہے تھے کہ مستقبل کی خبریں جاننے کے لئے مشرق میں جو ذرائع و وسائل اختیار کئے جاتے رہے ہیں ان میں علم نجوم اور دست شناسی بھی شامل ہے اور ہما شما پر کیا موقوف بڑے بڑے جغادری ترقی پسند حکمران بھی اسی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ اب تک ہم نے اختصار کے ساتھ ایشیا کے جوگیانہ اور متصوفانہ رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ مغرب میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے بھی حیرت انگیز ہے۔

(21 / مئی 1981ء)

چند محیّر العقول واقعات

یہ بدھ کا دن تھا اور مئی کی تیرہ تاریخ، پوپ جان پال دوم روم کے سینٹ پیٹر چوک میں دس ہزار کے اجتماع سے خطاب کرنے والے تھے اٹلی میں چند ہی دن بعد اسقاط حمل کے قانونی جواز یا عدم جواز پر ریفرنڈم ہونے والا تھا پوپ اسقاط حمل کے زبردست مخالف ہیں اسے مذہبی نقطہ نظر سے قتل قرار دیتے ہیں اس موضوع پر مختلف ملکوں میں وہ پہلے بھی اظہار خیال کر چکے ہیں آج کی تقریر بھی معرکۃ الآراء ہو گی۔ وہ عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہجوم کو برکت و محبت تقسیم کرنے، اسے اشیرباد دینے لکڑی کے بنے ہوئے تخت پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ فائرنگ کی آواز آئی۔ چار گولیاں پوپ کے جسم میں پیوست ہو چکی تھی، مذہب اور سیاست میں تشدد کی جو لہر در آئی ہے یہ اس کا تازہ ترین مگر افسوسناک اور قابل نفرت مظاہرہ تھا۔

پوپ سے ہسپتال میں جو لوگ ملنے آئے ان میں بشپ واج ٹائیلا بھی تھے۔ عیسائی حلقوں کی روایت کے مطابق آج سے سالوں پہلے انہوں نے پولینڈ میں پیدا ہونے والے اس مذہبی رہنما کو بتا دیا تھا کہ وہ آگے چل کر پوپ بنیں گے اور یہ بھی کہ ان پر قاتلانہ حملہ ہو گا اور اسی کے نتیجے میں وہ اپنی جان، جان آفرین کو سونپ دیں گے خدا کرے کہ وہ اس حملے کے نتیجے میں جاں بحق نہ ہوں لیکن اگر کہیں ایسا ہو گیا تو ماتم کے شور و غوغا کے ساتھ ساتھ بشپ کی پیش بینی کی دھوم مچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے بشپ واج ٹائیلا کی اس پیش گوئی میں روحانی عنصر بھی شامل ہو وہ خود ایک مذہبی رہنما ہیں اس لئے ان کے عقیدت منداسے کرامت بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن مغربی دنیا میں اس طرح کی پیش گوئیاں کرنے کے لئے کسی مذہبی ذہن و کردار کی

ضرورت نہیں۔ مستقبل بینی کی صلاحیت پر یقین رکھنے والے لوگ اسے چھٹی حس کا کرشمہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک ہر شخص میں کسی نہ کسی حد تک پیدائشی طور پر مستقبل کی جھلکیاں دیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے کچھ لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو وہ اسے استعمال نہیں کرتے۔ کچھ لوگ خاص طور پر یہ ملکہ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اس طاقت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست پاکستان کی وزارت اطلاعات میں افسر تھے کچھ عرصے تک فلم سنسر بورڈ کے چیئرمین بھی رہے اب مرحوم ہو چکے ہیں وہ آنکھیں پڑھنے کا ہنر رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جب کسی شخص سے ملتے ہیں اس کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کا تصویری عکس اس کی آنکھوں میں آ جاتا ہے جیسے سکرین پر فلم دکھائی جا رہی ہو۔ کراچی میں نیوی کے ایک سابق افسر مسٹر سبزواری کی بھی کچھ ایسی ہی شہرت ہے مختلف محفلوں میں انہیں بعض لوگوں کے بارے میں پیش گوئیاں کرتے میں نے بھی سنا ہے گو ان میں سے بعض غلط بھی نکلی ہیں لیکن بعض ناقابل یقین حد تک صحیح بھی ثابت ہوئیں۔ ہمارے تو چھٹی حس رکھنے والے باکمال افراد اکا دکا ہی ہوں گے اور انہوں نے بھی اس صلاحیت کو پیشہ نہیں بنایا مگر یورپ اور امریکہ میں تو یہ ایک کامیاب پیشہ ہے اس میں بڑے بڑے نامور لوگ پائے جاتے ہیں۔ مشہور ترین اخبارات و جرائد ان کی پبلسٹی کرتے اور وقتاً فوقتاً ان کی پیش گوئیاں شائع کرتے رہتے ہیں اس فن پر ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ نکلتی ہیں یہی نہیں ان کی زندگی اور ان کے کارناموں پر دوسرے اہل قلم بھی کتابیں لکھتے اور ان کی ہنرمندی پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

....

پیش گوئیاں کرنے والے ان ماہرین کا ایک حلقہ مذہب و سیاست سے کوئی خاص علاقہ نہیں رکھتا۔ اول تو یہ مذہبیات کے کچھ زیادہ قائل ہی نہیں ہوتے اور ہوں بھی تو ان میں تعصب نہیں پایا جاتا۔ سیاست میں بھی یہ حصہ نہیں لیتے اس لئے کسی مخصوص سیاسی نظریہ کی ترویج و تبلیغ بھی ان کے پیش نظر نہیں ہوتی انہیں صرف اپنے پیشے سے غرض ہے اور بس۔ لندن میں اس طرح کے کئی ماہرین ہیں مگر ان میں مسٹر ٹام کاربٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میری بھی ان سے ملاقات ہے۔ انگلستان میں جنوں بھوتوں کے لئے خاص طور پر بلائے جاتے ہیں ہمارے ہاں کے عاملین کی طرح جنوں اور بھوتوں کو بھگانے میں تو مہارت نہیں رکھتے البتہ انہیں محسوس کرتے اور صاف دیکھ لیتے ہیں نیز یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ جگہ آسیب زدہ ہے یا نہیں۔ ایک زمانہ میں لندن میں جنوں بھوتوں کا شور مچا اور وہاں کی بعض قدیم اور تاریخی عمارتوں کے رہنے والوں نے مسٹر کاربٹ کو تحقیق اور تفتیش کی دعوت دی۔ اس تحقیقات میں لندن کی ایک صحافی خاتون ڈیانا نارمین بھی مسٹر کاربٹ کے ہمراہ تھیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات "دی سٹیٹلی گھوسٹس آف انگلینڈ" کے نام سے کتابی صورت میں چھاپ دیئے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسٹر کاربٹ پیش گوئی کے لئے ایک بلوریں گیند کا سہارا لیتے ہیں۔ ملاقاتی دس منٹ تک شیشے کے اس بال کو اپنے دونوں

ہاتھوں میں تھامے رکھتا ہے اور وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس گیند کو دونوں ہاتھوں سے تھامے رکھنے کے نتیجے میں انسانی جسم و روح اور قلب و دماغ کی کچھ لہریں اس میں سرایت کر جاتی ہیں یا کم سے کم منعکس ہو جاتی ہیں اور وہ انہی سے اس کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ انگلستان کے اونچے حلقوں میں مسٹر کاربٹ کا اتنا شہرہ ہے کہ خود ملکہ کی والدہ اور شہزادی مارگریٹ وغیرہ بھی انہیں بلوا بھیجتی ہیں اور پیش آمدہ مسائل میں ان کی پیش گوئیوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن کی دعوت پر اسرائیل بھی جا چکے ہیں۔ امریکہ کی بعض اہم شخصیات بھی ان کے فن کی قدردان ہیں کم و بیش چالیس سال سے اس میدان میں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے سفر کا بھی ارادہ رکھتے ہیں انہیں اس کی بہت فکر ہے کہ وہاں وہ اس فن سے جو روپیہ پیسہ جمع کریں گے حکومت کے قواعد کی رو سے انہیں ساتھ لا سکیں گے یا نہیں، مضبوط اور تندرست و توانا، گٹھا ہوا جسم، پیشانی غیر معمولی طور پر فراخ، چہرے کے خدوخال متاثر کن بلکہ مرعوب کن، ان کی رہائش گاہ میں داخل ہوں تو سلیقے اور ذوق کے ساتھ ساتھ ایک عجیب پر اسرار ماحول کا احساس ہوتا ہے۔ میرے حلقہ احباب کا کہنا ہے کہ ان کے تجربے میں کچھ باتیں تو صحیح نہیں نکلیں مگر بعض حیرت انگیز حد تک پوری ثابت ہوئی ہیں۔

....

مغرب میں مستقبل کی دنیا تک رسائی کا ایک طریقہ "روحوں سے رابطہ" ہے۔ اس کی بنیاد اصل میں مسمریزم کا عمل ہے۔ مسمریزم کے بانی کا نام "میسمر" تھا یہ صاحب اٹھارویں صدی میں پیدا ہوئے اصلا یہ طریقہ انہوں نے علاج کی غرض سے نکالا تھا مگر اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ معمول کو مصنوعی طور پر سلا دینے کے بعد اس کے خیالات پر مکمل کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور اس سے حسب منشا ہر کام لیا جا سکتا ہے یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ جسمانی ذرائع کو بیچ میں لائے بغیر روح کی روح سے گفتگو ہو سکتی ہے، مسمریزم کے زیر اثر انیسویں صدی کی پہلی تہائی میں دو تحریکیں اور شروع ہوئیں۔ ان میں سے ایک کو کرسچین سائنس کہتے ہیں دوسری کو "سپر چوئلزم" یعنی روحانیت، کرسچین سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں غلط خیالات و افکار کا نتیجہ ہیں اگر افکار و خیالات کو تندرست کر دیا جائے تو جسم بھی صحت مند ہو جائے گا۔ تحریک روحانیت کا دعویٰ یہ تھا کہ مرنے والوں کی روحوں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے ایسے مخصوص افراد کو واسطہ بنانا ناگزیر ہے جن کی روحوں میں فوت ہو جانے والے لوگوں کی ارواح سے تعلق پیدا کرنے، ان کو دیکھنے اور ان کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہو، اسی کو انگریزی میں "میڈیم" کہتے ہیں۔ اس جدید تحریکِ روحانی کا آغاز 1840ء میں امریکہ کے ایک نیم مجذوب "اینڈریو جیکسن ڈیوس" سے ہوا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے عالم جذب و کیف میں "پرنسپلز آف نیچر" کے نام سے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب املا کرائی لیکن تحریک کو اصل شہرت چند سال بعد دو امریکی بہنوں کی وجہ سے ملی جنہیں "فاکس سسٹرز" کہا جاتا ہے۔ "فاکس سسٹرز" نے بہت سے مقامات پر روحوں سے اپنے رابطے کا مظاہرہ کیا، ان پر تنقیدیں بھی ہوئیں، انہیں جھٹلایا بھی

گیا لیکن بہت سے با اثر افراد ان کے مظاہروں کے زیر اثر تحریک روحانیت میں شامل بھی ہو گئے ان میں نیویارک ٹریبون کے ایڈیٹر "ہوربس گریلے" اور امریکن کورٹ آف اپیلز کے ایک سینئر جج مسٹر "ایڈمنڈز" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "ایکسٹرا سینسری پاورز" کے مصنف مسٹر الفرڈ ڈگلس کا کہنا ہے کہ 1851ء میں ان "روحانیوں" نے "نیویارک سرکل" کے نام سے باقاعدہ اپنا ایک حلقہ قائم کیا اور دو سال کے اندر اندر اس کے اراکین کی تعداد چالیس ہزار تک جا پہنچی اور یہ تین سو حلقوں میں منقسم ہو گئے۔ امریکہ میں تو نہیں لیکن لندن کی ایک "سپر چوئل سوسائٹی" کی ایک نشست میں مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ایک مقتدر اور محترم پاکستانی دوست اس کے رکن ہیں اکثر مجھے روحیں بلانے کے عجیب و غریب واقعات سناتے رہتے تھے۔ ایک دن میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا شاید اس نشست میں شریک ہونے کی فیس بھی تھی وہ بھی ہمارے مہربان دوست نے ادا کی۔ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے اس روحانی دنیا سے متاثر کرنا چاہتے تھے۔ میڈیم ایک بزرگ خاتون تھیں اور حاضرین کوئی چالیس پچاس کے لگ بھگ، مجلس کے آغاز میں محترمہ نے عیسائی طریقہ کے مطابق دعا کی اس کے بعد اعلان کیا کہ وہ محفل میں موجود کچھ لوگوں کے اعزا و احباب کی بچھڑی ہوئی روحوں سے رابطہ قائم کریں گی ان سے پوچھ کر بعض باتیں بتائیں گی اور بعد میں سوالوں کے بھی جواب دیں گی۔ اتفاق سے آغاز انہوں نے ہماری مخالف سمت سے کیا اور پانچ سات آدمیوں سے باری باری مخاطب ہوئیں ان میں سے ہر شخص کو انہوں نے دس دس منٹ دیئے ان کا انداز یہ تھا کہ وہ ایک شخص کو مخاطب کرتیں اور اسے بتاتیں کہ اس وقت ایک روح آئی ہے یہ بھی بتاتیں کہ وہ مرد کی ہے یا عورت کی اور وہ یہ پیغام دیتی ہے۔ ان میں سے آدھے تو مان گئے لیکن نصف کا کہنا تھا کہ وہ اس طرح کی کسی روح کو نہیں پہچان سکے۔ مجھے شبہ تھا کہ ماننے والے سوسائٹی کے اراکین حضرات ہیں اور جنہوں نے نہیں مانا وہ میری طرح نو گرفتار ہیں۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں مجھ تک "دور جام" آنے سے پہلے پہلے محفل ہی برخاست نہ ہو جائے اس لئے میں نے آداب مجلس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے محترمہ کو اپنی جانب متوجہ کیا اور عرض کی کہ کہیں ایسا نہ ہو آج کی صحبت میں ہم ان کے التفات سے محروم ہی رہیں، میرے دوست تو میرے اس گنوارپن پر بہت جزبز ہوئے مگر محترمہ مائل بہ کرم ہو گئیں اور جلدی ہی میری باری آ گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے سر پر ایک مذہبی شخصیت کی روح کھڑی ہے میں کوئی کتاب لکھ رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ کام کی بات ایک بھی نہ تھی، میں جن ارواح سے رابطہ قائم کرنے کا خواہشمند تھا ان میں سے کسی سے گفتگو ہوتی تو بات بھی تھی۔ ہمارے دوست حسب معمول بڑے خوش فہم تھے ان کا کہنا تھا کہ ان کی باری پر جو روح بلائی گئی ہے وہ ان کے باپ کی تھی اور میڈیم نے اس کا جو حلیہ اور وضع قطع بتائی ہے وہ بعینہ انہی کی ہے۔ بعد میں سوسائٹی کے ایک عہدیدار نے مہمان خاتون میڈیم کا شکریہ ادا کیا اور اعلان کیا کہ جو لوگ ان سے الگ ملاقات کا وقت چاہتے ہوں وہ اجلاس کے بعد بکنگ لے سکتے ہیں۔ فیس صرف پانچ پونڈ ہو گی۔ کچھ لوگ اس کے لئے بھی تیار ہو گئے مگر مجھے تو یہ سارا ڈرامہ بہت کھوکھلا لگا۔ روحانیت اس میں نام کو نہ تھی البتہ "روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر" کا یہ انداز بہت دلچسپ تھا۔

مغرب میں کی جانے والی پیش گوئیوں کی ایک قسم خالصتاً مذہبی بھی ہے۔ یہ پیش گوئیاں عام طور پر توہم پرستی پر مبنی ہوتی ہیں گو ان سے مقصود عیسائیت کی تبلیغ و ترویج ہے، ٹھیٹھ مذہبی عقیدہ کے لوگ ان کہانیوں پر کتنا اعتقاد رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابھی حال ہی میں انگلینڈ میں ایک شخص نے ایک طیارہ اغوا کرلیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ "تھرڈ سیکرٹ آف فاطمہ" نامی جو دستاویز ویٹی کن میں پوپ کی تحویل میں ہے اسے شائع کیا جائے ورنہ طیارے کو اڑا دیا جائے گا۔ اس تھرڈ سیکرٹ کی کہانی یوں بیان کی جاتی ہے کہ 1917ء میں پرتگال کے شہر لزبن سے 75 میل دور تین چرواہے بچوں نے حالتِ بیداری میں حضرت مریم کی زیارت کی جنہوں نے انہیں دنیا کے لئے پیش گوئیوں کی صورت میں تین پیغام دیئے۔ ان میں سے ایک پیش گوئی یہ تھی کہ روس ایک دن عیسائی مذہب کو قبول کرلے گا۔ دوسری پیش گوئی پہلی عالمگیر جنگ کے بعد دوسری جنگ عظیم کے بارے میں تھی جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اگر دنیا نے خدا کو نہ مانا تو یہ جنگ پہلے سے بھی کہیں بڑھ کر ہوگی۔ اس دوران چرواہوں میں سے دو فوت ہو گئے تیسری نن بن گئی اور اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران تیسری پیش گوئی ایک سربمہر لفافے میں پوپ کو روانہ کر دی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ اسے 1960ء سے پہلے نہ کھولا جائے۔ 1920ء میں پوپ نے بعض چوٹی کے عیسائی رہنماؤں کے ہمراہ اس لفافے کو کھولا "انسائیکلوپیڈیا آف پرافیسی" کے مؤلف نے ایک اعلیٰ عیسائی ذریعہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ پوپ اسے پڑھ کر خوف سے کانپنے لگے اور دہشت کے مارے بیہوش ہو گئے۔ یہ تیسری پیش گوئی کیا ہے؟ سالہا سال سے یورپ کے صحافتی اور مذہبی حلقوں میں اس سلسلے میں قیاس آرائی کا سلسلہ جاری ہے۔ 1963ء میں ایک جرمن اخبار نے بزعم خود اس کا مکمل متن شائع کر دیا جس پر عیسائی دنیا میں ایک سنسنی پھیل گئی مگر ویٹی کن کے حلقوں نے نہ اس کی تردید کی نہ تصدیق۔ ابھی حال ہی میں اس مذہبی جنونی نے اس پیش گوئی کی اشاعت کا مطالبہ کرنے کے لئے طیارہ اغوا کر لیا تو مغربی پریس میں یہ قضیہ ایک مرتبہ پھر تازہ ہو گیا اب کے جو مفروضے قائم ہوئے ہیں ان میں تین باتیں سرفہرست ہیں کچھ کا کہنا ہے کہ یہ پیش گوئی بیسویں صدی کے آخر میں ایک خوفناک عالمگیر جنگ سے متعلق ہے۔ جس کے دوران دنیا کی کئی قومیں صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی بعض اسے چرچ کے اندرونی جھگڑوں کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پیش گوئی کے مطابق ویٹی کن پر ایک زمانے میں شیطان قابض ہو جائے گا اور سنڈے ٹائمز کا کہنا ہے کہ اس میں ایک پوپ کے قتل کی اطلاع درج ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ موصوفہ نن صاحبہ زندہ سلامت موجود ہیں مگر وہ لوگوں کے اصرار کے باوجود نفسِ مضمون پر لب کشا نہیں ہوتیں البتہ عیسائی عوام ہیں کہ ہزاروں کی تعداد میں پرتگال کے اس مقام کی زیارت کو جمع ہو جاتے ہیں۔ جہاں چرواہوں کو اس داستان کے مطابق حضرت مریم کی زیارت ہوئی تھی۔

(4 جون 1981ء)

پیش گوئیاں...... ایک سیاسی ہتھیار

زلزلے کو "قیامت صغریٰ" کہتے ہیں یعنی چھوٹی قیامت، جس طرح قیامت کبریٰ، یعنی (اصل) بڑی قیامت کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب آئے گی، اسی طرح زلزلے کے بارے میں بھی تمام تر علمی اور سائنسی پیش رفت کے باوجود آج تک پیشگی یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ وہ کب اور کہاں آئے گا، صرف اتنا ریکارڈ پر ہے کہ اس سلسلے میں انسانوں سے زیادہ جانوروں کی چھٹی حس زیادہ تیز ہے۔ 1835ء میں چلی کے ایک قصبے میں بھونچال آیا تو اس سے کچھ ہی دیر پہلے تمام کتے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مقام الاسکا میں 1964ء میں ایک خوفناک زلزلہ سے کچھ ہی دیر پہلے تمام ریچھوں نے جنگل سے نکل کر پہاڑی پر اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اسی طرح آج سے پانچ سال پہلے 1976ء میں شمال مشرقی اٹلی کے جانوروں نے زلزلے کی آمد آمد کو پہلے سے سونگھ لیا۔ کتے بلا سبب بھونکنے لگے، پنجروں میں بند پرندے اپنے قفس توڑ کر آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگے، بلیاں کھیتوں کی طرف بھاگ نکلیں اور ہرن پہاڑوں سے نکل کر وادیوں میں آ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ چین جو دنیا کے ان چند ملکوں میں شامل ہے جہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں زلزلوں کی پیش گوئی کرنے کے لئے جانوروں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ حکومت چین کے متعلقہ محکمہ نے اس سلسلے میں جو پمفلٹ شائع کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ لوگوں کو اس وقت زلزلے کی تباہی سے بچنے کی تیاری کر لینی چاہئے جب گھوڑے، بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی باڑوں میں جانے سے انکار کر دیں، جب چوہے اپنے بلوں سے باہر آ جائیں اور

دوبارہ اندر جانے کے لئے تیار نہ ہوں، مرغیاں درختوں کی طرف اڑنے لگیں، مچھلیاں پانی سے باہر آ جائیں، خرگوش اپنے کان کھڑے کر کے ادھر ادھر کودنے لگیں اور کبوتر خوفزدہ ہو کر اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگیں اور اپنے آشیانوں میں واپس نہ جائیں۔ حکومت چین کی یہ پیش بندی کہاں تک صحیح ہے اس سلسلے میں قطعیت سے تو کوئی بات نہیں کی جا سکتی البتہ دو باتیں طے ہیں ایک یہ کہ جانور اس معاملے میں انسان سے بازی لے گئے ہیں اور دوسری یہ کہ زلزلہ کی پیش گوئی کرنے میں جانوروں کی وساطت سے ہی سہی مشرق کو مغرب پر ایک گونہ تفوق حاصل ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ چونکہ مغرب زلزلے کی پیش گوئی کرنے سے عاجز ہے اس لئے وہ دوسرے علمی اور سائنسی میدانوں میں بھی مستقبل بینی کی صلاحیت سے محروم ہے۔ حقیقت میں تو یہی ایک شعبہ ہے جس میں مغربی دنیا کی پیش گوئیاں اپنے اندر گہرائی بھی رکھتی ہیں اور گیرائی بھی۔ اس کی وچ کرافٹ شپ یعنی اس کی چڑیلیں (اور یورپ میں آج کل پائی جانے والی چڑیلوں کو "ماڈرن وچز" کہا جاتا ہے۔ تفصیلات پھر کسی وقت) اس کی پامسٹری اور آسٹرالوجی اس کے کمرشل بالز (بلوری گیندیں) اس کی سپرچوئل سوسائٹیز اور اس کے مذہبی توہمات کے بطن سے ہونے والی پیش گوئیاں تو سنجیدگی سے لائق توجہ نہ سہی لیکن سائنس کی دنیا میں آج اسے جس طرح قیادت کا مقام حاصل ہے اس کے ہوتے ہوئے اگر مغربی سائنس دان آنے والے دور کی سائنسی ترقیات یا ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے دنیا کی تباہی کے بارے میں کوئی پیش گوئی کریں یا اس کے ماہرین معاشیات دنیا کی معاشی اور اقتصادی صورتحال کے متعلق آنے والے زمانے کا کوئی نقشہ پیش کریں تو وہ یقیناً ہم سب کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہونا چاہئے۔

....

ابھی ایک آدھ ماہ پہلے "ایلم ٹری بکس لندن" نے ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "دی بک آف پریڈکشنز یعنی پیش گوئیوں کی کتاب" ایک بورڈ آف ایڈیٹرز نے اسے مرتب کیا ہے اور تیس مشہور سائنس دانوں اور اہل علم نے اس کے لئے مضمون لکھے ہیں، کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں ماہرین نے مستقبل کے بارے میں سن وار اپنے اندازے اور تخمینے بتائے ہیں اور دوسرے میں "علمائے نفس" (سائیکک) کی پیش گوئیاں ہیں اس کے سترہ ابواب ہیں اور پانچ سو سے زائد صفحات۔ پوری کتاب کا خلاصہ پیش کرنا تو مشکل ہے لیکن اس کی چند پیش گوئیاں ہم ضرور درج کریں گے۔ "فلیکس لوزمان" ایک مشہور ماہر معاشیات ہیں اور امریکہ اور یو این او میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

○ ...... 1994ء تک مصنوعی گردے تیار کرنا ممکن ہو جائے گا اور سن دو ہزار تک ہر قسم کے سرطان کا اس کی ابتدائی اسٹیج میں علاج کیا جائے گا۔

"رابرٹ ٹراکس" کہتے ہیں کہ:

○ ...... 2000ء تک پچاس ہزار آدمی خلا میں منتقل ہو جائیں گے وہیں ان کی رہائش ہوگی اور وہ

وہیں اپنی روزی کمائیں گے۔

آرتھر سی کلارک مشہور سائنس دان اور مصنف ہیں، سائنس فکشن پر ان کی پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

○ ......1990ء تک رسٹ واچ کی طرح کلائی پر باندھنے والا ٹیلیفون ایجاد ہو جائے گا۔

○ ......2005ء تک مریخ میں انسان پہنچ جائے گا اور 2010ء تک خلا میں شہر آباد ہو جائیں گے

اسی سے ملتی جلتی پیش گوئی ڈاکٹر گیری ہنٹ نے کی ہے یہ یونیورسٹی کالج لندن میں "سیاروں کی فضا" پر ریسرچ کرنے والی لیبارٹری کے سربراہ ہیں' ان کا کہنا ہے کہ:

○ ......1993ء سے 2030ء تک کے زمانے میں انسان مریخ پر پہنچ جائے گا اور وہاں سے جو مواد دستیاب ہو گا اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہاں بھی کوئی مخلوق آباد رہ چکی ہے۔ اس زمانے میں چاند کے مختلف علاقوں میں انسانی بستیاں آباد ہو جائیں گی چاند پر رہنے والے زمین سے رابطہ استوار رکھ سکیں گے اور وہاں سے ایسی دھاتیں زمین پر بھیجیں گے جس سے یہاں کی صنعت و حرفت اور ترقی یافتہ ہو جائے گی۔ گرانی اور مہنگائی کے بارے میں مغربی ماہرین معاشیات کا نظریہ یہ ہے کہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ کتاب میں جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں ان کے مطابق 1979ء میں اگر ایک مکان 68 ہزار ڈالر میں تعمیر ہوتا تھا تو 1989ء میں وہی مکان ایک لاکھ 58 ہزار ڈالر میں تعمیر ہو گا۔ جو اخبار بیس سینٹ میں ملتا تھا وہ تقریباً پچاس سینٹ کا ہو گا۔ پانچ سینٹ میں ملنے والی سگریٹ کا ایک پیکٹ ساڑھے نو سینٹ میں دستیاب ہو گا اور جس ٹائی کی قیمت آج ساڑھے سات سینٹ ہے وہ دس سال کے اندر اندر 19 سینٹ تک جا پہنچے گی۔

....

تیسری عالمگیر جنگ بلکہ ایٹمی جنگ ایک اور موضوع ہے جس پر ماہرین نے قیاسات کے گھوڑے دوڑائے ہیں یہ کب ہو گی' اس میں تو ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اب کے یہ ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی بلکہ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں خلاء کی تسخیر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہولناک اور خوفناک ذرائع و وسائل بھی استعمال ہوں گے۔ ویسے تو تیسری عالمی جنگ پر اس زمانے میں بعض دوسری مستقل تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ اس موضوع پر میں عنقریب جداگانہ عنوان کے تحت اپنی گذارشات پیش کروں کہ قوم اور ملک کو آنے والے وقت کے لئے پیشگی خبردار کرنا بھی ایک اہم فریضہ ہے فی الوقت آئندہ جنگ کے بارے میں زیر نظر کتاب کی پیش گوئیاں ملاحظہ فرمایئے۔

"نائیجل کالڈر" دس سال تک سائنسی جریدے "نیو سائنٹسٹ" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور سائنس کو مقبول بنانے پر یونیسکو کی طرف سے انہیں ایوارڈ دیا جا چکا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

○ ...... عین ممکن ہے تیسری جنگ عالمگیر 1982ء اور 1987ء کے درمیان کسی بھی وقت شروع ہو جائے وہ سنٹرل یورپ اور مڈل ایسٹ دونوں کو اس سلسلے میں خاص طور پر جنگ کا نکتۂ آغاز دیکھتے ہیں۔

○ ...... دو امریکی ماہرین مسٹر "والف" اور "ڈائی سیک" دس سال کے اندر اندر جنگ کا خطرہ دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جنگ روس اور امریکہ کے درمیان ہوگی اور اس میں تقریباً دو کروڑ آدمی مارے جائیں گے۔ ایک اور سائنس دان کا کہنا ہے کہ جو لوگ بچ جائیں گے وہ مرنے والوں پر رشک کریں گے مگر اس سلسلے میں سب سے دلچسپ تبصرہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس برکلے کے سائنس بک ایڈیٹر مسٹر کیلن باچ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"میں یہ پیش گوئی کروں گا کہ مستقبل میں ایٹمی جنگ نہیں ہوگی کیونکہ اگر یہ جنگ ہوئی تو اس کے نتیجے میں کوئی انسان باقی ہی کہاں بچے گا جو مجھے یہ کہہ سکے کہ تم نے غلط پیش گوئی کی تھی"۔

مغرب میں پیش گوئی کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کا رواج بھی عام ہے یہاں تک کہ ہٹلر کے پروپیگنڈا منسٹر گوئبلز نے تو اسے جنگ کا ہتھیار بنانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اہل مغرب کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا نجومی "ناسٹرا ڈیمس" تھا جو آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے ہو گزرا ہے۔ اس کی کتاب "دی پرافیسیز آف ناسٹرا ڈیمس" (ناسٹرا ڈیمس کی پیش گوئیاں) کا پہلا ایڈیشن 1568ء میں شائع ہوا تھا اس وقت سے لے کر اب تک مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں اور ہر دور میں مختلف اہل علم نے اس کی تشریح اور تعبیر کے لئے باقاعدہ شرحیں لکھی ہیں۔ میرے سامنے اس وقت کتاب کا وہ نسخہ ہے جسے "ایرکا چیتھم" نے ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے ناسٹرا ڈیمس فرانس کا رہنے والا تھا اس لئے اصل کتاب فرنچ میں ہے مؤلفہ نے قارئین کی سہولت کیلئے فرنچ کا متن بھی ساتھ ساتھ شائع کر دیا ہے۔ کتاب کی حیران کن باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ سینکڑوں سال پہلے ناسٹرا ڈیمس نے نپولین اور ہٹلر کے نام کے ساتھ ان کے عروج و زوال کی پیش گوئی کی ہے صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ ہٹلر کو وہ "ہسلر" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کی سبھی پیش گوئیاں پوری ہوئی ہیں، بعض غلط بھی ثابت ہوئی ہیں اور بعض ابھی تک چیستان بنی ہوئی ہیں کہ ان کا سر پیر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک پیش گوئی تو ایسی ہے کہ اسے پڑھ کر مغربی دنیا خوف سے کانپنے لگتی ہے خدا کرے وہ جلد پوری ہو جائے۔ کتاب کے پانچویں حصہ کی نمبر 55 پیش گوئی یہ ہے کہ

"عرب کے ایک خوش قسمت ملک میں ایک طاقتور شخصیت پیدا ہوگی جو قانون محمدیؐ کی پابند ہوگی اسپین اور غرناطہ اس کے ہاتھوں فتح ہوں گے اور سمندر کے ارد گرد دوسرے ملک بھی اس کے مطیع فرماں ہو جائیں گے"۔

شرح نگار خاتون نے اس پیش گوئی کی تشریح میں صرف دو سطور لکھی ہیں:

"ناسٹراڈیمس عربوں کے ہاتھوں اسپین اور غرناطہ کو فتح ہوتا دیکھتا ہے جو اٹلی تک اپنی حکومت بڑھالیں گے واضح رہے کہ غرناطہ 1492ء میں مُوروں کے قبضے میں آیا تھا۔"

یہ موقع نہیں کہ ناسٹراڈیمس کی شخصیت اور پیش گوئیوں پر تفصیل سے لکھا جائے۔ عرض یہ کیا جارہا تھا کہ مغربی دنیا میں پیش گوئیوں کو سیاست حتیٰ کہ جنگ تک کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی ایک دلچسپ مثال نازی جرمنی نے فراہم کی جب اس کے پراپیگنڈہ منسٹر نے ناسٹراڈیمس کی پیش گوئیوں کو توڑ مروڑ کر ہٹلر کی فتح یابیوں کا رستہ ہموار کرنے کیلئے لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کرایا۔ قصہ یوں ہے کہ 1939ء میں ایک دن گوئبلز کی بیوی "فراگوئبلز" ناسٹراڈیمس کی کتاب پڑھ رہی تھی کہ بعض ایسی پیش گوئیوں نے اسے چونکا دیا جو ہٹلر پر صادق آرہی تھیں اس نے فوراً اپنے خاوند کو جگایا اور اسے متعلقہ حوالے دکھائے۔ گوئبلز پروپیگنڈے کا بادشاہ تھا اسے ایک منصوبہ سوجھا اس نے کرافٹ نامی ایک نجومی کی خدمات حاصل کیں جس نے ناسٹراڈیمس کی پیش گوئیوں کو بنیاد بنا کر پمفلٹ مرتب کئے ہٹلر کی پروپیگنڈہ منسٹری نے اسے یورپ میں تقسیم کرانا شروع کیا۔ یہ جنگ ایک ایسا نفسیاتی حربہ تھا جس نے مخالفین کے حوصلے پست کرنا شروع کئے برطانیہ میں ناسٹراڈیمس ایک جانا پہچانا نام تھا اور یہاں کے لوگ اسے دنیا کا سب سے بڑا نجومی سمجھتے تھے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ بھی ہٹلر کی فتح کی پیش گوئی کر چکا ہے تو ان کے اعصاب بھی جواب دینے لگے اس پر برطانوی حکومت کو فکر لاحق ہوئی اور اس نے بھی اپنی "سیکریٹ سروس" کے ذریعے سے جوابی پروپیگنڈا کی مہم شروع کی جس پر اس سستے زمانے میں بھی اسی ہزار پونڈ خرچ ہوئے اور اس طرح ہٹلر کو نفسیاتی جنگ میں پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

....

عہد حاضر میں جنگ کی بھی کئی قسمیں ہیں اصل جنگ لڑنے سے پہلے دشمن کو نفسیاتی اور اعصابی مار دی جاتی ہے تاکہ اس کے ذہنی سکون کا شیرازہ بکھر جائے اس کے حوصلے جواب دے جائیں اور اس کے اعصاب اتنے کمزور ہو جائیں کہ وہ پیش آمدہ مشکلات اور مصائب کے تصوّر ہی سے لرزنے لگے۔ مغربی دنیا میں ماہرین کی پیش گوئیوں سے یہ سارے کام لئے جاتے ہیں ان پیش گوئیوں میں ان کی مخفی خواہشات بھی کام کرتی ہیں اور ان کی حکومتوں کے مستقبل کے منصوبے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر بعض اوقات دو ماہرین کی پیش گوئیاں باہم دگر متصادم ہوتی ہیں ہاں ایک میدان ایسا ہے۔ جس میں ان کی پیش گوئیاں عام طور پر یکساں بلکہ متفق علیہ ہوتی ہیں اور وہ مسلم دنیا ہے۔ دنیائے اسلام کی تباہی و بربادی' ان کی آرزو بھی ہے اور ان کا ارادہ بھی' یہی وجہ ہے کہ اٹھتے بیٹھتے وہ اسی کا خواب دیکھتے ہیں "دی بک آف پریڈکشنز" جس کا ذکر گزر چکا ہے اس طرح کی بہت سی پیش گوئیاں اپنے دامن میں رکھتی ہے جن کی نوعیت سیاسی ہے، ہم نمونے کے طور پر اس میں سے چند مثالیں پیش کریں گے تاکہ اہل وطن جان سکیں کہ کسی واقعہ کے ظہور سے پہلے مخصوص ذہنی فضا پیدا کرنے میں ان پیش گوئیوں سے کس طرح کام لیا جاتا

ہے نفسیات کے ایک سابق پروفیسر اور مستقبل کو عریاں دیکھنے کے ایک زبردست دعویدار مسٹر لیری کہتے ہیں۔

ساؤتھ امریکہ' افریقہ' مسلم دنیا' جنوب مشرقی ایشیا اور بھارت اپنے روایتی مذاہب سے مجنونانہ وابستگی کی وجہ سے قحط' بیماریوں اور تشدد کا شکار ہو کر 1981ء اور 1992ء کے دوران ہی ٹکڑے ہو جائیں گے۔ 1992ء تک آسٹریلیا اور شمالی امریکہ کو چھوڑ کر پوری دنیا کمیونسٹوں کے کنٹرول میں آجائے گی۔

مسٹر لیری کے برعکس دو دوسرے "پری ڈکٹرز" (پیش بینوں) مسٹر اموری اور "نوویئز" کی رائے یہ ہے (اور یہ دونوں اصحاب برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں کہ:

1995ء اور 2005ء کے درمیان روس کا شیرازہ اپنے داخلی سیاسی اختلافات کی وجہ سے بکھر جائے گا۔ ان میں سے بعض کے تیل کے ذخائر ختم ہو جائیں گے اور بیشتر نئی کاریں الکحل سے چلنے لگیں گی۔

○ ...... 1990ء سے پہلے پہلے روس کی موجودہ حکومت کا تختہ ایک داخلی خونی انقلاب کے ذریعے الٹ دیا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تبدیلی کمیونسٹ پارٹی میں موجود ایسے عنصر کے ذریعے عمل میں آئے جسے "سوشل ڈیموکریٹک کہا جاتا ہے۔ روس کے بعض حصے مثال کے طور پر یوکرین روس سے الگ ہو کر خود مختار ہو جائیں گے اور مشرقی یورپ کی روسی کالونیاں بھی ان کی تقلید کریں گی"۔

برمنگھم یونیورسٹی میں بین الاقوامی سیاسیات کے ایک سینئر لیکچرر کا کہنا ہے کہ:

○ ...... اسرائیل 1985ء تک ویسٹ بینک اور غازہ کے علاقہ کو رسمی طور پر اپنے علاقہ میں شامل کرلے گا اور 1993ء تک ان علاقوں کے عرب باشندوں کو بھی اسرائیلی شہریت دے دی جائے گی۔

ایک اور مشہور فاضل مسٹر لینی بیجبیل کی پیش گوئی ہے کہ:

○ ...... 1986ء تک کمیونسٹ انقلابی تھائی لینڈ پر قبضہ کرلیں گے البتہ وہ آئینی بادشاہت کو برقرار رکھیں گے۔

○ ...... 1989ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان تیسری جنگ ہو گی جس میں دونوں طرف سے ایٹمی ہتھیار استعمال کئے جائیں گے اور نتیجتاً تمام بڑے بڑے شہر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اسی جنگ کے نتیجے میں مغربی بنگال کی منتخب کمیونسٹ حکومت بھارت سے علیحدگی کا اعلان کر دے گی اور اس طرح یہ علاقہ دنیا کی تیسری بڑی اشتراکی ریاست بن جائے گا۔

افریقی معاملات و مسائل کے ایک ماہر کہتے ہیں کہ:

○ ...... 1982ء اور 1992ء کے درمیان بین الاقوامی واقعات' شرق اوسط کے تغیرات اور اسلام کے اندرونی دباؤ کی وجہ سے شمالی افریقہ کے ممالک میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوں گی جس کی وجہ سے لیبیا' الجزائر' مصر' تیونس اور مراکش کی قیادتیں سخت متاثر ہوں گی۔

اب ذرا ایک روسی پری ڈکٹر کی ذہنی اڑان ملاحظہ ہو۔ مسٹر سلیون کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور

روس کے محکمہ خارجہ اور سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کے تجزیہ نگار رہ چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

○ ...... روس 1983ء تک امریکہ پر ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں واضح برتری حاصل کر لے گا' ڈالر کی قیمت گر جائے گی اور امریکہ میں معاشی اور اقتصادی پریشانی بڑھ جائے گی۔ 1993ء تک روس پوری دنیا پر غلبہ حاصل کر لے گا اور امریکہ ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے تو کیا ایک قوم کی حیثیت سے بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ چین روس سے مصالحت کر لے گا اور نیٹو کا معاہدہ ختم کر دیا جائے گا۔

اب ذرا تل ابیب یونیورسٹی اسرائیل کے ایک پروفیسر اور اسرائیل کے "ادارہ تحقیقات بین الاقوامی امور" کے چیئرمین ڈاکٹر مشکت کی اسرائیلی خواہشات اور ارادوں سے لبریز پیش گوئیاں سنئے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

○ ...... خمینی کے بعد ایران میں جو حکومت قائم ہو گی وہ 1982ء میں کردوں اور دوسری اقلیتوں کے اتحاد 'علیحدگی پسندانہ تحریکوں اور بائیں بازو اور آزاد خیال دو تنظیموں کی جدوجہد کے نتیجے میں شکست کھائے گی ان میں سے بعض عناصر کو امریکہ کی تائید حاصل ہو گی اور بعض کو روس کی۔

○ ...... 1985ء تک لیبیا اور سعودی عرب اپنی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور دونوں ملکوں میں ایک نیا سیاسی جمہوری نظام قائم ہو جائے گا۔

○ ...... 1988ء میں انکشاف ہو گا کہ روس امریکہ پر ایٹمی حملہ کرنا چاہتا ہے اس پر امریکہ پہل کر کے روس کے اہم مراکز پر حملہ کر دے گا جس کے نتیجہ میں دس کروڑ روسی مارے جائیں گے۔

اور سنئے ایران کی تباہی امریکی اور روسی عناصر کی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں نہیں ہو گی تو دوسری آفات ارضی وسماوی ہی سہی۔ ایک اور پری ڈکٹر مسٹر جیمز کارنل کہتے ہیں (اور مجھے یقین ہے کہ یہ بھی یہودی ہوں گے) کہ:

○ ...... 1982ء میں شمالی ایران میں ایک خوفناک زلزلہ آئے گا جو بڑے بڑے شہروں کو تباہ کر دے گا۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ مریں گے مگر حکومت آفت زدگان کی مدد کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکے گی جس کی وجہ سے لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کا تختہ الٹ کر رکھ دیں گے۔ ایک سائیکک خاتون کیچنگز کہتی ہیں کہ:

○ ...... 1984ء میں عراق اور ایران پھر ایک دوسرے پر حملہ کر دیں گے۔

اسرائیل کا آئندہ ہدف

اس سال کے شروع میں حسب معمول بین الاقوامی پریس میں 1981ء کے بارے میں جین ڈکسن کی پیش گوئیاں شائع ہوئیں توان میں ایک پیش گوئی یہ بھی تھی کہ:

"اس سال بھی صدر انور السادات اور وزیراعظم بیگن مصر اور اسرائیل میں دادِ حکومت دیں گے ان کی پوزیشن مزید مستحکم ہو گی اور وہ شرق اوسط میں قیام امن کی کوششوں میں کامیاب ہوں گے"۔

میں نے اس وقت تواس پیش گوئی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی بظاہر حالات ہی ایسے تھے کہ مصر اور اسرائیل کی قیادت میں کسی فوری تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھالیکن جب دو چار ماہ بعد وزیراعظم بیگن کی حکومت اسرائیلی عوام میں غیر مقبول ہو گئی اور اسے قبل از وقت عام انتخابات کا اعلان کرنا پڑا تواس پیش گوئی سے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں جین ڈکسن کی تحریروں کو ہمیشہ بڑے غور سے پڑھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک یہ امریکہ کی با اثر سیاسی لابی کا ذہنی رخ جاننے کے لئے بیرومیٹر کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ با اثر لابی مصر میں صدر سادات اور اسرائیل میں بیگن کو برسراقتدار رکھنا چاہتی ہے مگر اسرائیل میں بیگن کی بڑھتی ہوئی غیر مقبولیت اور اس کی طرف سے انتخابات کے غیر متوقع اعلان نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ دوسری طرف اسرائیل میں اپوزیشن کے لیڈر مسٹر پیرس اس تیزی سے ابھرے کہ عام طور پر انہیں مستقبل کا وزیراعظم تسلیم کیا جانے لگا۔ برطانیہ بلکہ خود امریکہ تک کے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں نے اسی

حیثیت سے ان کے انٹرویو نشر کیے۔ اندرونی جائزوں کے جو اعداد و شمار اسرائیلی پریس میں شائع ہوئے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیگن اس مرتبہ حکومت نہیں بنا سکیں گے بلکہ کیا عجب اگر وہ اپنی سیٹ بھی کھو بیٹھیں۔ اندریں حالات میں حیران تھا کہ بیگن سے متعلق ڈکسن کی پیش گوئی کیسے صحیح ثابت ہوگی اور اگر یہ صحیح ثابت نہ ہوئی تو پھر میری یہ رائے کہاں تک درست ہوگی کہ مسز ڈکسن کی سیاسی پیش گوئیاں ایک مؤثر امریکی لابی کی خواہش بلکہ کوششوں کا عکس ہوتی ہیں۔

....

ابھی میری الجھن قائم تھی کہ شرق اوسط کی سیاست میں عجیب و غریب اتار چڑھاؤ ہونے لگا سب سے پہلے لبنان میں جھڑپیں شروع ہوئیں، بیگن نے فلسطینی مجاہدوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا، شام نے اپنی حدود میں میزائل نصب کرنے کا فیصلہ کیا تو بیگن نے اسے بھی اسرائیل کے وقار کا مسئلہ بنا لیا، کھچاؤ بڑھ گیا اور جنگ کے شعلے بھڑکتے نظر آئے تو امریکہ کے صدر ریگن کے سفیر خاص مسٹر حبیب اسرائیل اور عرب ملکوں کے چکر کاٹنے لگے ان سارے ایام میں بیگن کا لب و لہجہ سخت سے سخت ہوتا گیا اور اسرائیلی عوام میں وہ ایک مرتبہ پھر مرد آہن کی حیثیت سے مقبول ہونے لگے۔ ابھی یہ جذباتی فضا برقرار تھی کہ صحرائے سینا میں صدر سادات اور وزیر اعظم بیگن کی ملاقات طے گئی۔ صدر سادات کچھ ہی عرصہ پہلے اعلان کر چکے تھے کہ اسرائیل سے ان کی آئندہ بات چیت اب انتخابات کے بعد منتخب وزیر اعظم سے ہوگی۔ اسرائیل کے الیکشن 30 رجون کو ہو رہے ہیں اب اس میں دیر ہی کیا تھی مگر اچانک انہوں نے فیصلہ بدلا اور وزیر اعظم بیگن سے مذاکرات کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ بیگن کا سیاسی قد بڑھانے کی دوسری تدبیر تھی اور اسرائیل کی داخلی سیاست میں اس کے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوئے۔ صاف نظر آنے لگا کہ آئندہ انتخابات میں کامیابی ایک دفعہ پھر انہی کے قدم چومے گی بات یہیں تک رہتی تب بھی جین ڈکسن کی پیش گوئی کے صحیح ثابت ہونے میں کوئی کسر نہ تھی لیکن اچانک بیگن نے بغداد کی ایٹمی تنصیبات پر بمباری کر کے دنیا بھر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اسرائیل سے بغداد کا فضائی فاصلہ چھ سو میل ہے درمیان میں اردن اور سعودی عرب کا علاقہ پڑتا ہے اسرائیل کے نو سے لے کر بیس جہاز یہ ساری مسافت طے کر کے بغداد پہنچے، ایٹمی تنصیبات کی تباہی میں انہیں صرف بارہ سیکنڈ لگے۔ بمباری کے بعد وہ آرام سے اسرائیل واپس پہنچے اور خود وزیر اعظم بیگن نے اعلان کیا کہ اسرائیل نے بغداد پر بمباری کر کے اس کے ایٹمی پلانٹ کو تہس نہس کر دیا ہے مجھے یقین ہے کہ اگر اسرائیل خود دنیا کو یہ خبر نہ سناتا تو بغداد کو یہی خبر نہ ہوتی کہ حملہ کیا کس نے ہے، کیا عجب کہ ایران کی اسلامی حکومت پر ہی یہ الزام لگایا جاتا مگر بیگن کو تو الیکشن جیتنا تھا وہ اپنے ووٹرز سے یہ کامیابی کیسے چھپاتے، چنانچہ ان کے اعلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی مقبولیت یک لخت نکتۂ عروج کو پہنچ گئی اب ان کے مدمقابل مسٹر پیرس کو اپنی اسمبلی کی سیٹ کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔ بیگن نے اپنے نام ان کا وہ خط شائع کر دیا ہے جس میں انہوں نے اسرائیل کی طرف سے بغداد پر حملہ کرنے کے منصوبے سے اختلاف ظاہر کیا تھا۔

بغداد پر ایک زمانے میں تاتاریوں نے حملہ کیا تھا تو شیخ سعدیؒ نے وہ مشہور مرثیہ کہا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ۔

آسمان را حق بوَد گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ معتصم باللہ امیر المومنین!

خدا جانے اگر آج شیخ سعدیؒ زندہ ہوتے تو بغداد پر اسرائیل کے اس حملے کے بعد کیا کیا خون کے آنسو روتے۔ تاتاریوں نے مسلمانوں کا خون بہایا مگر وہ آگے چل کر خود اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اس سے بڑھ کر "معتصم باللہ امیر المومنین" کے زوال کا بدلہ اور کیا ہو سکتا تھا مگر آج تو بغداد پر اس دشمن نے حملہ کیا ہے جس کی اسلام سے عداوت کبھی ختم نہ ہو گی۔ اسلام سے اس کی ازلی اور ابدی دشمنی پر خود قرآن نے شہادت دی ہے اور اسرائیل سے بدلے لے گا بھی کون؟ کیا وہ عالم اسلام جو پندرہویں صدی ہجری کے جشن منانے پر اربوں روپے برباد کر رہا ہے؟ کیا وہ مسلمان ممالک جن کی زبان اسلامی اتحاد کے نغمے الاپ رہی ہے مگر جن کے دل ایک دوسرے سے کٹے اور پھٹے رہتے ہیں؟ ہمیں اگر دلفریب باتیں اور خوشنما نعرے سننے کی عادت ہو گئی ہے تو ہوتی رہے اس سے حقائق میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، مسلمان ملکوں کی کانفرنسوں اور وزیروں کے اجلاسوں سے مست اور مطمئن ہونے والی پاکستانی قوم کو کون بتائے کہ بغداد پر اس حملہ سے وہ تو یقیناً خون کے آنسو رو رہی ہے مگر اور کس کو صحیح معنوں میں اس کا دکھ ہوا ہے؟ عراق کی حکومت اور اس کے نظریات جیسے بھی ہیں اس سے بحث نہیں سوال تو پورے عالم اسلام کی غیرت اور حمیّت کا ہے، اس غیرت و حمیّت کا مظاہرہ کس نے کیا ہے؟ ہم لاکھ ڈھول پیٹتے رہیں (اسلامی نظام، اسلامی نظام کے نعروں کی وجہ سے) کہ دنیا بھر میں اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے مگر دنیا تو اندھی نہیں ہے وہ دیکھ رہی ہے کہ دو مسلمان ملک عراق اور ایران آٹھ ماہ سے برسرپیکار ہیں اور عالم اسلام ان میں صلح تک نہیں کرا سکا۔ جانتے ہیں آپ اس جنگ میں اب تک فریقین کا کتنا نقصان ہو چکا ہے؟ ابھی حال ہی میں سنڈے ٹائمز (24 مئی) نے اس موضوع پر ایران کے مشہور اور باخبر صحافی جناب امیر طاہری کا ایک دل ہلا دینے والا جائزہ پیش کیا ہے۔ جس کے مطابق اب تک اس جنگ میں پچاس ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں، ڈیڑھ لاکھ آدمی زخمی ہوئے ہیں جن میں زیادہ تعداد شہریوں کی ہے۔ بیس لاکھ بے گھر ہو چکے ہیں مالی نقصان اسی ہزار کروڑ روپے کا ہوا ہے اور ابھی کچھ معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کب تک چلے۔

....

ایران تو اسرائیلی حملے سے اس لئے خوش ہے کہ عراق ایٹم بم بنانے کے قابل ہوتا تو یہ بم اسی پر برسائے جاتے۔ خود عالم عرب میں بھی اِلا ماشاء اللہ ایک آدھ حکومت ہی کو حقیقی معنوں میں اس کا دکھ ہوا ہے۔ برادران وطن معاف فرمائیں اگر ڈپلومیسی کو بالائے طاق رکھ کر میں یہ عرض کروں کہ خلیج کی مسلمان ریاستیں اندر سے اس لئے مطمئن ہیں کہ وہ ایک مضبوط عراق کو خود اپنے لئے خطرہ محسوس کرتی ہیں۔ شام

اسرائیل کا مدِ مقابل ہے مگر عراق سے اس کی دشمنی اسرائیل سے زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں، خود عراق نے اس حملہ سے کتنا سبق سیکھا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے اسرائیلی حملہ میں گٹھ جوڑ کا الزام ایران پر لگایا ہے۔ حیرت بالائے حیرت کہ لیبیا جیسا سامراج واسرائیل دشمن ملک بھی ابھی تک مہر بہ لب ہے وجہ سمجھ میں یہی آتی ہے کہ صدام دشمنی میں وہ بھی شام کا ہم نوا ہے مگر سوال تو اس مرحلہ پر شخصیات کا نہ تھا' اسلام اور عالم اسلام کا تھا خود اپنے ہی جب اتنے بڑے سانحہ پر یہ رد عمل دکھائیں گے تو غیروں کو کیا پڑی ہے کہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑائیں' جیمن ڈکسن کے ملک نے عالم اسلام کا یہ رنگ دیکھ کر اگر اسرائیل کو اس امن سوز حرکت پر صرف اتنی سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ اس کو دیئے جانے والے چار جنگی جہاز چند دنوں کے لئے روک لئے گئے ہیں تو اس پر تعجب کیسا؟ اس عالم اسلام کی کسی بڑی طاقت کی نظر میں اہمیت ہی کیا ہے۔ جس کی باخبری اور جنگی صلاحیت کا عالم یہ ہو کہ دشمن کے جہاز دو مسلمان ملکوں کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سینکڑوں میل کا سفر کر کے آئیں اور اطمینان سے تباہی مچا کر ٹہلتے ہوئے واپس تشریف لے جائیں۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر کسی مسلمان ملک کو اس حملہ کا حقیقی صدمہ ہوا ہے تو وہ پاکستان ہے مگر صرف صدمے سے کیا ہو گا اصل بات تو یہ جاننے کی ہے کہ اسرائیل کی بمباری کا آئندہ ہدف خود پاکستان بننے والا ہے اس کے لئے فضا اسی وقت سے بنائی جارہی ہے جب ایک سیاستدان نے پاکستان کے ری پراسیسنگ پلانٹ کو اسلامی بم کا نام دیا تھا ہم مردہ نواز بھی ہیں اور جذباتی بھی' کسی کی تعریف کریں تو اس سے اختلاف نہیں کر سکتے' کسی سے اختلاف کریں تو اس کی تعریف نہیں سن سکتے۔ وہ سیاستدان بے حد ذہین تھا۔ قابل اور تجربہ کار تھا میں نے اسے "دیدہ ور" کہا میں آج تک اس پر قائم ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی مسئلہ میں اس سے اختلاف ہی نہ کیا جائے ہم نے تو اس کی زندگی میں بھی اس سے کتنے ہی مسائل پر اختلاف کیا' کبھی کابینہ کے اجلاسوں کی مفصل کارروائی سامنے آئے تو اس کی تصدیق ہو یا پھر جب میری "دستاویزی" یادداشتیں چھپیں گی تو قارئین اندرونی حقائق سے آگاہ ہوں گے۔ وہ بلاشبہ بڑا آدمی تھا مگر بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا جب جیل سے بھٹو مرحوم کی بعض تحریریں سمگل کر کے کتابی صورت میں بھارت میں شائع کرائی گئی تھیں' اپنی اسی کتاب میں بھٹو مرحوم نے پاکستان کے زیر تخلیق ایٹم بم کو "اسلامی بم" کا نام دیا ہے۔ حکومت پاکستان (اور اس میں خود ان کا زمانہ اقتدار بھی شامل ہے) برابر اس کی تردید کرتی رہی ہے کہ ہم ایٹم بم نہیں بنارہے مگر اس کتاب میں یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ یہ نام نہاد "اسلامی بم" کب تک تیار ہو جائے گا۔

"اسلامی بم" کے اس فلسفے پر بھارت تو جو واویلا مچاتا وہ متوقع ہی تھا اس پر اسرائیل کی تلملاہٹ اور بے چینی بھی ناقابل فہم نہ تھی۔ "اسلامی بم" کے اس ہوّے کو مزید ہوا بی بی سی کی اس فلم نے دی جس کی بے شمار کاپیاں خود پاکستان کے خوشحال گھرانوں میں موجود ہیں۔ اس فلم میں بعض پاکستانیوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہاں ہم ایٹم بم بنارہے ہیں اور اس کا سہرا فلاں شخص اور فلاں پارٹی کے سر ہے۔ بی بی سی ٹیلی ویژن کی یہ

تفصیلی فلم اسرائیل میں اب تک بار بار دکھائی جا چکی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسرائیل کھلم کھلا پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کے عزائم کا اظہار کر رہا ہے۔ لندن کے مشہور اخبار گارڈین (9 ر جون) کی اطلاع کے مطابق اقوام متحدہ کے مندوب مسٹر یہود ابلم نے 27 ر مئی 80ء کو سیکرٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائیم کے نام ایک مراسلہ بھیجا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"پاکستان میں خفیہ طور پر 1980ء سے پلوٹینیم ری پراسیسنگ کا کام جاری ہے جو اسے 1981ء (یعنی اسی سال کے وسط تک) ایٹمی دھماکہ کرنے کے قابل بنا دے گی"۔

خود وزیر اعظم بیگن نے اس حملے کے بعد بڑے طمطراق سے تل ابیب میں جو پریس کانفرنس کی ہے اس میں واضح طور پر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اسرائیل پاکستان کو کبھی ایٹمی طاقت نہیں بننے دے گا۔ خود گارڈین نے جو مغربی دنیا کا بڑا با اثر اور کثیر الاشاعت اخبار ہے اور اپنی اسرائیل نوازی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اس موضوع پر 9 ر جون 80ء کو جو اداریہ لکھا ہے اس میں گویا اسرائیل کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ عراق کے بعد لگے ہاتھوں پاکستان کی بھی خبر لے لے۔ گارڈین اسرائیل کے اس جارحانہ اقدام کی مدافعت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لیکن یہ طریق کار آخر کہاں جا کر رکے گا۔ پاکستان تقریباً یقینی طور پر بم بنا رہا ہے قبل اس کے کہ اسرائیل پشاور پر فضائی حملہ کرنے پر مجبور ہو جائے کیا پاکستان کو ایٹم بم بنانے سے رک جانے کی ترغیب نہیں دی جا سکتی؟"۔

اشارات بہت صاف اور روشن ہیں پاکستان کے اپنے ہی سیاسی حلقے ڈھائی تین سال سے برابر یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ ہم ایٹم بم بنا رہے ہیں، اسرائیل کا نمائندہ اقوام متحدہ میں رپٹ لکھا رہا ہے کہ پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے اور وہ اسی سال کے وسط میں ایٹمی دھماکہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ وزیر اعظم بیگن فرماتے ہیں کہ اسرائیل پاکستان کو ایٹمی دھماکہ نہیں کرنے دے گا اور یہ حملہ پشاور پر ہو گا۔ اب یہ کوئی پہیلی تو نہیں کہ بوجھی نہ جا سکے۔ نوشتۂ دیوار سامنے ہے۔ حملہ اسرائیل کی طرف سے براہ راست ہو یا بالواسطہ پاکستان کو آئندہ ادوار میں شدید بیرونی خطرہ لاحق ہے اس کی سرحدیں کابل اور بھارت کی طرف سے تو غیر محفوظ تھیں ہی بدقسمتی سے بوجوہ ایران بھی ہمارا کچھ ایسا زیادہ بہی خواہ نہیں رہا اب اس صورتحال میں ہمیں کرنا کیا چاہئے تھا اور ہم کر کیا رہے ہیں اس پر ذاتی مفادات اور جماعتی و گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کالعدم رہنما جوڑ توڑ اور کالعدم اتحاد کے چکر میں ہیں مستحکم جمہوری عوامی ادارے ناپید ہیں، قوم انتہا پسندی کے دو پاٹوں میں پس رہی ہے۔ ایک طرف مٹھی بھر لوگ نفس اسلام سے بیزار ہیں اور اندرونی و بیرونی ہر طرح کی سازش سے ملک کا تیا پانچہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ٹولہ مذہب کا اجارہ دار بن کر نئی نسل کو اسلام کی علم پرور اور روشن تعلیمات سے بے گانہ کرنے میں مصروف ہے۔ نوے فیصد اکثریت مسلک اعتدال پر گامزن اور دونوں انتہاؤں کے خلاف ہے مگر یہ غیر مؤثر اور غیر منظم

ہے اور اب تو یہ ملکی حالات سے آہستہ آہستہ غیر متعلق اور بے گانہ ہوتی جارہی ہے اس طبقے سے بات کرو تو یہ 'ماراچہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خررفت' کے مقولے پر کاربند نظر آتی ہے۔ ایسے میں ہماری منزل کیا ہو گی کون جانے۔

مرا در زیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

(19/ جون 1981ء)

حقیقت اور افسانے کے درمیان

موجودہ دور میں یوں تو اور بھی بہت سی شخصیات ہیں جنہیں "علم نفس" کا ماہر اور "پیش گو" اور "پیش بین" مانا جاتا ہے مگر اس میدان میں واشنگٹن کی ایک خاتون "جین ڈکسن" کو جو شہرت ملی، اس کا "ہاروسکوپ کالم" ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تین سو سے زائد اخبارات و جرائد میں شائع ہوتا ہے اور اس کے لیکچر سننے کے لئے اتنے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں کہ سیاسی رہنماؤں کے جلسہ ہائے عام بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ "وائٹ ہاؤس" تک اس کی رسائی ہے، کئی مشہور سینیٹر اس کے حلقہ احباب میں شامل ہیں اور عام شہریوں پر بھی اس کا اتنا اثر ہے کہ لوگ ریس کے گھوڑوں پر شرط لگانے سے پہلے اس کا مشورہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جین ڈکسن کی پیش گوئیاں سال بسال بڑے اہتمام سے دنیا بھر کے پریس میں جگہ پاتی ہیں اور کبھی کبھی ان کے بعض حصے ہندو پاک میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اخبارات بین بھی اس کے نام سے واقف ہیں اس کے بعض مداحوں نے اس کی شخصیت اور فن پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں "رتھ منٹگمری" کی کتاب "اے گفٹ آف پرافیسی" بہت مشہور ہے۔ خود جین ڈکسن کی اپنی دو کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ "مائی لائف اینڈ پرافیسیز" میں اس نے اپنی زندگی اور پیش گوئیوں کے بارے میں خود اپنے الفاظ میں مؤلف کو املا دی ہے اور "یسٹرڈے، ٹوڈے اینڈ فار ایور" میں اس نے ستاروں کے اثرات اور مختلف تاریخوں میں پیدا ہونے والے لوگوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ جین ڈکسن کی کتابوں، اس کی پیش گوئیوں اور

اس کی شخصیت پر چھپنے والی تحریروں کو میں نے غور اور دلچسپی سے پڑھا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان میں کچھ سچائی بھی ہے لیکن بنیادی طور پر یا تو وہ ایسی مذہبی مبلغہ ہے جس کے وعظ و تبلیغ کے ڈانڈے وہم پرستی سے جا ملتے ہیں یا سامراجی سیاست کی ایک ایسی آلۂ کار جس کی آڑ اور اوٹ میں ہونے والے واقعات کے لئے ذہنی فضا تیار کی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کی پیش گوئیوں کا اعتبار قائم کرنے کے لئے اسے کچھ منصوبوں کی پیشگی ہی اطلاع دے دی جاتی ہے' امریکہ کی داخلی سیاست میں بھی اس کی اپنی ذاتی پسند ناپسند' اس کی پیش گوئیوں کا معیار ہے۔ ایک زمانے میں صدر نکسن اس کے پسندیدہ صدر تھے انہیں اس نے امریکہ کے لئے آخری "شعاع امید" قرار دیا تھا لیکن غلبۂ محبت کی وجہ سے وہ اس زوال کو نہ دیکھ سکی جو واٹر گیٹ کی صورت میں نکسن کا مقدر بن چکا تھا۔ جین ڈکسن کے مخالفین اور ناقدین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی پیش گوئیاں مرتب کرنے کا کام باقاعدہ ایک برین ٹرسٹ کرتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے بعض طاقتیں اسے فنڈز بھی مہیا کرتی ہیں چنانچہ "بک آف پری ڈِکشنز" میں خود جین ڈکسن کے بارے میں یہ دلچسپ پیش گوئیاں کی گئی ہیں کہ 1980ء اور 1990ء کے درمیان اس کی پیش گوئیاں دنیا بھر میں شوق سے پڑھی جائیں گی مگر اسی دوران یہ انکشاف ہو گا کہ اس کی پیش گوئیاں لکھنے کا کام اہل قلم کی ایک ٹیم کرتی ہے اور 2000ء تک وہ ایسی سازش میں ملوث پکڑی جائے گی جس میں بیرونی سرمایہ کاری کا بھی دخل ہو گا۔

ان الزامات کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے اس معاملے میں تو قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اس کی شخصیت اور پیش گوئیوں کا جو تجزیہ ہم نے کیا ہے اس کے پیش نظر تین باتوں سے انکار ممکن نہیں۔ نمبر ایک یہ کہ اس کی بعض پیش گوئیاں حیرت انگیز حد تک صحیح ثابت ہوئی ہیں نمبر دو یہ کہ مذہبی طور پر وہ سخت متعصب اور توہم پرست ہے اور نمبر تین یہ کہ اس کی پیش گوئیوں کو سیاسی' اعصابی اور نفسیاتی جنگ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور ہمیں اس کی بعض پیش گوئیوں کو خطرے کی گھنٹی سمجھنا چاہئے۔

....

اس کی جو پیش گوئیاں صحیح ثابت ہو چکی ہیں ان کی تفصیل منگمری نے اپنی کتاب "اے گفٹ آف پرافیسی" میں دی ہے اور اس کے ناقدین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ پیش گوئیاں ان واقعات کے رونما ہونے سے پہلے شائع ہو چکی تھیں اس لئے ان کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔

1944ء میں ڈکسن نے امریکی صدر روز ویلٹ کے سامنے یہ پیش گوئی کی تھی کہ چین کمیونسٹ ہو جائے گا اور ہمارے لئے بہت بڑا درد سر ثابت ہو گا اس وقت روز ویلٹ نے اس سے اتفاق نہ کیا لیکن تین سال بعد واقعات نے ثابت کر دیا کہ ڈکسن کی پیش گوئی صحیح تھی۔

○ ...... 1945ء میں اس نے ہندوستان کی آزادی اور اس کی تقسیم کی پیش گوئی کی تھی اور 1947ء کے موسم گرما میں چھ ماہ قبل ہی اس نے بتا دیا تھا کہ مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا جائے گا۔

○...... 1961ء میں اس نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ہیمر شولڈ کے باڈی گارڈ کو منع کیا کہ وہ ان کے ساتھ طیارے میں سفر نہ کرے کیونکہ یہ جہاز تباہ ہو جائے گا چنانچہ یہی ہوا اور مسٹر ہیمر شولڈ ستمبر ہی میں ایک ہوائی سفر کے دوران طیارے کی تباہی کے نتیجے میں ہلاک ہو گئے۔

○...... اسی طرح اس نے صدر جان ایف کینیڈی کے ایک قریبی دوست مسٹر جیمز کا کہنا ہے کہ ڈکسن نے 13 ر ستمبر 1967ء کو ایک ملاقات میں ان خدشات کا اظہار کر دیا تھا اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خود رابرٹ سے ملنا چاہتی ہے۔ جنوری 1968ء میں اس نے ایک بار پھر بعض ممتاز امریکیوں کے اجتماع میں یہ پیش گوئی کی کہ رابرٹ کینیڈی کبھی صدر نہیں بن سکیں گے بلکہ وہ اسی جون میں کیلیفورنیا میں قتل کر دیئے جائیں گے۔ مئی 68ء میں اس سے بھی زیادہ حیران کن واقعہ ہوا۔ ڈکسن لاس اینجلز کے ایک ہوٹل میں لیکچر دے رہی تھیں، سامعین میں سے کسی نے سوال کیا "کیا بابی امریکہ کے صدر بنیں گے؟"۔

(بابی رابرٹ کینیڈی کا پیٹ نام تھا) ڈکسن نے جواب دیا "نہیں کبھی نہیں کیونکہ اسی ہوٹل میں ان کے ساتھ ایک المناک حادثہ ہو گا"۔ مسٹر کینیڈی اگلے ہی ہفتے اس ہوٹل میں اپنی صدارتی مہم کے سلسلے میں ایک جلسے سے خطاب کرنے والے تھے چنانچہ یہی ہوا اسی ہوٹل کے اجتماع میں انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

....

کہا جاتا ہے کہ جین ڈکسن بیداری میں آنے والے دور کی جھلکیاں دیکھتی ہے اسے اس سلسلے میں بعض آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ آوازیں الہامی ہیں، پندرہویں صدی عیسوی میں فرانس کی "جون آف آرک" نے بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے دعوے کئے تھے۔ اسے تو حضرت جبریلؑ اور میکائیل بھی نظر آتے تھے یہ الگ بات ہے کہ چرچ نے باقاعدہ عدالت قائم کر کے اسے چڑیل قرار دیا اور پھانسی پر لٹکا دیا مگر اب تو جمہوریت اور روشنی کا زمانہ ہے (خود فرانس نے بھی انیسویں صدی سے جون آف آرک کو شہید اور قومی ہیروئن کا درجہ دے دیا ہے اب اس کے سینکڑوں مجسمے فرانسیسی گرجوں میں نصب ہیں) اس آزادی کے زمانہ میں کسی کے دعویٰ الہام سے کسی کو تعرّض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جین ڈکسن کی ایک اور پیش گوئی جس کا بڑا چرچا ہوا وہ صدر کینیڈی سے تعلق رکھتی ہے اور ڈکسن کا کہنا ہے کہ اس واقع کی جھلکیاں سب سے پہلے اس نے 1952ء میں واشنگٹن کے ایک گرجے میں حضرت مریم کے مجسمے کے سامنے دیکھی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ دھند میں لپٹا ہوا وائٹ ہاؤس اس کی نگاہوں کے سامنے ہے اس پر 6-9-1 کے ہندسے لکھے ہیں پھر اس نے ایک طویل القامت نیلی آنکھوں والے خوبصورت نوجوان کو دیکھا اس کے بال بھورے تھے وہ اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ اسے ایک آواز سنائی دی:

"یہ خوبصورت نوجوان ڈیموکریٹ پارٹی سے تعلق رکھتا ہے یہ 1960ء میں

امریکہ کا صدر منتخب ہو گا اور ابھی اس کے عہدے کی میعاد ختم نہیں ہو گی کہ اسے قتل کر دیا جائے گا"۔

ڈکسن نے 1956ء میں ایک امریکی صحافی مسٹر جیک اینڈرسن کے سامنے اپنے اس تجربے کا ذکر کیا جس نے اسے "پریڈ میگزین" میں شائع کر دیا۔ اکتوبر 1963ء میں اس نے دیکھا کہ یک لخت کالے ہاتھ برآمد ہوئے اور انہوں نے لنڈن۔ جانسن کے دروازے کے باہر اس کے نام کی پلیٹ اتار دی۔ لنڈن جانسن ان دنوں امریکہ میں نائب صدر کے عہدے پر فائز تھے۔ ڈکسن نے صدر کینیڈی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ صدر کینیڈی ان معاملات میں پیش گوئیوں وغیرہ کے قائل نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ جو ہونا ہے سو ہونا ہے یہاں تک کہ 22ر نومبر 1963ء کا دن آ گیا۔ اس دوپہر ڈکسن ایک مقامی ہوٹل میں خواتین کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ یہ دو خواتین کہتی ہیں کہ ڈکسن کھانے کے دوران سخت بے چین تھی اس کا کہنا تھا کہ آج صدر کے ساتھ کوئی خوفناک حادثہ پیش آنے والا ہے ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہوٹل کا آرکسٹرا رک گیا اور کسی نے اعلان کیا:

"اطلاع ملی ہے کہ ابھی ابھی کسی نے صدر پر گولی چلانے کی کوشش کی ہے"۔

ڈکسن نے کہا "نہیں بات یہ نہیں کسی نے صدر کو قتل کر دیا ہے تم ابھی سنو گی کہ وہ قتل ہو چکے ہیں"۔

یہ ٹھیک ہے کہ کینیڈی برادران کے قتل کی پیش گوئی بعض اور ماہرین علم نفس (سائیکک) نے بھی کی ہے۔ ان میں امریکہ کے مشہور سائیکک "ایلن وان" کا نام بھی شامل ہے۔ ایلن وان' ڈکسن کے بعد دوسرا نام ہے جسے اس فن میں عالمی شہرت حاصل ہے۔ پیش گوئیوں سے بھی زیادہ اس کی ریسرچ کا میدان یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے اتفاقی واقعات حقیقت میں اتفاقات پر مبنی نہیں ہوتے یہ اپنے اندر بڑے معنی خیز اشارات رکھتے ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو زندگی کچھ سے کچھ ہو سکتی ہے۔ اسے تقدیر کا کرشمہ بھی کہہ سکتے ہیں' ان "بامعنی اتفاقی واقعات" کے لئے اس نے باقاعدہ ایک علمی اصطلاح وضع کی ہے جسے "سن...... کرانے سٹی" کہتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اس نے 151 واقعات کے حوالے سے اپنی تحقیقات کا نچوڑ "ان کریڈیبل کوان سی ڈینس" (ناقابل یقین اتفاقات) کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ انہی "ایلن وان" نے بھی اپنی کتاب "پیٹرنز آف پرافیسی" میں اپنے ایک خواب کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے دیکھا کہ وہ مشہور اخبار "انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون" پڑھ رہا ہے جس کی ایک آٹھ کالمی سرخی میں رابرٹ کینیڈی کے قتل کی خبر دی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس پر انہوں نے نیویارک میں ایک ریسرچر کو خط لکھا کہ وہ رابرٹ کو اس پر متنبہ کر دے مگر اس انتباہ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

کینیڈی برادران کے قتل کی ان پیش گوئیوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ پیش گوئیاں واقعہ سے پہلے کی نہیں واقعہ کے بعد کی ہیں۔ مثال کے طور پر جین ڈکسن کے بارے میں "واشنگٹن پوسٹ" نے لکھا تھا کہ ڈکسن کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس نے وقت سے پہلے یہ پیش گوئیاں کی تھیں اس پر ڈکسن نے اخبار کو اپنی شہرت کو نقصان پہنچانے کے عوض گیارہ ملین ڈالر کا ہرجانہ ادا کرنے کا نوٹس دیا۔ بات عدالت تک پہنچی مگر معلوم ہوتا ہے اخبار اور ڈکسن میں عدالت سے باہر ہی کوئی سمجھوتہ ہو گیا اور اس طرح اس الزام کی صحت اور عدم صحت کا ثبوت نہ مل سکا۔

قتل کی ان پیش گوئیوں کی مذہبی توجیہہ یہ ہوگی کہ تقدیر مُسلّم ہے ہر واقعہ پہلے سے لکھا جا چکا ہے یہیں سے انسان کی بندگی اور لاچارگی اور خدا کے وجود اور قدرتِ لامحدود کا سراغ ملتا ہے۔ مستقبل کے ان واقعات پر وہ جب چاہے جسے چاہے باخبر کر دے کوئی اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا۔ انسان کو اختیار عطا ہوا ہے مگر "جبر" کا ایک عنصر بھی برابر اس کی زندگی میں شامل ہے۔ ہماری بات بعض روشن خیالوں اور دانشوروں کو بری لگے تو ہم آئن سٹائن کا حوالہ دیں گے جس نے "لاء آف ایٹرنٹی" (قانون ازلیت) کا نظریہ پیش کیا ہے اس کے نزدیک مستقبل پہلے سے موجود ہے۔ جو مذہبی حوالے سے نہیں مغربی علم و دانش کے حوالے سے مزید تفصیلات چاہتے ہوں وہ میکس گنتھر کی کتاب "دی رنگ فیکٹر" (مطبوعہ میکملن نیویارک) کا مطالعہ کر لیں۔ مذہبی اور سائنسی توجیہات کے علاوہ ایک زاویۂ نظر ان پیش گوئیوں کو سیاسی انداز میں دیکھنے کا بھی ہے ان پیش گوئیوں میں سیاسی عوامل بھی کار فرما ہو سکتے ہیں اور اگر کینیڈی برادران سے متعلق پیش گوئیوں کو سیاسی محرکات پر مبنی پیش گوئیاں قرار دینا مشکل ہو تو جین ڈکسن کی بعض دوسری پیش گوئیاں تو ضرور ایسی ہیں جنہیں اس کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

....

(25ر جون 81ء)

جین ڈکسن کی تازہ پیش گوئیاں

مشہور عالمی پیش گو جین ڈکسن کا نام پاکستان کے اخبار بین حلقوں کے لئے نیا نہیں، خود اس کالم میں اس کی شخصیت اور بعض تصانیف کا تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے۔ سال کے سال وہ دنیا کے مختلف ممالک اور رہنماؤں کے بارے میں پیش گوئیاں کرتی اور عالمی پریس کی شہ سرخیوں کا موضوع بنتی ہے۔ اس کے بارے میں عمومی تاثر یہی ہے کہ وہ ہونے والے واقعات کو پہلے ہی سے دیکھ لیتی ہے، حالانکہ دیکھا جائے تو یہ تاثر محض اس کی بلند بانگ شہرت سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے ورنہ واقعات و حقائق اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ بنیادی طور پر وہ ایک عیسائی مبلغہ ہے اور اپنی کتابوں کے ذریعے بڑے پرجوش اور سرگرم طریقے سے عیسائیت کی تبلیغ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی اس خوش عقیدگی کے زیر اثر بعض اوقات وہ بڑی ہی دلچسپ پیش گوئیاں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ کہتی ہے کہ آنے والے سالوں میں روس مکمل طور پر عیسائیت کا حلقہ بگوش ہو جائے گا اور 2000ء میں چینی اور منگول فوجی دستے مڈل ایسٹ پر حملہ کریں گے۔ یہ لڑائی دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر لڑی جائے گی اور یہ مغرب کے خلاف مشرق کی جنگ ہوگی۔

جین ڈکسن کی مذہبی پیش گوئیوں میں سب سے دلچسپ پیش گوئی دجال کی ولادت سے متعلق ہے۔ دجال دجل سے نکلا ہے یعنی زبردست مکار اور دھوکہ باز' عیسائی اور مسلمان دونوں مانتے ہیں کہ قیامت سے قریب یہ ایک زبردست فریبی طاقت ہوگی۔ سالوں کا سفر دنوں اور مہینوں کا گھنٹوں میں طے

کرے گی، مصنوعی بارش برسائے گی، اس کی ایک آنکھ ہو گی یعنی مادہ پرستی کی آنکھ، روحانیت سے یہ کاملاً عاری ہو گی۔ جین ڈکسن رائج الوقت تصورات کے مطابق اسے ایک انسانی وجود مانتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ شخصیت چند سال پہلے شرق اوسط میں پیدا ہو چکی ہے اس سلسلے میں اپنی کتاب "مائی لائف اینڈ پرافیسنر" میں اس نے اپنا ایک دلچسپ کشف بیان کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ:

"2 ر فروری 63ء سے عجیب و غریب سلسلہ واقعات پیش آنا شروع ہوا۔ شام کو روزانہ بتیاں بجھ جاتیں اور میرے کمرے میں اندھیرا سا چھانے لگتا، لائٹ کا گلوب اس موقع پر آواز دے اٹھتا اور پھر کچھ وقت کے بعد روشنی ہو جاتی ایسا تین راتیں ہوتا رہا۔ سمجھ گئی کہ کوئی خاص بات ظہور پذیر ہونے والی ہے اور یہ خاص بات 5 ر فروری کی صبح کو سامنے آ گئی جب میں اپنے کمرے کی مشرقی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ سورج ابھی تک نہ نکلا تھا اچانک درختوں نے میری نگاہوں کو رستہ دے دیا اب ایک لق و دق صحرا میری نگاہوں کے سامنے تھا، صحرا میں اچانک دو ہیولے ابھرے یہ ایک مصری فرعون اور اس کی ملکہ تھے میں نے انہیں پہچان لیا یہ اخناتون اور اس کی ملکہ نفرطیطی تھے۔ ملکہ نے اپنے بازوؤں میں ایک بچہ اٹھار کھا تھا پھر میں نے لوگوں کا ہجوم دیکھا ایسا لگتا تھا جیسے پوری دنیا شاہی جوڑے کو یہ بچہ اس ہجوم کے سپرد کرتے دیکھ رہی ہے اب فرعون سین سے غائب ہو گیا اور اس کی ملکہ ہجوم اور بچے کو چھوڑ کر ماضی کی طرف بڑھنے لگی۔ تھکی ہاری اور پیاسی وہ ایک پانی کے جگ کے پاس رکی، مگر جونہی اس نے اپنا ہاتھ پانی کی طرف بڑھایا اچانک اس کی پیٹھ پر خنجر کا ایک وار ہوا اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئی"۔

جین ڈکسن کا یہ کشف اور آگے چلتا ہے وہ دیکھتی ہے کہ بچہ اب بڑا ہو گیا ہے اور ہر ملک اور نسل کے لوگ از راہ عقیدت اس کے آگے آنکھیں بچھا رہے ہیں اور آخر میں وہ یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ جس صبح یعنی 5 ر فروری 62ء کو اس نے یہ مکاشفہ دیکھا ہے اسی صبح فرعون کی نسل سے وہ لڑکا پیدا ہوا ہے جو آگے چل کر دجال بنے گا، جب یہ لڑکا گیارہ بارہ سال کا ہو گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ آگے چل کر اسے کیا کرنا ہے۔ 29 سال کی عمر تک اس کے ارد گرد جاں نثاروں کا ایک حلقہ قائم ہو جائے گا اور 29، 30 سال کی عمر تک (یعنی 1992ء) تک وہ کھل کر سامنے آ جائے گا اور اس کا اثر دنیا بھر میں تیزی سے پھیلنا شروع ہو جائے گا۔

....

مذہبی پیش گوئیوں کے علاوہ سال بہ سال اس کے جو مکاشفے شائع ہوتے ہیں وہ دنیا کے سیاسی مسائل و شخصیات کے متعلق ہوتے ہیں، یہ مکاشفات بہ کثرو بیشتر ایک مخصوص زاویہ نظر کے حامل اور بعض

شخصیات کے لئے ایک خاص نفسیاتی فضا پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ جین ڈکسن واشنگٹن میں رہتی ہے اور حکمران لابی میں اس کی اچھی جان پہچان بلکہ اثر ور سوخ ہے' اس لئے قدرتاً اس کی سیاسی پیش گوئیوں میں اس لابی کی خواہشات بلکہ منصوبہ بندی تک کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی بعض پیش گوئیاں پوری بھی ہو جاتی ہیں لیکن عام طور پر یہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھنے پاتیں۔ 1981ء کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا اس کی بعض موٹی موٹی باتوں ہی کو سامنے رکھا جائے تو ہمارے اس دعوی کی دلیل سامنے آ جائے گی۔ مثال کے طور پر قضیہ افغانستان کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ جنگ پھیلتے پھیلتے یورپی ممالک کے بڑے بڑے شہروں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی' جہاں افغان گوریلوں کے ہاتھوں روسی سفار تکار گولیوں کا نشانہ بنیں گے اسی طرح شرق اوسط میں بھی مجاہدین روس کے فوجی مشیروں پر حملے کریں گے اور پھر یہ آگ خود ماسکو تک جا پہنچے گی جہاں افغان محب وطن خود کشی کے ایک مشن پر پہنچیں گے اور روسی حکمرانوں میں سے ایک حکمران کو بطور انتقام قتل کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کے بارے میں جین ڈکسن کی یہ پیش گوئی اس کی خواہشات پر تو ضرور مبنی نظر آتی ہے اس میں افغان مجاہدین کو لائن دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کا کتنا حصہ 1981ء میں پورا ہو کر سامنے آیا ہے اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں البتہ افغانستان کے سلسلے میں یہ کریڈٹ جین ڈکسن کو ضرور جاتا ہے کہ اس نے 1980ء کی پیش گوئیوں میں افغانستان پر روس کے حملے کا ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ روس کابل پر حملہ کر کے اس قدیم علاقے کو اپنی مملکت میں باقاعدہ شامل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جہاں تک پیش گوئی کے اس حصے کا تعلق ہے ظاہر ہے اس میں اس کے ان وسیع تعلقات نے بہت کام کیا ہو گا جو وہ امریکی ارباب اقتدار کی ایک مؤثر اور طاقتور لابی سے استوار رکھتی ہے۔

اسی طرح خواہشات اور خوش فہمیوں پر مبنی اس کی کچھ پیش گوئیاں سال گذشتہ روس کے بارے میں تھیں۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے بہت پہلے کوسیجن کی حکومت سے علیحدگی کا انکشاف کر دیا تھا اور اب اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتی ہوں کہ اس سال برزنیف بھی حکومت سے الگ ہو جائے گا اور 1982ء تک کریملن میں اصل طاقت فوجی جرنیلوں کے پاس آ جائے گی اور صدیوں میں پہلی مرتبہ یہ واقعہ رونما ہو گا کہ روسی افواج روس پر حکمرانی کریں گی اور یہ دور روس کی خوفناک توسیع پسندی کا دور ثابت ہو گا۔ اس ضمن میں اس نے امریکی حکومت پر زور دیا کہ وہ اپنی فوجی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرے تاکہ آنے والے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکے۔

روس کے متعلق جین ڈکسن کی ایک اور دلچسپ پیش گوئی یہ ہے کہ سوویت یونین کے عین قلب میں ایک نیا آیت اللہ ابھرے گا جو وسط ایشیا میں اپنے مسلم پیرو کاروں کی مدد سے روسی حکومت کو ہلا کر رکھ دے گا اس کے متعدد ساتھی تشدد کا شکار ہو جائیں گے اور وہ خود اپنی جان بچا لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

کچھ اسی طرح کی پیش گوئیاں جین ڈکسن نے سال گذشتہ چین اور بھارت کے بارے میں کی

تھیں۔ چین میں چیئرمین ماؤ کی بیوہ اور اس کے ساتھیوں پر جو مقدمہ چل رہا تھا وہ اس کے نتیجے میں خلفشار کو بڑھتا ہوا دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ چین کے کئی رہنما اپنے ملک سے راہ فرار اختیار کر کے بیرونی دنیا میں پناہ لیں گے اور چینی رہنماؤں کی اندرونی زندگی کے بارے میں ایسے ناقابل یقین رازوں کا انکشاف کریں گے کہ مغربی دنیا دنگ ہو کر رہ جائے گی۔

بھارت کے بارے میں پہلے تو وہ یہ کریڈٹ لیتی ہے کہ اس نے اپنی نجی ملاقاتوں میں بعض ہندوستانی افسروں سے سنجے گاندھی کے المناک حادثے کی پیش گوئی کر دی تھی اور پھر یہ بتاتی ہے کہ یہ حادثہ تادیر اندرا گاندھی کو برسر اقتدار نہیں رہنے دے گا وہ اس کے لئے اندر ہی اندر اپنے آپ کو کوستی رہے گی اور اس کا غم اسے اس قابل نہیں رہنے دے گا کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھ سکے۔ بھارت میں فسادات بھڑک اٹھیں گے اور وہ انہیں دبانے کے لئے اپنے مخالفین کے خلاف زبردست تادیبی اقدامات کرے گی جس سے اس کی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ جائیں گی۔

بھارت اور چین کے بارے میں جین ڈکسن کی یہ پیش گوئیاں بھی واقعات نے جھٹلا دی ہیں چین میں "گینگ آف فور" کا مقدمہ کبھی کا ختم ہو چکا لیکن اس کے نتیجے میں کوئی خلفشار رونما نہیں ہوا نہ چینی رہنما ہی ملک سے فرار ہوئے اور نہ ہی وہ داستانیں ہی منظر عام پر آسکیں جنہیں سننے کے لئے مسز ڈکسن کے کان بے چینی سے منتظر تھے یہی صورتحال بھارت کی ہے جہاں اندرا گاندھی نے کامیابی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ عجیب بات ہے کہ سنجے گاندھی کی موت کا تذکرہ جین ڈکسن نے صرف نجی ملاقاتوں میں کیا اس کے لئے باقاعدہ کوئی پیش گوئی نہ کی اسی طرح کا دعویٰ اس نے گاندھی جی کے قتل کے بارے میں بھی کیا تھا کہ اس نے اس کی پیش گوئی کچھ عرصہ پہلے اپنے بعض ہندوستانی ملاقاتیوں کے سامنے کر دی تھی۔ اگر لوگوں کی موت وحیات کے بارے میں قدرت نے اسے واقعی ایسا باخبر بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تو اس سال وہ صدر سادات کی موت کی پیش گوئی کیوں نہ کر سکی جس کی صحت کے بارے میں اس نے تشویش تو ضرور ظاہر کی ہے لیکن محض بلڈ پریشر بڑھ جانے کی حد تک' وگرنہ او رہر طرح اس نے سادات کو امن کا مشن آگے بڑھانے اور 1981ء میں امریکہ سے کامیاب معاہدے کرتے بھی دیکھا ہے۔

....

1981ء کے بارے میں جین ڈکسن کی ناکام ترین لیکن محبوب ترین پیش گوئیاں وہ ہیں جو اس نے ایران اور لیبیا کے بارے میں کی تھیں۔ ایران کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ 81ء کے اختتام تک آیت اللہ خمینی وفات پا جائیں گے اور اس کے بعد ایران میں زبردست انتشار رونما ہو گا جس میں ایران کا موجودہ دور تاریخ کی تند و تیز ہواؤں میں گرد و غبار بن کر بکھر جائے گا۔ لیبیا کے بارے میں اس کی پیش گوئی عیدی امین کے انجام کے تذکرے سے شروع ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ دو سال پہلے میں نے عیدی امین کے عہد حکومت کے خاتمے کی پیش گوئی کی تھی اور اس کے چند ماہ بعد اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا

تھا اسی طرح اب میں پیش گوئی کرتی ہوں کہ زوال کے سائے بڑی تیزی سے عیدی امین کے پناہ دہندہ یعنی کرنل قذافی کی طرف بڑھ رہے ہیں اس سال قذافی کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے تیل کی آمدنی سے اور سب کچھ خرید سکتا ہے یہاں تک کے اس کے ذریعے وہ امریکہ کی فرسٹ فیملی تک رسائی بھی حاصل کر سکتا ہے (اس سے مراد سابق صدر کارٹر کے بھائی بلی کارٹر اور لیبیا کے تعلقات ہیں) لیکن اس کے ذریعے وہ اپنی ذاتی حفاظت اور سلامتی نہیں خرید سکتا جہاں تک ایران کے بارے میں مسز ڈکسن کی پیش گوئی کا تعلق ہے وہ شاید ان رپورٹوں پر مبنی تھی جو مرد انقلاب حضرت آیت اللہ خمینی کی صحت سے متعلق وقتاً فوقتاً عالمی پریس میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ عمر کے اس حصے میں اتنے زبردست بوجھ اٹھائے ہوئے اس تاریخ ساز شخصیت کے بارے میں کتنے ہی لوگوں کے اندازے یہی تھے کہ شاید وہ 81ء کا سال پورا نہ کر سکیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کے یہ اندازے صحیح ثابت نہ ہوئے اور حضرت آیت اللہ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت بھی ایرانی قوم کی قیادت کے لئے زندہ و سلامت موجود ہیں۔ رہی کرنل قذافی کے بارے میں جین ڈکسن کی پیش گوئی بلکہ دھمکی تو جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق وہ بھی سامراجی حلقوں کی تمام تر کوششوں اور سازشوں کے باوجود سامراج کے سینے پر مونگ دل رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس سال کرنل قذافی کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک خوفناک مہم چلی۔ امریکی اخبارات و جرائد نے انہیں دنیا کا خطرناک ترین فرد قرار دیا انہیں سیاسی ناولوں کا موضوع بنا دیا گیا۔ ان پر قاتلانہ حملے ہوئے انہیں اس بات کے لئے مورد الزام قرار دیا گیا کہ وہ صدر ریگن کو قتل کرانا چاہتے ہیں لیکن کردار کشی کے اس سارے طوفان کے باوجود کرنل قذافی کا بال بیکا تک نہیں ہوا البتہ جین ڈکسن کی یہ پیش گوئی اس کے اس مخفی رابطے کا سراغ ضرور دے گئی جو وہ اس طرح کی منصوبہ بندی کرنے والے کسی ادارے سے درپردہ استوار رکھتی ہے۔

1981ء کے بارے میں جین ڈکسن کی ان پیش گوئیوں کے اس مختصر جائزہ سے اس کے اس امیج کی قلعی کھل جاتی ہے جس میں یار لوگوں نے اسے ایک غیب دان کے روپ میں پیش کیا ہے ہمارے ہاں کے مغربی تعلیم یافتہ طبقے نے بھی جو ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھتا ہے اس کی تصانیف تو نہیں پڑھیں البتہ اس کا نام ضرور سنا ہے اس لئے اس کے حوالے سے مستقبل کو دیکھنا اس کے ہاں فیشن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس جائزے سے اس طبقے کو بھی اندازہ ہو سکے گا کہ جین ڈکسن کی پیش گوئیاں ظن و تخمین اور محض انکل پچو قیاسات پر مبنی ہیں یا پھر ان کے پیچھے مخصوص سیاسی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں جن میں بعض سازشوں کے لئے پیشگی نفسیاتی فضا تیار کی جاتی ہے ورنہ جہاں تک غیب دانی کا تعلق ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

(4 مارچ 1982ء)

شیطانی آیات

سلمان رشدی کی "شیطانی آیات"

ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسلامی اجتماعیت کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ توحید پر ایمان رکھنے والے دنیا میں بہتیرے ہیں' یہودی اپنے عقیدے کے اعتبار سے ٹھیٹھ موحد ہیں۔ ان کے ہاں شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ سکھ خدائے واحد پر کامل ایمان رکھتے ہیں حد یہ ہے کہ بعض ہندو اور عیسائی مکاتبِ فکر بھی ایک خدا کے قائل ہیں مگر تنہا عقیدۂ توحید پر ایمان رکھنے کی وجہ سے انہیں کوئی بھی ملت اسلامیہ کا فرد نہیں سمجھتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا رکن بننے کے لئے ذات رسالتؐ پر ایمان لانا شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی آپؐ پر ایمان نہ لائے تو خدا پر ایمان لانا اس کے کچھ کام نہیں آسکتا۔

بہت سادہ سا ہے اپنا اصولِ دوستی کوثر
جو ان سے بے تعلق ہے ہمارا ہو نہیں سکتا

اسلام میں عقیدۂ رسالت کی یہی وہ مرکزی حیثیت ہے جس کے تحفظ کے لئے قوانین اسلام نے بے حد احتیاط اور انتہائی سختی سے کام لیا ہے۔ اس بات پر مسلمانوں کے تمام گروہوں اور تمام علماء و فقہا کا اتفاق ہے کہ سرکارِ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین کرنے والا ہر بد بخت انسان واجب القتل ہے۔ اختلاف صرف اس مسئلے میں مذکور ہے کہ آیا توہین کرنے والے کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں' بعض ائمہ اور فقہا کہتے ہیں کہ توہینِ رسولؐ کرنے والے کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی اور اسے لازماً قتل کیا جائے گا لیکن

بعض دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی اگر اس دوران وہ توبہ کر لے اور بعد کی زندگی میں اپنے عمل سے اس توبہ کی صداقت کو ثابت کر دے تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی البتہ اس بات کا توہینِ رسالتؐ کا ارتکاب کرنے والے شخص کے بارے میں خدشہ ہے کہ توبہ کے بعد بھی اس کی عاقبت بخیر نہیں ہو گی اور اس کا خاتمہ برا ہو گا۔ علامہ قاضی محمد زاہد حسینی مدظلہ نے اپنی تصنیف "با محمد باوقار" میں امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"اگرچہ ایسے آدمی کی توبہ قبول کی جائے گی اور وہ قتل ہونے سے بچ جائے گا اور سچی توبہ کی برکت سے قیامت کے عذاب سے بچنے کی امید بھی ہو سکتی ہے، مگر پھر بھی یہ اس قدر عظیم جرم ہے کہ ایسے آدمی کا خاتمہ برا ہو سکتا ہے بلکہ ہمیں ایسی اطلاع بھی ملی ہے کہ کچھ ایسے لوگوں کا خاتمہ اچھا نہیں ہوا"۔

اسلامی قانون کے تحت توہینِ رسالتؐ کا ارتکاب کرنے والے کو قتل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ مسلمان ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم جو بھی یہ جسارت کرے گا موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ امام ابن تیمیہؒ کی عقیدۂ توحید میں شدت کسی بھی دینی طالب علم سے پوشیدہ نہیں مگر انہوں نے اس مسئلہ کی وضاحت اور تائید کے لئے باقاعدہ ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول" اس کی وجہ تالیف یہ ہے کہ ان کے زمانے میں ایک عیسائی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی، بعد میں وہ مسلمان ہو گیا مگر اس کے باوجود اس کے عاشق رسولؐ بھتیجے نے اسے قتل کر دیا چونکہ حکومت کی طرف سے اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد اسے امان دی جا چکی تھی اس لئے امام ابن تیمیہؒ کو اس مسئلے کو وضاحت کے لئے یہ کتاب لکھنی پڑی، جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ایسے بدبخت انسان کی توبہ بھی قبول نہیں ہے اس لئے اس کا قتل عین شریعت کے مطابق تھا۔

اسلامی قوانین اور اسلامی معاشرے کی یہی وہ شدت احساس ہے جس کے تحت مختلف ادوار میں ہر بدبخت شاتم رسول اسی انجام سے دوچار ہوا۔ ماضی قریب میں راج پال نے "رنگیلا رسول" لکھ کر اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کیا تو وہ لاہور کے غازی علم دین شہیدؒ کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا۔ یہ نوجوان عرف عام میں کسی مذہبی پس منظر کا حامل نہ تھا مگر جیسا کہ عرض کیا گیا ذاتِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو پورے مسلم معاشرے کا سنگ بنیاد ہے اس کا تحفظ صرف اہل مدرسہ و اہل خانقاہ ہی نہیں کرتے عام گنہگار مسلمان بھی اس سلسلے میں شمشیر برہنہ کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو وہ لوگ جنہیں اصطلاح فقہ میں فاسق سمجھا جاتا ہے اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی نزاکتِ احساس کے حامل ہیں آج بھی وہ رسول مقبولؐ کو اپنے ماں باپ اور اپنی آل اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں وہ ماں باپ کی گالی برداشت کر سکتے ہیں مگر شان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ذرا سی گستاخی بھی انہیں گوارا نہیں، وہ اس کے لئے نقد جان کا نذرانہ بھی پیش کرنے سے نہیں ہچکچاتے بلکہ شاید شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

تاریخ میں گستاخانِ رسولؐ مسیلمہ کذاب سے لے کر راج پال تک .... جس عبرتناک انجام سے دوچار ہوتے رہے ہیں اسے دیکھنے کے بعد دشمنان اسلام نے بھی اپنا طریقۂ واردات بدل لیا ہے۔ مستشرقین تو اس معاملے میں اتنے محتاط ہیں کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے اب باقاعدہ (نام نہاد) علمی انداز اختیار کر لیا ہے وہ ہمارے ہی ذخیرہ کتب سے ضعیف روایات کا سہارا لے کر مغالطہ آفرینی کی کوشش کرتے ہیں (خدا کا شکر ہے کہ ملت اسلامیہ کے اہل علم ان کی ان "علمی" جہالتوں کا تعاقب کرنے سے غافل نہیں ہیں۔ سر سید احمد خان سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تک سبھی نے یہ فرض انجام دیا ہے) گستاخیوں کا کاروبار کرنے کے لئے انہوں نے مسلمان گھرانوں ہی میں ایسے ناخلف اور غدار پیدا کر لئے ہیں جو اپنی ترقی یافتگی کے زعم میں حضور رسالتؐ میں انتہائی دریدہ دہنی سے بھی باز نہیں آتے۔ اس گندہ ذہنی کی ایک تازہ ترین اور شاید اب تک کے گستاخانہ لٹریچر میں ذلیل ترین مثال سلمان رشدی کی کتاب THE SATANIC VERSES (شیطانی آیات) ہے جو ابھی حال ہی میں لندن سے PENGUIN نے شائع کی ہے اور جس پر امریکہ اور یورپ کے مسلمان بالخصوص شعلۂ جوالہ بنے ہوئے ہیں۔

سلمان رشدی بمبئی کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا۔ آزادی کے بعد اس کے ماں باپ کراچی منتقل ہو گئے اس وقت بھی پاکستان میں اس کے بعض با اثر رشتہ دار موجود ہیں جن کا ذکر اس نے اپنے ایک اور ناول SHAME میں کیا ہے۔ یہ خود برطانیہ میں آباد ہو گیا یہیں ایک انگریز لڑکی سے اس نے شادی کی اور کئی سال سے وہ مغربی حلقوں میں ایک مصنّف اور ناول نگار کی حیثیت سے خاصا جانا پہچانا ہے۔ زیرِ نظر شرمناک اور افسوسناک کتاب میں (جس کے کچھ اقتباسات ہم لندن کے مشہور اسلامی جریدہ IMPACT کے حوالے سے اسی کالم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

(انگریزی کے یہ اقتباسات دشنام آمیز حصوں پر کالک پھیر کر اس کالم میں شائع کر دیئے گئے تھے مگر اب اس کالم کے کتابی صورت میں چھپنے پر انہیں حذف کیا جا رہا ہے)

رسولِ خداؐ، ازواج مطہرات، وحی اور قرآن کے ضمن میں اسلامی عقائد پر ایسی بدبودار کیچڑ اچھالی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اس کتاب کے چھپنے سے پہلے ناشر نے اپنے بھارتی ایڈیٹوریل ایڈوائزر اور مشہور صحافی سردار خوشونت سنگھ سے اس کے مسودہ کے بارے میں رائے لی تو سردار صاحب نے لکھا کہ ناول میں آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس سے قارئین میں زبردست ردِّ عمل ہو گا مگر PENGUIN جو صیہونی حلقوں کی طرف سے قرآن مجید کا ایک غلط ترجمہ شائع کر کے پہلے ہی اپنی اسلام دشمنی کا مظاہرہ کر چکا ہے اپنی ضد پر اڑا رہا اور اس نے یہ کتاب شائع کر دی۔ اس کے خلاف

سب سے پہلا ردِ عمل بھارت کی حکومت نے دکھایا اور کتاب کی فروخت وغیرہ ہندوستان میں ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس پر سلمان رشدی نے راجیو گاندھی کو ایک کھلا خط لکھا مگر مسٹر راجیو نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بعد میں یہ پاکستان میں بھی BAN کر دی گئی اور اسلامک سیکرٹریٹ (او آئی سی) کی اپیل پر خلیجی ریاستوں اور ملائشیا وغیرہ نے یہی اقدام کیا حد یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں بھی کتاب کے داخلے کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ سلمان رشدی جنوبی افریقہ جانے والا تھا مگر وہاں کے مسلمانوں کا غیرت مندانہ ردِ عمل دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا۔ کینیڈا کے ٹیلی ویژن پر اس کا انٹرویو دکھایا گیا تو مسلمانان کینیڈا نے ٹیلی ویژن پر مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کی پاداش میں باقاعدہ مقدمہ دائر کر دیا۔ اب ناشر یہ کتاب امریکہ سے بھی شائع کر رہا ہے اور وہاں احتجاجی تحریک کا عالم یہ ہے کہ ہر منٹ پر ناشر کو اس کے خلاف پچاس کالیں وصول ہو رہی ہیں۔ اب تک موصول ہونے والے احتجاجی مراسلوں کی تعداد ایک لاکھ سے بڑھ گئی ہے۔ برطانیہ کے مسلمان اس سلسلے میں بے حد منظم کام کر رہے ہیں یہ انہی کی تحریک کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ بھر میں تمام بک سٹالوں سے کتاب کے نسخے ہٹا لئے گئے ہیں۔ مسلمانان برطانیہ کا مطالبہ یہ ہے کہ:

1 PENGUIN مسلمانان عالم سے اس خوفناک دل آزاری پر معافی مانگے۔

2۔ وہ اب تک فروخت ہونے والی کتابوں کی مالیت کے برابر رقم بطور تاوان ادا کرے۔ جو برطانیہ کے مسلمان خیراتی مقاصد کے لئے خرچ کریں گے۔

3۔ امریکہ سے اس کتاب کی اشاعت کا منصوبہ فوری طور پر روک دیا جائے۔

4۔ اس کتاب کے تمام نسخے تلف کر دیئے جائیں۔

مغرب کے رہنے والے مسلمان عالم اسلام کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ جب تک ایسا نہیں ہوتا وہ:

1۔ PENGUIN کی تمام مطبوعات کا داخلہ اپنے اپنے ملکوں میں بند کر دیں اور اس کے کاروبار پر پابندی لگا دیں۔

2۔ اگر اس ادارے کی کوئی شائع کردہ کتاب تعلیمی مقاصد کے لئے اہم ہو تو کاپی رائٹ کے قوانین میں استثناء پیدا کر کے اسے مقامی طور پر چھاپنے کی اجازت ناشرین کو دے دی جائے۔

یورپ، کینیڈا اور امریکہ کے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اگر برطانوی ٹیلی ویژن سے ایک عرب شہزادی کی موت کی فلم دکھانے پر سعودی عرب کی حکومت برطانیہ سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر سکتی ہے تو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عزت و حرمت کے تحفظ کے لئے تو مسلمان حکومت کو اس سے بھی زیادہ غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ برطانیہ کے جمہوری اور ترقی یافتہ معاشرے میں اس طرح کی مطبوعات پر لاگو ہونے والا قانون صرف "عیسائیت" کے تحفظ کے لئے ہے وہ

کسی دوسرے مذہب کی بے حرمتی پر حرکت میں نہیں آتا اور نہ اب تک وہاں کے مسلمان اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کر چکے ہوتے۔ پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ سرکاری اور سفارتی سطح پر پیغمبرِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور اس گستاخانہ جسارت کا نوٹس لے ورنہ جہاں تک پاکستانی عوام کا تعلق ہے ان کے جذبات تو اس سے ظاہر ہیں کہ ابھی حال ہی میں جب لاہور کے ایک اجتماع میں میں نے اس کتاب کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا تو ایک مشہور فلم ساز جناب محمد سرور بھٹی نے بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر یہ مجاہدانہ اعلان کیا کہ وہ اس بدبخت کو خود کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ اس معاملے میں صرف بھٹی صاحب ہی تنہا نہیں ہیں، سینکڑوں جانباز بدبخت شاتم رسول کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں اور وہ لندن میں ہر رات ڈر کے مارے اپنا ٹھکانہ بدلتا رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے کہ مصنّف دنیا و آخرت دونوں جگہ عبرتناک انجام سے دوچار ہو گا۔

بدقسمتی سے پاکستانی پریس میں اب تک اس کتاب اور اس کتاب کے خلاف چلنے والی احتجاجی تحریک پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ یہ سارا کریڈٹ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کو پہنچتا ہے کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود عظمت مصطفیٰ کے لئے اس بے جگری سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ بھی اس سلسلے میں بھرپور حصہ لیں اور آغاز کار کے طور پر تمام قارئینِ ناشر کو تاروں اور خطوط کے ذریعے اس کتاب کے خلاف اپنے جذبات سے آگاہ کریں۔ جو احباب انگریزی میں نہ لکھ سکتے ہوں وہ اردو ہی میں لکھیں اور ان کی ایک ایک کاپی ہمیں بھی روانہ کریں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ دین تمام تر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات ہے اور مولانا ظفر علی خان کا یہ شعر ہر مسلمان کی زندگی کا اصل الاصول ہونا چاہئے کہ۔

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

شیطانی کتاب اور سانحہ اسلام آباد

رشدی کی شیطانی کتاب پر پاکستان میں اٹھنے والی ہمہ گیر احتجاجی تحریک اور شہدائے اسلام آباد کی قربانیوں کے نتیجے میں سرکار رسالت مآبؐ کی عظمت و حرمت کا پرچم چار دانگ عالم میں بلند ہو چکا ہے' امام خمینی کا مجاہدانہ فتویٰ بھی انہی قربانیوں کا ثمرہ تھا۔ ایران کی طرف سے رشدی کے سر کی قیمت مقرر ہونے پر مصنف اور ناشرین کے ہوش ٹھکانے آنے لگے۔ کینیڈا میں کتاب کی درآمد ممنوع ہو گئی۔ اٹلی نے اس ترجمے کا منصوبہ ترک کر دیا۔ امریکہ میں پبلشرز کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بڑے بڑے کتب فروشوں نے یہ کتاب اپنے سٹالوں سے اٹھالی۔ رشدی معافی مانگ رہا ہے مگر ظاہر ہے یہ معافی ایک مسلمان کی معافی نہیں ایک مرتد اور مردود کی معافی ہے۔ آخرت کے عذاب سے تو وہ بچ نہیں سکتا نہ اسلامی توبہ کی شرائط کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے مگر دنیا میں اپنے بدترین انجام سے بچنے کے لئے اس کی معافی کے یہ بے جان خالی خولی الفاظ کافی نہیں جب تک:

- ...... کتاب واپس لینے کا اعلان نہیں کرتا۔
- ...... تمام موجود نسخے جلا نہیں دیئے جاتے۔
- ...... جو رائلٹی وہ لے چکا ہے اسے کسی خیراتی ادارے کو دینے کا اعلان نہیں کرتا۔

مجھے یقین ہے کہ کفن پوش شیدائیانِ رسولؐ اس کے تعاقب میں سربکف رہے تو سب شرطیں مانے گا۔ زمین پر ناک رگڑے گا اور اس کی مثال سے عبرت پکڑ کر آئندہ کوئی بھی گستاخِ رسول شانِ رسالتؐ میں زبان درازی کرنے سے پہلے ایک لاکھ مرتبہ سوچے گا۔

تحریکِ تحفظ ناموسِ رسالتؐ کے یہ ٹھوس نتائج سب کو نظر آ رہے ہیں، مگر ایسے میں کچھ لوگ پھر بھی پروپیگنڈے کا گرد و غبار اٹھا کر حقائق کو دھندلا کرنے میں لگے ہوئے ہیں ان میں کچھ عناصر تو وہ ہیں جو رواداری کا درس دینے میں مصروف ہیں، کچھ دبی زبان میں کتاب کی مدافعت سے بھی نہیں چوکتے۔ ایک فیشن میگزین نے تو مصنف کا انٹرویو بھی بڑے دھوم دھڑکے سے شائع کر دیا ہے اور کچھ افراد اور قلم کار ایسے ہیں جو سانحہ اسلام آباد اور پاکستان میں اٹھنے والی احتجاجی تحریک پر تابڑ توڑ حملے کرنے میں مصروف ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس طرح کی مہمات میں اصل ڈور کہاں سے ہلائی جاتی ہے مگر پھر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی پریس میں جگہ پانے والے بعض شوشوں اور وسوسوں پر کچھ نہ کچھ ضرور تبصرہ کر دیا جائے۔

سب سے پہلے رواداری کے مبلغین کو لیجئے یہ فرماتے ہیں فکر کا مقابلہ فکر سے کیجئے اختلاف کو برداشت کرنا سیکھئے۔ بات قتل مقاتلے تک نہ پہنچا دیجئے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم ہر وقت اسلام پر ہونے والے اعتراضات اور اٹھائے جانے والے تنقیدی نکات کا جواب دینے کو تیار ہیں۔ مستشرقین کی طرف سے ایسی بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ہماری لائبریریوں میں موجود ہیں۔ سر سید احمد خان اور سید امیر علی سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تک بھی اکابر نے ان کا منہ توڑ رد بھی کیا ہے مگر علمی بحث اور چیز ہے اور دشنام طرازی اور گالم گلوچ دوسری چیز۔ اس بدبخت نے فکر پیش ہی کہاں کی ہے کہ اس کے جواب میں فکر پیش کی جائے۔ اس نے تو پیغمبرؐ اسلام، صحابہ کرامؓ، امہات المومنینؓ کو ننگی گالیاں دی ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ شاتم رسول راج پال کی کتاب میں بھی وہ گستاخیاں نہیں پائی جاتیں جو اس بد فطرت کی کتاب میں موجود ہیں۔ چودہ سو سال کے اسلام دشمن لٹریچر میں اس لحاظ سے بھی یہ غلیظ ترین کتاب ہے کہ بدقسمتی سے یہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے شخص کے قلم سے نکلی ہے۔ جو لوگ ہم سے رواداری چاہتے ہیں ان کی خدمت اقدس میں ماں کی گالی نذر کی جائے تو پھر دیکھتے ہیں وہ اس کا کیا فکری جواب عنایت فرماتے ہیں اگر وہ ماں کی گالی برداشت نہیں کر سکتے تو امت کی ان ماؤں کو (جن پر ہم سب کلمہ گوؤں کی ماؤں کی عزت و حرمت قربان) گالی دے تو اس کا جواب قلم کے بجائے نوک خنجر سے نہ دیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔

کچھ اور ہیں جو اس کے انٹرویو چھاپ کر اس کے گواہان صفائی بننے کی کوشش کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں یہ تو ناول ہے اس میں فرضی کردار ہیں، انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام پر منطبق ہی کیوں کیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں وہ مصنف کا وہ انٹرویو پڑھ لیں جو 25 ستمبر 88ء کو کے طور پر برطانوی اخبارات میں شائع ہوا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

"اس سلسلۂ خواب میں میں نے وحی کے انوکھے واقعے اور دنیا کے ایک عظیم مذہب کے آغاز پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور یہ نقطۂ نظر ایک ایسے سیکولر انسان کا ہے جس

کے لئے اسلامی کلچر زندگی بھر مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے"۔

مصنف کے اس انٹرویو سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے فکشن اور ناول کے رنگ میں وحی اور ظہور اسلام کو موضوع بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے کرداروں میں صحابہ کرامؓ میں سے بلالؓ (جو مصنف کے الفاظ میں حبشہ کا رہنے والا ہے) خالدؓ اور سلمانؓ (جو فارس سے آیا ہے) شامل ہیں۔ آغاز میں وہ ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت) ہاجرہؓ (حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ) کے بارے میں بکواس کرتا ہے۔

جبریل اور غارِ حرا کا ذکر کرتا ہے اور شیطان کی طرف سے وحی کی خرافات بکتا ہے۔ امہات المومنینؓ میں سے عائشہؓ، ہودہؓ، زینبؓ بنت جحش؛ حضرت حفصہؓ اور مسلمانوں کی دوسری ماؤں کو گالی دیتا ہے۔ رسولؐ خدا کا نام بگاڑ کر پرانے دشمنان اسلام مستشرقین کی پیروی میں وہ MA HOUND لکھتا ہے جو "لانگ مین" ڈکشنری کے مطابق نہایت مکروہ مفہوم میں حضورؐ کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ جس سرزمین میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اسے وہ "یثرب" کہتا ہے جو مدینہ منورہ کا پہلا نام ہے کیا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ سب نام اور کردار فرضی ہیں؟ سرکاری درباری حلقے فرماتے ہیں کہ کتاب ایک سال پہلے چھپی تھی۔ اس کے خلاف تحریک اب کیوں چلی ہے۔ یہ بات یا تو جہالت پر مبنی ہے یا دیدہ دانستہ 'اس طرح حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے' اصل میں 88ء میں اس کتاب کے چھپنے کی وجہ سے اسے ایک سال پرانا قرار دیا جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب کے مصنف کی طرف سے اس کا چرچا اور اس پر اظہار خیال اگست' ستمبر 88ء ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن یہ مارکیٹ میں اکتوبر کے اوائل میں آئی اور جیسے ہی یہ بازار میں آئی برطانیہ کے مسلمانوں نے اس پر احتجاج شروع کر دیا۔ کتاب پر سب سے پہلے بھارت نے پابندی لگائی اس کے بعد جنوبی افریقہ نے اور پھر ملائشیا' سوڈان' عمان اور سعودی عرب نے۔ یہاں تک کہ پوپ نے ویٹی کن میں اس پر پابندی لگا دی۔ اکتوبر کے آخر میں پاکستان نے اس پر پابندی لگائی تو اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت نہ تھی اس لئے یہ کریڈٹ بھی اس کے کھاتے میں نہیں جاتا۔ 29ر نومبر کو لندن میں مسلم ممالک کے سفیروں کا ایک اجلاس ہوا جس میں 22 سفیر شامل ہوئے۔ ان میں پاکستان کے سفیر جناب شہریار محمد خان بھی تھے۔ اس اجلاس میں پاکستان' کویت اور صومالیہ کے سفیروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ سے رابطہ قائم کر کے اسے کتاب کے خلاف کارروائی کرنے پر آمادہ کریں۔ کمیٹی نے بعد میں ممتاز وکلاء سے بھی مشورہ کیا تاکہ کتاب کے خلاف قانونی کارروائی کی جاسکے مگر قانون دانوں کا کہنا تھا کہ برطانوی قانون میں صرف عیسائی مذہب کو تحفظ دیا گیا ہے اس لئے پیغمبرؐ اسلام پر ہونے والے ان حملوں کو مقدمے کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ بعد میں برطانیہ میں مسلمانوں نے زبردست مظاہرے کئے۔ بریڈ فورڈ میں سرعام ایک اجتماع کے اندر کتاب کا نسخہ جلایا گیا۔ یہ ایجی ٹیشن برطانوی پریس کی ایک

اہم خبر بن گئی تا آنکہ اس مؤثر احتجاج کے نتیجے میں بعض اہم کتب فروشوں نے کتاب کے نسخے بک اسٹالوں سے ہٹا لئے اور رشدی کو جان کے لالے پڑ گئے اور وہ برطانوی پہرے کے حصار میں خانہ نشین ہو گیا۔

اہل وطن جانتے ہیں کہ میں مذہبی امور اور بیرون ملک پاکستانیوں کے وزیر کی حیثیت سے بیرونی مسلم تنظیموں میں جانا پہچانا جاتا ہوں اب بھی بیرون ملک ہونے والی اسلامی کانفرنسوں میں اکثر شریک ہوتا رہتا ہوں۔ اس لئے قدرتاً کینیڈا، برطانیہ اور امریکہ کے کئی مسلم رہنماؤں نے ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ کیا اور پھر کتاب کے چند اقتباسات مجھ تک پہنچائے 10 رجنوری کو میں نے "غازی علم الدین شہید" کے نام سے کتاب کی افتتاحی تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے پہلی مرتبہ اس شیطانی کتاب پر تبصرہ کیا۔ اس سے پہلے میں ایک اردو روزنامہ کے لئے ایک مضمون بھی بھیج چکا تھا جو ادارہ نے بڑی تاخیر کے بعد یکم فروری کو شائع کیا۔

یہ پاکستان میں پہلی مرتبہ عوام کو پیغمبرؐ اسلام کی عظمت و ناموس پر آنے والے اس ناپاک حملے کی اطلاع تھی جس کے بعد پورے ملک میں ہیجان پھیل گیا اور تحفظ ناموس رسالت کی وہ عظیم الشان تحریک چلی جس نے پوری دنیا میں ایک زلزلہ برپا کر دیا اور آخر کار حکومت پاکستان کو بھی چند اقدامات کا اعلان کرنا پڑا۔ تو کتاب کے خلاف تحریک ایک سال بعد نہیں چلی، تین چار مہینے کے اندر چلی اور اس سلسلہ واقعات میں چلی جن کا ذکر ابھی اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ پارلیمنٹ میں قرارداد منظور ہو گئی تھی تو پھر جلوس کی کیا ضرورت تھی اور یہ بات ٹیلی ویژن پر بڑے ترقی پسند صحافیوں نے کہی ہے جو رات دن عوام دوستی کا اشتہار دیتے نہیں تھکتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا برطانیہ، فرانس، امریکہ، اٹلی اور دوسرے جمہوری ملکوں میں پارلیمنٹ کی کسی قرارداد یا اظہار خیال کے بعد کوئی مظاہرے نہیں ہوئے۔ یہ جو وہاں امن مارچ ہوتے ہیں، ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف جلوس نکالے جاتے ہیں؟ کیا ان پر پارلیمنٹ کے اراکین کے جذبات عوام سے مختلف ہوتے ہیں اور پھر یہ تو دین اور ایمان کا مسئلہ تھا، کیا اس پر صرف اسمبلی کے ممبران ہی بولنے کے مجاز تھے۔ اسلامیانِ پاکستان اپنے جذبات کا اظہار نہ کرتے، حکومت اور پارلیمنٹ کے ہاتھ مضبوط نہ کرتے کہ وہ ان عوامی جذبات کے حوالے سے متعلقہ حکومتوں پر دباؤ ڈال سکیں۔ کیا سینٹ میں نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑنے کی متفقہ قرارداد کے بعد صحافی حضرات اپنے فورم پر اس مسئلہ کو اٹھانا چھوڑ چکے ہیں؟ کیا پارلیمنٹ کی طرف سے (میری ہی تجویز پر) دو تین سال پیشتر بہاری پاکستانیوں کی واپسی کی متفقہ قرارداد منظور ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ عوامی جلسوں اور جلوسوں کا موضوع نہیں بنا؟ اگر یہ سب جائز ہے تو ناموسِ مصطفیٰ پر پارلیمنٹ کی ایک قرارداد پاس ہو جانے کے بعد عوامی جلسوں اور جلوسوں کا انعقاد کیونکر شجر ممنوعہ بن گیا؟۔

سرکاری ذرائع ابلاغ کے دروازے سب پر کھولنے کے دعویدار وزراء کا فرمانا ہے کہ اسلام آباد کے جلوس کے پیچھے سیاسی مقاصد کار فرما تھے۔ یہ بات ٹیلی ویژن پر صبح و شام سرکاری درباری حضرات تواتر سے ارشاد فرما رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تحریکِ تحفظ ناموس رسالتؐ کے رہنماؤں کی کوئی بات اب

بھولے سے بھی نشر نہیں کی جاتی۔ غلطی سے ٹی وی کے کارکن جلوس سے پیشتر میری ایک پریس کانفرنس کی مختصری خبر دکھا بیٹھے تھے وہ غریب آج تک اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ جلوس کی کوریج ہوئی مگر بڑے بڑے ذمہ داروں اور ماہرینِ ابلاغیات نے فلم سے کاٹ کاٹ کر صرف وہ ٹکڑے سکرین پر دکھائے جن میں بھاگتے ہوئے لوگ، پتھر بازیوں اور شیشہ شکیوں کے چند مناظر تھے اور بس وہ عدیم المثال عظیم جلوس غائب تھا جو راولپنڈی اور اسلام آباد کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ تھا۔

اگلے دن غائبانہ نماز جنازہ تھا۔ ٹی وی کے غریب کارکن اپنے جذبۂ ایمانی سے مجبور اس کی کوریج کے لئے موجود تھے مگر شام کو اس کی خبر غائب تھی۔ اگلے دن قاضی حسین احمد، نوابزادہ نصراللہ خان، مولانا عبدالستار خان نیازی، چودھری شجاعت حسین، غلام مصطفیٰ جتوئی، شیخ رشید احمد اور میری مشترکہ پریس کانفرنس تھی مجھے چھوڑ کر باقی سب حضرات پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ چودھری شجاعت تو اپوزیشن لیڈر بھی تھے مگر پریس کانفرنس کا ایک لفظ سرکاری ذرائع ابلاغ سے نشر نہیں ہوا۔ اس جمعہ کو پورے ملک میں یوم احتجاج منایا گیا کوئی قصبہ اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں جلسہ نہیں ہوا یا جلوس نہیں نکلا۔ کراچی راولپنڈی کے جلسوں کو بی بی سی ٹیلی ویژن کی ٹیم نے کور کیا اور اسی رات سٹیلائٹ سے لندن نیٹ ورک پہ دکھایا مگر پاکستان کا ٹی وی غائب تھا اس پر ملک بھر میں ہونے والے اس ہمہ گیر احتجاج کا ذکر ہی سرے سے گول تھا اور تو اور ابھی کل نوابزادہ نصراللہ خان نے پریس کانفرنس کی۔ ٹی وی ٹیم موجود تھی مگر اسے بھی غائب کر دیا گیا۔ بات پھیل گئی ذکر سرکاری ذرائع ابلاغ سے نشر ہونے والے اس الزام کا ہو رہا تھا کہ جلوس کے پیچھے سیاسی مقاصد کار فرما تھے۔

تحریکِ تحفظ ناموسِ رسالتؐ برپا کرنے کے لئے اسلام آباد اور راولپنڈی کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء، دانشوروں اور ممتاز شہریوں کے اوّلین اجتماع کا اہتمام میں نے 5 ر فروری کو اسلام آباد ہوٹل میں کیا تھا اس کے لئے بلالحاظ مسلک و سیاست سب کو مدعو کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم صاحبہ کے مشیر مذہبی امور مولانا سراج الدین دین پوری کو بطور خاص دعوت دی گئی تھی یہ دعوت نامہ عالمی دعوت اسلامیہ کے سیکرٹری جنرل علامہ سعید الرشید عباسی لے کر گئے تھے اس وقت مولانا دین پوری کے پاس مجلس تحفظ ختم نبوت کے مبلغ مولانا عبدالرؤف اور اسلام آباد کے مشہور عالمِ دین مولانا قاری احسان اللہ بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا دین پوری نے عباسی صاحب سے فرمایا کہ دعوت نامہ پڑھ کر سناؤ اس میں کیا لکھا ہے۔ انہوں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی تو فرمایا مصنف نے کتاب میں لکھا کیا ہے۔ انہیں بتایا گیا تو کہا کہ پھر تو میں ضرور آؤں گا۔ اجلاس کے دن پھر انہیں یاد دہانی کرائی گئی اور دوبارہ انہوں نے وعدہ فرمایا اجلاس میں ہم نے سٹیج پر ان کے لئے کرسی رکھی تھی مگر وہ تشریف نہیں لائے اگر شروع کے اجلاس ہی میں مشیر صاحب آ گئے ہوتے تو پیپلز پارٹی کی بھی اس میں نمائندگی ہو جاتی ہم نے تو انہیں باہر رکھنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا وہ خود ہی نہ آئے تھے تو ہمارا اس میں کیا قصور؟۔

اس الزام پر فیصلہ صادر کرنے کے لئے دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ جلوس کی قیادت کن اصحاب نے کی۔ کیا وہ مارشل لاء کے حامی تھے؟ کیا ان کا تعلق پیپلز پارٹی کی حریف اقتدار جماعت "آئی جے آئی" سے تھا؟ کیا وہ جنرل ضیاء الحق کے معتقدین میں شامل تھے؟ نوابزادہ صاحب کی ساری عمر تو جمہوریت کے لئے جدوجہد کرتے گزری۔ مولانا فضل الرحمان ایم آر ڈی میں شامل رہے۔ مولانا عبدالستار نیازی ہر دور میں آمریت کے خلاف شمشیر برہنہ رہے۔ میں سالوں سے جنرل ضیاء الحق اور مارشل لاء کے سخت ترین نقادوں میں رہا ہوں۔ میری سینٹ کی تقریریں اور اخبارات میں تحریریں اس پر شاہد عادل ہیں۔ اب بھی آٹھویں ترمیمی بل پر جلوس کے بعد میرے جو خیالات شائع ہوئے ہیں وہ آئی جے آئی کے بجائے پیپلز پارٹی کے نقطہ نظر کے ترجمان ہیں پھر جلوس کے پس پردہ سیاسی مقاصد کہاں سے در آئے؟ جلوس میں کوئی بینر حکومت کے خلاف نہ تھا کوئی نعرہ خلاف حکومت نہیں لگا' اب اگر مشیروں کی بے دانشی سے تحریک کا رُخ حکومت اپنے خلاف موڑنے پر تل جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟۔

یہ مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ جلوس برطانوی سفارت خانے کے بجائے امریکن سنٹر کیوں گیا؟ میرے ایک عزیز صحافی نے جن کی صلاحیتوں کا میں نے ہمیشہ کھلے دل سے اعتراف کیا ہے' یہ دون کی لی ہے کہ اصل میں یہ روس اور امریکہ کی جنگ تھی۔ کوثر نیازی روس کا دورہ کر چکا ہے اس نے روس کی شہ پر یہ ساری کارروائی کی تھی۔ مجھے اپنے عزیز کے وسعت مطالعہ پر بڑا اعتماد تھا مگر ان کا یہ طرزِ فکر دیکھ کر مایوسی ہوئی' اس سے بڑھ کر حیرت جماعت اسلامی سے وابستہ کراچی کے ایک "ہفتگی" پر ہوئی جس کے اکابر تو اس تحریک میں ہمارے شانہ بشانہ چل رہے ہیں' مگر وہ امریکہ نوازی میں اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرے مضمون کے بعد خود اس نے تمام شرعی احکام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رشدی کے ان اقتباسات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا جو خود ایک طرح کی توہینِ مصطفےٰ ہے۔ اپنے تازہ ترین شمارہ میں "اسلام آباد کے خونین سانحہ" کے تحت یہ رسالہ لکھتا ہے۔

> "اس وقت سلمان رشدی کی کتاب پر احتجاج کی آڑ میں روسی' کابلی اور بھارتی ایجنٹوں نے شرکائے جلوس میں شامل ہو کر پاکستانیوں کے جذبات کو امریکہ کے خلاف بھڑکانے' پاک امریکہ تعلقات کو کشیدہ کرنے اور دیندار افغان مجاہدین کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت واشتعال پیدا کرنے کی سازش کی ہے"۔

کاش! "یہ صاحبِ صلاحیت" بزرگوار کراچی ہی میں اپنے قائدین کے زیر اہتمام نکلنے والے جلوس کے پلے کارڈ اور بینر پڑھ لیتے اور ان کی تقریریں سن لیتے تو پھر کوثر نیازی دشمنی میں وہ یوں ہوش وحواس سے بیگانہ نہ ہوتے۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ برطانیہ میں بک سٹالوں سے کتاب اٹھالی گئی تھی۔ اب ناشر نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے از سرِ نو نیویارک سے شائع کیا جائے گا' بیرونی پریس میں چھپنے والی خبروں اور لندن اور نیویارک کی اسلامی تنظیموں کے رہنماؤں سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق 22 ر فروری کو

مارکیٹ میں آنا تھا۔ مزید بر آں ناشرین نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اسے امریکہ ہی سے نو دوسری زبانوں میں شائع کیا جائے گا۔ اب قدرتاً مسئلہ یہ درپیش تھا کہ امریکہ میں زیر تکمیل اس اشاعتی مہم کو رکوانے کے لئے فی الفور کارروائی کی جائے' بدیں وجہ امریکن سنٹر پر مظاہرہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ویسے بھی اسلام آباد میں برطانوی اور امریکی سفارتخانے آبادی سے دور ایک "ڈپلومیٹک این کلیو" میں واقع ہیں اور ادھر حکومت کسی جلوس کے داخلے کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ کرتی۔ امریکن سنٹر اسلام آباد کے پررونق علاقے میں واقع ہے اور وہاں تک جلوس کے جانے میں انتظامیہ بھی آمادہ ہو گئی جو اصحاب روسی لابی کی بات کرتے ہیں وہ گویا یہ ثابت کرتے ہیں کہ مذہبی جذبات اور عظمت مصطفےؐ کے لئے کٹ مرنے کی لہر پیدا کرنا بھی کمیونزم کے پروگرام میں شامل ہے' وہ یہ نہیں سوچتے کہ کمیونسٹ تو اس تصور ہی سے لرزہ براندام ہیں کہ ان کے زیر نگیں وسط ایشیا میں کہیں اڑوس پڑوس سے یہ لہر پہنچ گئی تو مارکس اور لینن کے فلسفے کا کیا بنے گا؟۔

اصل میں بہت سے کرم فرماؤں کو یہ دکھ ہے کہ کوثر نیازی نے اس تحریک کا آغاز کیوں کیا؟ کوئی اور کرتا تو شاید ان کی سوئی ہوئی رقابتیں اعتراضات والزامات کے یہ گل بوٹے نہ کترتیں۔ ایک اور بزرگوار جو پاکستان میں "خمینی ثانی" کہلانے کے شوق میں مبتلا ہیں اور اپنے دست حق پرست پر بیعت ہی کو انقلاب اسلامی کی شرط اوّل قرار دیتے ہیں۔ اسلام آباد کی تحریک پر کچھ زیادہ ہی تلملاہٹ اور تکلیف کا شکار ہیں۔ ان بزرگوار کو شاید یاد نہیں رہا جب انہوں نے ہمیں جماعت اسلامی کی رکنیت کے لئے درخواست دی تھی تو اسے مجھ ناہنجار ہی کے بعض اشعار سے مزیّن فرمایا تھا ان کا ارشاد ہے کہ "اسلام آباد کا جلوس ایک غیر نمائندہ شخصیت کی طرف سے اپنا سیاسی تشخص ابھارنے کا ایک اوچھا مظاہرہ تھا"۔

بدم گفتی خور سندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

میں تو خیر ایک ذرہ ناچیز اور خالص غیر نمائندہ آدمی ہوں' مگر حضرت سے پوچھا جائے کہ انہوں نے نمائندگی کی سند کہاں سے حاصل کی ہے۔ محض ایک خطبہ جمعہ سے؟ اگر یہی معیار ہے تو یہ عاجز بھی سولہ سال تک لاہور کی ایک جامع مسجد میں خطبہ جمعہ دیتا رہا ہے۔ محض پمفلٹ اور دو چار کتابیں لکھ دینے سے؟ اگر یہی کسوٹی ہے تو دو درجن سے زیادہ کتابیں میری بھی چھپ چکی ہیں۔ میں تو غیر نمائندہ ٹھہرا کہ 70ء اور 77ء کے انتخابات میں دو مرتبہ قومی اسمبلی کا رکن رہا۔ 80ء میں قومی اسمبلی کے 171 حاضر ارکان میں سے 141 نے مجھے ووٹ دے کر سینٹ کا رکن منتخب کیا لیکن سرکار "تقویٰ مآب" اس لئے نمائندہ ہیں کہ انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ مارشل لاء کے دور میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اپنی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا۔ حضرت سے یہ بھی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جلوس تو خالص دینی تھا پھر اس میں سیاسی تشخص

کامسئلہ کہاں سے در آیا؟ کیا کوئی ضمنی الیکشن ہونے والا تھا جس میں مجھے ووٹ درکار تھے۔ افسوس کہ تقویٰ مآبی اور منہاج نبوت پر چلنے کے دعویداروں کی انا اتنی متورم ہو گئی ہے کہ وہ دوسروں کی نیتوں پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

غرور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگان خدا پر زباں دراز کرے

خدا کے فضل و کرم سے پاکستان کی تحریک تحفظ ناموس رسالتؐ نے دنیا بھر میں غلغلہ برپا کر دیا ہے۔ شہدائے اسلام آباد کی قربانیوں کے نتیجے میں امام خمینی کے صادر کردہ فتویٰ سے گستاخانِ رسولؐ لرزہ براندام ہیں۔ رشدی اور اس کی کتاب دم توڑ رہی ہے۔ مجھے جو کچھ چاہئے تھا مل گیا کل قیامت کے دن حضور رسالتؐ میں اپنا پھٹا ہوا سر اور بہا ہوا خون ہی میرے لئے ذریعۂ شفاعت ہو گا۔ اس کے بعد نہ کسی کی طعن و تشنیع کی مجھے پرواہ ہے نہ کسی الزام تراشی کا افسوس۔

"رُشدی" کا مسئلہ

بین الاقوامی حلقوں بالخصوص برطانیہ میں تو "رُشدی" کا مسئلہ برابر عوامی توجہات کا مرکز بنا رہا ہے لیکن پاکستان میں بینظیر بھٹو کے "رُشدی پرور" رویئے اور اسلام آباد فائرنگ کے سلسلے میں ہونے والی طویل عدالتی تحقیقات کی وجہ سے یہ کچھ عرصہ سے پس منظر میں چلا گیا تھا اب پاکستان ہی میں رونما ہونے والے دو واقعات نے اسے نئے سرے سے جلا بخشی ہے اور امید ہے کہ تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے رہنما 24 اکتوبر کی مصروفیات سے فارغ ہوتے ہی اسے از سرِ نو پوری شدومد سے اٹھائیں گے لیکن الیکشن کی مصروفیات کے دوران بھی نگران حکومت کو اس سلسلے کے کچھ مسائل کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے سو ان سطور کا محرک انہی مسائل کی نشاندہی کرنا ہے مگر سب سے پہلے ان دو واقعات کا تذکرہ جن سے یہ مسئلہ پھر سے پاکستان میں تازہ ہو گیا ہے۔

ان میں سے پہلا واقعہ "رُشدی" اور اس کی کتاب پر بننے والی ایک فلم ہے جس نے نہ صرف پاکستانی عوام کے جذبات کی عکاسی کی ہے بلکہ برطانوی معاشرے کے تضادات کو بھی طشت ازبام کر دیا ہے۔ "انٹرنیشنل گوریلے" کے نام سے یہ فلم بنی جس میں رُشدی کو آسمانی عذاب سے جل کر راکھ ہوتے دکھایا گیا ہے تو برطانیہ میں رُشدی کے سرپرست حلقوں میں کھلبلی مچ گئی' بی بی سی ٹیلی ویژن کی ایک ٹیم پاکستان پہنچی اور اس نے سینما گھروں میں جا کر لوگوں کے رش کو فلمایا' فلم کے بعض سین اپنے ہاں ٹی وی پر دکھانے کے لئے کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کیے۔ فلم دیکھنے والے بعض تماشائیوں کے تاثرات ریکارڈ

کئے اور جب یہ ٹیم میرے پاس میرا انٹرویو لینے آئی تو اس کے سبھی ارکان اس بات پر حیران اور پریشان تھے کہ فلم کی ٹکٹیں بلیک ہو رہی ہیں اور لوگ فلم کے دوران جوش و جذبے سے نعرے لگاتے ہیں ہم نے جس سے پوچھا اس نے یہی جواب دیا کہ میرا بس چلے تو "رُشدی" کو زندہ نہ چھوڑوں۔ میں نے کہا "آپ کا' پریس' آپ کی حکومت اور آپ کے ادیب اور دانشور تو اب تک یہی پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں کہ یہ مسئلہ "بنیاد پرستوں" کا اٹھایا ہوا ہے کیا سینما گھروں میں اپنی آنکھوں سے یہ صورتحال دیکھ کر بھی آپ لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ یہ کسی مخصوص طبقے کا مسئلہ نہیں' عام مسلمان کا مسئلہ ہے۔ آپ لوگ اوّل تو "بنیاد پرست" کی اصطلاح گھڑ کر ہی ایک غیر علمی حرکت کر چکے ہیں لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس طرح کا کوئی طبقہ عالم اسلام میں پایا جاتا ہے تو کم سے کم اس سے تو آپ اتفاق کریں گے کہ وہ سینما گھروں میں نہیں پایا جاتا اس کے نزدیک تو سینما جانا ہی گناہ کا کام ہے یہ ہزاروں لوگ جو آپ قطار در قطار اس فلم کے لئے سینما گھروں کے باہر دیکھ رہے ہیں' عام گنہگار مسلمان ہیں حقیقت میں یہ مسئلہ "بنیاد پرستوں" کا نہیں ان عام گنہگار مسلمانوں کا ہے جو پیغمبرؐ کو اپنے دلوں کی دھڑکن اور خدا کے بعد اپنا پہلا اور آخری سہارا سمجھتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ جس سعودی عرب کو آپ "بنیاد پرست" معاشرہ سمجھتے ہیں یہ تحریک وہاں نہیں اٹھی اس کا آغاز پاکستان سے ہوا ہے' جس میں علمائے کرام نے ہی اپنا خون نذر نہیں کیا' سات نوجوانوں نے ناموس رسالتؐ پر اپنی جانیں قربان کی ہیں"۔

بعد میں' میں لندن گیا تو دوستوں سے معلوم ہوا کہ برطانوی ٹیلی ویژن نے "انٹرنیشنل گوریلے" فلم پر جو پروگرام پیش کیا اس میں میرا یہ انٹرویو بھی شامل تھا۔ اس پروگرام کا انگریزوں پر کیا اثر ہوا' اس کا تو اندازہ نہیں ہو سکا لیکن پاکستانی فلم کو برطانیہ کے لاکھوں پنجابی بولنے والے لوگوں میں بڑی پبلسٹی ملی پھر چونکہ اسے انگریزی میں بھی ڈب کیا جا رہا تھا اس لئے انگریزی دان طبقہ بھی یکساں اس کے دیکھنے کا مشتاق تھا' شوٹنگ وڈیو سنٹر لندن کے مالک مسٹر محمد فیاض نے فلم کے حقوق خرید کر اسے "برٹش بورڈ آف فلم کلاسیفیکیشن" کے سامنے پیش کیا تو اس نے اس پر پابندی لگا دی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں "وڈیو اپیلز کمیٹی" نے مسٹر فیاض کی اپیل پر ان کے حق میں فیصلہ دے دیا مگر برطانوی قانون اور معاشرے کا جو تضاد آزادیٔ اظہارِ رائے کے حسین پردوں میں چھپا ہوا تھا ایک دفعہ تو کھل کر سامنے آ گیا۔

"رُشدی" کی کتاب پر پابندی نہیں لگ سکتی خواہ اس سے کروڑوں دل زخمی اور روحیں فگار ہوئی ہوں مگر ایک فلم پر پابندی لگ سکتی ہے کیونکہ اس میں ایک شخص کو عذابِ الٰہی کا نشانہ بنتے دکھایا گیا ہے' بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ایک مٹھی بھر نام نہاد دانشور اور روشن خیال طبقہ مغرب کے آزادیٔ اظہارِ رائے کے نعروں سے بری طرح مرعوب ہے مگر بنیادی طور پر ان پڑھ اور سطح بیں ہونے کی وجہ سے وہ مغرب کے ان لاتعداد واقعات سے نابلد ہے جن سے اس کے دہرے معیار کا ثبوت ملتا ہے۔

امریکی روزنامہ سان فرانسسکو ایگزامینر نے اپنی 10 مارچ 88ء کی اشاعت میں ایک رپورٹ

شائع کی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ ایک برطانوی انٹیلی جنس آفیسر کی ایک کتاب پر برطانوی حکومت نے اس لئے پابندی عائد کر دی ہے کیونکہ اس میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے موقع پر برطانیہ کو اس بات کا پیشگی علم تھا کہ جاپان امریکہ کی پرل بندر گاہ پر ایک تباہ کن حملہ کرنے والا ہے لیکن اس نے اس راز کو صرف اس لئے چھپائے رکھا تا کہ امریکہ کو بھی جنگ عظیم میں ملوث کیا جا سکے۔

اور امریکی سی آئی اے کے ایک سابق ایجنٹ اور کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل فلپ ریجی کا یہ واقعہ تو مغرب کے احوال پر نظر رکھنے والے ابھی اہل نظر کو یاد ہے کہ جب اس نے سی آئی اے کو چھوڑنے کے بعد اس ادارے کے معاملات سے متعلق انکشافات پر مبنی کتاب لکھنی شروع کی تو اس پر بے حد دباؤ ڈالا گیا اسے دھمکیاں دی گئیں یہاں تک کہا گیا کہ سی آئی اے انہیں قتل کرا دے گی' اس دباؤ سے مجبور ہو کر مسٹر فلپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انگلستان سے چلے گئے اور یورپ کے ایک گمنام گوشے میں سر چھپا کر بیٹھ گئے۔

مصنفین اور اہل قلم کی بات تو رہنے دیجئے کہ وہ پھر کچھ وزن رکھتے ہیں مغرب کے اس رویّے کا شکار وہ فنکار اور موسیقار بھی بنتے رہتے ہیں جو اکثریت کے عقیدے اور نظریات کا احترام نہیں کرتے۔

"میڈونا" امریکہ کی ایک مشہور گلوکارہ ہے جسے نئی نسل میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہے مگر جب سے اس نے ایک گانا "لائک اے پریئر" پکچرائز کرایا ہے جس میں چرچ' سینٹ اور صلیب کا استخفاف ہے اسے طرح طرح سے عوامی اور اداروں کی سطح پر قہر و غضب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ مشروبات کی ایک کمپنی میڈونا کو اپنے ٹی وی اشتہارات میں دکھایا کرتی تھی اس پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ میڈونا کے گانوں کو اپنے "ایڈز" میں دکھانا بند کر دے۔ کسی نے نہیں کہا کہ یہ کمپنی کی آزادی میں مداخلت کے مترادف ہے۔

ابھی جولائی 90ء میں میڈونا کو روم میں اپنا ایک شو کرنا تھا مگر عیسائیوں کے دباؤ اور یورپ کے اشارے پر عوام نے اس کے شو ناکام بنا دیئے' اچھی خاصی گڑبڑ ہوئی' مگر "رُشدی" کا دفاع کرنے والے کسی حلقے نے اس پر احتجاج نہیں کیا کہ میڈونا کی آزادیٔ اظہارِ رائے پر یہ حملہ کیوں کیا جا رہا ہے۔

یہی رویّہ مشہور گلوکار "کیٹ سٹیونز" کے ساتھ روا رکھا گیا جس کی مقبولیت ایک زمانے میں پورے یورپ میں پھیلی ہوئی تھی اس نے اسلام کیا قبول کیا تعصبات کی آگ بھڑک اٹھی اور اس وقت تو قیامت ہی برپا ہو گئی جب اس نے آیت اللہ خمینی کے مشہور عالم فتوے کے حق میں آواز بلند کر دی۔ امریکہ کے بیشتر ریڈیو سٹیشنوں نے اس کے ریکارڈ چلانے بند کر دیئے' بعض جگہوں پر برسرِ عام اس کی موسیقی کے ریکارڈوں کو نذر آتش کیا گیا مگر کسی اخبار کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس پر اپنے کالموں میں صدائے احتجاج بلند کر سکے۔

امریکی پرچم کو آگ لگانے کے مسئلہ ہی کو لے لیجئے' اب تک امریکی قانون میں پرچم کو اپنے جذبات کے اظہار کے طور پر آگ لگانا جرم نہ تھا اس طرح کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے جن میں افراد اور تنظیمیں

اپنی ناراضگی کے اظہار کے طور پر امریکی پرچم کو نذرِ آتش کر دیا کرتی تھیں۔ اب قانون بنا دیا گیا ہے کہ ایسا کرنا جرم ہے امریکی آئین میں بھی اس مقصد کے لئے ایک ترمیم کی جا رہی ہے ہمارے ہاں کے آزادی پسندوں نے اسے بنیادی حقوق میں مداخلت قرار کیوں نہیں دیا؟۔

آسٹریا کے صدر والڈہائم کسی زمانے میں نازی ازم میں ملوث رہے ہوں گے ایک ملک کا صدر ہونے کے باوجود امریکہ میں ان کے داخلہ پر پابندی لگا دی گئی۔ یاسر عرفات اسرائیل کے دشمن ہیں اس لئے انہیں بھی امریکہ کا ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ میں ایک ذرۂ ناچیز ہوں مگر چونکہ پاکستان میں رُشدی کے خلاف تحریک چلانے میں مَیں بھی شامل تھا میرے پاسپورٹ پر پانچ سال کے لئے لگا ہوا امریکی ویزا منسوخ کر دیا گیا۔ ہمارے ہاں کے مغرب نواز حلقوں میں کسی نے بھی کہا کہ یہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کے جمہوری حق کا اتلاف ہے؟۔

مغرب کی ایک اور تازہ ترین حریت پسندی کا مظاہرہ "کورٹنگ ڈز آسٹر" کے نام سے اس کتاب کے خلاف اٹھنے والا طوفان ہے۔ جس میں انگلستان کے شاہی خاندان کے چند اسرار سربستہ پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ کتاب کے مصنف میلکم بار کر 80ء سے 83ء تک شاہی خاندان کے محل سرا میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں اس کتاب میں انہوں نے برطانیہ کے شاہی محلات میں کثرت مے خواری اور ناجائز جنسی تعلقات کی داستانیں قلمبند کی ہیں ایک تصویر میں بستر پر ملکہ معظمہ جس انداز سے استراحت فرما رہی ہیں اس کی اشاعت بھی ملکہ کے غیض و غضب کا باعث بنی۔ اس کتاب کے بعض اجزا فرانس کے ایک رسالہ "پیرس میچ" میں بھی شائع ہوئے ہیں لیکن اب برطانوی ایڈیشن میں ان کو خارج کر دیا گیا ہے۔

خود رُشدی نے اپنی ایک اور کتاب "مڈنائٹ چلڈرن" میں اندرا گاندھی پر جو کیچڑ اچھالی تھی بھارتی حکومت نے اس پر احتجاج کیا تو وہ حصے کتاب سے حذف کر دیئے گئے مگر پیغمبرِ اسلامؐ، ازواجِ مطہراتؓ اور صحابہ کرامؓ کو ننگی گالیاں دینے پر دنیا بھر کے مسلمانوں کے سینے چھد گئے اور ان ناپاک حملوں کے خلاف جانی قربانیاں تک دی گئیں تو بھی نہ مصنّف اور ناشر کو کتاب میں سے یہ قابلِ اعتراض حصے حذف کرنے کی توفیق ہوئی اور نہ ہمارے کفر نواز حلقوں کو یہ مطالبہ کرنے کا حوصلہ ہوا، الٹا تنقید ہوئی تو شمعِ رسالتؐ کے پروانوں پر، زبانِ طعن دراز ہوئی تو تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے کارکنوں پر، یہ تھڑدلے ہیں جمہوریت اور آزادیٔ اظہارِ رائے کا احترام نہیں کرتے، علم اور سائنس کی نعمتوں سے محروم ہیں مگر اے مغرب کے زلہ خوارو! اے غیروں کے خوانِ علم و ادب کی ریزہ چینی کرنے والو! اے مغربی اہلِ قلم کے چبائے ہوئے مضمون کی جگالی کرنے والو! تھڑدلے ہم ہیں یا تم جنہیں بدبخت مصنّف کو یہ نصیحت کرنے کی بھی توفیق نہیں کہ کتاب سے وہ حصے نکال کیوں نہیں دیتے جس سے کروڑوں دل زخمی ہوئے ہیں؟

اب رُشدی برطانوی حکومت کو اپنے حقوق کی دہائی دے رہا ہے، لندن کے مشہور روزنامہ "انڈی

پینڈنٹ کی 4 فروری 90ء کی اشاعت پر اس کا جو مضمون چھپا ہے اس میں وہ کہتا ہے:۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں ایک عام آدمی کی طرح اپنی مرضی سے نہ سڑکوں پر چہل قدمی کر سکتا ہوں اور نہ ہی کسی کتاب کی دکان میں جا کر کتابوں کی ورق گردانی"۔

اس بد بخت کی حالت یہ ہے کہ بیوی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے یہ سزا سے بچنے کے لئے پچھلے ایک سال میں ساٹھ ٹھکانے تبدیل کر چکا ہے مگر پھر بھی اسے توبہ کرنے اور اپنے گھناؤنے جرم کا اعتراف کرنے کی توفیق نہیں ہوتی' اسی مضمون میں کہتا ہے:۔

"صاف لفظوں میں' میں مسلمان نہیں ہوں' میں اپنے اوپر لگائے گئے کفر اور الحاد کے الزام کو نہیں مانتا کیونکہ جہاں ایمان ہے ہی نہیں وہاں کفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

ظاہر ہے مرتدوں کے اس امام کو کوئی بھی ذی ہوش انسان مسلمان نہیں سمجھے گا مگر کیا اس کے مسلمان نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمارے آقا و مولا کو گالی بھی بکے' کیا غیر مسلم ہونے کے بعد یہ لائیسنس مل جاتا ہے کہ مسلم دینی رہنماؤں کی اہانت کی جائے اور ناول اور افسانہ کی آڑ میں کاغذ پر اپنے خبثِ باطن کی قے کے چھینٹے اڑائے جائیں۔

بہر حال پاکستانی فلم "انٹرنیشنل گوریلے" کے اس قضیئے نے برطانیہ میں پہلے سے تازہ اس مسئلے کو مزید اجاگر تو کیا ہی تھا پاکستانی پریس میں پے در پے چھپنے والی خبروں سے یہاں کے عوام کا حافظہ بھی اس سلسلے میں پھر سے چمک اٹھا ہے۔ شاید ہمارے ہاں کے پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں جانتے کہ رشدی کے مسئلہ پر بین الاقوامی توجہات مرکوز ہونے کے بعد یہودی ذہانت نے "پامیلا سکینڈل" کو اس آب و تاب سے پھیلایا کہ چند دنوں میں خود مسلم پریس بھی رشدی کو بھول کر پامیلا کی سرخیوں سے اپنے صفحات کو رنگین بنانے لگ پڑا جونہی رُشدی کا مسئلہ پس منظر میں چلا گیا' پامیلا کے قصے بھی اخباروں سے غائب ہو گئے۔ اب اس فلم کے بعد ذہنوں سے اس مسئلہ کو کھرچنے کے لئے نہ جانے کون سا نفسیاتی حربہ استعمال کیا جائے مگر جب تک یہ حربہ استعمال نہیں ہوتا کم سے کم اس وقت تک ایک مرتبہ پھر ہمارے عوام کی ذہنی فضا میں ہل چل مچ گئی ہے خدا کرے کہ اس کے تعمیری نتائج بر آمد ہوں۔

دوسرا واقعہ اسلام آباد میں رُشدی کے خلاف نکلنے والے مشہورِ عالم جلوس پر فائرنگ کے سلسلے میں ہونے والی تحقیقات کی رپورٹ کا منظر عام پر آنا ہے۔

اس عدالتی تحقیقات کا مطالبہ قومی اسمبلی میں تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے رہنماؤں نوابزادہ نصر اللہ خان' حضرت مولانا عبد الستار خان نیازی اور مولانا فضل الرحمٰن نے کیا تھا۔ ان حضرات کو اندازہ نہ تھا کہ حکومت اس عدالتی تحقیقات کو عوامی جذبات کی آگ سرد کرنے کا ذریعہ بنائے گی اور اسے اتنا طول دے گی کہ تحریک ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ قدرتاً لوگوں کی آنکھیں عدالتی تحقیقات پر لگی رہیں گی کہ دیکھئے اس

کا کیا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے تحقیقات مکمل ہوئی اور فاضل جج جناب جسٹس اعجاز نثار نے رپورٹ مکمل کر کے وزارت داخلہ کو بھجوادی تو اس کے "دانشور" وزیر تحقیقات کو اپنی خواہشات کے خلاف پا کر اس کے اوپر بیٹھ گئے کئی ماہ گذر گئے مگر اسے حسب وعدہ اسمبلی میں پیش نہ کیا۔ تحریک کے رہنما جناب صدر مملکت سے ملے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی 'شہدائے ناموسِ رسالت کے ورثاء کا ایک وفد بھی ان سے ملوایا انہیں بتایا گیا کہ یہ جان نثارانِ رسالت اپنے شہدوں کے خون کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتے اس لئے کہ

شہیدانِ وفا کا خون بہا کیا؟

مگر حکومت کو تو شرم کرنی چاہئے کہ ہر حادثہ میں مرنے والے لوگوں کے لئے اس کے پاس امدادی رقوم ہیں مگر شہدائے ناموسِ رسالت کو خاک و خون میں تڑپانے کے بعد ان کے پسماندگان کی مدد کے لئے اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ صدر صاحب نے ہماری گذارشات کو بہت ہمدردی سے سنا ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنے دفتر میں رُشدی سے متعلق تمام مسائل اور واقعات کی ایک مکمل فائل بنا رکھی تھی' انہوں نے بتایا کہ وہ کس طرح ہر برطانوی اور امریکی وی آئی پی سے اس مسئلہ پر بات چیت کرتے رہے ہیں اور دلائل سے اسلامی موقف کو ثابت کرتے رہے ہیں' انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ حکومت کو باقاعدہ ایک صدارتی مراسلے کے ذریعے رپورٹ کی اشاعت' شہداء کے پسماندگان کی مالی امداد اور مسلم وزرائے خارجہ کے فیصلوں پر عملدر آمد کی ہدایت کریں گے۔ ہمیں یقین ہے صدر صاحب نے یہ خط لکھا ہو گا اس لئے کہ خدا کے فضل و کرم سے وہ اول و آخر مسلمان ہیں اور اپنے عوام کے احساسات و اعتقادات سے بخوبی واقف ہیں مگر ان کے مراسلہ کا بھی کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا اور رپورٹ بدستور وزارت داخلہ کے سرد خانے کی زینت بنی رہی۔

بینظیر حکومت ختم ہوئی تو ایک دفعہ پھر قائدِ تحریک نوابزادہ نصر اللہ خان نے صدر صاحب سے بات کی میں نے وزیر اعظم جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کو اس جانب متوجہ کیا' خدا کا شکر ہے کہ اب رکاوٹیں ختم ہو چکی تھیں ان حضرات نے فوری طور پر رپورٹ کی اشاعت کا حکم دیا اور اس طرح ایک بار پھر تحریکِ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے اس بین الاقوامی شہرت یافتہ جلوس کے حوالے سے رُشدی کا مسئلہ عوام کے ذہنوں میں تازہ ہو گیا۔ میں نے اس جلوس کو بین الاقوامی شہرت یافتہ جلوس اس لئے کہا ہے کہ 12 فروری 89ء کو اسلام آباد سے نکلنے والے اس جلوس کے بعد دنیا بھر میں تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے لئے وہ عظیم الشان تحریک چلی جس نے مغرب کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا اور اہانتِ رسول کے لئے اس ممکنہ فلڈ گیٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جو صیہونی سازش کے آلہ کار رُشدی کے اس ناپاک اقدام کی وجہ سے جگہ جگہ کھل سکتا تھا۔ 12 فروری کے اس جلوس کے بعد 13 فروری 89ء کو کشمیر اور بمبئی میں جلوس نکلے جن میں کئی مسلمان شہید اور ساٹھ زخمی ہوئے۔ 14 فروری کو امام خمینی نے یہ مجاہدانہ فتویٰ جاری کیا کہ ملعون

رشدی واجب القتل ہے۔ 15 فروری کو تہران میں برطانوی سفار تخانے کے سامنے مظاہرے ہوئے اور رُشدی کے سر کی قیمت کا اعلان کیا گیا۔ اگلے ہی دن امریکہ میں مظاہرے شروع ہو گئے اور رُشدی جو کتاب کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لئے امریکہ جانے والا تھا اس نے ڈر کے مارے اپنا سفر امریکہ منسوخ کر دیا۔ 17 فروری کو آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس نے اعلان کیا کہ اگر پینگوئن کا ادارہ اپنی کتاب کو واپس نہیں لے گا تو دنیا کے 45 اسلامی ملک اس کی ہر کتاب کا داخلہ اپنی اپنی حدود میں بند کر دیں گے غرضیکہ رُشدی کے سلسلے میں چلنے والی عالمی تحریک بنیادی طور پر اسلام آباد کے شہداء کے پاک خون ہی کی مرہون منت ہے۔

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سر فروشی کے فسانے میں

ہمیں معلوم ہے کہ دوران تحقیقات جسٹس اعجاز نثار پر کیا کیا دباؤ نہیں ڈالا گیا' انہیں تحریص و تخویف کے کن کن مرحلوں سے نہیں گذرنا پڑا مگر یہ اس مردِ مومن کا حوصلہ تھا جس نے انصاف کا دامن نہیں چھوڑا اور ایک ایسی غیر جانبدارانہ رپورٹ پیش کی جس کے نتیجے میں عدلیہ کے وقار کو چار چاند لگ گئے۔ تحقیقات میں حکومت کی اصل خواہش یہ تھی کہ کسی طرح اس سارے واقعہ کی ذمہ داری خطا کار و نانبجار کوثر نیازی پر ڈال دی جائے جسے پہلے تو بیگم بھٹو اور دانشور وزیر داخلہ کے خصوصی احکام پر تاک کر پولیس کے ایک پتھر کا نشانہ بنایا گیا کہ اگر وہ پتھر دو چار انچ ادھر ادھر اس کی کنپٹی یا آنکھ پر لگتا تو ہمیشہ کے لئے حکومت کو اس کے شر سے نجات مل جاتی اور اس طرح کچھ لوگوں کے انتقامی جذبات کی بھی تسکین ہو جاتی مگر جب ایسا نہ ہو سکا اور سپاہی کا نشانہ قدرے چوک گیا اور پتھر صرف اس کے سر ہی پر زخم لگا سکا تو اب منصوبہ یہ بنا کہ عدالتی تحقیقات کے ذریعے سے اسے مجرم بنوایا جائے اور اس پر اتنا ملبہ ڈال دیا جائے کہ وہ اس کے نیچے سے اٹھ نہ سکے۔ فاضل جج نے حکومت کے کیس کو سمیٹتے ہوئے جہاں اس کے دلائل کا خلاصہ بیان کیا ہے اس میں تان کم و بیش اسی بات پر آ کر ٹوٹتی ہے "انتظامیہ کے دلائل" کے زیر عنوان فاضل جج اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں:۔

"یہ شرمناک کتاب ایک سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اس کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اس پر پابندی لگا دی گئی تھی (یہ بات واضح طور پر غلط ہے کیونکہ خود فاضل جج نے اس کی تاریخ اشاعت ستمبر 88ء قرار دی ہے گویا اسلام آباد کا یہ جلوس اس کی تاریخ اشاعت کے تین ساڑھے تین ماہ بعد نکالا گیا تھا...... ک۔ ن) جب قومی اسمبلی میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تو حکومت نے اپوزیشن کے ساتھ مل کر کتاب کی مذمت کی۔ ان حالات میں اس بات کا کوئی جواز نہ تھا کہ لوگوں کو سڑکوں پر لایا جائے' اس کے پیچھے یقیناً سیاسی محرکات تھے۔ ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو موجودہ سیاسی ہیئت

حاکمہ کے خلاف ہیں اور اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اسے غیر مستحکم اور کمزور کر دیا جائے۔ اس احتجاج کا مقصد حکومت کو کمزور بنا کر اسے ختم کرنا تھا۔ منتظمین کو انسانی جان کا کوئی احترام نہ تھا مولانا کوثر نیازی جنہیں جمہوری عمل نے پیچھے چھوڑ دیا تھا ایک دفعہ پھر ابھر کر منظر عام پر آنا چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے بدنیتی سے کتاب کے نام کا ترجمہ "شیطانی کلمات" کے بجائے "شیطانی آیات" کیا اور اس کے جارحانہ اقتباسات کا ترجمہ کر کے عوامی جذبات کو مجروح کیا انہوں نے دینی اداروں کے طلبہ کو بطور خاص دعوت دے کر جلوس میں شامل کیا اور یہی نوجوان تھے جنھوں نے پولیس پر حملہ کیا۔ مولانا کوثر نیازی نے حدود سے تجاوز کیا کیونکہ حکومت نے مسلمانان عالم کے احتجاج کا ساتھ دیا' قابل اعتراض حصوں کا ترجمہ کر کے انہیں پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی انہوں نے روزنامہ "جنگ" میں مضمون لکھا اور اسلام آباد کی انتظامیہ ان کی چال میں آ کر ان کے اس وعدے پر بھروسہ کر بیٹھی کہ جلوس پوری طرح پر امن ہو گا"۔

دلائل اسی ورخ پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور انتظامیہ یہ جھوٹ بولنے میں بھی تامل نہیں کرتی کہ جلوس کلاشن کوفوں' لوہے کی سلاخوں' لاٹھیوں' ڈنڈوں' خنجروں اور پستولوں سے مسلح تھا اور اس میں شامل افراد نے پولیس پر فائرنگ کی پولیس نے تو اس کے جواب میں صرف ہوائی فائرنگ کی تھی۔

فاضل جج نے اپنی رپورٹ میں ان غلط بیانیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ:۔

(1) اس احتجاج کے پیچھے کوئی سیاسی محرک کار فرما نہ تھا یہ خالصتاً ایک دینی تحریک تھی۔

(2) مولانا کوثر نیازی نے کتاب کے نام کا صحیح ترجمہ کیا تھا' یہی ترجمہ ایران اور دوسرے مقامات کے علماء نے بھی کیا ہے۔

(3) جلوس میں شامل افراد مسلح نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے پولیس پر کوئی فائرنگ کی کیونکہ جتنے سپاہی زخمی ہوئے ہیں ان میں کوئی بھی گولی سے زخمی نہیں تھا۔

(4) پولیس نے ہوائی فائرنگ نہیں کی بلکہ نشانہ باندھ کر فائرنگ کی۔

(5) جلوس میں شامل افراد کا جذبہ مقدس اور قابلِ تعریف تھا' شہید ہونے والوں کی جان کا بدل کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا مگر میں پھر بھی حکومت سے سفارش کرتا ہوں کہ ہر شہید کے وارثوں کو ایک ایک لاکھ روپے ادا کئے جائیں۔

فاضل جج نے اگرچہ اپنی رپورٹ میں اس الزام کی پوری قوت سے تردید کر دی ہے کہ اس تحریک کے داعی اس احتجاج کے ذریعے سے بینظیر حکومت کو ختم کرنا چاہتے تھے مگر میں بات کو مزید واضح کرنے کے

لئے کہتا ہوں کہ اگر ہمارا منشاء یہ ہوتا تو ہم اپنی تحریروں اور تقریروں میں بتا سکتے تھے کہ لندن میں قیام کے دوران میں رُشدی محترمہ کی محفلوں کا مستقل حاضر باش تھا۔ ہم وہ اخباری تبصرہ بھی پڑھ چکے تھے، جو رُشدی نے محترمہ کی کتاب "ڈاٹر آف دی ایسٹ" پر کیا تھا۔ ہمیں لندن ٹی وی کے چینل 4 سے ٹیلی کاسٹ ہونے والا رُشدی کا وہ انٹرویو بھی یاد تھا جو 88ء کے پاکستانی انتخابات کے دوران میں نشر ہوا تھا اور جس میں رُشدی نے کھل کر محترمہ کی تائید کی تھی مگر رُشدی کے خلاف چلنے والی ہماری تحریک میں کہیں بھی ان معلومات کو استعمال نہیں کیا گیا۔ خود فاضل جج نے لکھا ہے کہ جلوس کا فیصلہ کرنے والے اجلاس میں کچھ لوگوں نے تجویز کیا تھا کہ اسے پرائم منسٹر ہاؤس کے باہر ختم کیا جائے مگر کوثر نیازی نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ہم چاہتے تو اپنے شہداء کی لاشیں اٹھا کر شہر بہ شہر نکل کھڑے ہوتے اور واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ حکومت دو دن بھی قائم نہ رہ سکتی مگر ہم نے اس طرح کا کوئی رستہ اختیار نہیں کیا ہم شہداء کے خون کا سودا کسی سیاسی نفع کے حصول کے لئے نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں ویسے ہی یقین تھا کہ یہ خون رنگ لائے گا ایک طرف اس سے پوری دنیا میں ناموسِ رسالتؐ کا پرچم اور بلند ہو جائے گا اور دوسری طرف وہ ظالم حکمران بھی تا دیر اپنی مسندوں پر قائم نہیں رہ سکیں گے جنہوں نے اس بیدردی سے جان نثارانِ رسالت کا خون بہایا ہے۔ عروج و زوال کے روحانی اسباب ہماری نظر میں تھے اور اگرچہ بینظیر حکومت کا خاتمہ 6ر اگست کو ہوا ہے مگر ہمیں یقین ہے کہ اس کی بنیاد 12ر فروری کو اسی وقت پڑ گئی تھی جب مبینہ طور پر بیگم بھٹو اور ایک وزیر کے احکام کے تحت رسولؐ خدا کے سات شیدائیوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اور متعدد مظاہرین شدید زخمی ہو گئے تھے۔

اس رپورٹ کی اشاعت سے مسئلہ ایک دفعہ پھر ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ نئی حکومت کا یہ اقدام لائق تبریک ہے کہ اس نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا مگر ابھی تک فاضل جج کی سفارش کے مطابق شہداء کے ورثاء کی امداد نہیں کی گئی، فائرنگ کے ذمہ دار افراد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی (کہ منصب کے لحاظ سے اس واقعۂ ہائلہ کا اصل مجرم وہی ہے) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئی حکومت نے مسلم وزرائے خارجہ کے ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے عزم بالجزم کا اب تک کوئی اعلان نہیں کیا جن میں کتاب کے پبلشر کی دوسری تمام کتابوں کا داخلہ بھی تمام مسلمان ملکوں میں بند کرنا طے پایا تھا ہمارے ہاں کے پریس نے تو یہ خبر شائع نہیں کی کہ شاید ہماری وزارت خارجہ بینظیر حکومت کے دوران اس بات کو پبلسٹی نہیں دینا چاہتی ہو گی مگر دوسرے ملکوں کے مسلم پریس نے اطلاع دی ہے کہ قاہرہ میں ہونے والے حالیہ مسلم وزرائے خارجہ کے اجلاس میں دوبارہ پھر تمام مسلمان ملکوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ رُشدی کے سلسلے میں ہونے والے سابقہ اجلاس کے فیصلوں کو فوری طور پر عملی جامہ پہنائیں۔

اگر اس معاملے میں کوئی مسلمان لیڈر یا حکومت کسی مغالطے میں مبتلا ہے تو اسے فوراً اس مغالطے سے نکل آنا چاہئے کہ تحفظِ ناموسِ رسالت کی تحریک کوئی وقتی تحریک ہے یہ وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو

جائے گی۔ یہ تحریک ایک دائمی اور لازوال تحریک ہے اور جو مسلمان حکومت بھی اس کے تقاضوں سے منہ موڑے گی اس کا حشر وہی ہو گا جو بینظیر حکومت کا ہوا ہے۔ ہر شخص جان لے کہ رُشدی ملعون اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ کر رہے گا اور اس کے نام نہاد مسلم اور غیر مسلم بھی سرپرستوں کے وہ تمام منصوبے خاک میں مل کر رہیں گے جو وہ اس بد نہاد کی حفاظت کے لئے بنا رہے ہیں۔ قرآن پاک نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے:-

والذین یوذون رسول اللہ لہمُ عذاب الیم

ترجمہ ...... "جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

اور یہ دردناک عذاب دنیا و آخرت دونوں جگہ رُشدی کا منتظر ہے۔

کوثر نیازی کی دیگر تصنیفات

جنگ پبلشرز

......اور لائن کٹ گئی

بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک، بھٹو سے پی این اے کے مذاکرات اور پھر یکلخت جنرل ضیاء الحق کے آپریشن فیر پلے تک کے سنسنی خیز واقعات ....

ذوالفقار علی بھٹو

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت پر پہلی اور آخری جامع دستاویز۔ انکشافات ہی انکشافات ....

جنہیں میں نے دیکھا

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
مذہب، روحانیت، تصوف، فکر و دانش، علم و ادب، سیاست اور زندگی کے دیگر اہم شعبوں سے متعلق نامور شخصیات کا انوکھا تذکرہ ....

ذکر رسولؐ

عشق اور وارفتگی میں ڈوبے ہوئے قلم سے لکھی گئی کتاب

ذکر حسینؓ

خون دل [illegible] لکھی گئی
دلگداز کتاب۔

جنگ پبلشرز 13- سر آغا خان روڈ لاہور فون 24-305820